جلد ۳ نمبر ۵ ماہ ذوالحجہ ۱۳۳۹ہجری مطابق ماہ اگست ۱۹۲۱ء

شذرات

دفتر ستاب میں مقصد ذیل کتب برائے ریویو موصول ہوئی ہیں۔ جن پر ریویو بعد ازاں کیا جائیگا۔

(۱) رباعیات وتنان مصنفہ رودر دت وشا مرحوم جو ایک روپیہ کو لالہ دیودت مہاجن کوچہ دائی بصولی سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

(۲) روایات ادب مرتبہ احمد منصور صاحب اس میں مولانا شبلی۔ مولوی ظفر علی اور ڈاکٹر اقبال کا کلام ہے یہ کتاب چھ آنہ کو ہندوستانی کتب خانہ لاہور سے ملیگی۔

افسوس ہے کہ ایڈیٹوریل سٹاف کو پروف پڑھنے کی فرصت نہیں ہے۔ موجودہ پروف ریڈر کی بے اعتنائی قابل افسوس ہے۔ جولائی نمبر میں بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں حضرات ناظرین ازراہ کرم درستی فرمالیں۔

جناب گوہر چانسی کے مضمون کا غلطنامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵۰		واقعات عالم	واقعات عالم شعر
"	۱۱	حکم کی پہلی صورت	حکم کی پہلی حکومت
۶۱	۱۵	قائل	فائلہ
"	۱۰	چاہیئے	بتا ہے
"	"	بنائی	بنائے
"	"	چاہے	چاہیے
"	۲۳	قائل	فائلہ
"	۲۴	قائل	فائلہ

غلطنامہ کلام جناب لسان الہند مرزا عزیز لکھنوی

ایک غزل کا ساتواں شعر یوں ہے۔ سیر گلشن سے کیا غرض ہم کو + اک تماشائے دلفگاری ہے
اک تماشا ہے لکھدیا

مقطع کے دوسرے مصرع میں بجائے ستے - سی چاہیئے۔ بیقراری سی بیقراری ہے۔

پیکٹوں کے گم ہونے کی شکایت آنے سے زیادہ ہوتا ریخ اشاعت تیس تاریخ ہر ماہ کی دس تاریخ تک اطلاع آنے پر دوبارہ پرچہ ارسال ہوسکتا ہے۔ خط وکتابت میں نمبر رجسٹر کا حوالہ لازمی ہے

برکت علی جائنٹ ایڈیٹر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شباب اردو

مولوی آل لطیفی او بی ای ایم۔ اے۔ ایل ایل ڈی بیرسٹرایٹ لا+ آئی سی ایس

مولوی آل لطیفی جن کی تصویر اگست کے نمبر میں زینت افروز رونق شباب ہے ۱۲ نومبر ۱۸۷۶ء کو عالم ارواح سے کشور اجسام میں تشریف لائے۔ آپ مسٹر قمر الدین لطیف کے نورعین ہیں۔ جن کے آبا و اجداد ایک معزز اور ممتاز گھرانے کے گراسیہ راجپوت تھے۔ آپ کی والدہ محترمہ کے بزرگ مشرف بہ اسلام ہونے سے پہلے ناگر برہمن تھے۔ ابتدا میں اس خاندان کی رہایش مغربی ہند کی ریاست کیمبے یعنی کھمبایت میں تھی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں کسی زمانہ میں ابن بطوطہ فروکش ہوا تھا۔ کھمبایت سے نقل مکان کرکے یہ خاندان بمبی میں آگیا۔ جہاں اب تک آباد ہے۔ مگر ریاست کی طرف سے جاگیر اور معافی بدستور برقرار ہے +

مسٹر قمر الدین لطیف غیر معمولی دل اور دماغ کے انسان ہیں۔ آپ مدت تک سلاطین زنجبار کے قانونی مشیر رہے۔ اور یہ خدمت اس خوش اسلوبی سے سرانجام دی۔ کہ سلطنت زنجبار نے آپ کو اپنے گوہر نگار تمغۂ عزت یعنی کوکب دری سے مزین اور ممتاز فرمایا۔ بعد ازاں سے آپ دوبارہ آپ کو انگلستان لیگیا۔ ولایت میں مدت تک آپ لنڈن مسلم لیگ کے وائس پریذیڈنٹ اور وزیر ہند کی صلاح کار مجلس کے جو ہندوستانی طلبا کی بہبودی کے لئے قائم ہوئی

بھی سرگرم رکن رہے۔ آجکل آپ نے بمبئی میں مستقل رہایش اختیار کرلی ہے۔ اور اشغال تجارت و [illegible] صنعت وحرفت میں ہمہ تن مشغول ہیں +

مولوی لطیفی کی ولادت کا فخر بمبئی کو حاصل ہوا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم کھمبایت اور [illegible] اردو اور گجراتی زبان میں حاصل کی۔ آپ عہدِ طفلی سے ذہین۔ ذکی۔ جدت پسند اور روشن دماغ تھے۔ نو سال کی عمر میں آپ سینٹ زیویرز اسکول بمبئی میں داخل ہوئے اور میٹرک امتحان نمایاں طور پر پاس کرکے سنہ ۱۹۰۶ء تک اسی مدرسہ کے کالج میں تعلیم پاتے رہے یہاں آپ نے انٹرمیڈیٹ امتحان پاس کیا۔ بمبئی یونیورسٹی کے کامیاب طلبا کی فہرست میں اوّل رہے۔ اور ریاضی اور طبعیات میں خاص نام پایا۔ سنہ ۱۹۰۸ء کے آغاز میں آپ کیمبرج یونیورسٹی کے سنٹ جانس کالج میں داخل ہوئے اور اپنی زندگی کے چار سال لگاتار یہاں بسر کئے۔ صرف تعطیلیں آپ کبھی فرانس کے دار الخلافہ پیرس اور کبھی ہائی ڈل برگ میں گذارتے تھے۔ جو شہرت کیمبرج میں مولوی لطیفی نے مختلف علوم وفنون میں حاصل کی وہ صرف انہیں کا حصہ تھی اور کسی ہندوستانی کو شاید ہی نصیب ہو +

کیمبرج کے زمانہ کا پہلا تمام سال آپ نے عربی زبان کی تحصیل کے لئے وقف کردیا اور سالانہ امتحان میں تقریبًا پورے نمبر حاصل کئے۔ پھر آپ نے ایک جامع جواب مضمون گلیڈسٹون پر لکھا جو نہایت مقبول ہوا۔ بمبئی یونیورسٹی نے آپ کو انعام موسومہ ایچ۔ سی۔ ڈاڈی عطا فرمایا۔ قانونی امتحان ٹرائی پاس کے لئے عموماً دو سال درکار رہیں۔ مگر مولوی لطیفی کو قدرت نے انوکھا حافظہ اور نرالی ذہانت نہایت دریادلی سے دے رکھی تھی۔ آپ نے ایک سال سے بھی کم عرصہ میں یہ امتحان عزت تعریف کے ساتھ پاس کیا۔ جو طالب علم عموماً اعلیٰ درجہ پر کامیاب ہوتے ہیں وہ صرف کتابوں کے کیڑے بن جاتے ہیں اور اکثر کسی اور کام کے نہیں رہتے۔ لیکن مولوی لطیفی میں کمال کے جوہر کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے آپ پڑھائی میں بھی سرگرمی سے مصروف تھے۔ اور ساتھ ہی اپنے کالج کی ڈی بیٹنگ مجلس کے صدر منتخب ہوئے۔ کیمبرج کے زمانہ کا تیسرا سال سنہ [illegible] آپ کے لئے بڑی مصروفیت کا وقت تھا۔ آپ کی عذب البیانی اور شیریں زبانی آپ کا زرخیز دل اور روشن دماغ ہر شخص کو گرویدہ کرلیتا تھا۔ آپ دو بار اتحادی مجلس کے جسکو کیمبرج کی بزم شورا یا پارلیمنٹ کہنا چاہئے۔ رکن منتخب ہوئے۔ اور دوسرے موقعہ پر آپ سب سے زیادہ ووٹ [illegible] ہی حق میں تھے۔ جب اس مجلس کے سکریٹری کے انتخاب کا وقت آیا۔ تو اس کے لئے دو امیدوار

میدان میں نکلے۔ ایک تو مولوی لطیفی اور دوسرے مسٹر ایڈون۔ ایس مونٹیگو۔ یہ وہی مسٹر مونٹیگو تھے۔ جو آج کل وزیر ہند ہیں۔ پہلے انتخاب میں دونوں کے ووٹ برابر نکلے۔ اس پر دوبارہ انتخاب ہوا اور جانبین کی طرف سے سر توڑ کوششیں ہوئیں۔ یہ وہ مقابلہ تھا۔ کہ جس کی نظیر کیمبرج کی تاریخ میں مفقود ہے۔ آخرکار مولوی لطیفی کو شکست ہوئی۔

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا

لطف تو یہ ہے کہ اس مقابلہ کے بعد دونوں رقیب دوست بن گئے۔ اور یہ دوستی اب تک فریقین کے مابین قائم ہے۔ مولوی لطیفی کی دنیاداری کا یہ عالم نہ تھا۔ وہ تجربے اور مشاہدہ سے دل کھول کر کام لیتے تھے۔ اور ان معلومات کے ذخیرہ کو مالا مال کرتے تھے۔

ایک بڑا لطف یہ ہے۔ کہ کالج کی کھیلوں میں بھی سرگرمی سے شریک ہوتے تھے۔ جب سنہ ۱۹۱۰ء کے ایام میں کشتیوں کی دوڑ ہوئی۔ تو آپ دوم کشتی کے سٹیئرر تھے۔ کاکس یعنی کشتی ران وہ شخص ہوتا ہے جس کے اشارہ پر کشتیوں کی رفتار اور اس کے متعلق نظم و نسق کا مدار ہوتا ہے۔ اس کام کے لئے اعلیٰ درجہ کی دور اندیشی۔ استقلال اور کاردانی مطلوب ہوتی ہے۔ مسٹر لطیفی نے اس کام کو اس کامیابی سے نبھایا کہ کالج کے میگزین ایگل نے تعریفوں کے پل باندھ دیئے اور کامیابی کے سہرے کا مستحق آپ ہی کو ٹھہرایا۔ اسی سال مولوی لطیفی نے سول سروس کے مشکل امتحان کا اول مرحلہ مقابلہ سے طے کیا۔ آپ فرانسیسی زبان میں اول اور ریاضی میں دوم رہے۔ ساتھ ہی بجائے دو سال کے ایک ہی سال میں قرون وسطیٰ کا امتحان بھی پاس کر کے ساتھ عہدہ ور کر کے اپنی شہرت اور عزت اور فضیلت کے تاج کو چار چاند لگا دیے۔

کیمبرج کی رہائش کے چوتھے سال یعنی سنہ ۱۹۱۲ء میں آپ نے سول سروس کی آخری منزل طے کی اور اول نمبر پر رہے۔ ساتھ ہی بیرسٹری کی عزت بھی حاصل کر لی۔ بیرسٹری فی نفسہ کوئی مشکل چیز نہیں ہے۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی مصروفیت کی کوئی انتہا نہ تھی وہ دنداں شکن تھا جو طالب علم دو سال میں مشکل پاس کرتے ہیں سال سے بھی کم عرصہ میں پاس کر رہے تھے اور ساتھ ہی سول سروس کے خار سمندر کے پیراک تھے۔ تو ایسے وقت میں بیرسٹری پاس کر لینا واقعی خاص قابلیت کا ثبوت تھا۔ اسی سال آپ نے قانونی ڈگری پاس کر کے مرحلہ میں اول درجہ عزت کے ساتھ حاصل کیا۔ اور قانون بین الاقوام اور فقہ میں بارسٹو حاصل کیا۔ اور اسی سال میں کیمبرج کا اعلیٰ سکالرشپ دی ول۔ قانون بین الاقوام سیاست مدن ۔

سیاسیات۔ اور ہیج قواعد وضوابط تعلقات اقوام (ڈپلومیٹک ہسٹری) میں حاصل کیا
۱۸۹۹ء میں آپ نے ملازمت چھوڑ کر ہندوستان کی طرف مراجعت کی اور ۱۹۰۰ء میں آپ کے
کالج نے بیلو شپ کا اسٹوڈنٹ کی عزت آپ کی نذر کی جس کی حیثیت بمنزلہ فیلوشپ کے ہے۔

ایام ملازمت میں آپ نے خاص توجہ السنہ شرقیہ کی طرف کی ۱۹۰۵ء میں آپ عربی زبان کی تکمیل کے لئے مصر گئے اور واپسی پر عربی زبان میں سرکاری امتحان فضیلت کے ساتھ پاس کیا۔ ۱۹۰۵ء ڈبلن یونیورسٹی نے آپ کو ایل۔ ایل۔ ڈی کی جلیل القدر ڈگری عطا کی۔ یہ اُس رسالہ کے صلہ میں دی گئی جو آپ نے بعنوان "جائداد پر قانونی تاثیر" تصنیف کیا۔ یہ کتاب بہت عالی پایہ ثابت ہوئی۔ علمی حلقوں میں اس کا بہت چرچا ہوا۔ اور جب یہ طبع ہوئی تو یورپ اور امریکہ میں بہت مقبول ہوئی۔ مدت تک وہاں کے اخبار اس کی تعریفوں کے گونجتے رہے اور اہل الرائے نے اس کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا۔

آجکل ہفت زبان ہونا بڑا کمال ہے۔ مگر مولوی لطیفی تو دس زبانیں جانتے ہیں۔ علاوہ اردو کے جو آپ کی مادری زبان ہے۔ آپ کو انگریزی۔ فرانسیسی۔ جرمنی۔ لاطینی۔ گجراتی۔ پنجابی فارسی اور عربی میں کماحقہ دخل ہے

آپ کی ملازمت کی طرف دیکھا جائے۔ تو وہ ایک گلشن ہے جس میں طرح طرح کے پھول شگفتہ دکھائی دیتے ہیں۔ آپ نے جس کام کو ہاتھ لگایا وہ سنور گیا۔ جس پھول کی طرف دیکھا۔ وہ شگفتہ ہوگیا۔ اس وقت تک آپ بحیثیت اسسٹنٹ کمشنر ڈسٹرکٹ جج۔ ڈپٹی کمشنر اور سکرٹری گورنمنٹ پنجاب کام کر چکے ہیں۔ آپکا مستقبل منور اور امید افزا ہے۔

سنہ ۱۹۰۹ء میں آپ خاص کام پر مامور ہوئے۔ اس وقت کے آپ کے تجربات اور مشاہدات ایک کتاب کی صورت میں ہمارے پیش نظر ہیں۔ یہ کتاب "انڈسٹریل پنجاب" اس قسم کی تصنیف ہے۔ جسے صرف ایک نادرہ روزگار دماغ لکھ سکتا ہے۔ اس کے متعلق پروفیسر مارشل جیسے ماہر کی یہ رائے ہے کہ اگر اس کتاب کا فاضل مصنف اپنی باقی ماندہ زندگی میں اور کچھ نہ کرے۔ تو بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے حق زندگی ادا کر دیا ہے۔ دہلی دربار میں جو ۱۹۱۱ء میں نہایت تزک واحتشام سے منعقد ہوا تھا۔ آپ اخبار نویسوں کے کیمپ کے مہتمم تھے۔ یہ کام آپ نے اس قدر استقلال۔ قابلیت اور اخلاق سے سرانجام دیا کہ نہ صرف سرکار نے آپکی تعریف کی۔ بلکہ تمام مہمان آپ کا کلمہ پڑھنے لگے۔ اور ہر ایک اخبار نویس آپ کو دوست سمجھنے لگا۔

۱۹۱۳ء میں ریاست حیدرآباد دکن نے آپ کی قابلیت سے بہرہ اندوز حلاوت ہونے کے لئے آپ کو ریاست میں ناظم تعلیمات مقرر کیا۔ یہاں تین سال آپ رہے۔ اور اس عرصہ کے آپ کے کارنامے اور اصلاحیں تاریخ حیدرآباد دکن میں ہمیشہ زریں حروف میں چمکتی دکھائی دینگی۔ اہل ریاست کو آپ سے عشق تھا۔ جب آپ وہاں سے رخصت ہوئے۔ تو رخصتی کا نظارہ قابل دید اور رقت خیز تھا۔ بلا مبالغہ ہزاروں بندگان خدا آپ کی الوداع کہنے کے لیے موجود تھے۔ نظمیں پڑھی گئیں۔ آنسو بہائے گئے۔ اور آپ پر پھولوں کی بارش کی گئی۔ وزارت سے فارغ ہوکر آپ نے رخصت لی۔

جب ۱۹۱۷ء میں آپ رخصت سے واپس آئے۔ تو عالمگیر جنگ کی وجہ سے ہندوستان میں اضطراب کی لہر دوڑ چکی تھی۔ بھرتی کا کام کچھ اس قسم کا مشکل تھا۔ کہ تمام افسر جو اس کام پر مامور تھے بڑی مشکل میں تھے۔ اس موقعہ پر مولوی لطیفی نے پھر انوکھی کارروائی کا ثبوت دیا۔ آپ نے سلیح شستہ اخلاق مروت تلطف اور دلسوزی سے باغ وفا کو جو خشک ہوتا نظر آتا تھا۔ پھر شاداب کر دیا۔ آپ کی زبان میں جادو تھا۔ آپ کے اشارہ پر سوفی صدی لوگ [illegible] میں بڑی کامیابی ہوئی۔ اگر حصار میں تو آپ نے کمال ہی کر دکھایا۔ یہ محض آپ کی ہمت تھی۔ کہ حصار کی بدولت ترغیب جنگ کے متعلق نہ صرف عزت میں پنجاب کو تیسرا درجہ نصیب ہوا۔

اپریل اور مئی ۱۹۱۹ء میں جبکہ حادث شورش کی آگ سلگ رہی تھی۔ آپ کے ضلع حصار میں امن کی باد صبا مشام جاں کو معطر کر رہی تھی۔ وہاں آندھی تو درکنار آسمان کا چہرہ بھی گرد آلود نہ ہوا۔ آپ کو تشدد سے نفرت تھی۔ آپ کو وہ اسم اعظم یاد تھا۔ جس کا نام تسخیر قلوب ہے۔ اور اس کی بدولت آپ دلوں میں ولولہ اور طبیعت میں جوش پیدا کر دیتے تھے۔

۱۹۱۹ء میں جب آپ ولایت میں تھے۔ تو آپ نے خاتون صاحبہ بیگم طیب جی سے شادی خانہ آبادی کی۔ یہ جلیل القدر خاتون فخر ملک جناب مرحوم بدر الدین طیب جی جج ہائی کورٹ بمبئی کی صاحبزادی بلند اختر ہیں جسٹس بدر الدین کا نام نامی ادنی و اعلیٰ کو معلوم ہے۔ [illegible] ہندوستان کے ساتھ زندہ رہیگا۔ یہ شادی مولوی لطیفی کے لئے فردوس حیات ثابت ہوئی۔ اس نے آپ کی طبیعت پر جو سونا تھی سوہاگے کا کام کیا۔ اور آپ کی

عالی صفات کا چمن سدابہار ہوگیا۔

جب ہم مولوی لطیفی کی شخصیت کی طرف دیکھتے ہیں۔ تو وہ ہمیں ایک ہمہ صفت موصوف انسان، ایک محسن ملک، ایک محب قوم۔ ایک عالی دماغ ادیب۔ ایک روشن خیال مصنف۔ ایک خلیق دوست۔ ایک شیریں گفتار رفیق ایک فاضل جج۔ ایک قادر الکلام مقرر اور ایک نکتہ رس متفنن اور دریادل فلاسفر دکھائی دیتا ہے۔ اس کی تصنیف ایک باغ ہے جس کا ایک ایک پھول قیمت میں کشتِ زعفران کے برابر ہے۔ اس کا دم ہندوستان کے لئے باعث فخر۔ عزت و ناز ہے۔

ایڈیٹر

ساون کا جھولا

آ گئی جھولے کی پینگوں سے نہ ہو کیوں آشکار — گل رخوں کو کھینچ کر لے آتی ہے اس کی بہار
چھا گئی برسات[1] ساون کا مہینہ آ گیا — جھولیے جھولا کہ اس رت کی یہی ہے یادگار
اونچی اونچی شاخہائے نخل جھک جھک جائیں گی — ہونے تو دیجئے ذرا جھولے کو اونچا ایک بار
ہاں اٹھا لے جھولے کسی شاخ تمنا تک پہنچ — جھولنے کو ہیں حسینانِ جہاں امیدوار
تیرے ہی خاطر یہ سارا جمگھٹا ہے باغ میں — تیری ہی پڑنے کا بارش میں ہے سب کو انتظار
سب فراہم ہو لیا ساماں مگر اب ہے تلاش — ہو بڑا سا پیڑ کوئی یا ہو شاخِ استوار
منتظر ہیں سب پری۔ تو بیلے میں ہی بیٹھ جاؤں — ہر نگاہِ شوق ہے بیتاب۔ ہر دل بیقرار
جو چڑھے ہیں پیڑ پر ڈالینگے یہ جھولا ضرور — اس طرح باندھیں کہ پھر کھلنے نہ پائے زینہار
پانوں ٹہنی سے لگانا لازمی ہے پینگ میں۔ — شرط یہ سب جھولنے والوں میں پائی ہے قرار
دوڑ کر وہ ایک جا بیٹھی غضب کی شوخ ہے — تک رہی ہے سب تو منہ اور خود ہے جھولے پر سوار
وہ زمین پر ٹیک کے تلوے بڑھائی اسنے پینگ[2] — خوش نوائی سے ادھر گانے لگی کوئی ملار
اس جوانی میں غضب ہے ہر ادائے دلستاں — یہ حیا۔ یہ حسن۔ یہ شوخی۔ یہ صورت کا نکھار
یہ جو سب کمسن کھڑی ہیں منتظر جھولے کی ہیں — وہ جب اتریں تو کوئی ان میں سے بیٹھے ایک بار

[1] برسات چھانے میں تامل ہے کہ لکھتے یا نہیں۔ لیکن اپنی رو میں میں لکھا گیا ہوں۔ اختر

[2] پینگ کو لکھنو والے بالتذکیر استعمال کرتے ہیں۔ اور دہلی والے بالتانیث بولتے ہیں۔ اختر

اس تغیر محو دیں اس دستکی میں آج ہے ۔　　نکالگھر کی ... شوہر کی طرف سے انتشار
ہرادا تیری ہے اسے چھونے سے غضب کی دلفریب　　جھوٹ کر بیٹھے ہیں ... سب کا روپ
ملک جھمسے کا غرض برسات میں آتا ہے خوب　　تھی ... ہر ... سب بہار
ہر شجر شاداب ہے ہر نخل ہے پھولا پھلا　　سبزہ ... کیا کیا دکھاتا ہے بہار
جان کو دیتی ہے راحت دل کو دیتی ہے سرور　　پینگ کے ہمراہ بلتی ہے ہوا جب بار بار

اختر

لمعاتِ اکبر

کہیں دانا ہوں کہیں میں باعثِ بینائی دل ہوں　　کہیں اسرار سمجھ ہوں کہیں میں ناز قاتل ہوں
کہیں شیدائی خوبی ہوں ۔ کہیں ہنگامہ الفت　　کہیں رنگ بہار گل ہوں کہیں شور عنادل ہوں
کہیں جلوہ ہوں صورت کا کہیں ہوں شاہد معنی　　کہیں ہوں محمل لیلیٰ کہیں لیلیٰ محمل ہوں
کہیں عاشق کا مطلب ہوں کہیں معشوق کی خواہش　　کہیں محو مطلق ہوں کہیں مختار کامل ہوں
کہیں ہوں شوق آزادی کہیں تدبیر پابندی　　کہیں پابند جوش سودا ہوں کہیں طوق و سلاسل ہوں
کہیں عمر دوروزہ ہوں کہیں ہوں آرزو دل کی　　کہیں مٹنے کے لائق ہوں کہیں جینے کے قابل ہوں
کہیں جذب محبت ہوں کہیں ہوں درد دل عاشق　　کہیں نالہ بھی ... کہیں میں ... ہوں
کہیں جوش اہل معنی کا کہیں جوش اہل صورت کا　　کہیں شور انا الحق ہوں کہیں دعوائے باطل ہوں
کہیں جوش حسن کا ادا ۔ کہیں ہوں درد کی لذت　　کہیں قاتل کا جنوں ہوں کہیں جنوں کا بسمل ہوں
کہیں ہوں صورت لیلیٰ کہیں حال دل مجنوں　　کہیں چھپنے کے لائق ہوں کہیں کھلنے کے قابل ہوں
کہیں بارونق محفل ہیں کہیں ہنگامہ دل میں　　کہیں میں رند مشرب ہوں کہیں درویش کامل ہوں
کہیں تصویر حیرت ہوں ۔ کہیں محو پریشانی　　کہیں ہوں شیفتہ رخ کا کہیں زلفوں کا مائل ہوں
معاون ہوں کسی جا میں کہیں امداد کا طالب　　کہیں خضر ہدایت ہوں کہیں گم کردہ منزل ہوں
کہیں ہوں گوہر مقصد کہیں دامن تمنا کا　　کہیں ہمت کریموں کی کہیں امید سائل ہوں
کہیں ہوں ولولہ دل کا کہیں ہوں ضبط عاقل کا　　روانی میں کہیں دریا ۔ کہیں رکنے میں ساحل ہوں

یہ دریائے معانی جوش پر ہے دل میں اے اکبر
مگر ساکت ہوں جب تک آپ میں آنے کے قابل ہوں

اکبر الہ آبادی

میرا خیال

میرا دماغ میری سلطنت ہے جسمیں طرح طرح کی مسرتیں مصروف رقص ہیں ....

میں بھی بہت کچھ حاصل کرنا چاہتا ہوں لیکن میرے دماغی مشیر مجھے اس کوشش سے روکتے ہیں۔

میں قانع ہوں۔ قناعت میرا اصول ہے۔ مجھے اس سے زیادہ کی خواہش نہیں جو میرے لئے کافی ہو میرا دماغ اور میرے تخیلات میری تمام ضرورتیں مہیا کرتے رہتے ہیں اسطرح دیکھو میں ایک اولوالعزم بادشاہ کی طرح زبردست فاتح ہوں۔

میری آنکھیں روزدیکھتی ہیں کہ تیزی سے اوپر چڑھنے والا ضرور اور جلد نیچے گرتا ہے۔ میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ خاموشی کے ساتھ محنت کرنے اور رشک وحسد سے پاک رہنے والا بام عروج پر پہنچتا ہے۔

میں دوسروں کے نقصان پر نہیں ہنستا۔ میں اوروں کے منافع پر حاسدانہ نگاہیں نہیں ڈالتا .....

دنیوی سمندر کی کوئی لہر میرے دماغ میں تلاطم پیدا نہیں کرسکتی۔ میرا دماغ کہتا ہے کہ یہ تکلیف دہ تخیلات دوسروں کے لئے ہیں ..... میرا نہ کوئی دشمن ہے نہ دوست۔ میں نہ موت سے ڈرتا ہوں اور نہ اپنے خاتمہ سے۔

بعضوں کے پاس بہت کچھ ہے مگر انکے حریص ہاتھ پھیلے ہوئے ہیں انکے پاس خواہ دولت دنیوی کے کتنے ہی انبار ہوں لیکن میں انہیں غریب کہونگا۔ میرے پاس گو کچھ نہیں۔ لیکن میں امیر ہوں ....

وہ غریب ہیں امیر۔ وہ دندان آز تیز کرتے ہیں۔ میں داد و دہش سے کام لیتا ہوں۔ وہ ضرورتمند رہتے ہیں۔ میں دوسروں کی ضرورتیں پوری کرتا رہتا ہوں۔ وہ جل جل کر تنگ ہوتے ہیں۔ اور میں خوشی خوشی اپنی زندگی بسر کرتا ہوں۔

میں خواہش کرتا ہوں لیکن اس چیز کی جسے میرا دماغ مہیا کرسکے۔ میں زمین سے نکلی ہوئی دھاتوں کے خزانے نہیں چاہتا۔ میں پہاڑی پر چڑھنے کا خواہشمند نہیں۔ مجھے میدان پسند ہے۔ میں طوفان کے وقت ساحل پر بیٹھ جاتا ہوں۔ اور ان لوگوں پر ہنستا ہوں جو بیکار ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔ وہ چیز حاصل کرنے کے لئے جو پھر ضائع ہوجائے گی ....

میرا اعتقاد یہی ہے۔ لیکن کیوں؟

میں محسوس کرتا ہوں کہ ساکت وہموار دماغ کا مقابلہ دنیا کی کوئی دولت نہیں کرسکتی۔

شبیر مارہروی

رُوحِ ادب

جولائی ۱۹۲۱ء کی جدید علمی یادگار ارباب علم وفن کی خلوت وجلوت کو روشنی دینے والی کتاب شبیر حسن خاں جوش سلمہ اللہ کی افکار تازہ کا نتیجہ مقبول شائع ہونے کے مبارک وقت سے میری نگاہوں کے سامنے ہے۔ ہر روز اس کوشش میں رہا کہ کتاب مذکور پر مختصر یا مبسوط کوئی مضمون لکھوں مگر زمانہ مہلت ہی کب دیتا ہے۔ کہ کوئی اپنے خیالات میں کم و بیش کامیابی حاصل کرے۔ خیر آنچہ گذشت گذشت۔ آمدم بر سر مطلب۔ جوش سلمہ اللہ میرزو معزز دوست بشیر احمد خانصاحب مرحوم رئیس ملیح آباد کے منجھلے صاحبزادے ہیں جن کو کئی پشت کی شاعری کے حقیقی وارث ہونے کا فخر حاصل ہے۔ جوش سلمہ کے دل و دماغ میں فطرۃً مادۂ شاعری ودیعت ہوا ہے۔ عالم جوانی اور ایسے حکیمانہ خیالات مصنف روح ادب کی علمی وعملی قابلیت کے جوہر نماں ہیں۔ صرف چھبیس برس کی عمر اور واعظانہ یا عارفانہ طرز تحریر مصنف کا تزکیہ نفس نہیں تو کیا ہے۔ عالم مدہوشی اور اس قدر ہوشمندی ودانشوری جذبات حقیقت آشنا کی شرح بسیط ہے۔ جوش قلم کے مالک ہیں اور قلم جوش کا حامی۔ جوش فکر سخن کے وقت کافی طور سے باثر ادبی الفاظ منتخب کر کے شعر کی تصویر بنانے پر بخوبی تمام قادر ہیں۔ اور اس کے سوا ضرورت ہی کیا ہے۔ اگر کہیں فن کی فروگذاشت نظر آجائے تو سمجھنا چاہیئے کہ جوش کی نوجوان طبیعت دائرہ انسانیت سے باہر نہ جا کر اساتذہ قدیم وجدید کی تنزل سے پیرو رہی۔

میں نے روح ادب پر تنقید کے لئے قلم نہیں اوٹھایا نہ میرے دماغ میں تنقیدی خیالات نے جگہ پائی ہے۔ میں ہر تالیف و تصنیف میں زیادہ تر محسنات کا جویا رہتا ہوں اور خذ ما صفا پر عمل ہے یہی بڑا دروح ادب کی بھی جان سمجھتا ہوں۔ کسیکا کلام ہو جس قدر پسند آئے آزادی سے حوالہ قلم کرنا نہ اخلاقی گناہ ہے نہ شرعی۔ روح ادب کے دوسرے صفحے پر ہونہار مصنف کی تصویر ہے کرسی پر نشست میز آگے ہاتھ میں قلم سفید کاغذ کا ایک گوشہ بائیں ہاتھ میں تیور کہتے ہیں کہ پھر کسی جدید فکر میں عالم فراموشی ہے۔

تیسرے صفحے پر حضرت لسان العصر اکبر مدظلہ العالی کی تحریر میں گیارہویں سطر یعنی (اس وقت آپ کی طبیعت میں جو رنگ ہے اسپر ازلی پرتو پڑ رہا ہے) معنویت کی جان ہے۔ بارہویں سطر میں (آپ بہت کچھ ہو سکتے ہیں) کلیات شاعری کا مجرب نسخہ ہے۔ آگے بڑھ کے میرے ہم سن

۔۔دوست جناب شرر نے بھی خوب ہی داد سخن دی ہے۔ (کہ آپ اہل دل بھی ہیں اہل زبان بھی) اگرچہ یہ جملہ بھی جناب لسان العصر کی تحریر سے ماخوذ ہے۔ مگر شرر صاحب کا انتخاب لائق توصیف ہے

نویں صفحے سے رفیع احمد خانصاحب ایم۔اے۔ پروفیسر کیننگ کالج کا مقدمہ شروع ہوتا ہے جس کو آخر تک بہت ہی قابلیت اور ادبی معلومات سے لکھا ہے۔

ذوق فطری سے مجبور ہوں مجھے زیادہ تر نظم سے دلچسپی ہے۔ یہ مانا کہ جوش کی نثروں میں بھی سب کچھ ہے۔ مگر نظمیں کچھ اور ہی کہتی ہیں

تتمہ کلام میں مجھے جوش سے یہ کہنا ہے۔ کہ انقلابات دنیوی پڑھتے پڑھتے اگر نمونۂ قیامت بھی ہو جائیں مگر شعر گوئی نہ چھوڑنا۔ تمہاری طبیعت کو ذوق نظم سے وہ تعلق ہے جو روح کو دل سے۔ ایک زمانہ ایسا آئیگا کہ تم مقبول زمانہ شاعر ہوگے

ایک بات اور سنو وہ یہ کہ شاعری نہایت شریف اور قابل عزت فن ہے۔ اس کی توقیر کبھی ضایع نہ کرنا۔ شاعری کی عزت خاک کرنا اپنی ہستی مٹانا ہے۔ کوئی ہو شاعر یا غیر شاعر اپنا شعر ہرگز ہرگز بیجا داد سخن کی قیمت پر فروخت نہ کرنا بس یہی نصیحت روح ادب ہے۔ تمہاری تالیف کے اکیسویں صفحے پر پروفیسر رفیع احمد خانصاحب نے جو اوقات شعر گوئی لکھے ہیں۔ بہت درست۔ مگر یہ یاد رہے کہ سخن فہم احباب کو شعر سنانے کے لئے بھی وقت ہونے چاہئیں۔ چلو خدا حافظ اگر اس کے پابند رہوگے بیڑا پار ہے۔

جوہر شناس نگاہیں روح ادب کو اگر انصاف سے دیکھیں گی۔ تو دلکش اور اثر کرنے والے اشعار کا ذخیرہ کافی طور سے دستیاب ہوگا۔ ناظرین مضمون کا یہ اعتراض ہوگا۔ کہ محشر نے اپنی رائے کے موافق چیدہ چیدہ اشعار کیوں نہ لکھے۔ واقعی اس خیال کو صحیح مان لینا چاہیے لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ جوش سے روح ادب طلب کر کے ملاحظہ فرمائیے۔ اگر میں نے مبالغہ سے کام لیا ہو تو مجرم۔　　پتہ یہ ہے ملیح آباد ضلع لکھنؤ۔ منشی شبیر حسن خانصاحب جوش۔

راقم محشر لکھنوی

مُرغابی

یہ تیرا ننھا سا بدن!!　(۱)　یہ تیرا رنگیں پیرہن!!
یہ دلکشی یہ بانکپن!!　　تو ہے مگر اک نازنین!!!

یہ اُودی اودی بدلیاں !! (۲) یہ موجۂ آبِ رواں !!
پھر یہ تری اٹکھیلیاں برقِ ستم سے کم نہیں !!
یہ سبزہ زارِ دل کشا ! (۳) یہ جانفزا ، بادِ صبا !!
اوس پر یہ تیرا قہقہا اِک ناز ہے خاطر نشیں !!
فطرۃ کی یہ گلکاریاں (۴) تیرے پَروں سے ہیں عیاں
تیرے یہاں کا آسماں اک حسن کی ہے سرزمیں
تو مایۂ صد دلبری !! (۵) تو پیکرِ عشوہ گری !!
یا کوئی دریائی پری نازک ادا ، ناز آفریں -
تیرا حریمِ جانفزا (۶) پھولوں کا کنج دلربا -
تیرے ٹہلنے کو سدا سبزے کا فرشِ مخملیں
یہ تیرا رقصِ بیخودی (۷) یہ بیخودیٔ خود سَری
یہ خود سریٔ دلبری یہ دلبریٔ دلنشیں !!
جھم جھم یہ تیرا جھومنا (۸) یہ جھوم کر پر چومنا
پانی میں پھر یوں گھومنا رقصاں ہو جیسے اک حسیں
پہلے اڑی - پھر گر پڑی (۹) گر کر چلی ، چل کر بڑھی
اللہ رے تیرا کی تری پہلے کہیں تھی - اب کہیں !!
تیری طرف کوئی اگر (۱۰) کرتا ہے بھولے سے نظر
چھپتی ہے غوطہ مار کر اُف ری ادائے شرمگیں
وقت ، ہردم ، شادماں (۱۱) ہر لحظہ خرّم ، کامراں
ــ ، فکر ، بے خوف و زیاں زخندہ خو - خندہ جبیں
اے پیاری مرغابی مگر (۱۲) تو ہے کوئی رشکِ بشر!!
ــ کاش میں تشنہ جگر ہوتا ترا ہی ہمنشیں !!

تسکین قریشی
(سوروونوی)

پنکھا قلی

تہذیب جدید نے جہاں ہماری زندگی کے واسطے کئی ایک نئی سہولتیں پیدا کردی ہیں۔ وہیں ہم سے بعض پرانی دلچسپیاں چھین بھی لی ہیں۔ جو کام پہلے انسانی ہاتھوں کے سپرد ہوا کرتے تھے۔ اب وہ مشین کے ذریعہ کئے جاتے ہیں۔ پنکھا قلی بھی اسی پرانے زمانے کی نشانی ہے۔

جدید پنکھا قلی (بجلی) اور اس پرانی وضعدار ہستی کا مقابلہ کیجئے زمین و آسمان کا فرق نظر آئیگا۔ ہمارا پنکھا قلی پرانے زمانہ کی مٹتی ہوئی یادگار ہے۔ اب اس کا بازار سرد ہے۔ اب جوسٹ کا پنکھا۔ سقفی پنکھا۔ فرشی پنکھا۔ اور نہ معلوم اور کس کس قسم کے پنکھے ایجاد ہو گئے۔ اور اب مہذب دنیا بجائے اس پرانے کھلونے کے نئی دلچسپیوں کو زیادہ پسند کرتی ہے۔ آج میں اپنے پرانے پنکھا قلی سے تعارف کرانا چاہتا ہوں۔

اس کا نام پنکھا قلی۔ ولد باد کش۔ پیشہ مروجہ جنبانی۔ مسکن برآمدہ یا پنکھے والا کمرہ عمر ساٹھ کے لگ بھگ۔ دبلا پتلا جسم۔ زنخدان پر گنتی کے چند بال۔ سر اس بار گراں بار سے مستغنی۔ چہرے پر جھریاں پڑی ہوئیں۔ پتلی پتلی کمزور ٹانگیں۔ کمر میں صرف ایک بوسیدہ لنگوٹی۔ بالائی حصہ جسم "تیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا" کا مصداق۔ مستقل مزاجی انتہا درجہ کی۔ چیل انڈا چھوڑ دے۔ مگر پنکھا قلی صاحب اپنے ہاتھ سے پنکھے کی رسی نہ چھوڑینگے۔ کوٹھی کے برآمدے میں اکڑو بیٹھے ہیں۔ آنکھیں بند ہیں۔ لب پر گنگناہٹ ہے۔ خدا جانے مراقبے میں ہیں یا کہ پینک میں۔ تھک جاتے ہیں تو پاؤں کی انگلی اور انگوٹھے میں رسی پکڑ کر کھینچنا شروع کرتے ہیں۔ کبھی برآمدہ کی دیوار کے ساتھ خم کمر کا کچھ حصہ ٹیک کر ہو بیٹھتے ہیں۔ خود لو میں ہیں۔ مگر دوسروں کو باد نسیم کا لطف دے رہے ہیں۔

دوپہر کا وقت تھا۔ گرمی کا موسم خس کی ٹٹیاں لگی ہوئیں۔ ٹھنڈا کمرہ۔ میرا جی بھی للچایا۔ کہ ذرا آرام کرلوں۔ پنکھا قلی صاحب حسب معمول سر بسجود بیٹھے تھے۔ ان کو ہوشیار کیا۔ انہوں نے سر اٹھا کر میری طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جن کا مطلب سب کچھ بھی تھا۔ اور کچھ بھی نہ تھا۔ میں نے کہا بڑے میاں! ذرا سونے لگا ہوں۔ ہوشیاری سے پنکھا جھلنا۔ بڑے میاں عموماً خاموش رہتے ہیں۔ اس وقت بھی انہوں نے سکوت کو ہی تقریر پر ترجیح دی۔ اور ڈوری ہاتھ میں لے لی۔ میں پلنگ پر دراز ہوگیا ٹٹیوں پر پانی کا چھڑکاؤ۔ پنکھے کی ٹھنڈی ہوا۔ دوپہر کا وقت۔ بلا کی خاموشی۔ رات کا رتجگا۔ غرضیکہ تکیہ پر

پر سر رکھتے ہی آنکھ لگ گئی۔ کیا دیکھتا ہوں۔ کہ ایک نہایت خوشگوار وادی ہے۔ گھنے سایہ دار درختوں کے جھنڈ ہیں۔ چشموں سے پانی ابل رہا ہے۔ جو اکٹھا ہوکر دامن کوہ میں ندیاں بہا رہا ہے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا پتوں سے سرگوشیاں کر رہی ہے۔ کنول کے پھول غنچہ دل کو شگفتہ کر رہے ہیں خوبصورت پرندے اپنی خوشنما بولیوں سے دل لبھا رہے ہیں۔ میں ایک چشمہ کے کنارے سبز گھاس پر لیٹا ہوا ہوں کہ یکایک سین بدل گیا۔ ہوا بند ہوگئی۔ سانس لینا دشوار ہوگیا۔ پسینہ سے کپڑے تر بتر ہوگئے۔ مچھروں نے بے طرح کاٹنا شروع کیا۔ گردن کو مسلا۔ تو ہاتھ پر آبیٹھا۔ ہاتھ کو کھجایا۔ تو پاؤں کو جا کاٹا گھبرا کر آنکھ جو کھولی۔ تو دیکھا۔ کہ پنکھا دل مردہ کی طرح بالکل ساکت ہے۔ دم گھٹا جا رہا ہے ٹٹیوں کی وجہ سے باہر کی ہوا بھی رک گئی۔ بلا کا حبس ہے۔

پلنگ پر بیٹھ کر پنکھے کی جھالر کو زور سے ہلایا۔ بڑے میاں نے گھبرا کر "ہاں جی" کہا۔ دو تین دفعہ خوب زور کی ہوا آئی۔ طبیعت ٹھکانے ہوئی۔ پھر غنودگی محسوس ہونے لگی تھی۔ کہ وہی پہلا والا سین پیش نظر تھا۔ کہ ع پشہ بیدار است و پنکھا کش بخواب افتادہ است * عذاب میں جان آگئی بدن گرمی سے جل رہا تھا۔ پیاس الگ ستا رہی تھی۔ مگر آنکھیں خمار آلودہ تھیں۔ نہ لیٹ سکتا تھا۔ نہ اٹھ سکتا تھا۔ آخر دل ہی دل میں پنکھا قلی کو کوستے ہوئے۔ پلنگ کے پاس سے چھڑی اٹھائی۔ اور پنکھے کی رسی کو زور سے جھٹکا دیا۔ ایک دو دفعہ پنکھا ہلا۔ بارے کچھ ہوا آئی۔ نیند کا ارادہ کرکے لیٹا ہی تھا۔ کہ پنکھا پھر قالب بیجاں بن گیا۔ اب تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ غصہ میں آکر پلنگ سے اٹھا۔ اور رسی کو پکڑ کر خوب زور سے چار پانچ جھٹکے دئے۔ اب کے پنکھا زیادہ مستقل رفتار سے ہلنا شروع ہوا۔ اور میں بھی دل میں یہ خیال کرکے لیٹ گیا۔ کہ اب تو بڑے میاں کی نیند اچاٹ ہوگئی ہوگی۔ مگر دیکھا تو ہماں آش در کاسہ کا مقابلہ تھا۔ اب مجھ سے تحمل نہ ہو سکا۔ کواڑ کھول کر بڑے میاں کے سر پر آگر جا۔ غصہ میں نہ معلوم کیا کیا بک گیا۔ بڑے میاں حسب معمول منہ سے نہ بولے۔ مگر سہ خموشی کہنی تھی سب راز دل زباں کی طرح شرمندہ ہوکر میں نے کہا جاؤ تھوڑی دیر سو رہو۔ اور خود برآمدہ میں کرسی کھینچکر بیٹھ گیا۔

میرے پیش نظر اپنی نازک مزاجی اور جفاکش ذلت نصیب پنکھا کی حالت تھی۔ میرا قلب سلیم مجھے سرزنش کر رہا تھا۔ کہ اے مغرور المزاج عیش پسند انسان یہ وہ بردبار ہستی ہے کہ جو نہایت قلیل معاوضہ کے عوض مشقت کا بار عظیم سر پر اٹھائے ہوئے ہیں جو خود دھوپ میں جلتی ہے اور تجھ کو آرام دیتی ہے۔ جو کئی بار دوران خدمت میں اپنی پیاری جان بوٹ کی ٹھوکر کے نذر کر دیتی ہے۔ یہ ہرگز عتاب کی مستحق نہیں ہے۔ کونسل کے راحت خیز کمروں میں جب اراکین کونسل اونگنے لگتے ہیں۔ اور کئی بار بیٹھے بیٹھے سو جاتے ہیں۔ تو یہ کانٹوں پر لوٹنے

والا پنکھا قلی اگر تھک کر کاہل ہو جائے۔ تو کونسا تعجب ہے اور کیا وہ لوگ جو اس پر جفا و جور کرتے ہیں۔ داور محشر کے روبرو مورد الزام نہ ٹھہرائے جائیں گے۔

میں نے گھبرا کر چوکی کا رخ بدل لیا۔ اور رسی پکڑ کر آہستہ آہستہ پنکھا جھلنے لگا۔ میں نہیں کہہ سکتا کتنا عرصہ پنکھا جھلتا رہا۔ صرف اتنا یاد ہے۔ کہ جب آنکھ کھلی۔ اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا۔ اور پنکھے کی رسی میرے ہاتھ میں تھی

آوارۂ مجنوں نے رسوا سر بازارے۔

برسات

اے مری برسات اے رقاصۂ شیریں نوا
وجد کے قابل ہے تیرا ہر کرشمہ ہر ادا

برق ہے تیرا تبسم زلف ہے تیری گھٹا
کھیت میں سرخی بڑھاتی ہے تیری ٹھنڈی ہوا

تیری بوندوں میں شراب زندگی کا جوش ہے
مست تیرے جام سے ہر شاعر ذی ہوش ہے

تیرے آتے ہی نرالا ساز و ساماں ہو گیا
خاک جس میں اڑتی تھی گلستاں ہو گیا

عاشقوں سے پھر کسی کا عہد و پیماں ہو گیا
پتہ پتہ باغ میں حوروں کا داماں ہو گیا

قلب میں انگڑائی لی جذبات شورانگیز نے
قوتیں دل کی بڑھا دیں سبزۂ نوخیز نے

پھوٹ نکلی پھر در و دیوار سے شیریں مہک
نرمیاں کانٹوں میں دوڑیں پائی شاخوں نے لچک

شوخ پھولوں کا تبسم صاف پتوں کی جھلک
ہر گھٹا میں راگنی، ہر بوند کے اندر کھنک

آسماں ہے رایت فتح و ظفر کھولے ہوئے
اڑ رہی ہے حور موسیقی کی پر کھولے ہوئے

بجلیوں کا وہ چمکنا ابر کا وہ پیچ و تاب
موسموں کی گردش و ترتیب کا پورا [illegible]

ہر چمن شاداب ہے ہر صحرا میں سبزہ بے حساب
ہر گھٹا کے آگے آگے رنگ گل بو [illegible]

موتی موتی مخزن فطرت کا وہ بکھرا ہوا
سوندھی سوندھی ہر طرف خوشبو چمن نکھرا ہوا

اودی اودی کالی کالی جھومنے والی گھٹا
نیند آنکھوں میں بھری آتی ہے چلتی ہے ہو[illegible]

آبشاروں کے ترانے تیز موجوں کی صدا
یہ ترنم مرحبا، یہ زمزمے صل [illegible]

ساز ہر گوشے میں چھیڑا ہے ہوائے سرد نے
اہل باطن میں ترقی کی ہے دل کے درد نے

پیاری چڑیاں گا رہی ہیں باغ ہے رشک جناں
کہتی ہے "یا دوست" کوئی تو کوئی "پی کہا[illegible]

ہر طرف جھولے پڑے ہیں پک رہی ہیں پوریاں
کمسنوں نے شوق میں پہنیں بسنتی چوڑیا[illegible]

عشوہ پردازوں کے گیسو دوش پر بکھرے ہوئے ۔ سرخ ڈورے آنکھ میں اور رنگ بھی نکھرے ہوئے
طربوں نے ساحلوں پر جا کے چھیڑا ہیں ستار ۔ ہل دھری کاندھو پہ ہنستے جا رہے ہیں کاشتکار
دشت میں ہے مست چرواہا۔ گلستاں میں ہزار ۔ ناخدا کشتی پہ بیٹھا گا رہا ہے کیا ملار
شادیانے بج رہے ہیں ہر طرف اک دھوم ہے ۔ اس طرح سب خوش ہیں گویا راز حق معلوم ہے
اسنوں "دھوپ برسے جا" کی آتی ہے صدا ۔ بے تحاشہ بھاگتے پھرتے ہیں لڑکے جابجا
کوئی پھسلا، کوئی دوڑا اور کوئی گر پڑا۔ ۔ کوئی گر کر رو دیا، کوئی گرا کر ہنس دیا
شور برپا ہے کدھر وہ دشمن جانی گیا ۔ ریت میں کوڑی گئی اور کھیت میں پانی گیا
شاد ہیں دل، آم کے باغوں میں آئی ہے بہار ۔ ناچتی ہیں قمریاں چھیڑا ہے بھونری نے ستار
شاخ پر کوئل چہکتی ہے بیاباں میں ہزار ۔ گا رہے ہیں رکھ کے ڈولی نیم کے نیچے کہار
جمگھٹے باغوں میں ہیں راحت کا بندوبست ہے ۔ ابر ہے، ہے مے، گھنے پیڑوں کا سایہ مست ہے
بھر دیے پانی نے جل تھل ندیاں بہہ گئیں ۔ چھوڑ کر تسا نوا پہ زلفیں آئے باغوں میں حسیں
آج ہے اسپر سفیدی سنج شفی جو گل زمیں ۔ سر دہانی پہ رس کر زوروں نے آنکھیں بند کیں
بہ گیا پانی زمیں پر دھاریاں سی بن گئیں ۔ جا بجا اٹھی جو مٹی کیاریاں سی بن گئیں
موسم سرما میں بھی ہر چند ہیں رنگینیاں ۔ برف سی وہ صبح اور دریا سے وہ اٹھتا دھواں
فصل گل میں بھی مہک اٹھتے ہیں دشت و بوستاں ۔ سب سہی، لیکن بہار برسات کے جلوے کہاں
دہر کے نقشے میں ایسا رنگ بھر سکتا نہیں ۔ کوئی موسم یہ مناظر پیش کر سکتا نہیں
ادی پودوں نے نکلے پھول مہکے گلستاں ۔ آگئیں بازار میں خوشرنگ جامن و الیاں
رخ جاناں سے پھر چھلکی شراب ارغواں ۔ چھا گیا پھر ہر طرف کالی گھٹاؤں کا دھواں
کونپلیں پھوٹیں۔ نئی شاخوں پہ جوبن آگیا۔ کہتی ہیں "نکولیاں" اے جوش ساون آگیا

جوش لکھنوی

محبت کے دو ورق

...کا مہینہ ہے اور نسیم مرمر کے تلاب پر بیٹھا اپنی دلہن عذرا سے راز و نیاز کی باتیں کر رہا ...دونوں سفید لباس زیب تن کئے ہیں۔ چاندنی جو چپکے چپکے عذرا کے کاکل مشکبار سے ...کرتی ہے۔ تو تالاب کا شفاف پانی اس نظارہ کا فوٹو کھینچ لیتا ہے۔ عذرا نے

اپنی نیم باز آنکھیں چاند کیطرف اٹھائیں۔ چاندنی نے اسکے چہرہ اور صراحی دار گردن نے کے فروغ حسن کو دوبالا کر دیا
نسیم نے محبت آمیز نگاہوں سے عذرا کی طرف دیکھا۔ اور کہا۔

نسیم۔ اچھا تمہیں یاد ہے آپکو وہ رات جبکہ میں اختلاج قلب سے پریشاں ایک سراپا پیکر تحسیّات تھا عورت کا قرب میرے لئے ایک اچھوتا تجربہ تھا محبت کی پری کا میرے شیشۂ دل میں اترآنا ایک نیا کھیل۔ تمہاری ناز آفریں حیا کے حضور بات کرنا میرے کانپتے ہوئے لبوں کے لئے قیامت تھی۔ چاند اپنی بے حجابانہ نور پاشیوں سے تمہارے چہرے اور سیاہ زلفوں کو منور کر رہا تھا آپ جیوں کی روشنائی جلوۂ طور کے گرد محیط تھی۔ تمہاری نگاہیں نیچی تھیں۔ پیشانی پر عرق شرم کے قطرے تھے اور آواز میں دوشیزہ تھرتھراہٹ۔ میں نے جو دل کڑا کر کے تمہارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ تو تم نے بیساختہ دزدیدہ تبسم سے ایک حیا پرور نگاہ مجھ پر ڈالی۔ اس وقت چاند کچھ مدھم سا پڑ گیا خدا جانے کیوں ! میرے رگ و ریشہ میں ایک برقی رو دوڑ گئی تھی۔ اور میں سوچتا تھا کہ دنیا چلتے چلتے رک جائیگی قیامت آجائیگی اور میرا طلسم نشاط ٹوٹ جائیگا۔

عذرا۔ ان شاعرانہ خیالات کو چھوڑئے۔ دنیائے فانی میں ہر چیز کا خاتمہ لازمی ہے ! للّٰلہ اب کوئی اور بات کیجئے

نسیم۔ ہاں پیاری جب تک میرے دلمیں تڑپ ہے۔ اور اشک بیں نیاز۔ تب تک دنیائے محبت شب مرادمیں چار چاند لگایا کرے گی۔ ایسا نہ ہوگا۔ تو ہستی ایک خزان ہے نمک ایک گل بے رنگ و لو ایک سراب بے آب بنجائیگی۔

یہ رات اس زندگی کے مرقع کا ایک ورق ہے جو نسیم و عذرا کو شادی کے ایک سال بعد تک میسر رہی۔

اس عرصہ میں دونوں ایک دوسری کی محبت میں ہمہ تن جذب ہو گئے۔ نسیم سمجھتا تھا۔ کہ عذرا سے پہلے اس کے حصار راحت کی بنیاد ریت پر قائم تھی۔ اور وہ ذمہ داری کا عنصر جو اسرار خودی کا پہلا باب ہے۔ اسکی زندگی میں موجود نہیں تھا۔ الفت کی خلش اس کے راہوار سعی کے لئے مہمیز تھی۔ اور اس کے منزل مقصود تک پہنچنے کا بہترین ذریعہ

عذرا۔ جس کی آرزوں کا کنول شادی سے پہلے غنچہ نادمیدہ کی طرح مہر بہ لب تھا۔ اب ایک گونہ ارمانوں کا مرکز تھی۔ اب کسی کی یاد سے اسکے آتشیں رخسار اور بھی چمک اٹھتے اس کی سیاہ موٹی موٹی آنکھیں محبت کا سرمہ لگانے سے اور بھی زیادہ متجسس ہو گئی تھیں۔ انہیں ایک غم تھا۔ جو ایک فطری راز کا ترجمان تھا۔ اسے اپنی نسوانیت پر ناز تھا۔ اور اپنی خوبیوں پر اعتماد تھا۔ نسیم کی محبت نے اسکے دلمیں وہ تاثرات پیدا کئے تھے۔ جو فوقیت انسانی کا مایہ ناز ہیں۔ اور جوہر نسوانی کا عطر۔ اس کا بالپن بے اعتنائی و لاپروائی نسیم سے ہم آہنگ ہو کر اسے ہمیشہ کے لئے الوداع کہہ گئے۔ اب اس کے تبسم میں خود آگاہی کی جھلک تھی۔ باتوں میں ایک معنی خیز پختگی۔ وہ خوب جانتی تھی کہ فطرۃً اس

ایک بے بایہ پانی کی بوند نہیں - بلکہ اسمیں آبروئے الفت کی جھلک ہے اور جستجوئے نیاز کی کس مپرسی وہ سمجھتی تھی کہ انتظار ایک عذاب عظیم ہے - جو موت سے بدتر ہے - فرقت کی پریشانی وسیماب وشی وصل کی بیخودی و لطافت ان سے اس کا دل اب پوری طرح آشنا تھا - اس کا کاخ کامرانی اس سرزمین میں تھا - جہاں بہار کسی کے خندۂ لطف پر - اور روشنی کسی کے روئے پرتنویر کی دید پر منحصر ہے

۲

شادی کے ایک سال بعد نسیم حصول تعلیم کے لئے عازم انگلستان ہوا - عذرا کسی قدر حیران تو تھی - مگر مستقبل کی بہبودی وآسودگی اور نسیم کی تکمیل ترقی کی امید سے تقویت حاصل کرتی - محبت سنا ہے - ہمیشہ شکی واقع ہوئی ہے - مگر ایسی محبت تار عنکبوت سے ضعیف ہے - اور دراصل ایمان کی کمزوری اور فطرت کی ناہمواری اور ارادوں کی بے ثباتی پر دال ہے - یہ دراصل سراب محبت ہے جسے وہم ناکارہ اصلیت سے معطوف کرتا ہے - محبت دراصل دوسرا نام ہے خوش اعتقادی اور راسخ الاعتباری کا - اس کی عینک لگانے سے محبوب فوق العادت صفات کا مجموعہ نظر آتا ہے شک کو مجال کہاں جو کہیں سے اس دلکش منظر میں رخنہ ڈالے -

عذرا تو سن چکی تھی کہ بڑے بڑے قوی چلن نوجوان انگلستان جاکر عامیانہ خوبصورتی کا شکار ہو جاتے ہیں - مگر ان باتوں کو نسیم کے ضمن میں باور کرنا اسکے لئے ایک اخلاقی کمزوری تھی جس میں اور اسکے اعتقاد میں اسقدر بین تضاد تھا - کہ یہ نا ممکن الوقوع معلوم ہوتی تھی - وہ سمجھتی تھی - کہ نسیم میرا ہی میرا رہیگا - اس کی محبت عذرا کے نزدیک آرسی کی سی - منہ دیکھنے کی محبت نہیں - بلکہ یہ ایک مردانہ جذبہ تھا - جس کی تخلیق غیرت و استقامت سے تھی - اور جو ہر قسم کے امتحانات دلبریوں کے مقابلہ میں ثابت تھا - اور اسی محبت کا نقوش اعتبار عذرا کے اطمینان قلب کا اعظم تھا - اس کے سرور امید کی سرخی -

چلتے وقت یہ کہکر "لو پیاری - الوداع" جو نسیم نے اس کے لبوں پر ایک لمبا وحسرت آمیز دیا - تو وہ مدت تک یہی محسوس کرتی رہی - کہ نسیم نے اپنی روح کی ہمہ گیر رقت اور اپنے دل بے پایاں نیاز کا ہدیہ اس کے حضور گذارا تھا - اس سنسنی خیز واقعہ کی یاد اسے اکثر بیخود بناتی اس ترنم کی گونج اس کے کانوں میں پہروں رہتی تھی کہ اس کے دل میں طوفان وحشت بپا ہو اس کے خشک اور کانپتے ہوئے لب ایک سراپا آرزو بنجاتے - اور اس کی متجسس آنکھیں حسرت انتظار آئینہ -

(۳)

نسیم انگلستان پہنچ کر آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کرنے لگا۔ کبھی کبھی جب تعطیل کا دن ہوتا تو وہ لندن چلا جاتا لیکن سالانہ رخصت کے دوران میں وہ ساحل بحر پر اپنے چند دوستوں کے ہمراہ جا ٹھہرتا سمندر میں موجوں کا مدوجزر۔ شفق کی گل کاری۔ نسیم فرحت بخش کی عیاری جہازوں کی متین روانی سب اس کے اثر پذیر دل میں نقش حیرت بنکر ثبت ہو جاتے۔

قدرت نے نسیم کی فطرت میں شعریت کا جزو عظیم ودیعت کیا تھا۔ اور یہی باعث تھا۔ کہ حسن ہر رنگ میں اس کی آنکھوں میں محویت اور دل میں اک تلاطم پیدا کرتا تھا۔

مس فلورا روز سے نسیم کی شناسائی ہوئے چند دن ہوئے تھے۔ کہ نسیم نے اسے شام کی چائے پر کنگس ہوٹل میں مدعو کیا۔ نسیم ٹھیک چار بجے ہوٹل کی جانب چلدیا۔ مس روز بھی کشاں کشاں اسی جانب آ رہی تھی۔ اس کے ننھے ننھے قدموں میں وہی سرگرمی تھی جو نسیم کے پائے شوق کی تیز رفتاری میں۔ دونوں مقناطیسی کشش سے ایک دوسرے کی جانب کھنچے چلے آتے تھے۔ بالآخران کا ایک جگہ اکٹھا ہونا تعجب خیز بات نہیں تھی۔ اور نہ ہے۔ چونکہ کشش جانبین سے تھی۔ یہ امر حیرتناک تھا۔ کہ باہمی قرب دونوں کے لئے حظ جاذب کا اثر رکھے۔ ایک جا بیٹھے تھے ان کے میلان طبائع کا دامن گوہر مقصود سے پر تھا۔ اگر نسیم ہوا پر گامزن تھا۔ تو فلورا ایک شعاع نور کی طرح اڑی جاتی تھی۔

چائے سے فارغ ہوکر وہ شام کی گہری خاموشی میں کچھ دیر تک سیر کرتے رہے اس تھوڑی عرصہ میں ان کی شناسائی اعتماد کلی کے درجہ تک پہنچ گئی تھی۔ وہ خیال کرتے تھے۔ کہ وہ ازل سے ایک دوسرے کے آشنا ہیں اور باہمی تکمیل کا ذریعہ۔ سکوت کی زمزمہ پردازیاں دل میں آرزوں کا ہیجان پیدا کر رہی تھیں

نسیم نے رخصت ہوتے وقت مس روز سے کہا۔ میں آپ کا از حد ممنون ہوں کہ آپ نے اپنی خوشگوار صحبت سے مجھے اس قدر محظوظ کیا۔ مس روز نے جواب میں کہا۔ میرے خیال میں ہم ایک دوسرے اتنے شناسا تو ضرور ہیں۔ کہ ان چھوٹے چھوٹے تکلفات کی ضرورت محسوس نہ کریں۔ اور میرا احسان۔ اگر میں نے کوئی کیا ہے۔ تو فی سبیل اللہ نہیں بلکہ آپکے احسان کے عوض میں ہے"۔ اس کے بعد مس روز نے ایک فتنہ پرور تبسم سے نسیم کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ نسیم عالم بے بسی میں چپ وراست لگا ہیں پھیرتا تھا۔ تاکہ ان ہمہ داں آنکھوں کو جھٹلا سکے۔ جو اس کے دل کے عمیق ترین پردوں اس کے خیالات کی آناً فاناً نیرنگیوں کی رازداں معلوم ہوتی تھیں۔ ایک ایک لمحہ صدیوں کی سرگذشت تھا۔ آخر

اوسان سنبھال نسیم نے کہا۔ "پھر کب ملاقات ہوگی" مس روز (شوخی سے) - آج رات کو خواب میں یا نسیم اس جملہ کی رنگینی سے پھڑک گیا۔ یہ خوش مذاقی اور حاضر جوابی اس کے دل میں گھر کر گئی۔ گھر پہنچا تو دوستوں نے اصرار سے پوچھا۔ کہو بھئی شام کیسے گذری۔

نسیم - بڑی شان سے۔ شاید قسمت سے پھر بھی ایسی گذرے۔

(۴)

نسیم سول سروس کے امتحان میں اول رہا۔ فلورا روز سے اسکی ملاقات کو تین سال ہوگئے تھے دونوں ایک دوسرے پر جان و دل سے قربان تھے۔ فلورا کو معلوم تھا کہ نسیم کی ایک بیوی ہندوستان میں ہے اور ایک بچہ کامران۔ مگر اس پر بھی وہ نسیم کے اس سے شادی کرنے کی تحریک قلبی مسرت سے سنتی تھی وجہ یہ تھی کہ اسے نسیم سے اس قدر الفت تھی کہ وہ اسکے بغیر رہنا خیال تک نہ کر سکتی تھی۔ ورنہ مغربی نقطۂ نگاہ سے دوسری شادی ایک اخلاقی و تمدنی گناہ ہے جس کا مرتکب زمرۂ تہذیب سے خارج ہو جاتا ہے۔ اور جسکے نام سے حمیت نسوانی کی رگ فوراً متحرک ہو جاتی ہے۔ بالآخر فلورا روز مسلمان ہو کر نسیم کی دوسری بیوی بن گئی۔ دونوں کے لئے مستقبل ایک دلکشا مرغزار تھا۔ جس میں گلہائے مراد کی فضا جوئے عیش کی روانی اور بلبل عشق کے نغمے عجب پر کیف بہار دکھلا رہے تھے + زندگی ایک بارور نخل امید تھا۔

ہوش و حواس بند ہیں مست ہوں سوز و ساز سے ملنے چلا ہوں اس طرح عشق جنوں نواز سے

(۵)

نسیم پشاور میں اسسٹنٹ کمشنر ہے۔ فلورا دن بھر گھر کے کام کاج میں مشغول رہتی ہے رات کو وہ پیانو کے سروں کو دست کمال سے چھیڑتی ہے۔ نسیم اسکی دلنواز سرود سرائی پر مرمٹا ہے۔ شہر کے یورپین حلقہ میں فلورا ایک کوکب بیمثل ہے + عذرا۔ حرماں نصیب عذرا بمبئی میل میں بیٹھی عجب سرعت کے ساتھ نسیم کے طرف کھنچی آتی ہے۔ کامران کو بخار چڑھا ہوا ہے۔ اور کچھ سینے میں درد ہے۔ وہ رہ رہ کر پوچھتا ہے "اچھی اماں تو ابا ہمیں اسٹیشن پر لینے آئینگے" عذرا آبدیدہ ہو کر کہتی ہے۔

"ابا کا گھر اب تمہارا گھر نہیں۔ وہ ہمیں کاہیکو لینے آئینگے۔ ہم تو بے اطلاع اور بن بلائے جا رہے ہیں"

کامران - "اچھی اماں۔ ابا ولایت سے کیا لائے ہیں۔ الیاس کے ابا تو اس کے لئے ایک سنہری بالوں والی گڑیا لائے تھے"

عذرا - تمہارے ابا بھی ولایت سے ایک جیتی جاگتی گڑیا لائے ہیں۔ جس کے چاؤ میں وہ ہمیں بھول چکے ہیں"

کامران - پھر کہنا اماں میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ آہا۔ منہ بولتی گڑیا۔ تو میں اپنے سب کھلونے ابا کو دیکر

یہ گڑیا ان سے کھیلوں گا۔" **عذرا** " تمہیں وہ گڑیا دینا کاہیکو پسند کرینگے۔ کامران نے چلانا شروع کیا۔ گڑیا ضرور لونگا۔ عذرا نے پیار کیا۔ بجلی چمک رہی تھی۔ بارش سے ریل کی چھت پھٹی جاتی تھی۔ چاروں طرف ایک وحشتناک سیاہی محیط تھی۔ سرد ہوا زوروں پر تھی۔ اس ہولناک رات کے وقت غمزدہ عذرا اور ناتواں کامراں معہ عذرا کے ماموں کے ایک تیز رفتار ٹانگہ میں سوار ہوکر رات کے گیارہ بجے نسیم کی کوٹھی پر جا پہنچے۔ کوٹھی اس ظلمت جانکاہ میں بقعۂ نور تھی۔ پیانو کے سُروں کی آواز اور فلورا کی صدائے ساز نواز نصف شب کے سکوت میں دلوں کو مسحور کر رہے تھے۔ عذرا کا دل جوش جذبات سے دھک دھک کر رہا تھا۔ محو حیرت تھی کہ کس دنیا میں ہوں۔ خیال کرتی تھی کہ میری بے اطلاع آمد ایک آفت ناگہانی کی طرح سب پر گراں گذریگی۔ سوچتی تھی کہ اُلٹے پاؤں واپس ہو جاؤں اور اس عذاب کشمکش سے چھوٹ جاؤں۔ کہ ایک ملازم ٹانگہ کی آواز سنکر باہر آیا۔ اطلاع ہونے پر عذرا اور کامران ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ مسٹر نسیم بھی ایک تصویر حیرت بنکر کمرے میں جھٹ آموجود ہوئے۔ چہرے کا رنگ فق تھا۔ آنکھوں میں حیرانی و وحشت تھی۔ جب کچھ بن نہ پڑی تو بولے " آپ بے اطلاع کیسے آئے "

عذرا۔ مجھے ڈر تھا کہ اطلاع دینے پر آپ سے ملاقات نہ ہوسکیگی یا تو آپ مجھے آنے سے روک دینگے یا کسی اور جگہ چلے جائینگے۔ تقریباً پانچ سال سے آپکی دید کو آنکھیں ترستی تھیں۔ آپکے ولایت سے واپس ہونے پر بھی انکی تشنگی سیراب نہ ہوئی۔ میرا تو خیر شیوۂ صبر اختیار کرنا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ مگر اس معصوم بچہ کی روز کی فرمائشوں نے کہ چلو ابا کے پاس مجھے لیچلو میرا ناطقہ بند کر دیا۔ مجبور ہوگئی۔ ورنہ آپکی نشاط انگیز زندگی میں یوں بے محل آکر مخل نہ ہوتی۔

نسیم۔ نہیں کچھ مضائقہ نہیں۔ آپکا اپنا گھر ہے۔ بڑا افسوس ہے کہ کامران کو دیکھنے کا مجھے اس سے پہلے کوئی موقع نہ مل سکا۔" کامراں بخار سے بیہوش پڑا تھا۔ نسیم نے حکم دیا کہ کمرے میں خوب آگ جلادی جائے۔ کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد وہ سونے کے کمرے میں چلا گیا۔ ناشاد عذرا کمرے اور کوٹھی کے ساز و سامان کو دیکھکر ششدر تھی۔ کہیں اس عیش و کامرانی کی امیدیں رات دن اسکے تخیل میں خیمہ زن رہتیں۔ وہ نسیم کو صاحب ثروت دیکھنے کے لئے ہمہ تن آرزو تھی۔ آج رات خواب امید کا نقشہ ایک سچے واقعہ کی صورت میں اسکے پیش نظر تھا۔ مگر اس کی تعبیر کیا تھی۔ درد حرماں نصیبی۔ وہ نظارہ جس کی تصویر اس کی متوقع نگاہ شوق میں پہروں پھرا کرتی تھی آج اس کی آنکھوں میں خار ہوکر کھٹکتا تھا۔ عذرا بیٹھی بیٹھی دریچے تک تارے گنا کی۔ باہر ہوا زوروں پر تھی۔ ساتھ کے کمرے میں ایک بتی نظر آئی عذرا نے ایک دروازہ کھولا۔ فلورا نسیم ٹہلتے ٹہلتے ٹھہر گئی۔ دونوں جو ایک ہی شمع کے پروانے تھے۔ ایک ہی شاہین کا شکار۔ ایک دوسرے کی جانب غور سے دیکھنے لگ گئیں۔ آخر عذرا نے مہر سکوت توڑی۔ **عذرا** " میں کیا فلورا نسیم سے مخاطب ہو رہی ہوں "

فلورا " میری خوش قسمتی ہے کہ صبح سے پہلے آپ سے ملاقات ہوگئی۔ نسیم ولایت جب تھے۔ تو اکثر آپ کی باتیں کیا کرتے۔ سو مجھے آپ سے غائبانہ پوری پوری شناسائی ہے۔

عذرا۔ خوش قسمت فلورا! کوئی وقت تھا۔ کہ نسیم کے تخیل کی میں ہی ملکہ تھی۔ اس کا دل میرے لئے ہی بیقرار ہوتا اور آنکھیں میری دید کے لئے ہی وحشی اور متجسس۔ میرا ہی نام اس کا وردِ زباں تھا۔ میرے ہی تبسم سے اس کے چمنستانِ شوق میں بہار تھی۔ میں اگرچہ ان سب عنایات کی مستحق تو نہ تھی۔ کہ نسیم مجھے سمائے حسن کا مہر نیمروز گردانتا مگر میں بھی اسکی محبت میں مر مٹی تھی۔ اور وہ میری محبت کو قصرِ راحت کا سنگ بنیاد تصور کرتا تھا۔ اف اب وہ دن ہیں کہ نسیم کی آنکھوں میں ایک خار ہوں۔ اس کی تیغ بستہ بے اعتنائی پگھلتی تک نہیں۔ اب وہ آپ کا اسیر زلف ہے۔ اس کے دل کی حکمران آپ ہیں۔ میری اور اس کی محبت فسانۂ ماضی ہوگئی جس کی لے دے کر یہ ایک بچہ یادگار ہے۔ جو اپنے باپ کی ہو بہو تصویر ہے۔ ذرا حوصلہ کروں۔ اور تخیل کو ذرا وسعت دوں۔ تو اسے دیکھکر ہی اپنی تمناؤں کی پیاس بجھالوں۔ مگر گذشتہ ایام عیش کی یاد دل کو کمزور کئے دیتی ہے۔ اور میں تڑپ کر رہ جاتی ہوں۔

فلورا حیران تھی کہ ان درد انگیز کلمات کے جواب میں کیا کہے اور کیا نہ کہے۔ عذرا کی تقریر میں لب ولہجہ میں ناکامئ محبت و وفائے لاحاصل کی رقت تھی۔ فلورا محسوس کرنے لگی۔ کہ وہ ایک برتر ہستی کے روبرو کھڑی ہے۔ جس کی حق تلفی کا بار اسی کے سر پر ہے۔ وہ اس بات کی قائل ہوگئی تھی۔ کہ اُسے نسیم کی محبت غصب کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ اب اس کی حیثیت ایک مجرم کی تھی جو اپنی ضمیر کی سرکار میں پیش ہو۔ اس کی مغربی عیاری وحاضر جوابی سادہ لوح عذرا کی بے اختیار محبت کے سامنے بیکار تھیں فلورا نے اقرار ہزیمت میں صاف دلی سے کام لیا۔ وہ کہنے لگی "پیاری عذرا۔ میں واقعی مجرمہ ہوں۔ مجھے ہرگز کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ کہ آپ دونوں کی محبت بھری زندگی میں خلل انداز ہوتی۔ خواہ میرے دل میں نسیم کے لئے کتنا ہی انس کیوں نہ ہوتا۔ خواہ نسیم سے شادی کئے بغیر میں محبت کی چاشنی سے بے بہرہ اور تکمیل آرزو کی لذت سے محروم رہتی۔ خواہ میرے گلستانِ زیست کی بہار صرف اسی ایک بلبل کے دم پر موقوف ہوتی۔ مجھے پاس نسوانیت سے یہ شایان تھا۔ کہ نسیم سے شادی کرنے پر ہرگز راغب نہ ہوتی۔ آپ نے اس میدان میں گامزن ہونے میں مجھ سے پیشقدمی کی تھی مجھے چاہتے تھا۔ کہ اُس کا سودا سر سے نکال دیتی۔

واقعی میری کج اندیشی تھی جو شادی سے پہلے مجھے یہ خیال نہ آیا۔ کہ میں کسی کی کشتِ راحت برق خزاں کی نذر کر رہی ہوں۔ کسی کے قصر محبت کو منہدم کرکے اپنا محل عیش استوار کر رہی ہوں۔ عورت کی زندگی شروع سے آخر تک ایک تفسیر قربانی و خود فراموشی ہے۔ مگر میں ہوں کہ ننگ نسوانیت ہوں۔ میری خودغرضی و مطلب پرستی مجھے اپنی نظروں میں شرمندہ کر رہی ہے۔ چاہیئے تھا۔ کہ میں خود

جلکر راکھ ہو جاتی۔ مگر آپکے رشتۂ محبت پر آنچ نہ آنے دیتی۔ اب بھی جہانتک ہوا اپنے کئے کی تلافی کروں گی یہ گھربار سب آپ کا ہے۔ خدا آپکو مبارک کرے۔ کامراں رہے۔ پروان چڑھے۔ اور آپ دونوں کی محبت نسیم کے دل میں گھر کرے ؏

عذرا حیران تھی کہ وہ گلچین جو اس کے چمن امید کی بربادی کا باعث ہوا ہو۔ اب صورت باغباں اس کی بہار کا پیغامبر کیونکر ہو سکتا ہے۔ وہ ہستی جس کا سرچشمہ حیات انہیں برفانی چوٹیوں سے فیض پذیر ہوتا ہو جن سے عذرا کے دریائے محبت میں تلاطم تھا۔ اتنی بیغرض کیونکر ہو سکتی ہے۔ دوسرے کے آرام کی خاطر اپنی زیست دوبھر کرلے۔ عذرا فرط حیرت سے آبدیدہ ہوگئی۔ فلورا جھپٹ کر بڑھکر اس سے بغلگیر ہوئی اور دم بھر کے لئے دونوں نے بھرے ہوئے دل کی ترجمانی کے لئے گفتگو کی بجائے سکوتِ گریہ سے مدد طلب کی اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد غمزدہ نسیم کامران کی بھولی بھالی باتوں کا یادِ دل ناخواستہ جواب دے رہا تھا۔ کہ ایک خط موصول ہوا جسپر مِس می کی مہر ثبت تھی۔ اور جس کا مضمون مندرجہ ذیل ہے :-

پیارے نسیم۔ سلامت تا قیامت

اگرچہ میری اور آپ کی شادی دونوں کی دلی خواہش سے ظہور میں آئی تھی۔ مگر اس وقت میری آنکھیں محبت کے نشہ سے اندھی تھیں۔ اور میں ایک وفا شعار دل کی جس کو میں بے وفا سمجھ رہی تھی۔ ٹھیک قدر نہ پہچان سکتی تھی۔ اب جب میں محبت سے آشنا ہو چکی ہوں۔ میں زخم خوردہ دل کے درد کا اندازہ کر سکتی ہوں۔ میں ان دنوں آپکے گھر کی رانی تھی۔ اگر کوئی میرا تخت چھین لیتا تو مجھے کیا ہی شاق گذرتا۔ اس سے دو سال پہلے آپ کے دل کی ملکہ عذرا تھی میں نے اس کی قلمرو پر تسلط جمالیا۔ اس کے مجروح دل کی جب میں نے ناگفتہ بہ حالت دیکھی۔ تو اپنی غاصبانہ حرکت پر نادم ہوئی مجھے یقین ہے۔ بلکہ میرا یہ ایمان ہے۔ کہ آپ کی الفت کی ضرورت مجھ سے بڑھکر عذرا کو ہے۔ اور اس حالت میں مجھے کوئی حق حاصل نہیں کہ اس پر قبضہ جمائے بیٹھی رہوں اس صورت میں میرا آپ کے گھر چین سے رہنا کب ممکن ہو سکتا تھا۔ پس میں عازم انگلستان [illegible] ہوتی ہوں۔ اور آپ کو ان سنہری مسرت آمیز گھڑیوں کی قسم دیتی ہوں۔ جن میں [illegible] محبت کی مٹھاس کے مزے نصیب تھے۔ کہ عذرا صرف عذرا ہی کے ہو کر [illegible] کا دل ایک بیش بہا گنجینہ ہے جسے ٹھکرانا کفران نعمت ہوگا ؏

اسلم

خون کے پیاسے

(گذشتہ سے پیوستہ)

[illegible] اس شخص نے ہماری گستاخی کی یہ فقرہ دیکھ کر صاحب کمشنر بہادر [illegible] ہوجاتے اور کچھ دست اندازی [illegible] کرتے۔ لیکن ایک بار صاحب کمشنر بہادر کو خیال آگیا [illegible] ہر اہلکار کی موقوفی میں یہ فقرہ ہوتا ہے تو ان کمشنر [illegible] پڑ گیا اور انہوں نے دل میں سوچا کہ یہ بات [illegible] میں آئی کہ ہر شخص صاحب ڈپٹی کمشنر کی [illegible] کرسکے اور یہ معلوم کرکے کہ یہ صاحب بہادر کی [illegible] اخلاقی کمزوری ہے پھر اس فقرہ کی جانب [illegible] کیا صاحب بہادر بھی تاڑ گئے اور ایسے شرمندہ [illegible] پھر اس کمشنری سے فوراً تبدیلی کرالی خاندانی [illegible] انکو سکرٹریٹ [illegible] لیکن ہر جگہ [illegible] کبھی دی توجیس [illegible] تمام ضلع چلا اٹھتا تھا۔ اہلکاروں و پیلداروں [illegible] اردلیوں کی کم بختی آجاتی تھی۔ ایک دو [illegible] موقوف ہوتا تھا۔ ایک دو جیل خانہ جاتا تھا۔ [illegible] لگ جاتا تھا نہ خود کرتے تھے نہ کسی کو [illegible] فوجداری اپیل منظور کرنا تو گناہ سمجھتے [illegible] پیلداروں سے علی الخصوص ناراض [illegible] کرتے تھے [illegible] تار آئے تو صاحب چیف [illegible] شریف اور فرشتہ منش

افسر تھے جنکو ہندوستانی اپنا مربی اور ہر ایک انگریز اپنا دوست سمجھتا تھا۔ لاٹ صاحب نے کہا کہ میجر صاحب کو جو ڈویژنل میں ڈویژنل جج بہادر بنا دو۔ اول اول تو بیشک خلق خدا کی گلوتراشی ہوگی لیکن خود کام کا بوجھ صاحب بہادر کو درست کریگا۔ ورنہ انتظامی کام میں تو روز بروز یہ بدتر ہونے جائینگے۔ لیڈی صاحب بھی سن رہی تھیں انہوں نے فرمایا کہ فریڈی کو لاہور اپنی زیر نظر رکھو تو اچھا ہے چیف کورٹ کے جج بھی انکی خبر رکھینگے۔ لاٹ صاحب اس ہندوستانی مثل کا خیال نہ کیا کہ چراغ کے تلے اندھیرا ہوتا ہے اور لیڈی صاحب کے ایما کو جو انکی محبت کا تقاضا تھا منظور کرلیا۔ جب اس طرح ڈویژنل جج مقرر ہوئے اور صاحب بہادر سمجھ گئے کہ اب اس کام میں عمر بسر کرنی ہے۔ تو فوجداری میں کچھ توجہ کرنے لگے۔ اسلئے کچھ تھوڑا بہت دال دلیہ کرلیتے تھے لیکن دیوانی میں ان کا دماغ بالکل نہ لڑتا تھا۔ دیوانی ایسا کام نہیں کہ کوئی تھوڑے سے عرصہ میں سیکھ لے خواہ کیسا ہی محنتی اور ذہین ہو۔ پھر بھی خامی رہجاتی ہے۔ جنگ شروع سے توجہ کرکے پتہ مار کر نہ سیکھے کچھ نہیں آتا۔ سررشتہ دار کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح ناچتے تھے۔ اول اول تو وکیلوں کی بحث پر بہت بے صبر ہونے لگے لیکن جب دیکھا کہ اس بلا سے بے درماں سے خلاصی محال ہے۔ اگر وکیلوں سے

جھگڑا پڑتا ہی تو ناٹ صاحب تک نوبت پہنچتی ہے صاحب بہادر نے سوچ سمجھ کر یہ طریقہ اختیار کیا۔ کہ کاغذ اور پنسل لیکر بت کی طرح بیٹھ جاتے معلوم ہوتا تھا کہ نوٹ لکھ رہے ہیں لیکن یہ سب دکھاوا تھا بحث کو بالکل نہ سنتے تھے اور مقدمہ کو بالکل نہ سمجھتے تھے۔ دیکھنے والوں کی تصویر بنانی شروع کر دیتے تھے۔ اور اس طرح گھنٹوں کے گھنٹے خراب کر دیتے تھے جس وقت میز سے اٹھتے تھے تو ایسے ہی خالی الذہن ہوتے تھے جیسے کہ بیٹھے تھے۔ سررشتہ دار کو حکم تھا وہ نوٹ کرتا جاتا تھا۔ اسکے سررشتہ دار پہلے تو منشی ایزد بخش تھے وہ پرانی روش کے آدمی تھے۔ انگریزی سے ناواقف تھے مگر اپنا کام بہت خوبی اور دیانت داری کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ حکام ان سے بہت خوش رہتے تھے اور صاحب بہادر سے پہلے جو ڈویژنل جج رہ چکے تھے ۱۰ اسکی بہت تعریف لکھ گئے تھے۔ لیکن وہ آخر کو سررشتہ دار تھے جج تو نہ تھے۔ صاحب بہادر کو کوئی ایسا سررشتہ دار درکار تھا کہ کل مسل دیکھ کر وکیلوں کی بحث سنکر انسے انگریزی میں فیصلہ لکھوا لیتا۔

منشی وہ بتاتا جاتا اور صاحب بہادر لکھتے جاتے منشی ایزد بخش کو کسی ایسے کوڑ مغز حاکم سے پالا نہ پڑا تھا۔ اس لئے وہ صاحب بہادر کا نہ تو مطلب سمجھ سکے اور نہ ان کو خوش کر سکے نتیجہ یہ ہوا۔ کہ صاحب بہادر نے ایک ماہ کے اندر ہی اندر اسکو عدالت ماتحت میں بدل دیا۔ اور چار ریڈر یکے بعد دیگرے عدالت ماتحت سے آزمائش کے لئے بلائے۔ آخر ایک بابو صاحب جو انگریزی اور فارسی دونوں میں ہشیار تھے اور بد دیانتی اور رشوت خواری میں بھی حد سے زیادہ مشہور تھے۔ صاحب بہادر کے اصلی مرض کو تشخیص کر گئے اور صاحب بہادر کو اپنے ہاتھوں پر ڈال لیا۔ یہ سررشتہ دار دہلی کے باشندہ تھے۔ کئی نسلوں سے ان کا خاندان لاہور میں رہتا تھا۔ بلا کے ذہین اور چلتے پرزے تھے۔ پانچ منٹ میں عدالت ماتحت کا فیصلہ پڑھ لیتے۔ اور دس منٹ میں فرفر انگریزی میں اپیل کا فیصلہ لکھوا دیتے۔ صاحب بہادر کو ایسے ہی ریڈر کی ضرورت تھی۔ یہ ضرور ہوا کہ صاحب بہادر ہمیشہ کے لئے نکمے اور محتاج ہو گئے۔ لیکن بہر وقت کام چل گیا۔ اور سررشتہ دار صاحب بہادر کی زندگی کے جزو بن گئے

گرمی کے دنوں میں میم صاحب کی مفارقت اس قدر گراں معلوم نہ ہوتی تھی۔ لیکن بابو صاحب کی دو دن کی بھی غیر حاضری بڑی حیرت ہو جاتی تھی۔ تین برس لاہور رہنے کے بعد جب صاحب بہادر ڈیرہ غازی خاں بدل گئے۔ تو وہاں جاتے ہی ایک لائق بیگناہ اور متدین ریڈر کو پنشن پر نکال دیا۔ اور لالہ لاڈلی پرشاد کو وہاں بلوا لیا۔ وہاں سے کانگڑہ گئے۔ تو وہاں بھی جوڑ توڑ کر کے لاڈلی پرشاد کو بلانا پڑا۔ جب لاڈلی پرشاد کو صاحب بہادر نے لاہور میں مقرر کیا تھا۔ اور وہ اپنی طرح سے صاحب کی نبض کو پہچاننے لگا تو تقرر کے ایک ماہ کے بعد ہی کھلے بندوں رشوت لینی شروع کر دی ... منشیوں کی سی نہ لیتا تھا۔ بلکہ ایسی رقمیں ...

اس انداز سے مانگتا تھا کہ گویا صاحب بہادر کا
دل سے بلکہ ہیچ ہیں ایسے اشارات سے بھی کام
لیتا تھا۔ گویا بیم صاحبہ بھی اسکی رازدار ہیں۔ ایسے
حالات میں عوام الناس کا کیا قصور تھا اگر وہ شبہ
کرنے لگے کہ بیجر صاحب رشوت لیتے ہیں۔ آخر
[illegible] کے [illegible] اس راز کو کروسانند مخفی [illegible] ۔ یہ افواہ
بیجر صاحب [illegible] تک بھی پہنچی [illegible] وہ لولا چار تھے۔
اور [illegible] ریڈر کے بس میں تھے کیا کر سکتے تھے
[illegible] ہو جاتے تھے۔۔

[illegible] مال کا اپیل ہوا تو بابو لاڈلی پرشاد
اپنے عروج پر تھے۔ بیلی رام خود ان کے دلالوں
[illegible] یہ بھی جانتا تھا کہ بابو صاحب مہر
[illegible] اور لالہ گوبند رام کی معرفت بھی
[illegible] ہیں۔ اس کو
[illegible] ہو [illegible] لاڈلی پرشاد
[illegible] گیا۔ اور ایک [illegible] ڈالی لگا کر
[illegible] ہزار [illegible] بھی رکھدیئے
[illegible] رومال اٹھا کر دیکھا تو کہا کہ بیلی رام
[illegible] بیلی رام نے مقدمہ اور اس کے
[illegible] کیا۔ اور عرض کی کہ اگر آپ
[illegible] قرار دینگے تو یہ ہزار روپیہ
[illegible] مقابل اپیل کردوں۔
[illegible] کہا کہ یہ تو تیرا [illegible] ہاتھ کا کرتب
[illegible] بابو صاحب بہادر کا قلم میرے ہاتھ
[illegible] اور جس طرف چاہوں چلا سکتا ہوں

ملا صاحب کی خوش قسمتی سے ایسا اتفاق ہوا کہ بیجر صاحب
کی تبدیلی ڈیرہ غازیخاں کی ہوگئی اور ایک ہفتہ کے
اندر اندر بابو صاحب بھی لاہور سے دال [illegible]
ہو گئے۔ فاسٹ صاحب جوان کی جگہ آئے۔ وہ ان
افسروں میں سے تھے کہ انگلستان اور ہندوستان
جسقدر انکی ہستیاں [illegible] ہوں بالکل بجا ہے
انہوں نے اپنے دفتر کے [illegible] کام کو نہایت محنت
سے سیکھنا شروع کیا۔ انتظامی حوالے ان کے دماغ کو
کبھی پراگندہ نہیں کیا۔ [illegible] دیوانی۔ مال سب
کاموں میں برق تھے۔ لدھیانے ضلع کا بندوبست
بھی نہایت کامیابی کے ساتھ کر چکے تھے پنجابی اور
اردو خوب سمجھتے تھے۔ اور نہایت روانی کے ساتھ
بولتے تھے۔ انڈر سکرٹری بھی رہ چکے تھے کئی کمیٹیوں
کے ممبر بھی مقرر ہوئے۔ فارسی اور عربی [illegible] انر
امتحان پاس کیا تھا۔ باغ و بہار کا ایک نہایت صحیح
بامحاورہ اور لفظی ترجمہ ایسا کیا تھا کہ گورنمنٹ نے
[illegible] انعام ان کو عطا کیا تھا۔ نہایت صبر اور محنت
اور غیر طرفداری سے کام کیا کرتے تھے۔ وکیل بھی ان سے
بہت خوش تھے۔ کیونکہ صاحب بہادر ان کے ساتھ نہایت
شرافت سے پیش آتے تھے اور بھی ان کا ادب کرتے
تھے۔ شرارت اور ضد سے وقت خراب نہ کرتے تھے
جیسا کہ اکثر شریر وکیل بدمزاج حکام کو چڑانے کے
لئے ارادتاً کیا کرتے ہیں۔ اہلکار اور [illegible] مقدمہ
خوش تھے کہ ان کا عام حکم تھا کہ کام ٹھیک سے
دس بجے شروع ہو جاوے اور [illegible] بجے ختم ہو زیادہ

ناظر کو حکم تھا۔ کہ صبح کو ساڑھے نو بجے کمرے کھلوا دے اور چار بجے پر دس منٹ گزرے بند کر دے۔ نہ تو وہمی تھے۔ نہ جلد باز۔ مقدمہ کی اصلیت پر فوراً پہنچ جاتے تھے۔ اور زیادہ تر تفصیلات اور تنقیحات میں ظرفی میں گھس کر اپنے دماغ کو پریشان نہ کرتے تھے مقدمہ کے جو اصلی اور حقیقی نقاط ہوتے تھے۔ وہ تصویر بنکر انکے سامنے کھڑے ہو جاتے تھے۔ ہندوستانیوں کے ساتھ کچھ ہمدردی بھی تھی لیکن اپنی قوم کے بڑے طرفدار اور اپنی طرز حکومت کے بڑے مداح تھے۔ ہندوستانیوں کو کسی حکومت کے لایق نہ سمجھتے تھے لیکن اُن سے نفرت بھی نہ کرتے تھے۔ حد سے زیادہ قانون کو قبل از وقت سمجھتے تھے لیکن قانون کے نام سے چیں بجبیں بھی نہ ہوتے تھے۔ اگر کوئی وکیل حوالہ دیتا تو نہایت خوشی سے دفعات اور فیصلوں کو پڑھتے۔ اور اگر وہ حوالہ متعلق ہوتا تھا تو بہت خوش ہوتے تھے۔ اور اگر متعلق مقدمہ نہ ہوتا تھا تو خفا نہ ہوتے تھے اور چپ ہو جاتے تھے۔ وکیل خود شرمندہ ہو جاتا تھا۔ اگرچہ اب تک عملی آزمایش نہ ہوئی تھی۔ لیکن عام راے یہ تھی کہ صاحب بہادر اس قدر منصف مزاج ہیں کہ اگر کسی مقدمہ میں ایک فریق انگریز یا کرانی اور دوسرا ہندوستانی ہوگا۔ تو بھی انصاف کرینگے۔ کیونکہ جیوری کے قانون کی بابت ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے۔ کہ یہ قانون ان ملکوں کے لئے موزون ہوتا ہے جہاں ملزم اور اہل جیوری ایک قوم اور ایک مذہب کے ہوں۔ انگریزوں کے مقدمات میں بعض وقت جیوری کا فیصلہ سنکر نہایت جز بز ہوتے تھے لیکن مجبور تھے۔ الغرض یہ صاحب طبعاً حق پرست اور منصف مزاج تھے۔ اپنے اور بھائیوں کی طرح نہ تھے۔ کہ اگر ہندوستانیوں کا مقدمہ ہو تو ایسے سخت منصف ثابت ہوں کہ حضرت دانیال۔ بکرماجیت نوشیرواں اور حضرت فاروق کو بھی مات کریں۔ لیکن جب کسی انگریز کا مقدمہ ہو یا تو یا پھوٹا کرانی اور دیسی کرسچن بھی مقدمہ کا فریق ہو تو آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لیں۔ اور دیدہ و دانستہ مکھی مچھر سب نگلجا دیں۔

ایسے افسر کے سامنے لاڈلی پرشاد کی کیا فروغ سنی۔ فاسٹ صاحب کو فوراً معلوم ہوگیا کہ یہ شخص بڑا چالاک اور رشوت خوار ہے۔ انہوں نے آتے ہی اس کو عضو معطل بنا دیا۔ اور عدالت ماتحت میں واپس بھیج کر منشی ایزد بخش کو اپنے پاس بلا لیا۔

ملا جمال کا اپیل پیش ہوتے ہی صاحب بہادر مقدمہ کو سمجھ گئے۔ ان کو یقین ہوگیا۔ کہ بیلی رام نے دو ہزار روپیہ زیادہ لکھایا ہے۔ لیکن وہ صاحب رجسٹرار کے نوٹ اور محمد عمر کے متضاد بیانات کے سامنے کیا کر سکتے تھے۔ آخر کو صاحب بہادر نے دونوں اپیل نامنظور کر دیئے۔ لیکن خدا نے یہ انصاف کر دیا۔ کہ جو روپیہ بیلی رام نے زیادہ لیا تھا اسکو بابو لاڈلی پرشاد لے اُڑے۔ اس نکلہ میں ملا محمد جمال کا کچھ خرچ نہ ہوا۔ کیونکہ سرشتہ دار منشی ایزد بخش اور انکا اہل مد اتفاقاً دونوں مرتشی نہ تھے۔ فقط دو سو روپیہ گریوی حساب کو دینا پڑا مگر فیصلہ کے دن دیلیو نگی جمعدار کو پھر بھی دینے پڑے

باقی باقی

یونان

گذشتہ سے پیوستہ

اسلاف کی اولادیں ہیں۔ ہیلین کے تین بیٹے تھے ڈورس (جو ڈورینس کا سلف تھا) زوتھس اور ایے یولس (جو ایے یولس کے اسلاف تھے) زوتھس کے دو بیٹے آیون۔ اور ایکائیس ایونین اور ایکائین اقوام کے سلف بنے۔ یہ ظاہر ہے کہ ان من گھڑت لوگوں کو صرف قومی ناموں کے ظاہر کرنے کے لئے گھڑا گیا تھا۔ اس کے علاوہ خود یونانی زبان سے بہت کچھ پتہ چلتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ یہ اہل یونان آرین قوم کے اس شاخ کی ٹہنی ہیں جسے انڈو یورپین شاخ کہتے ہیں۔ جو بہت ابتدائی زمانہ میں مختلف فرقوں میں مشرق سے آکر تمام یورپ پر پھیل گئی تھی۔ سیلٹک۔ جرمن یونانی اور بعض ایطالوی اقوام تمام اس شاخ کی ٹہنیاں ہیں۔ لیکن یونانی زبان ایطاوی قوموں کے لاطینی امبرین۔ اور اُسکن زبانوں سے بہت ملتی جلتی ہے اور سیلٹک اور جرمن زبانوں سے بہت مختلف ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے۔ کہ سیلٹک اور جرمن قوموں کے ٹہنیاں اپنی شاخ سے پہلے ہی جدا ہو کر ایکدوسرے سے مل گئیں۔ اور اس کے بعد یونانی اور ایطالوی قوموں نے بھی ان کی تقلید کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ یونانی یونان میں ایشیائے کوچک سے آئے لیکن مختلف راستوں سے اور مختلف اوقات میں۔ بعض خشکی کے رستہ سے شمال و مشرق کی طرف آئے اور بعض سیدھے سمندر میں ہو کر چلے آئے۔

کچھ خبر نہیں کہ یونانیوں کے یونان میں آنے سے پہلے کون سی قومیں یونان میں آباد تھیں۔[۱] یونانی مورخ ان قوموں کو جو یونانیوں کے آنے سے پہلے یونان میں آباد تھیں۔ پلاسگائی اقوام کہتے ہیں۔ جو تاریخی زمانہ سے پہلے یونان میں سواحل ایجین پر آباد تھیں۔ بہت ممکن ہے کہ یہ پلاسگین لوگ کوئی مستقل قوم نہ ہوں۔ اور ان میں بعض وہ یونانی لوگ ہیں جو سب سے اول یونان میں آئے۔ اور جن کی زبان بعد میں آنیوالوں سے بہت مختلف تھی اور بعض ایشین قومیں ہوں۔

بعض ایسے الفاظ کو دیکھکر جو یونانی اور لاطینی میں یکساں رائج ہیں یہ پتہ چلایا جا سکتا ہے کہ یہ یونانی کس قسم کے لوگ تھے۔ یہ الفاظ ان رسوم کو ظاہر کرتے ہیں جو یونانیوں اور ایطالویوں کے ایک دوسرے سے جدا ہونے سے پہلے دونوں میں مروج تھیں۔ اسلئے یہ بہت ممکن ہے اور اکثر مورخوں کی رائے بھی ہے کہ یونانی جب پہلی مرتبہ یونان میں آئے تب بھی جہازوں کے متعلق کچھ معلومات رکھتے تھے۔ ہل جوتنا جانتے تھے۔ اور انکے پاس بکریاں اور دوسرے مویشی تھے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ پہلے صرف ایک آوارہ گرد قوم تھے جو زراعت کے متعلق اور مویشی

---

[۱] سوائے ایپی رس تھسلی اور ایشیائے کوچک کے شمال و مغربی حصہ کے کسی دوسری جگہ پلاسگائی کا ہونا یقینی نہیں۔

چرانے کے متعلق کچھ باتیں جانتے تھے ۔ اور جو اپنی زندگی جوار۔ باجری پر بسر کرتے تھے ۔ اپنے مویشی کا دودھ دہی کھاتے تھے اور بری اور بحری شکار نفع میں تھا ہی ۔ وہ شہد اور موم کا استعمال بھی جانتے تھے ۔ اور اپنی بھیڑوں کے بالوں سے ایک قسم کی چپٹی ٹوپیاں بھی بنا لیتے تھے ۔ یہ کہنا بالکل اور قطعی ناممکن ہے کہ ان باتوں کے علاوہ وہ لوگ ابتدا میں اور کیا کیا جانتے تھے اور یہ کہ آیا تہذیب انہیں سرعت سے پھیلی یا نہایت آہستہ آہستہ ۔

اجنبیوں کے متعلق افسانے ان تمام قصے اور کہانیوں میں جو مختلف قصبوں کے باشندوں میں انکی آغاز کے متعلق رائج تھیں سب سے زیادہ اہم وہ قصے اور کہانیاں ہیں جو بعض زبردست ریاستوں کے بانیوں کا غیر ملکی شہزادے ہونا ظاہر کرتے ہیں ۔

تھیبز کہا جاتا ہے کہ تھیبز ۔ کیڈمس شاہزادہ فینشیا کا آباد کیا ہوا ہے جو اپنی بہن یوروپا کی تلاش میں اسوقت آوارہ پھر رہا تھا ۔ جب تک کہ معلم غیب نے اسے ایک سفید گائے کے پیچھے پیچھے جانے کا اور جہاں پر کہ وہ گائے لیٹ جائے ایک شہر آباد کرنے کا حکم نہ دیا ۔ اس شاہزادہ نے بوائیشیا میں ایک شہر بنایا جس کا نام کیڈمیا رکھا ۔ جو بعد میں تھیبز کا قلعہ بنا دیا گیا ۔ کہا جاتا ہے کہ اسی کیڈمس نے سب سے اول یونانیوں کو حروف تہجی اور ان کا استعمال بتایا ۔ اور یہی وہ پہلا شخص ہے جسنے پنگیس اور تھریس کے کانوں پر جنکو کہ اس نے اپنی آوارہ گردی کے زمانہ میں پا لیا تھا ۔ کام شروع کیا ۔

آرگوس انسانوں کے مطابق آرگوس پر آیو کا باپ آئی نیکس حکمراں تھا ۔ لیکن آیو کو مار کر مصر کی طرف بھگا دیا گیا تھا ۔ اور تھوڑی عرصہ کے بعد اس آیو کا پوتا ڈینیس اپس آکر آرگوس میں ایک نئے خاندان کا بانی ہوا ۔

میسینائی اور مائرنس پلوپاس مروجہ انسانوں کے مطابق ٹین ٹلیس کا بیٹا تھا جو فریجیا یا لیڈیا کے شاہی خاندان سے تھا ۔ وہ یونان میں آیا اور آتے ہی پیسا پر قابض ہو گیا ۔ اور اس کا بیٹا اٹری اس اس تمام حصہ ملک پر جو متصل ہے ۔ آرگو اس میسینائی ۔ اور مائرنس کے حکمراں ہوا اور میسینائی کو مستقر ریاست قرار دیا

اہل فینشیا یونان میں ان تمام قصے کہانیوں میں اتنی بات ضرور ہے کہ یہ اس پر ایک حد تک کافی روشنی ڈالتے ہیں ۔ کہ یونان کے ابتدائی آبسنے والوں نے اپنی تہذیب صنعت اور حرفت کا کچھ حصہ اہل فینشیا سے لیا ۔ اور کچھ حصہ اہل مصر سے ۔ عام اس سے کہ یہ حصہ بالا بالا مصر سے لیا گیا ہو ۔ یا ایشیائے کوچک اور فینشیا کے توسط سے ۔ اہل فینشیا ہی وہ لوگ ہیں ۔ جنھوں نے سب سے پہلے بحری تجارت کا ذوق ظاہر کیا ۔ ان ہی لوگوں نے بحر الجین کے سواحل پر متعدد مقامات پر چند تجارتی کارخانے بنائے اور ان کارخانوں میں گھونگوں سے ارغوانی رنگ بنا کر آس پاس کے یونان والوں کو فروخت کیا ۔ اور انہی نے شمالی ایجین میں کان کنی شروع کی ۔ ممکن ہے کہ یہ بھی سچ ہو کہ ان اہل فینشیا نے تھیبز میں کوئی قلعہ

بنایا ہو اور وہاں اپنی علم الانشا کو رائج کیا ہو۔ اور اس علم الانشا سے اہل یونان نے اپنے حروف تہجی اخذ کئے ہوں یہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کا ابتدائی میل جول اہل مصر سے کس طرح ہوا اور یہ کہ اہل یونان نے اہل مصر کے صنعت و حرفت اور مذہب سے کیا کیا باتیں اخذ کیں۔ لیکن بعض وجوہ سے یہ امر یقینی ہے کہ یونانیوں اور مصریوں میں سنہ ۱۳۰۰ ق۔م۔ ہی میں تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ فینیشیا والوں کی صنعت و حرفت کا ایک بڑا حصہ اہل مصر کی صنعت و حرفت سے اخذ کیا گیا تھا۔ اور پھر خود ابتدائی اہل یونان نے اسی حصہ کو فینیشیا والوں سے اپنے یہاں لے لیا۔ ہرکیولیز کے جدوجہد کے متعلق قصے کہانیوں سے بھی انہی واقعات کا پتہ چلتا ہے۔ اسلئے کہ یونانیوں کا ہرکیولیز اور فینیشیا والوں کا دیوتا میلکارٹ ایک ہی شخصیت ہیں۔ اور ممکن ہے کہ اہل فینیشیا نے اہل یونان کو وحشی درندوں کی غارتگری۔ سڑکوں کے بنانے اور ان تمام باتوں پر مجبور کیا ہو۔ جو کہ ہرکیولیز کے متعلق افسانوں سے ظاہر ہوتی ہیں۔ اور پھر اہل یونان نے فینیشیا والوں کے دیوتا میلکارٹ کو بہ اختلاف نام وصفت اپنا ہرکیولیز بنا لیا ہو۔

آرگوناٹس کا قصہ معلوم ہوتا ہے کہ یونانی ابتدائی بحری مہمات کے یادگار ہیں وہ قصہ وجود میں آیا تھا۔ یہ آرگو اور بہت سے تھسلی والوں نے خلیج پیگے سین کے پہلوانوں کے متعلق ہے۔ یہ آرگوناٹس تھسلی کے بندرگاہ آئولکس سے جہاز میں بیٹھکر گولڈن فلیس کی تلاش میں روانہ ہوئے جو بحر اسود کے مشرقی سواحل پر ایاپا میں جو کولچس میں واقع ہے ایک ہولناک اژدہے کی حفاظت میں تھا۔ ان پہلوانوں میں ہرکلیز یا ہرکولیز اور تھی سلیس بھی شامل تھے۔ اور اس مہم کا سردار جےسن تھا۔ جب یہ لوگ ایا پہنچے تو شاہ اے ای ٹیز نے جےسن کو اس شرط پر شئے مطلوبہ دینے کا وعدہ کیا۔ کہ وہ دو آتش دم اور روئیں تن سانڈوں کو مغلوب کرکے ہل میں جوتے اور دوسرے خطرناک کام انجام دے۔ شاہ اے ای ٹیز کے لڑکی میڈیا نے جےسن کو وہ تمام چیزیں دیدیں جن کی برکت سے کہ جےسن تمام بلیات سے محفوظ رہا۔ اور تمام کام بوجہ احسن انجام دیئے۔ اور جب میڈیا نے دیکھا۔ کہ اس کا باپ باوجود تمام شرائط پورے ہوجانے کے بھی شئے مطلوبہ دینے میں پس و پیش کرتا ہو تو اس نے رات کو جاکر اپنے جادو کے زور سے محافظ اژدہے کو غافل کر دیا۔ اور اس طرح جےسن اپنے مقصد میں کامیاب ہوکر معہ میڈیا کے راتوں رات وہاں سے چل کھڑا ہوا۔

جنگ ٹرائے یونانی افسانوں میں جنگ ٹرائے مذکورۂ بالا قصے سے بھی کہیں زیادہ مشہور ہے شاہزادہ پیرس خلف شاہ پریم والئے ٹرائے نے اسوقت جبکہ وہ شاہ اسپارٹا مینی لاز کا مہمان تھا۔ مینی لاز کے تمام خاطر و مدارات کا یہ بدلہ دیا کہ اس کی بیوی ہیلن کو لیکر بھاگ گیا۔ یہ ہیلن اپنے زمانہ کی انتہا سے زیادہ خوبصورت عورت تھی۔ اور شادی ہونے سے پہلے جو جو بادشاہ اس کے خواستگار رہ چکے تھے ان سب نے اپنے ارادوں

میں ناکامیاب ہوجانے اور اس کی شادی شاہ اسپارٹا سے ہوجانے پر بھی یہ عہد کیا تھا کہ وہ سب ملکر اس ہیلن کو حتی المقدور آفات سے بچائینگے۔ چنانچہ اب سب نے ملکر بارہ سو جہازوں کا ایک بیڑہ تیار کیا اور بسرکردگی شاہ ایگےمیم نان والئ میسینائی برادر شاہ مینی لازبوا ایشیا کے بندرگاہ آرلس سے روانہ ہوئے اگرچہ شاہ میسینائی اس بیڑہ کا سپہ سالار تھا مگر تمام فوج میں سب سے زیادہ بہادر اور سب سے زیادہ جنگجو ایکیلیز تھا۔ جو تھسلی کا ایک سردار تھا۔ اور سب سے زیادہ عقیل و فصیح روڈے سیس والی اتھاکا تھا۔ اہل ٹرائے کی طرف سے ایکیلیز کا جواب ہیکٹر تھا اور دیوتا آدھے اہل ٹرائے کی طرف تھے۔ اور آدھے اہل یونان کی طرف۔ لڑائی دس سال تک جاری رہی۔ اور یہ دسواں سال ہی ہے جس کا ذکر ایلیڈ میں ہے۔ ایکیلیز۔ ایگےمیم نان کی کسی حرکت سے ناراض ہوکر اپنے خیمہ میں لڑائی سے بےفکر ہوکر بیٹھ گیا۔ اور اس کی غیر حاضری میدان جنگ میں ہیکٹر نے یونانیوں کو جو فی الحقیقت ایکیلیز کے بغیر ہیکٹر کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے۔ مار کر پیچھے ہٹا دیا۔ اور ان کے جہازوں میں آگ لگا دی۔ اتنا تھا کہ ایکیلیز نے اپنی زرہ اپنے دوست پیٹروکلس کو پہنادی اور اپنے لشکر کا افسر کر کے میدان میں بھیجا۔ پیٹروکلس نے اگرچہ اہل ٹرائے کو اپنی ماتحت فوج کے زور پر مار کر پیچھے ہٹا دیا۔ لیکن خود ہیکٹر کے مقابلہ سے جانبری نہ کرسکا۔ اپنے دوست کے قتل ہونے کی خبر نے آخر کار ایکیلیز کو اپنی ہٹ سے ہٹایا۔ وہ میدان میں آیا۔ اہل ٹرائے کو پے درپے شکستیں دیں اور خود ہیکٹر کو بھی تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔

ایلیڈ۔ ہیکٹر کے دفن پر ختم ہوجاتی ہے۔ ایکیلیز کے قتل اور فتح ٹرائے کے متعلق دوسری نظموں سے پتہ چلتا ہے۔ جو ندکورہ بالا نظم سے بہت زمانہ بعد لکھی گئی تھیں۔ خود ایکیلیز بزدل پیرس کے لگائے ہوئے اس تیر سے جسے دیوتا اپالو کی ہدایت کے مطابق تاکا گیا تھا۔ مارا گیا۔ دونوں طرف کے رستموں کے ختم ہوجانے کے بعد اب اوڈے سیس آگے بڑھتا ہے اور فاتح ٹرائے ہوتا ہے۔ اس شخص نے ایک نہایت زبردست اور بہت بڑا لکڑی کا گھوڑا بنایا۔ اور اسمیں چھ سو چیدہ جنگجو چھپا دئے۔ خود معہ تمام لشکر کے یہ ظاہر کرنے کو کہ اہل یونان لڑائی سے مایوس ہوکر چلے گئے۔ ایک دور دراز مقام پر جا کر ٹھہرا۔ ٹرائے والوں نے اس حکمت عملی سے بےخبر ہوکر اور محاصرہ کی سختیوں سے چھٹکارا نصیب ہونے کی خوشی کے ترنگ میں کسی چیز کی پروا نہ کرکے اور اس لکڑی کے گھوڑے کو کھینچ کھانچ کر شہر میں لے گئے رات کو وہ چھ سو جوان اپنے مورچہ سے نکلکر یکدم سے دربانوں پر ٹوٹ پڑے۔ دروازے کھولے گئے اور ادھر سے اوڈے سیس معہ تمام فوج کے شہر میں داخل ہوکر مصروف کشت و خون ہوا۔ ٹرائے بالکل تباہ و برباد کردیا گیا۔ فتح ٹرائے کے بعد سب لوگ واپس چلے گئے (باقی باقی) سید حمید الدین احمد رند

اقتصادیات ہند کا مرجع

ہمارے وسائل معاش

(گذشتہ سے پیوستہ)

کہ ابتدا میں وشنب کرمن نے اسے ظاہر کیا تھا۔ اسے ہر قسم کے علوم و فنون کا دیوتا اور منبع علم قرار دیا گیا ہو۔ روایت ہو کہ اسنے مختلف کتابوں میں چونسٹھ فنون کا ذکر کیا ہو۔ پھر پیدانوں میں مذکور ہے۔ کہ وہ ایک ہزار کا موجد۔ زیورات مخترع۔ ہر قسم کے ہوائی جہاز بنانیوالا۔ اور دولت پیدا کرنے کے طریقے سکھانیوالی کتابوں کا مصنف ہے مگر چانکیہ نے اس کی ابتدا کا اور ہی بیان دیا ہے۔ گو اس کی معرکۃ الارا تصنیف کا ابتدائی حصہ جو اقتصادی مسائل اور اصول کی بحث کے لئے وقف تھا۔ تلف ہو چکا ہو۔ مگر وہ اپنی کتاب کو پرانے اُستادوں کی کتابوں پر مبنی قرار دیتا ہے۔ اس نے پرانے وقتوں کے ماہروں کا سو سوا سو مرتبہ حوالہ دیا ہو منو پہلا ماہر تھا۔ کہ جس کا زمانہ سن عیسوی سے کئی سو برس پہلے کا قرار دیا گیا ہے۔ ہندو ماہروں نے وسائل دولت حسب ذیل قرار دیئے ہیں۔ کوٹلیہ کے نزدیک ورتہ زراعت۔ مویشی پروری اور تجارت پر ساوی ہے"۔ ورتہ کے جاننے والے دوسروں کی محنت یا غلے۔ مویشی سونے وغیرہ قابو حاصل کرتے ہیں۔ ورتہ دولت اور غیر دولت سے بحث کرتا ہو۔ ورتہ کے وسیلے سے راجہ خزانہ اور سپاہ قابو کرکے اپنی رعایا اور غنیم کو محکوم و مطیع کرتا ہو"۔ پھر وہ کہتا ہے۔ نیکی۔ دولت اور حظ زندگی میں دولت سب سے زیادہ قابل ہے۔ اس کی رائے میں نیکی اور لطف زیست دولت سے حاصل ہوتا ہے۔ شنکراچاریہ کہتا ہو۔ انسان دولت کا غلام ہو۔ مگر دولت کسی کی غلام نہیں ہے۔ اس وجہ سے انسان کو دولت حاصل کرنیکے واسطے دل و جان کے انہماک سے سعی بلیغ سے کام لینا چاہیئے۔ کیوں کہ دولت ہی کی طفیل انسان نیکی۔ اطمینان قلبی اور نجات حاصل کر سکتا ہے"۔ اس نے راجہ کے لئے چار علوم کی تحصیل قرار دی ہو۔ منطق۔ الہیات ورتہ اور سیاسیات" اسکے خیال میں ورتہ لین دین زراعت تجارت اور مویشی پروری پر حاوی ہے۔ "جو انسان اس علم پر قادر ہو۔ اُسے عدم معاش اور دیگر تنگی کا خرچہ نہیں ستا سکتا"۔ کمانڈکہ ایک اور مشہور ماہر ہے کہ جس نے شنکراچاریہ کی تشریح ورتہ سے صرف لین دین یعنی روپیہ سود پر دینے کا طریقہ خارج کر دیا ہے۔ بھاگ وت پران میں لکھا ہو۔ کہ ورتہ لین دین۔ زراعت۔ تجارت اور مویشی پروری پر حکمران ہے۔ بشبد۔ رتہ چنتامنی" سنسکرت کی مشہور ڈکشنری ہو۔ کہ جس میں لکھا ہو۔ کہ ورتہ کے وسائل معاش کے تین بڑے وسائل سے بحث کرتا ہو جسمیں زراعت تجارت اور مویشی پروری شامل ہو۔ دیوی پوران میں لکھا ہو۔ ورتہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے۔ کہ یہ زراعت تجارت مواشی پروری اور لین دین (ساہوکارہ) سے بحث کرتا ہے"۔ ارتھ شاستروں کے مفہوم اور حلقۂ اثر کی

بابت چانک کا بیان حسب ذیل ہے۔ بنی آدم کی معاش کا نام ارتھ ہے۔ اور زمین جس پر انسان بستے ہیں۔ ارتھ کہلاتی ہے۔ وہ علم کہ جو زمین کو حاصل کرنے اور قائم رکھنے کے لئے اقتصادی (اور سیاسی) وسائل سے بحث کرتا ہے۔ ارتھ شاستر یعنی فن حکم رانی اور اقتصادیات کہلاتا ہے" پھر وہ اپنی کتاب ارتھ شاستر کا مقصود اولی یوں بیان کرتا ہے" یہ ارتھ شاستر ان تمام ارتھ شاستروں کا مجموعہ ہے کہ جو پرانے زمانہ کے استادوں نے راجہ کو زمین حاصل کرنے اور قائم رکھنے کے وسائل بتلانے کو لکھتے تھے۔ پس اس ارتھ شاستر کا مقصد یہ ہے کہ راجہ کو یہ دنیا اور نیز اگلا جہاں زیر نگین کرنے کا طریقہ بتائے۔ اس شاستر کے رو سے انسان نہ صرف مستحسن۔ اقتصادی اور خوش گوار کام ہی کرنے کا طریقہ جانتا ہے۔ بلکہ وہ غیر مستحسن مذموم اور ناخوش گوارا کاموں کی بھی بیخ کنی کر سکتا ہے۔ اس بحث سے ظاہر ہو گیا ہوگا۔ کہ ہندو ماہران اقتصادیات کے نزدیک اس کا حلقہ اثر کیا تھا۔ زمانہ حال کے اکانومکس اور پرانے زمانہ کے ورتہ اور ارتھ شاستر کے مفاہیم میں کسی حیرت انگیز موافقت اور مماثلت پائی جاتی ہے۔ وسائل معاش اور ذرائع تمول میں بھی کیسی مشابہت اور یک رنگی نظر آتی ہے۔ بالفاظ دیگر زمانہ حال کے ماہروں کو جو بات اب ہاتھ آئی ہے۔ وہ اب سے ہزاروں برس پہلے اسلاف ہند پر روشن تھی۔ وہ انسان کو اسی دنیا میں راحت اور شادمانی اور خوش حالی کی زندگی بسر کرنے کا راستہ بتانے ہی پر قانع نہ تھے۔ بلکہ اس کی دونوں جہان کی فلاح بہترین کے لئے بھی فکر مند تھے اور یہ خیال افلاطون اور سقراط سے بخوبی لگا کھاتا ہے۔ کہ جو اخلاقی کردار اور طرز عمل پر سب سے زیادہ زور دیتے تھے پروفیسر رادھا کمل مکرجی نے ہندو تصور اقتصادیات کو خوب واضح کیا ہے منو اور شنکراچاریہ کے زمانے کے بعد زمین اور آسمان میں بہت تھوڑا فرق واقع ہوا ہے۔ کہ جس پر ہم چلتے پھرتے اور بود و باش رکھتے تھے۔ یا جس کے عظیم الحجم سائبان کے نیچے بیٹھ کر انہوں نے اقتصادیات پر ایسی حیرت انگیز قابلیت اور صناعی سے بحث کی۔ اگر مغربی محققوں کا تتبع نہ کیا جائے۔ اور یہاں کے جغرافیائی۔ طبعی اور تمدنی حالات پر غور کی جائے۔ تو پرانے زمانے کے ماہروں کے اصول و ہدایات نہایت درستی اور خوبی کے ساتھ اب بھی چسپاں ہوتی اور راست ٹھہرتی ہیں اہل ہند کا سب سے بڑا پیشہ زراعت ہے (۷۴ء۷۱) فی صدی کی روزی براہ راست یا بواسطہ زمین ہی سے بہم پہنچتی ہے اس وجہ سے زراعت کا وسائل معاش میں نہایت وسیع اور ممتاز درجہ ہے۔ اقتصادیات ہند کا مرکز ثقل فلاحت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یورپ میں زراعت کے ماتحت کئی پیشے ہیں۔ ڈنمارک ہی ایک ایسا ملک ہے کہ جس کی ساٹھ ستر فی صدی آبادی زراعت پر بسر اوقات کرتی ہے۔ اور مواشی پروری کاشت کاری کے برابر اہمیت رکھتی ہے۔ مکھن اور پنیر بنانے کا کام نہایت وسیع پیمانہ پر ہوتا ہے۔ اور کروڑوں [illegible] باہر جاتا ہے۔ پھر مرغ پروری بھی زراعت کا شعبہ ہے۔ مرغیاں فیل مرغ۔ بیرو بطخیں پالی جاتی ہیں [illegible]

اور اناج دوسرے ملکوں کو جاتے ہیں۔ اور کروڑوں روپے کی آمدنی اسی وسیلہ سے ہوتی ہے۔ پھر نکیس گوشت بناکر
غیر ممالک کو بھیجا جاتا ہے۔ سبزی ترکاری سناج غلہ پیدا کرکے لوگ کروڑوں روپے کماتے ہیں۔ اور یہ سب مختلف دھندے
زراعت کی وسیع چادر تلے پرورش پا رہے ہیں۔ ہندوستان میں مختلف چیزیں زمین سے پیدا کیجاتی ہیں
نیشکر۔ کپاس۔ دھان۔ گندم۔ چنے۔ جو۔ مکئی۔ جوار باجرہ۔ مسور مونگ۔ ماش چاول۔ نیل۔ قہوہ۔ روغنی تخم۔ پھل خشک
میوہ وغیرہ وغیرہ چیزیں زمینی پیداوار کی ذیل میں شمار ہوتی ہیں۔ تجارت اور صنعت زمانہ حال کے ماہروں کے
خیال میں افراد اور اقوام کے سب سے بڑے وسائل معاش ہیں۔ یورپ میں برطانیہ۔ فرانس۔ جرمنی۔ بلجیم۔ اٹلی آسٹریا
سویڈن۔ ناروے سب سے مہذب اور ترقی یافتہ ممالک ہیں۔ اور ان کی آبادیوں کے جزو اعظم کا وسیلہ معاش صنعت و حرفت
اور تجارت ہے۔ ڈنمارک اور ریاستہائے بلقان کی مردم شماری ایک کروڑ بھی نہیں ہوئی۔ مگر باشندوں کا سب سے بڑا پیشہ
زراعت ہے اس وجہ سے مغربی ماہروں نے اپنے ہاں کے طبعی اور اقتصادی حالت اور سیاست کے رو سے صنعت و تجارت
کو سب سے بڑے وسائل معاش قرار دیا ہے۔ مگر ہندوستان قدرتاً صنعت و حرفت کے موزوں نہیں ہے۔ قدیم الایام
سے یہ ملک زراعت کا محتاج چلا آتا ہے۔ اس وجہ سے سب سے بڑا پیشہ یہی ہے۔ مگر صنعت و تجارت ہمیشہ زراعت
کی دست نگر رہتی چلی آئی ہے۔ اگر اسلاف ہند نے زراعت کے بعد تجارت کو وسیلۂ معاش قرار دیا۔ تو یہاں کے
کے عین مطابق تھا۔ اس امر پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ زراعت ہی سے صنعت اور تجارت کو
اصل ہوتا ہے۔ اور فی زمانہ ہماری خارجی تجارت اور نیز مصنوعات کا انحصار تمام تر زراعتی پیداوار پر
ہے۔ ہندوستان سے اشیاء برآمد میں سے سب سے بھاری مقدار خام زمینی پیداواروں کی ہے۔ پٹسن۔ کپاس
روغنی تخم۔ چاول۔ چاء۔ غلہ وغیرہ وغیرہ سب زراعتی اشیاء ہیں اور درآمد میں خام نہیں بلکہ تیار اور
مال آتا ہے۔ اہل صنعت بھی کپڑے اور دیگر چیزیں بنانے میں زمینی پیداواروں کے حاجتمند ہیں۔ اس
بخوبی ظاہر ہے کہ زراعت ہی سے تجارت اور صنعت کو اقبال حاصل ہوتا ہے۔ موجودہ اقتصادیات کی رو سے
صنعت اور تجارت سب سے بڑی وسائل معاش اور تمول ہیں۔ دیگر پیشہ اُن ہی کے ذیل میں شمار ہوتے
زراعت ایجاباً اقتصادیات ہند کا مرجع ہے۔

ت اور دیگر وسائل معاش پر تفصیلی بحث کرنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کے
پر بھی غور کیا جائے۔ اگر قدیم زمانہ میں ہندوستان سونے کی چڑیا تھا۔ تو اب وہ پر بندھی چڑیا۔
کی مانند ہے۔ بالفاظ دیگر اقتصادیات ہند کا سب سے بڑا مسئلہ افلاس ہے۔ ہندوستان دنیا کے
ملکوں میں سب سے زیادہ مفلس ہے۔ ہماری مراد اضافی اور اقتصادی تہیدستی سے ہے۔ جب ہم
ستان کو غریب اور کنگال قرار دیتے ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں۔ کہ پانچ کروڑ آدمی رات کو خالی

پیٹ سوتے ہیں۔ جیسا کہ بعض حضرات کا گمان ہے۔ اور یہ سر ولیم ہنٹر کے ستر سال کے ایک بیان پر مبنی ہو۔ ممکن ہے۔ اس وقت ایسے لوگ ہوں کہ جو ایک وقت بھی پیٹ بھر کر نہ کھاتے ہوں۔ مگر اس وقت یہ گمان حقیقت سے سراسر معرا اور واقعیت سے محض بیگانہ ہے۔ شرح مزدوری میں بیحد اضافہ ہوگیا ہے ستر سال پیشتر اور موجودہ اقتصادی حالات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ دیہات و قصبات میں چوتھائی صدی پہلے کی نسبت اب چار گنا مزدوری بڑھ گئی ہے۔ شہروں کا بھی یہی حال ہے۔ پنجاب کے دیہات میں مزدور دست یاب نہیں ہوتے سکتے سب لاہور۔ امرتسر اور لائل پور وغیرہ کی نو آبادیوں کو چلے جاتے ہیں۔ کیونکہ اول الذکر شہروں میں روپیہ اٹھارہ آنے روزانہ اجرت ملتی ہے۔ اور موخر الذکر نو آبادیوں میں فصل کاٹنے کے موقعہ پر ڈیڑھ دو روپے روزانہ کو آدمی ہاتھ نہیں آتے۔ ریلوے اسٹیشنوں کے حمال بی۔ اے۔ ایم۔ اے والوں سے بدرجہا خوشحال ہیں۔ اندریں حالات اس حال کی کوئی ضرورت نہیں کہ کوئی آدمی رات کو فاقہ کشی کرے۔ اگر اہل ہند کی آمدنی کے اوسط اور نیز قومی دولت کا مقابلہ دنیا کے اور ملکوں سے کیا جائے۔ تو ہمارا درجہ کہتر ثابت ہوتا ہے۔ سب سے دولتمند ملک امریکہ ہے کہ جس کی مجموعی دولت (۴۲) ارب پونڈ اور باشندوں کی سالانہ آمدنی کا اوسط (۷۲) پونڈ ہے۔ برطانیہ کا نمبر دوسرا ہے۔ قومی دولت ساڑھے چار ارب پونڈ ہے اور سالانہ آمدنی فی کس (۵۲) پونڈ ہے۔ جرمنی کی قومی دولت سولہ ارب پونڈ اور سالانہ آمدنی (۳۰) پونڈ ہے۔ فرانس کی قومی دولت بارہ ارب پونڈ اور سالانہ آمدنی (۳۸) پونڈ فی کس ہے۔ ڈنمارک کی سالانہ آمدنی (۴۵) پونڈ اور آسٹریلیا کی چالیس پونڈ سالانہ ہے۔ اٹلی کی چار ارب پونڈ دولت اور (۲۵) پونڈ سالانہ آمدنی فی کس ہے۔ آسٹریلیا ہنگری کی قومی دولت آٹھ ارب پونڈ اور آمدنی کا اوسط (۲۱) پونڈ۔ جاپان کی دولت چار ارب پونڈ اور سالانہ آمدنی فی کس چھ پونڈ ہے لیکن ہندوستان کی قومی دولت ۱۹۰۳ء کے ایک تخمینہ کی رو سے تین ارب پونڈ اور آمدنی کا اوسط فی کس دو پونڈ سالانہ ہے۔ فروری گذشتہ کے آخری ہفتہ میں سردار جوگندر سنگھ صاحب کے ایک سوال کے جواب میں منجانب سرکار ایک افسر نے یہ بیان کیا تھا کہ حال میں کوئی صحیح تخمینہ آمدنی کا مرتب نہیں ہوا۔ لیکن اگر چیزوں کی بڑھی ہوئی قیمتوں کا لحاظ کیا جائے تو ۱۹۱۱ء کے ایک اندازہ کو مبنی قرار دینے سے موجودہ آمدنی فی کس اسی روپے سالانہ یعنی (۸) پونڈ فی کس منتج ہوتی ہے۔ تمام مہذب دنیا میں جو بات نہیں ہے۔ وہ ہندوستان میں پائی جاتی ہے یعنی ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے رو سے کمانے والوں کا شمار (۴۷) اور نہ کمانے والوں کی تعداد (۵۳) فی صدی ہے۔ مغربی ملکوں میں بے کار آبادی (۲۵) فی صدی (برطانیہ) سے لیکر

؎ مسٹر گک سکرٹری صیغۂ مالیہ کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ ۱۸۸۲ء میں آمدنی کے سالانہ اوسط کا تخمینہ (۲۷) روپے تھا ۱۹۰۱ء میں لارڈ کرزن نے اپنی تقریر میں (۳۰) روپے بیان کیا تھا۔ ۱۹۱۱ء میں اسی حساب سے آمدنی کا اوسط پچاس روپے ہونا چاہیئے تھا۔ مگر ایک اور جامع طریقہ سے آمدنی کا اوسط اسی روپے برآمد ہوا تھا۔ اگر ہندوستان کی پبلک مطالبہ کرے تو گورنمنٹ ماہروں کی ایک کمیٹی اسی کام کے لئے مقرر کر دے گی۔ جے آر۔ راے

(۳۳) فی صدی تک پائی جاتی ہے۔ اگر بیکار آبادی قدرتی حدود کے اندر آجائے تو آمدنی میں معتدبہ بیشی ہو جائیگی۔ علاوہ ازیں اس امر سے اغماض معقول بات میں شمار نہ ہوگا۔ کہ آمدنی ہمیشہ ضروریات زندگی کے تعلق میں مذکور ہوتی ہے جغرافیائی اور تمدنی حالات حوائج زیست پر حکمران ہوتے ہیں۔ یورپ کی آب و ہوا سخت ہے۔ وہاں پر بھاری گرم کپڑوں اور جسم میں گرمی پیدا کرنیوالی چیزوں کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ پیرس۔ لنڈن اور برلن میں معمولی خوراک کے لئے سوا دو روپے ایک وقت صرف ہوتے ہیں۔ اس قسم کی خوراک پر لاہور۔ دہلی اور لکھنو کے ہندوستانی ہوٹلوں میں چھ آنے لئے جاتے ہیں۔ غریب بازار میں دو آنے سے پیٹ بھر سکتا ہے۔ مگر پیرس اور لنڈن میں اسی درجہ کے آدمی ایک وقت کی خوراک کیلئے بارہ چودہ آنے خرچ کرنے پڑتے ہیں اس سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ ضروریات زندگی کی گرانی اور ارزانی کے تعلق میں آمدنی محسوب ہوتی ہے۔ اب ہم اس استفسار سے دوچار ہوتے ہیں۔ ہندوستان کیوں اس قدر مفلس ہے؟ اس کا جامع جواب یہ ہے۔ کہ ہندوستان زراعتی ملک ہے۔ اسی وجہ سے وہ اس قدر غریب اور خستہ حال ہے۔ مگر شائد ناظرین کرام کی اس سے تسلی نہ ہوگی اسلئے وضاحت سے بیان کرنا لابدی ہے۔ ہندوستان کے باشندوں کا سب سے بڑا پیشہ کھیتی باڑی ہے۔ آبادی کی روزی اسی سلسلہ سے بہم پہنچتی ہے مگر زراعت بارش کی دست نگر ہے اور بارش انسان کی قدرت سے بالا ہے۔ اگر وقت پر بارش ہو جاوے۔ تو وارے نیارے ہیں۔ اور اگر بارش دھوکہ دے تو پھر خشک سالی اور قحط کی آفت کا سامنا ہے۔ زراعت سے تجارت اور صنعت اور دیگر باتیں وابستہ ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہندوستان کیوں غریب اور تنگدست رہتا ہے۔ ماہران اقتصادیات کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ امساک باراں اور زراعت قحط اور افلاس کا ہے۔ اگر وطن پرست اور نیز حکام باہمدگر صلاح اور سعی سے اس دشوار مسئلہ کو حل کرنے کی سعی بلیغ کریں۔ تو ہندوستان آسودگی سے دوچار اور قحط کی بلاسے ناآشنا اور غربت سے رستگاری حاصل کر سکتا ہے۔ اور اپنی رخصت شدہ عظمت کے از سر نو بغل گیر ہونے کی امید لگا سکتا ہے۔ پس اب یہ سوال ہمارے سامنے آتا ہے۔ کہ ملک کو افلاس سے کس طرح آزاد کیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا یہ مطلب ہے۔ کہ زراعت کو بارش کی دست نگری سے کس طرح مستغنی کیا جائے۔ پس اقتصادیات ہند کا یہی مرجع اور یہی مرکز ثقل ہے

پچھلی بحث سے یہ واضح ہو گیا ہوگا۔ کہ اقتصادیات ہند میں زراعت ہی مقدم ہے۔ اگر اسے معاشیات ہند کی روح رواں پکارا جائے۔ تو غیر انسب نہ ہوگا۔ زراعت ہی سے اس ملک کی ہر قسم کی ترقیاں وابستہ ہیں۔ ہم اسے وسیع ترین معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ ہندوستان کی خوشحالی اور تمول کا محرک اعظم زراعت ہے۔ اس وجہ سے ہم اس کی ترقی اور اصلاح کی تجاویز پیش کرینگے۔ کھیتی باڑی کو باران رحمت کی متلون زحمتوں سے سبکدوش کرنا سب سے ضروری اور اہم کام ہے۔ گر یہ مسئلہ حل ہو گیا۔ تو ہماری جملہ مشکلات کا گورکھ دھندا آپ سے آپ سلجھ جائیگا۔

(باقی دارد)

جے۔ آر۔ رائے

مرد افضل یا عورت؟

یہ موضوع کوئی نیا موضوع نہیں ہے۔ مغربی اہل قلم نے ظریفانہ یا سنجیدہ پیرایہ میں اس پر اکثر خامہ فرسائی کی ہے۔ ہماری زبان میں بھی متعدد مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ ذیل کا اقتباس زمانۂ حال کے ایک مشہور مصنف انگلینڈ رایم تھایسن کے مضمون سے کیا گیا ہے۔ مضمون نگار نے شوخ و متین رنگ کو ایسی پرلطف آمیزش دی ہے کہ بے اختیار تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اصل زبان کے "ہیومر" کو اپنی زبان میں ادا کرنے کی یہ ایک محض مترجمانہ کوشش ہے۔ وھو ھذا:-

مسٹر آرنلڈ بینیٹ ایسا بیذھب آدمی واقع ہوا ہے۔ کہ مجھے اس سے خوف معلوم ہوتا ہے۔ اُس نے "ہماری خواتین" کے نہایت دشوار موضوع پر ایک کتاب لکھنے کی جرأت کی ہے۔ جسمیں وہ (جو نسائی شائقین ناول کا پرستیدۂ خیال ہے) یکماں استغنا اس حسن ظن کی بنیادوں کو تباہ کر رہا ہے اور اس کے اجزائے شکستہ کو اپنی حسین پرستاروں کی شتاق صورتوں پر دعوت جنگ دیتے ہوئے پھینک رہا ہے۔ وہ عورت کی ریش مفروضہ کو پکڑ کر اس کی نازک ناک ہلاتا ہے۔ اور صاف صاف سناتا ہے۔ کہ "وہ اتنی حسین نہیں ہے جتنا کہ وہ خود ہے" مختصر یہ کہ اُس نے وہاں زور آزمائی کی ہے جہاں میں قدم رکھتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں اسنے اشارۃً میری قدیمی دوست شاپن ہار سے تلمذ رکھنے کا اعلان بھی کر دیا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ عقلاً و خلقاً مرد عورت سے افضل ہے اور اس وثوق کے ساتھ کہتا ہے میں یا آپ کہیں "پانی نم دار ہے" کوئی اسکو چشم بصیرت سے دیکھے تو اسکی تصویر یوں نظر آئیگی کہ بال اسکی ناصیۂ دانش آثار سے پیچھے ہٹے ہوئے ہیں اسکی فاختہ کی سی آنکھیں چمک رہی ہیں اسکی مونچھیں خونخوارانہ انداز سے استادہ ہیں ہاتھ اسکے ابھرے ہوئے سینہ پر صلیبی شکل بنائے ہوئے ہیں اور وہ چپکے چپکے دنیا کو ہلا دینے والا یہ اعلان سنا رہا ہے کہ "مرد عورت سے افضل ہے۔"

میرا خیال ہے کہ ان باتوں سے عورتوں کی کچھ نہ کچھ دل شکنی ضرور ہو رہی ہے۔ عورت کی پستی کو پردے کا لانیوالے بڑے بڑے دلیر اور جدت طراز محقق گزرے ہیں۔ غالباً حضرت آدم ان میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ شاپن ہار نے آزادانہ اظہار خیال کیا ہے۔ اور شاپن ہار کے بعد مسٹر بینیٹ کی کوشش وہی وقعت رکھتی ہے جو ہاتھی کی لات کے بعد مکھی کی لات کو حاصل ہے۔ مسٹر بینیٹ کی طرح شاپن ہار کا بھی خیال تھا۔ کہ مرد عورت سے افضل ہے مگر اس کا اسلوب بیان زیادہ پرزور ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "جنون محبت نے مرد کی عقل پر ایسا پردہ ڈال دیا ہے۔ کہ اس پست قد تنگ کمر کوتاہ نسل پر "صنف نازک" کا اطلاق کرتا ہے۔"

عورتوں کی دماغی کائنات کے متعلق (جس کی نسبت مسٹر بینیٹ کے استاد کا خیال تھا کہ عورتوں کو بھی ایک قسم کا نہایت محدود ادراک عطا کیا گیا ہے۔ وہ سوائے اس چیز کے جو اُن سے نہایت قریب ہو اور کچھ نہیں دیکھ سکتیں۔ صورت کو حقیقت سمجھتی ہیں اور معمولی باتوں کو اشد ضروری امور پر ترجیح

دیتی ہیں۔ وہ از راہ کرم اُن کے ذوق شاعری و موسیقی و صنعت کا معترف تھا اور اس ذوق کی توجیہہ بڑی جدت کے ساتھ اس طرح کرتا تھا۔ کہ یہ ایک ذریعہ ہے اُن کی افزائش نشاط کی کوششوں میں مدد دینے کے لئے۔

مسٹر بینٹ کہتا ہے۔ کہ کلیۃً عورتوں کو محکومیت سے اُنس ہے۔ یہاں بھی وہ اپنے استاد کے جذبات کا اعادہ کرتا ہے جس کا قول تھا۔ کہ فرماں پذیری عورت کی فطرت میں داخل ہے۔ اور ہر وہ عورت جس کو منشائے قدرت کے خلاف کبھی کامل آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔ عجلۃ الوقت اپنے آپ کو کسی مرد کے حوالے کر دیتی ہے جو اس کا رہنما اور حاکم بنجاتا ہے۔ شاپن ہار نہایت دانشمندانہ طریقہ سے اس کی یہ وجہ بیان کرتا تھا۔ کہ اس کو ایک آقا اور مالک کی ضرورت ہے۔

مسٹر بینٹ کا دعوے ہے کہ ایک خانہ دار عورت کی بڑی کمزوری فقدان تخیل ہے یعنی تمدن حیات ایک مستقل روش پر قائم ہو کر بدمزگی پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن شاپن ہار کہتا ہے کہ عورتیں اپنے اختلاف پسند مزاج کی بدولت اس کمی کو پورا بھی کر دیتی ہیں۔ ان کا مزاج اصولاً مردوں کے مزاج کے خلاف ہے اور حیات ازدواج میں نزاع باہمی کو جو عمومیت حاصل ہو گئی ہے اس کی بڑی وجہ یہی ہے" حیوان افضل کی اطاعت کی بجائے عورتیں عادی ہو گئی ہیں کہ اپنے باضابطہ مالکوں کی مخالفت کریں اور ہمیشہ ان کی تردید و تنقیص کی گھات میں لگی رہیں۔ اس معاملہ میں انکی حوصلہ افزائی کیجاتی ہے۔ شاپن ہار کا خیال تھا۔ کہ مردوں نے اغماض و احترام کی ایماندارانہ روش اختیار کر کے یہ نتائج پیدا کئے ہیں کہ وہ زیادہ گستاخ اور ناقابل برداشت ہو جاتی ہیں اور انکو دیکھ کر بعض وقت بنارس کے مقدس بندروں کی جانب ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔ جو اپنے تقدس کے احساس کے ساتھ خیال کرنے لگتے ہیں کہ وہ بلا خوف مواخذہ جو کچھ چاہیں کر سکتے ہیں

ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ ان کے علاوہ بھی بہت سے مصنفین گذرے ہیں۔ جنہوں نے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔ مثال کے طور پر سٹرنڈبرگ نے اس حقیقت کو عالم آشکار کر دیا ہے کہ عورت کا خون بچہ کے خون سے ملتا جلتا ہے۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی بندر سے مماثلت رکھتی ہے۔ اور اس کی کھوپڑی حبشی کی کھوپڑی کے مانند ہے۔ ایک اور سائنسدان نے مرد اور عورت کے دماغوں کو نہایت احتیاط سے تول کر ثابت کیا ہے۔ کہ مرد کا دماغ عورت کے دماغ سے بھاری ہے اس لئے مرد بالضرور افضل ہے اس نے قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ ایک اوسط درجہ کی عورت میں دماغی مواد متوسط مرد کی نسبت دس فیصدی کم ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کو یہ بھی ماننا پڑا کہ اسی معیار تقابل سے نوے فیصدی عورتیں نوے فیصدی مردوں کے برابر ہیں اور اسی حساب کی رُو سے چالیس فیصدی عورتیں باعتبار فہم و فراست متوسط آدمیوں سے افضل ہوتی ہیں۔ تاہم بقول اس منطقی خامکار کے جس نے ہومر کی تصانیف پڑھکر کہا تھا۔

کہ "آخر یہ ثابت کرنا چاہتا ہے"۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وزنی پیمائش افضیلت ثابت کر سکتی ہے؟۔

یہ سچ ہے کہ تاریخ نسواں اب تک ہومر ڈینٹی شیکسپیئر اور گیتھے کے ناموں سے مزین نہیں ہوئی لیکن اگر ایلزبتھ کرامویل انگلستان کے حکمرانوں میں سب سے بڑا شمار ہوتا ہے۔ تو ملکہ الزبتھ دنیا میں سب سے بڑی فرمانروا گذری ہے۔ علاوہ بریں عورتوں کو کبھی کوئی موقع نہیں ملا۔ ان کی تربیت ہمیشہ ان کو مسکین پالتو جانور بنانے کے لئے ہوتی ہے۔ کہ وہ بلیوں کی طرح غرائیں اور جب اُن کا مالک اُن کی طرف متوجہ ہو تو خوش نظر آئیں۔ اطاعت کو اُن کی زندگی کا اولین مقصد قرار دیا گیا ہے معلمانِ اخلاق شعرا فلاسفہ اور واعظین نے اُن کو یہی سکھایا ہے۔ کہ وہ شعور و سلیقہ کے کارزار میں بود و باش اختیار کریں اور جب مرد اپنی آسائش اور کبر و ناز کے سامان کی بہم رسانی کے لئے ان کو طلب کرے تو بغیر توقف عاجزانہ مستعدی کے ساتھ سامنے آکھڑی ہوں

گذشتہ ایک پشت کی ایک لڑکی کے لئے تمام تعلیم کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ ایک شوہر حاصل کرے اور اس کے حاصل کر لینے کے بعد اسکا مطمح نظر لوٹارک کے پرلطف الفاظ میں یہ تھا کہ "وہ اپنے شوہر کی صورت اور مزاج کا ایک خوبصورت آئینہ بنجائے۔ اگر وہ خوش ہو تو خود بھی مسرور ہو جب وہ ہنسے تو خود بھی متبسم ہو جب وہ غمگین ہو تو خود بھی اسکے غم میں حصہ ۔ اور آدھی دکھ درد کی شریک بنکر اس کو راحت پہنچائے"۔

ایمان کی بات ہے کہ عورتوں نے اپنے معلموں کا نام روشن کر دیا ہے اور علمی دنیا میں جو خدمت ان کو سپرد کی گئی ۔ اس کا حق ادا کیا ہے۔ جہاں انہوں نے اپنے آپ کو جلیل القدر جرنیل قانون داں ڈاکٹر واعظین اور ماہرانِ سیاست نہیں کیا ہے۔ وہاں انہوں نے اپنے پیار پرورش اور محبت کی دنیا میں مائیں بہنیں بیویاں بن کر اور اولاد کی مناسب نشو و نما کرکے غیر فانی شہرت حاصل کی ہے۔

بڑی خوشی کا مقام ہے کہ مسٹر بینٹ زمانہ مستقبل کی عورتوں میں دل آویزی کے آثار پاتا ہے ۔ اُس کو زمانہ حال کی لڑکی کی شان و شکوہ میں معتدبہ اضافہ نظر آتا ہے۔ اس کے خیال کے مطابق مرد اور عورت کے مابین مزید آزادی اور معقولیت کے برتاؤ کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اور بیش از بیش یک جہتی اور بے تکلفی کا میلان پایا جاتا ہے۔

بالفاظ دیگر ہماری لڑکیاں صدیوں کی ابلہانہ مغلوبیت سے اُبھر رہی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک اُن کو مردوں کا پایہ تو نصیب نہیں ہوا لیکن اگر وہ استقلال کو ہاتھ سے نہ دیں اور نمائش حسن کے سبق کو نہ بھولیں تو اُن کے سامنے ایک شاندار مستقبل ہے۔

سید سرفراز حسین۔ بی۔ آر

خاتم لعل

گیارہ بجے کا وقت ہے۔ ایک جوہری اپنی دوکان میں بیٹھا ہوا نوٹ گن رہا ہے۔ آج صبح سے مرصع زیور کی بکری بہت زیادہ ہوئی ہے کیونکہ ایک امیر خاندان میں عنقریب شادی ہونیوالی ہے اور اس خاندان کے ممبران اور دوستوں نے دولہا دولہن کے واسطے تحائف بکثرت خریدے ہیں یکے بعد دیگرے آج گاہک دوکان میں آ کر اپنی جیبیں خالی کر گئے ہیں اور دوکان کی بہترین چیزیں منتخب کر کے خرید لے گئے ہیں۔

اتنی بکری کے بعد جوہری نے ارادہ کیا۔ کہ آج سب سے اعلیٰ درجہ کے ریسٹورانٹ میں کھانا کھانا چاہئے۔ لہذا ٹیلیفون پر اس نے مالک ریسٹورانٹ کو اطلاع دی کہ میں اور میری اہلیہ دوپہر کا کھانا کھانے آئیں گے۔ اس کے بعد ایک منٹ پر اپنی اہلیہ کو ٹیلیفون دیا۔ کہ آج کھانا باہر کھائیں گے۔ تم جلد تیار ہو جاؤ۔ میں تمہیں لینے آتا ہوں۔

جوہری نوٹ شمار کر کے مقفل کر رہا تھا۔ کہ ایک گاڑی اس کی دوکان کے دروازہ پر آ کر کھڑی ہوئی۔ آج وہ اتنا سامان بیچ چکا تھا کہ مزید خریداروں کی ضرورت اس کو نہ تھی۔ تاہم بحیثیت ایک تاجر کے وہ اپنے آرام و راحت یہاں تک کہ اپنے خورد و نوش پر بھی اپنے گاہکوں کو ترجیح دیا کرتا تھا۔ گاڑی سے اتر کر ایک معزز خاتون دکان کے اندر آئی۔ اور جوہری نے اُسے بغور دیکھا۔ خیال کیا کہ شائد شکار ہاتھ لگے اس لئے وہ باہر نہیں گیا۔ اور خاتون کی طرف آگے بڑھا۔ اس خاتون کے طرز و انداز اور حرکات اور سکنات سے جوہری کو یقین ہو گیا۔ کہ وہ کسی دولتمند گھرانے کی ہے۔ وہ نہایت ادب سے پیش آیا۔ خاتون نے کہا انگوٹھیاں دکھائیے۔ جوہری نے اپنی سنگ مرمر کی میز پر ایک مخملی چادر بچھا کر اتنی انگوٹھیاں لا کر پھیلا دیں۔ کہ ان کی قیمت ایک ملک کے خراج سے کم نہ تھی۔ مگر اچھی اچھی انگوٹھیوں کو اس خاتون نے معمولی جتلایا۔ اور ہمیشہ مزید قیمت کی انگوٹھی طلب کرتی رہی۔

بڑی سے بڑی قیمت جو جوہری بیان کرتا تھا۔ وہ اُسے حقیر سمجھتی تھی۔ جب دکان کی بہترین انگوٹھیاں جوہری پیش کر چکا تو اس خاتون نے اپنا ہاتھ انگوٹھیوں کو آزمائشاً پہننے کے لئے پھیلایا۔ اس نازک اور سڈول کلائی ہاتھ کے مقابلہ میں یہ انگوٹھیاں بے حقیقت معلوم ہوتی تھیں یکے بعد دیگرے اس نے کئی انگوٹھیاں پہنکر دیکھیں اور ان میں سے ایک خاتم لعل پسند کی۔ اب خاتون نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ اور سنگ مرمر کی میز کے کنارے کو پکڑ کر کہا کہ یہ انگوٹھیاں جو تم نے آخر میں پیش کی ہیں۔ درحقیقت اپنی دلفریبی میں ایک سے ایک بڑھکر ہیں۔ اس لئے انتخاب بہت مشکل ہے۔ مگر میں اس لعل کی انگوٹھی کو ترجیح دیتی ہوں۔ بقیہ انگوٹھیوں کو اٹھا لو۔ جوہری نے دبی زبان سے یہ کہکر کہ یہ حقیر انگوٹھیاں آپ کے خوبصورت ہاتھ کے قابل نہیں۔ باقی انگوٹھیوں کو سمیٹ کر اور گن کر علیحدہ رکھنا شروع کیا۔ گن چکا تو اس کو معلوم ہوا کہ دو نہایت قیمتی انگوٹھیاں غائب ہیں۔ جب اس امر کا اظہار کیا تو ا

تو اس نے متعجب ہو کر پوچھا "کیونکر کھوئی گئیں" اس نے اپنے ہاتھ آستینوں اور لباس کو جھٹکا۔ کہ مبادا اس میں لپٹی رہ گئی ہوں اور نیچے جھک کر قالین پر جسپر وہ کھڑی تھی۔ چاروں طرف متجسسانہ نظر دوڑائی۔ مگر انگوٹھیوں کا کہیں پتہ نہ لگا۔ تھوڑی دیر بعد جوہری نے کھسیانہ ہو کر کہا۔ کہ یہ انگوٹھیاں ابھی ابھی موجود تھیں ان میں پر نو لگے تھے کہ باہر اڑ جاتیں ضرور یہیں ہونگی۔ اس لیے میں ممنون ہونگا۔ اگر آپ اپنی تلاشی دینے کی اجازت دیں میں ایک خادمہ کو بلاتا ہوں۔ وہ اس برابر کے کمرہ میں آپکی تلاشی لیگی"

خاتون کڑک کر بولی "تمہیں اس طرح میری توہین کرتے ہوئے شرم نہیں آتی"

جوہری کو یقین تھا کہ وہ دو انگوٹھیاں اس عورت کو دکھلائی گئیں تھیں اور اس نے پہنکر دیکھیں وہ ایک تجربہ کار تاجر تھا اور چوروں کے کرتب سے بھی کسیقدر واقف تھا اس لئے اسنے اس امر پر اصرار کیا کہ خاتون کو تلاشی دینا ہوگا۔ ورنہ وہ اس امر پر مجبور ہوگا۔ کہ فوراً پولیس سے امداد طلب کرے۔ یہ سنکر خاتون نہایت اطمینان کے ساتھ برابر والے کمرے میں چلی گئی۔ اور اسی اطمینان کے ساتھ بخندہ پیشانی تھوڑی دیر میں باہر نکل آئی۔ کیونکہ کوئی مسروقہ چیز تلاشی میں برآمد نہیں ہوئی۔

باوجودیکہ خادمہ نے تلاشی نہایت احتیاط سے لی اور وہ اپنے اس منصبی کام سے اچھی طرح واقف اور نہایت ہوشیار تھی۔ خاتون نے باہر نکلکر کہا "تم نے جو میری توہین کی ہے۔ اس کا مزہ تمہیں عنقریب چکھاؤنگی۔ اور جو انگوٹھی میں نے پسند کی تھی اس کو اب میں نہیں خریدونگی۔ نہ آیندہ تمہاری دوکان سے کوئی معاملہ کرونگی۔ اور اپنی ملنے والیوں کو بھی حتی الامکان یہ صلاح دونگی کہ ایسے تاجر سے جو اس طرح اپنے گاہکوں کی بیوجہ توہین کرے ہرگز لین دین نہ کریں" جوہری نہایت شرمندہ مگر حیرت زدہ تھا کہ انگوٹھیاں کیا ہوئیں۔ اس کے دو ملازموں نے خاتون کے جانے کے بعد دوکان کا کونہ کونہ دیکھا مگر کہیں پتہ نہ لگا۔ اس روز بکری میں جو فائدہ ہوا تھا وہ ان دونوں انگوٹھیوں کے جاتے رہنے سے سارا ڈوب گیا۔ اس لئے جوہری نہایت رنجیدگی کی حالت میں اور وقت مقررہ سے بہت دیر بعد کھانا کھانے گیا۔ اور باوجود اسکے کہ کھانا نہایت لذیذ تھا اسکو کچھ مزہ نہ آیا۔ خاتون کے پیچھے اسنے ایک سراغرساں لگا دیا تھا۔ گو وہ سوچتا تھا۔ کہ اگر وہ انگوٹھیاں اسنے چرائی ہوتیں تو تلاشی میں ضرور نکلتیں۔ جوہری اپنی اہلیہ کے ساتھ اپنے ... میں کھانے کی میز کے پاس بیٹھا ہوا ان خیالات میں غلطاں و پیچاں تھا کہ اس کی دوکان میں ایک اور گاہک اس کی غیبت میں داخل ہوا۔ یہ گاہک انگوٹھیوں کا خریدار نہ تھا۔ اور کوئی چیز اس وقت خریدنی چاہتا تھا۔ اس کے پاس ایک چھلا تھا جسے دکھا کر وہ صرف یہ پوچھنا چاہتا تھا۔ کہ اس نمونہ کا دوسرا چھلا اس دوکان میں تیار ہو سکتا ہے یا نہیں۔ جوہری کا منیب جو اس وقت دوکان میں موجود تھا مگر اس روز اسی حادثہ سے بہت گھبرایا ہوا تھا ... گاہک کی گفتگو سنکر مطمئن ہوا کہ اشیا موجودہ دوکان دکھانے کے لئے اسکو کوئی قفل کھولنے نہ پڑینگے۔ اس ...

گاہک کو جواب دیا کہ دوسرا چھلا غالباً تیار ہو سکے گا۔ لیکن اس وقت مالک دوکان موجود نہیں ہیں۔ اگر آپ دوبارہ تکلیف کریں تو وہ آپکو قطعی جواب دے سکیں گے"۔ گاہک جتنی دیر کھڑا رہا اس کے ہاتھ برابر چلتے رہے۔ سنگ مرمر کی میز کا کنارہ جو باہر نکلا ہوا تھا۔ اسکے نیچے خصوصاً یہ گاہک ہاتھ دوڑاتا اور ٹٹولتا رہا۔ منیم نے یہ سمجھ کر کہ جس طرح بعض آدمیوں کو پیر یا ہاتھ ہلانے کی عادت ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ شخص ہاتھ چلانے کی بیماری میں مبتلا ہے۔ اور نیز اس خیال سے کہ میز کے کنارے کے نیچے کوئی قیمتی چیز نہیں ہے جو چرائی جا سکے۔ گاہک کی حرکات سے کچھ تعرض نہ کیا۔ کچھ عرصہ تک گاہک خندہ پیشانی سے گفتگو کرتا رہا۔ اور بالآخر یہ کہکر کہ میں پھر آؤنگا۔ چلا گیا۔ منیم نے خیال کیا۔ کہ اس گاہک کے پیچھے کوئی سراغرسانی لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اسے دوکان کی کوئی چیز دکھلائی ہی نہیں گئی۔

گم شدہ انگوٹھیوں کا راز کئی ہفتہ بعد اسطرح ظاہر ہوا۔ کہ ایک دن جوہری اپنی سنگ مرمر کی میز کے اس جانب کھڑا تھا جہاں اُسکے گاہک کھڑے ہوا کرتے تھے۔ میز کے کنارے کے نیچے اتفاقیہ اس کا ہاتھ گیا۔ تو وہاں اُسے کوئی چپکتی ہوئی چیز معلوم ہوئی۔ جھک کر دیکھا۔ تو وہ موم تھا۔ اور موم پر دو صاف نشان انگوٹھیوں کے نمودار تھے۔

اس واقعہ کے بعد جوہری کی دوکان میں بہت تبدیل و تغیر ہوا۔ از انجملہ سنگ مرمر کی میز کے آگے کو نکلا ہوا کنارہ جس کے نیچے موم لگا کر گمشدہ انگوٹھیاں اسمیں چسپاں کر دی گئیں تھیں کاٹ ڈالا گیا۔

تعجب یہ ہے کہ خاتون کے چلے جانے کے بعد کامل ایک گھنٹہ تک انگوٹھیاں وہاں چسپاں رہیں۔ اور کسی کو خبر نہ ہوئی۔ یہانتک کہ دوسرا گاہک جو خاتون کا ہمراز تھا۔ آیا۔ اور باتوں باتوں میں انہیں نکال کر لے گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد خاتون اور اس کا ہمراز دونوں گرفتار ہو گئے۔ کیونکہ مسروقہ انگوٹھیاں انہوں نے جہاں فروخت کی تھیں۔ اس کا پتہ پولیس کو لگ گیا۔ اور دونوں کو ایک طویل میعاد کے لئے قید با مشقت کی سزائیں دیگئیں۔ — **شیبانی**

غزل

نیاز خودی کیا آرزو ہو قلب مضطر کو — کہ ساز و برگ غفلت مایہ عشرت ہے ساغر کو
سیہ نا چشم ساقی کو جو لبریز کرم دیکھوں — خوشی سے رہن جام بادہ کردوں حوض کوثر کو
علاقہ کیا سبکروحوں کو رزق و برق ہستی سے — نہیں کچھ واسطہ تار نفس سے عقد گوہر کو
پر پرواز ہمت بنے حریف سوز ناکامی — گرہ ہے یاد کا آتشکدہ بال سمندر کو
ملا ہے حسن کی سرکار سے یہ خط غلامی کا — نہ کیوں آئینہ حرز جاں بنائے خط جوہر کو
طلوع صبح آگاہی ہے فتح الباب غم یعنی — ہجوم جلوہ آشوب بلا ہے جان مضطر کو
ہر قطرہ موجوں کو ہے جولانگاہ آزادی — تمنا ڈھونڈتی ہے اشک حسرت میں سمندر کو
[illegible] ہے [illegible] سرتا سر شناعت کبر و خود بینی — دکان سجدہ کیوں کھولے جبین داغ پرور کو
[illegible] مال باصفا میں کیا کروں ضامن — نگاہیں میری میلا دیکھتی ہیں ماہ انور کو

مہملاتِ غالب

(گذشتہ سے پیوستہ)

فرماتے ہیں "یہ معلوم بالکل وجود کونسی اصطلاح ہے" اکمل وجود کوئی اصطلاح نہیں نہ اصطلاح کا دعویٰ کیا گیا۔ بس یہ دیسی ہی اصطلاح ہے جس طرح جناب کے محاکمہ میں صفحہ ۶۵ پر (شارخ اور تلفی) کاتب نے ۃ کو دال سے بدل دیا۔ اور اراکین شباب اردو نے (جن کو نہ فرصت ہوا اور مضمون نگار کے غلط مضمون شائع ہونے کا احساس) عفو جمع فرمایا اس سے مضمون نگار کا کیا بگڑا۔ ہاں شباب کے دامن پر چند بدنما دھبے نمودار ہو گئے جو باوجود تنبیہ بھی برطرف نہ کئے گئے۔ نیز آپ کو تذکرہ حسن خود بتا دیگا۔ کہ لفظ اکمل وجود تھی جس کو دال سے بدل کر وجود کر دیا گیا۔ اسکو پھر آپ اپنی قدیم عادت کے مطابق مہمل فرمانے لگے جناب محترم ذرا غور فرماکے ارشاد فرمایا کیجئے الفاظ کا بےموقع ہونا اور شے ہے۔ اور مہمل ہونا اور چیز ہے۔ "اکمل وجود لفظ بامعنی ہو مہمل نہیں۔ ہاں کاتب کی عنایت سے بےموقع ضرور ہو گیا۔ آپ مہملیت کو نصب العین نہ قرار دیں۔

فرماتے ہیں "یہ ارتفاع نقیضین محال ہے یہ ایک نئی منطق ہے جو کبھی سننے میں نہیں آئی"

بجا ارشاد ہوا۔ یہ محض آپ کا انکسار ہو یا لاعلمی ایسی بات نہ فرمایا کیجئے۔ ورنہ ارباب منطق ہنسینگے اگر آپ نہیں سمجھے ہو تو اب سمجھئے ارتفاع نقیضین۔ ملاحظہ ہو ظن بمعنی گمان بولا جاتا ہے۔ اسمیں تو آپکو بھی شک نہ ہوگا۔ یہ بھی غور فرمائیے کہ اس ظن کا حسن جب ہی ہے جب یہ صحیح ہو اس کا قبح جب ہے جب یہ غلط ہو۔ یونہی یہ صحت بھی عام ہے۔ چاہے بطریق جہل مرکب ہی کیوں نہ ہو۔ جب یہ بات معلوم ہو گئی۔ تو گمان صحیح کی نفی مستلزم ہے۔ گمان غلط کے وجود کو کیونکہ گمان ہے نہ چہ لفظ ظن قطع نظر کیا نہیں جا سکتا۔ اگر ایسا نہ ہوگا تو لازم آئیگا۔ کہ ایک ایسا گمان ہو جو نہ صحیح ہو نہ غلط اسکو وہی تسلیم کرے گا۔ جو کلی کا وجود براسہ خارج میں مانتا ہو۔

تحقیق لغت حاکم کی زبانی۔ فرماتے ہیں "علامہ کا یہ کہنا کہ اس کے یہ معنی گمان صحیح کے نہیں اس کے یہ معنی ہیں کہ غالب نے اپنی شرح جو حسن ظن کے معنی گمان صحیح کے لئے ہیں وہ غلط ہیں اور یہ ان کا کہنا درست ہے کیونکہ حسن ظن کے معنی کتاب لغت میں جمال خوبی نکوئی محاسن الخ"

حسن ظن کے معنی کیا ہیں؟ اس کے متعلق میں نے 'نظر منقد' میں عرض کیا تھا آپنے اسپر غالباً توجہ نہیں کی ورنہ اعتراضات ایسے خفیف نہ ہوتے۔

گھر و غالب نے اس بات کا انکار نہیں کیا کہ حسن کے معنی خوبی و جمال وغیرہ کے نہیں تاکہ آپ قاموس منتہی الارب وغیرہ کا بجم اٹھا کے پیش کریں لیحمل اسفارًا۔ بحث یہ ہے کہ آدمی میں تو یہ حسن تناسب اعضا یا پسندیدہ

نقشہ وچہرہ مہرہو لیکن ظن کا حسن کیونکر سمجھا جا سکتا ہے۔ غالب اسی حسن کو بتاتا ہے۔ کہ اگر گمان صحیح ہوگا۔ تو صحت حسن میں شک نہ ہوگا۔ اب آپ ہی فرمائیں کہ اسمیں کس لغت کی مخالفت ہے۔ ہاں یہ الگ بات ہے۔ کہ لغت والے حسن کے معنی خوبی وجمال وغیرہ لکھتے ہیں آپ حسن ظن کے معنی خوبی وجمال کے لیتے ہیں۔ یہ ہر او چہ مے سرائد طنبور او چہ مے سراید +

فرماتے ہیں "حسن ظن کے معنی گمان نیک کے ہیں نہ گمان صحیح کے والفرق بیّن پس ایک تو شرح مہمل دوسرے جو شرح لکھی وہ بھی غلط الخ"

حسن ظن کے معنی گمان نیک آپ نے سوء ظن کو دیکھکے نکالے ہونگے۔ مگر یہ تو فرمائیے کہ نیک تو صفت مشبہ ہے جس کے معنی اچھے کے ہیں اور حسن ایسا ہے نہیں پھر حسن کے معنی نیک کے کیونکر ہوئے۔ ذرا کبھی کسی سے فرمائیے کہ آپ کے چہرہ میں نیک ہے اور اس نیک سے مراد حسن لیجئے پھر دیکھئے یہ الفاظ کیا کام کرتے ہیں۔ درحقیقت ایک لفظ اگر مشترک المعنی ہو اور کوئی شخص ایک معنی چھوڑ کر دوسری مراد لے تو قابل الزام نہیں؛ عام طور سے حسن ظن کے معنی کسی چیز سے بھلائی کی امید ہیں یہ ایک معنی ہیں جو محاورات میں رائج ہیں لیکن اگر اس معنی کو مد نظر رکھتے ہوئے خوبصورتی گمان یعنی حسن ظن سے مراد لیجائے۔ تو اس کی تفسیر وہی ہے جو غالب کی۔

(بہار عجم کی عبارت) الحکم صاحب نے بہار عجم کو ایک عظیم القدر کتاب سمجھتے ہوئے مجھے اس کی طرف توجہ دلائی ہے میں متشکر ہوں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جب حسن ظن، حسن بہار وغیرہ میں لفظ حسن موجود ہے۔ تو اسی حسن کلی کے یہ افراد ہیں پھر نہ معلوم اس میں کیا شک پیدا ہو سکتا تھا۔ جسکے متعلق صاحب بہار عجم لکھتے ہیں کہ اطلاق ان بر...... نہ صحیح باشد ایک کاتستہ اس سے زیادہ اور کیا لکھ سکتا تھا۔ اہل زبان کو چھوڑ کر ایک کاتستہ کی طرف رجوع ... کے معنی کند تجنیس کے سوا کچھ نہیں، پھر بھی مرزا کے بتائے ہوئے معنی بہار عجم کے معنوں کے مخالف نہیں، اگر آپ اس امر میں غور کریں کہ ظن میں حسن کیونکر پیدا ہو سکتا ہے۔ تو سمجھ میں آجائیگا کہ حسن ظن کے معنی گمان صحیح کہاں تک درست وموزون ہیں + (حکومت جدیدہ کی تیسری حکومت) فرماتے ہیں "گوہر صاحب نہیں سمجھے کہ اس شعر میں لفظ نفس جو بسکون فا تھا مرزا نے بفتح فا غلط باندھا ہے۔ اب اگر گوہر صاحب بجائے اس کے کہ یہ کہتے الانسان مرکب من الخطا والنسیان نفس بفتح فا کے استعمال کو جائز سمجھا"

میں نے بہت اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ اصل لفظ اس جگہ کیا مستعمل ہوا۔ میں علامہ کے اس خیال کو غلط جانتا ہوں اس جگہ نفس بسکون فا مستعمل ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ یہاں نفس پروری میں بسکون فا کا کوئی تک نہیں تاکہ آپ اور علامہ فرمائیں کہ غالب نے غلط کہا ہے۔ غالب تو نفس پرور بفتح فا کہتا ہے۔ کیونکہ سلک گوہر اس وقت تک بن نہیں سکتی۔ جبتک گوہر نفس پرور (بفتح فا) ہوکے ایک خط کی صورت نہ اختیار کریں۔ یہ اور بات ہے

یہ اور بات ہے کہ آپ نے بھی علامہ کی پیروی کرتے ہوئے نفس بفتح فا کو نفس بسکون فا زبردستی قرار دیکر غالب پر اعتراض فرما دیا۔ اور اسے اس قدر جاہل سمجھا کہ وہ نفس نفس میں تفرقہ نہ کرسکے۔ یقبس المرء الخ،

فرماتے ہیں" الانسان مرکب من الخطا والنسیان" کیوں جناب یہ کوئی عربی کی مثل ہے۔ کوئی قرآن کی آیت ہے۔ کوئی حدیث ہے کسی حکیم کے دہن کا نکلا ہوا فقرہ ہے۔ آخر جناب نے اسے کن معنوں میں استعمال فرمایا ہے کبھی اس کی تحقیق کی نوبت کاہیکو آئی ہوگی۔ اگر کسی کتاب میں جناب نے ملاحظہ کیا ہو تو مجھے بھی مستفید فرمایئے گا۔ یہ تو غور کیا ہوتا کہ یہ جوہر کی تعریف عرض سے کیسے کیجا رہی ہے۔ یہ فقرہ صحیح بھی ہے یا غلط۔ یہ ہی نئی منطق جس میں جوہر کی تعریف سے کیجا رہی ہے اب کہیئے۔ اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی۔

(چوتھی حکومت) فرماتے ہیں" گہر صاحب نے ازالۂ حرکت کے لفظ پر اعتراض فرمایا ہے مگر یہ اعتراض وہی کرسکتا ہے جو علم ادب پر کافی عبور نہ رکھتا ہو الخ" اس کے بعد میر زاہد کی عبارت نقل کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مصدر اپنے اثر مترتب کے معنوں میں مستعمل ہو سکتا ہے۔"

درست ہے۔ یہ بجا فرمایا کہ جاہل علم ادب ہی یہ اعتراض کرسکتا ہے۔ کیونکہ مصادر اور ان کے خواص علم ادب ہی میں تو بیان کئے جاتے ہیں۔ اس اعتراض سے حکم کی صرفی قابلیت بھی معلوم ہو گئی۔ اے روشنی طبع الخ

میر زاہد کے حوالہ سے اتنا تو معلوم ہوا کہ آموختہ یاد ہے مگر یہ نہ ثابت ہو سکا کہ ہر مصدر متعدی لازم ہو جاتا ہے۔ اسنے تو صرف لفظ حمد کے متعلق گفتگو کی ہے۔ میں اب حکم صاحب کو چیلنج دیتا ہوں کہ آدم سے لیکر صبح محشر تک جستجو فرمائیں اگر کہیں ازالہ زوال کے معنوں میں مستعمل ہوا ہو تو میں ہر سزا کے لئے تیار ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ تعصب کے پردے کچھ ایسے کثیف پڑ جاتے ہیں کہ زبان عرب بھی اتہامات بیجا سے مجروح ہو رہی ہے۔ یہ بیہودہ بات جیسے عالم بے عمل یا عامل بے علم کہہ سکتا ہے۔

وکم من عائب قولا صحیحا　　　وآفته من الفهم السقيم

پانچویں حکومت ۔ فرماتے ہیں" اسی طرح غنچہ تا شگفتنا کی ترکیب اور خواب گل پریشاں کی ترتیب تا شگفتنا میں تا اور ہا کی بلاغت کو بھی دیکھا جائے"

کیوں جناب "تا شگفتنہا" کی ترکیب میں کیا غلطی ہے کاش اس مجمل کو مفصل فرما دیا ہوتا، خواب گل پریشاں کی فصیح ترتیب میں کیا خار زار آپ کی آنکھوں نے دیکھا جو کھٹک گیا، انصاف کا خون ہے اگر ایک محسن اردو کے لئے آپ اس قسم کے رکیک و سخیف اعتراض فرمائیں۔ ہا اور تا کی بلاغت کو آپ کیا دکھاتے ہیں درآنحالیکہ علم معانی سے آپ کا یعنہ تیا عدضب دنون سے کم نہیں، کیونکہ آپ بلاغت الفاظ و حروف میں ڈھونڈھتے ہیں۔ جہاں سے بلاغت کوسوں دور ہے آپ کو بلاغت کے بجائے فصاحت کہنا چاہیئے تھا سبحان اللہ معانی سے دوری اور محاکمہ میں یہ سینہ زوری۔ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔　　　باقی دارد

گہر جھانسی

قصیدہ بردہ

(گذشتہ سے پیوستہ)

۱۲۹ ے گرستند ازلیالی مہ بہ بحیر از نما
دانستندے یاد شبہائے حرم را تا سیم

یاد وہ رہتے نہ تھے ہے کونسی تاریخ آج
گنتے تھے لیکن وہ ایام حُرُم کو تا سیم

۱۲۱ گویا دیں بود مہمانے بصحن شاں فرود
ہمرہ او مہتران جنگجو و باحشم

جنکے مہماں دین حق نازل تھا انکے صحن میں
ساتھ تھے سردار اس کے جنگجو اور باحشم

۱۲۲ ہمرہ او لشکرے سوار چوں بحر محیط
اسپ خوش رفتار زیر ہر یکے چوں سیل یم

لشکر اس کے ساتھ تھا اک مثل دریا موجزن
تیز رو گھوڑا تھا ہر اک کا مثال سیل یم

۱۲۳ عسکرش بودہ ہمہ فرمانبر و امیدوار
کفر را از بیخ برکندید ایشاں یک قلم

اس کے لشکر نے جو تھا فرمانبر و امیدوار
سنگلاخ کفر کو جڑ سے اوکھاڑا یک قلم

۱۲۴ ہست اسلام بعد از غربتش پیوست یار
باذوی القربے کہ میکردند بر ایشاں ستم

مل گئے وہ ہجرت و غربت کی تکلیفوں کے بعد
اون ذوی القربے سے پھر کرتے تھے جو اُنپر ستم

۱۲۵ کے بماندے گرسنہ در قوم بیوہ یا یتیم
بہترین شوہر و اب شد کفیل شاں ز غم

بھوک سے بیخوف تھے ان کے یتیم و بیوہ سب
جب کفیل ان کی ہوا روزی کا وہ شاہ امم

۱۲۶ کوہ آسا بود ہر یک از صحابہ در مصاف
پس از اعدائے دیں آخر چرا خوردند رم

ہر صحابی ان کا تھا میداں میں قائم مثل کوہ
دشمنوں سے پوچھ آخر کیوں ہوئے وہ منہزم

۱۲ از حنین و بدر پرسی ہم بپرسی از اُحد
وقت چوں کافر سزائے خویش از بخت دژم

شاہد عادل احد ہے نیز ہیں بدر و حنین
کیسی ذلت سے مرا تھا وہاں پر اک عبد صنم

۱۲ تیغ شاں اسپید آمد بر سر دشمن فرود
چون خنگوں را بدید آمد بروں ہمچوں بقم

سر پہ دشمن کے لگی جب ان کی شمشیر سفید
سُرخ نکلی جعد شبگوں کا لگا مثل بقم

۱۲۹ نیزہ خطی جو کلک کاتباں در دست شاں
حروف جسم اعدا نقطہا ے زد رقم

نیزے ان کے جسم اعدا پر ان کی کلک سے
نقشہائے بوالعجب کرتے تھے میداں میں رقم

۱۳۰ ہر یکے زینساں مسلح بد ز سیمای سجود
ہمچنانکہ گل ممیز ہست از شاخ سلم

تھا نشاں سجدہ کا پیشانی پہ ہر اک کے عیاں
ہو ممیز گل سے اپنے جس طرح شاخ عنم

۱۳۱ مے وزید باد نصرت بوئے خوش از جسم شاں
در غلاف ورع ہر یک مثل غنچہ مکتتم

۱۳۲ ہر یکے زیشاں بہ پشت اسپ چوں بر تل درخت
احتیاج تنگ وزیں کس را نبود ے لاجرم

۱۳۳ دشمناں را عقل پریدے چناں از خوف و ترس
بزہ و بز غالہ شاں آمد نظر شیر اجم

۱۳۴ ہر کہ شد نصر رسول اللہ معینش در جہاں
کرد پیش او بہ بیشہ گردن خود شیر خم

۱۳۵ ہر یکے از دوستانش منتقم از دشمناں
ہر یکے از دشمنانش خستہ از بار سقم

۱۳۶ امتش آسودہ است اندر پناہ ملتش
گویا در بیشہ با اشبال خود شیر اجم

۱۳۷ امی عالم اگر شد گر یتیمے شد ادیب
ہم بخیل انبیا ایں معجزہ باشد نہ کم

۱۳۸ ہر معاند کو بقرآنش خصومت مے کند
سر بریدہ مے شود از دست برہان قلم

عرض حال

۱۳۹ ہر جفائے کرد بر من دہر از دستم اماں
او امانم داد در دنیا ز ہر جور و ستم

۱۴۰ ہر غنائے دین و دنیا من طلب کردم ازو
آں غنا و آں عطا از دست جودش یافتم

۱۴۱ خدمتش کردم بمدحت تا بیا مرزد خدا
زانکہ کردم جرمہا از خدمت اہل نعم

۱۴۲ مثل حیوانیکہ اورا بہر قرباں مے برند
خدمت شاں گوئی بد قلادہ در گردنم

باد نصرت کی مہک آتی تھی ان کے جسم سے
تھے غلاف اسلحہ میں مثل غنچہ مکتتم

شہسوار ایسے تھے تنگ وزین کی پروا نہ تھی
پشت پر گھوڑے کے مثل میخ جب جاتے تھے جم

دشمنوں کے ہوش اڑ جاتے تھے ان کو دیکھ کر
بچہ بز ان کو آتا تھا نظر شیر اجم

آ گیا جو اس کے دامان حمایت کے تلے
شیر بھی کرتا تھا اس کے سامنے گردن کو خم

لیتا تھا اعدا سے ہر اک دوست اس کا انتقام
لیٹتے بستر پہ دشمن کر کے ارمان سقم

جیسے ہوں جنگل میں شیر اور شیر کے بچے بکثرت
ہے پناہ اس کی میں امت اس قدر بیفکر و غم

ہو گیا اوستاد اوستادوں کا اک امی یتیم
سچ اگر پوچھو تو ہے کیا معجزہ کچھ یہ بھی کم

جو ہوا قرآن کا اس کے مخالف جہل سے
سر گیا فی الفور اس کا دست برہان قلم

عرض حال مصنف

اس کے دامان کرم میں لی معاً میں نے پناہ
گر زمانہ نے کیا مجھ پر کبھی جور و ستم

دین و دنیا کی جو نعمت اس سے کی میں نے طلب
آرزو پوری میری کی اوسنے از روئے کرم

اس کی مدح کے صلہ میں دہ گنہ بخش اے خدا
جو کمائے میں نے کر کے خدمت اہل نعم

جانور کو جیسے لے جاتے ہیں قرباں کی طرف
تھا مری گردن میں طوق بندگی مثل خدم

باقی دارد

آرتھر کی وفات

تمام دن موت کا ہنگامہ برپا رہا۔ اس بلا کا رن پڑا کہ زمین کانپ گئی۔ آخر کار بادشاہ ارتھر کے نبرد آزما شہسوار ایک ایک کر کے لاؤنیز کے میدان میں اپنے آقا پر نثار ہو گئے۔ صرف ایک سردار بچا جو بادشاہ کو کندھے پر اٹھا میدان کار زار سے باہر ایک چھوٹے سے کلیسا میں لے گیا۔ یہ پرانے وقتوں کی ایک شکستہ عمارت تھی جس کے ایک جانب سمندر کی نیلگوں موجیں محراب و ممبر کو بوسہ دیتی تھیں اور دوسری طرف شفاف پانی کی ایک جھیل تھی۔ چودھویں رات کا چاند اس میں منعکس ہو رہا تھا۔

آرتھر کو کچھ ہوش آیا۔ تو بختیار سے کہا۔ آج کی جنگ میں وہ تمام پہلوان ہلاک ہوئے۔ جن کے بہادرانہ کارناموں سے صفحات تاریخ روشن ہیں۔ میرے رفیق سب موت کی نیند سوئے ہیں۔ امید نہیں کہ پھر کبھی ایسا دن نصیب ہو کہ ہم شمشیر زنی اور مبارز طلبی کی باتوں سے پژمردہ دلوں کو تازہ کریں یا شہر کماَلیہ کے روح پرور باغات یا نشاط انگیز محلات کی سیر کریں۔ میں اس قوم کے لئے تمہید ہو رہا ہوں۔ جس کو میں نے حیوانوں سے انسان بنایا۔ اگرچہ استاد مرلن نے قسم کھائی ہے کہ میں ایک دن ضرور واپس آؤں گا اور سلطنت کروں گا لیکن اب تلوار نے خود کو چیر کر میرے سر میں کاری زخم لگایا ہے۔ مجھے امید نہیں کہ صبح تک زندہ رہوں۔ یہ میری شمشیر ایکسکلیبر ہے۔ اسے لے۔ تجھے معلوم ہے کہ کس طرح ایک دن۔ گرمی کی موسم دوپہر کے وقت ایک پر اسرار خوبصورت ہاتھ جھیل کی سطح سے بلند ہوا جو اسے پکڑے ہوئے تھا۔ اور میں نے دریا میں سفینہ ڈال کر تلوار کو لے لیا۔ اور آج تک بادشاہوں کی طرح پہلو میں آویزاں رکھا۔ میری موت کے بعد جہاں کہیں میرا ذکر ہوگا اس کا بھی تذکرہ ہوگا۔ اب درنگ نہ کر۔ اس تلوار کو لے اور تمام زور کے ساتھ جھیل کے درمیان ڈال آ۔ جو کچھ تجھے نظر آئے یا کان سنیں مجھے اس سے مطلع کر۔

بختیار نے جواب دیا۔ سرداروں کے سردار مناسب نہیں کہ میں آپ کو ایسی نازک حالت میں چھوڑ کر کہیں جاؤں۔ زخم رسیدہ مرد کو ایک تنکا بھی گزند پہنچا سکتا ہے۔ لیکن جیسا آپ نے حکم دیا اس کی بجا آوری میں عذر نہیں ✦ یہ کہہ کر وہ اس شکستہ خانقاہ سے باہر آیا۔ چاندنی چٹکی ہوئی تھی سمندر کی تند اور خنک ہوا پرانے قبرستان میں سائیں سائیں کر رہی تھی۔ وہ پرانے مزاروں کے درمیان خوفناک اور ٹیڑھے رستوں پر چکر کھاتا ہوا جھیل کے کنارے آ پہنچا۔ ✦ تب اس نے تلوار نیام سے نکالی اور جب وہ اسے نکال رہا تھا چاند بدلی سے نکل آیا۔ اس کی تابدار شعاعوں سے تلوار کے دستے میں آگ لگ گئی۔ کیونکہ وہ تمام قبضہ یاقوت بالعل نگار تھا۔ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ آخر اس نے مناسب خیال کیا کہ سرکنڈوں کے جھنڈ میں اسے کہیں چھپا دے

وہ یہ کہکے زخم رسیدہ بادشاہ کی خدمت میں واپس آیا۔

بادشاہ نے پوچھا کیا میرے حکم کو پورا کیا۔ تونے کیا سنا۔ اور تیری آنکھوں نے کیا دیکھا۔ عرض کی حضور جب میں نے تلوار جھیل میں پھینکی پانی کی لہروں نے ٹیلوں کے قدم چومے اور سرکنڈوں کی چوٹیوں کو بوسہ دیا۔

آرتھر کا چہرہ اتر گیا کہنے لگا افسوس تونے اپنے نیک نام کو بٹہ لگایا۔ اور جھوٹ بولا۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی بختہ علامت ظاہر ہوتی۔ یا تو وہی ہاتھ سطح آب سے باہر آتا۔ یا کوئی ندا پہاڑ کا دامن چیرتی آتی۔ یا جھیل میں کوئی غیر معمولی تموج ظاہر ہوتا۔ انسان کے لیے جھوٹ بولنا شرم کی بات ہے۔ جیسا تو مجھے پیارا اور وفادار ہے۔ میں تجھے پھر حکم دیتا ہوں کہ ابھی جا۔ اور جو کچھ کہا گیا ہے۔ اُسے پورا کر۔

بختیار سرکنڈوں کو چیرتا ہوا جھیل کے کنارے آیا۔ اور خیالات میں غرق تھا۔ اس کے قدم آہستہ آہستہ اٹھتے تھے۔ اس کی نگاہیں ایک اور کنکر پر جمی ہوئی تھیں۔ جونہی اس کی نظر اس خوبصورت زر اندود قبضے پر پڑی۔ ایک آہ بھری اور زور سے کہا۔

اگر میں تلوار پھینکتا ہوں تو یقیناً ایک قیمتی شے ایک گرانقدر تحفہ ایک دیدہ زیب چیز ہمیشہ کے لئے جہان سے گم ہوتی ہے۔ اگر میں پھینکدوں۔ تو اسمیں کیا بہتری ہے۔ اور اگر نہ پھینکوں تو کیا گناہ ہے؟ حکم عدولی۔ اوہ اس سے بڑھ کر اور کیا گناہ ہو۔ نافرمانی ایک بڑا عیب ہے۔ حکمبرداری سلطنت کا راز ہے ؎

ہر میں عیش دوام آئین کی پابندی سے ہے
موج کی آزادیاں سامانِ شیون ہوگئیں

کیا اس حالت میں بادشاہ کا حکم بجالانا ضروری ہے۔ جب وہ ایسی باتوں کا خواہشمند ہے۔ جس سے اُسے نقصان پہنچتا ہے۔ بادشاہ بیمار ہے اُسے معلوم نہیں کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ میرے بادشاہ کی وفات کے بعد چند افسانوں اور شکستہ قصوں کے سوا کیا نشانی رہ جائیگی۔ ہاں اگر یہ تلوار بچالی جائے۔ اور کسی زبردست بادشاہ کے خزانے میں محفوظ رکھی جائے۔ تو کسی نہ کسی دن یا کسی مصنوعی لڑائی کے موقعہ پر ظاہر کیجائیگی۔ لوگ انگشت بدنداں ہونگے کہ یہ بادشاہ آرتھر کی تلوار ایکسکلیبر ہے جو اسے جھیل کی کنواری شہزادی نے دی نو سال تک اسی نے سمندر کی تہ میں اسپر زرنگاری کی۔ ضرور ہے کہ کسی نہ کسی دن کوئی کہن سال پیر اس کے حیرت انگیز اوصاف سنائے۔ لوگ اس کی عزت کریں۔ لیکن اگر یہ تلوار پھینکدوں تو اس قدر شہرت برباد ہو جائیگی۔ انہیں خیالات میں محو اس نے دوبارہ تلوار کو چھپا دیا۔ اور بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے پوچھا۔ بتلا تونے کیا دیکھا اور تونے کیا سنا۔

بختیار نے جواب دیا۔ حضور لہروں نے چٹانوں کے قدم چومے۔ اور سرکنڈوں کی چوٹیوں کو بوسہ دیا۔ آرتھر غصہ سے بھر گیا۔ اور کہا لعنت ہے تجھ پر۔ او نامہربان فریبی۔ عیار۔ دغاباز۔ سچ ہے حکومت مرتے بادشاہ کا دامن چھوڑ دیتی ہے۔ آنکھیں جلال سے بے نور ہو جاتی ہیں۔ بس مجھے معلوم ہوگیا۔ کہ تو کیا ہے۔ میرے

دلاوروں میں سے تو ہی ایک پسماندہ ہے۔ شایاں تو یہ تھا کہ تمام فرائض خود ادا کرتا۔ لیکن افسوس ایک جڑاؤ قبضے کی خاطر مجھے دھوکا دے رہا ہے۔ یا تو تجھے زر کا لالچ ہے۔ یا ایک معصوم لڑکی کی طرح اس کے چمکیلے موتیوں سے اپنی آنکھوں کی خواہش پورا کیا چاہتا ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوا کہ ایک آدمی دو مرتبہ اپنے فرض سے چوکا ہو۔ اور تیسری مرتبہ کامیاب ہو جائے۔ خیر اب تو جا اور اگر تو نے تلوار پھینکنے سے گریز کیا۔ تو میں اٹھ کر ان ہاتھوں سے تجھے ہلاک کر دوں گا۔

بختیار جلدی سے اٹھا۔ سرکنڈوں کو پائمال کرتا ہوا جھیل کے کنارے پہنچا۔ تلوار کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر سر کے گرد چکر دیئے اور پھینک دیا۔ ماہتاب کی روشنی سے تلوار سے ایک شرارہ اٹھا جیس طرح قطبین کی روشنی برفانی تودوں کے اوپر ایک جانب سے دوسری جانب عبور کرتی ہے

جونہی وہ تلوار سطح آب پر پہنچی ایک پراسرار خوبصورت کلائی سفید ریشم میں ملبوس پانی سے اٹھی تلوار کو قبضے سے پکڑ کر تین مرتبہ ہلایا اور جھیل کے اندر لے گئی۔ بختیار آہستہ آہستہ بادشاہ کے پاس آیا بادشاہ کا دم گھٹ رہا تھا۔ بمشکل سے سانس لیا اور کہا۔ تیری آنکھیں بتلا رہی ہیں کہ تو حکم بجا لایا اب جو کچھ تو نے سنا یا دیکھا صحیح صحیح بتلا۔

بختیار نے کہا۔ سرداروں کے سردار بادشاہ عالی میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں مبادا کہ موتیوں کی چمک تحصیل مدعا کو تاریک کر دے۔ اگرچہ میری عمر ساٹھ سال سے زیادہ ہو چکی ہے میں نے ایسی عجیب وغریب چیز آج تک نہیں دیکھی۔ اور مجھے یقین ہے کہ تا دم زیست ایسی نادر شے نظر نہ آئے۔ تب میں نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ سر کے گرد چکر دیئے اور پھینک دیا۔ جونہی میں نے مڑ کر نگاہ ڈالی ایک خوبصورت پراسرار تعجب انگیز ہاتھ سفید ریشم میں ملبوس سطح آب سے بلند ہوا۔ جس نے دستہ کو پکڑ تین مرتبہ ہلایا۔ اور اُسے پانی میں لے گیا۔

بادشاہ کا دم اکھڑنے لگا۔ کہا بس میرا وقت آ پہنچا۔ یہ وقت ہے کہ میں دنیا سے کوچ کر جاؤں۔ جھک کر مجھے اپنے کندھوں پر بٹھا۔ اور جھیل کے کنارے لے چل۔ مجھے ڈر ہے۔ کہ میرا خون سرد پڑ گیا ہے اور میں اب ضرور مر جاؤں گا ٭ یہ کہکر آہستہ آہستہ کہنی کے بل فرش سے اٹھا۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئیں وہ اس طرح دیکھتا تھا کہ ایک تصویر ہے۔ بختیار نے جو یہ حالت دیکھی۔ بے اختیار آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ آہیں سینے میں اٹھتی تھیں لیکن دل کے تہ خانے سے باہر نہ آسکیں۔ اس نے اپنا گھٹنہ ٹیک کر بڑی احتیاط کے ساتھ بادشاہ کے کمزور ہاتھ اوپر کھینچے۔ کندھوں پر بٹھایا۔ اور شکستہ قبروں کے درمیان سے لے چلا ٭ جب وہ گذرا بادشاہ نے لمبے لمبے سانس اس طرح کھینچے۔ کہ جیسے کوئی شخص سنسان

مکان میں کابوس سے بیقرار ہے - ایک سرد آہ بھری اور اس کے کان میں آہستہ آہستہ سے کہا۔ جلد جلد کہیں دیر نہ ہو جائے اور میں مر جاؤں۔

وہ برفانی چٹانوں پر شتاب قدم روانہ ہوا - کہرا اور اپنے سانس میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کی شکل انسانی شکل سے طویل معلوم ہوتی تھی - سمندر کی ڈراؤنی آوازیں پس پشت سے آرہی تھیں اور ہیبت ناک چیخیں سامنے سے اٹھ رہی تھیں۔ اس کے خیالات اُسے کھینچے لیجا رہے تھے - سنگلاخ زمین پر اس کے آہن پوش قدموں اور اسلاح سے مہیب اور بھیانک آواز آرہی تھی۔ وہ بے ترتیب اور ناہموار راستہ کو عبور کرکے جھیل کے مسرت انگیز کنارے پر آپہنچا - چاندنی پانی کی لہروں میں آنکھ مچولی کھیل رہی تھی -

وہ ایک ٹیلے پر کھڑا تھا - فوراً نگاہ نے ایک سیاہ بجرا دیکھا - جو نچلے تختے سے بادبان تک کفن کی صورت تھا۔ نیچے اکر معلوم کیا کہ اس سفینے کے تمام تختے نازک اندموں سے بھرے ہیں جنکا تمام لباس سروں کی چادریں اور برقعے سیاہ ہیں - ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ عالم خواب ہے - ان کے درمیان تین شہزادیاں ہیں جنکے سر پر سونے کے تین جڑاؤ تاج تھے - اس سفینے سے ایک نالہ اٹھا اور چشمک زن ستاروں تک جا پہنچا - یہ ایک رونے کی آواز تھی جو اکثر سنسان ویرانوں میں جہاں آدم زاد کا قدم - ابتدائے آفرینش سے کبھی نہیں گزرا - ہوا اسطرح بلبلایا کرتی ہے -

آرتھر نے دھیمی آواز سے کہا مجھے بھی اس کشتی میں بٹھا لو - وہ کشتی کی طرف آئے - شہزادیوں نے ہاتھ دراز کئے اور بادشاہ کو اٹھا لیا - تینوں میں سے جو سب سے طویل اور خوبصورت تھی اسنے بادشاہ کا سر اپنے زانوں پر رکھا - پارہ پارہ خود کو ڈھیلا کیا - اس کی ہتھیلی کو ملا - اس کا نام لیکر بلایا - پھر ایک تعشق آمیز چیخ ماری خونی آنسو حیرت کیش آنکھوں سے بادشاہ کی پیشانی پر ٹپک پڑے - بادشاہ کا چہرہ اترتے ماہتاب کی طرح بے آب اور زرد تھا - اسکی خود اور زرہ پر خون اعدا کے دھبے تھے - اس کے چمکدار سیاہ بال جس سے اس کی پیشانی نکلتے سورج کی طرح خندہ ان معلوم ہوتی تھی خاک آلود تھے - خون کے ڈھیلے انگوروں کی طرح لٹک رہے تھے اس کی مردانہ مونچھیں خون و خاک سے لتھڑی ہوئی تھیں - بادشاہ ایک شکستہ ستون کی طرح بے حس … یہ وہ آرتھر نہ تھا جو سجیلا جوان بنکر خود اور چار آئینہ سجائے پہلو میں تلوار آویزاں کئے - شہاب ثاقب بادشاہوں اور نازک اندموں کے سامنے کمالیہ کے اکھاڑے میں اترا کرتا تھا -

بے اختیار رو پڑا - آہ میرے آقا آرتھر میں کہاں جاؤں - کس بن میں خاک چھانوں افسوس عشرت کا دور گزر گیا - جب صبح کی شفق کے ساتھ ہماری بہادر خون اعدا سے زمین کو گلرنگ کرتے - جب ہر صبح بہادری سے ہمیں موقعہ ملتا - جسروز بابل اور نینوا کے زیرک منڈی اور خوشبوئیں لیکر مقدس شہر میں داخل ہوئے - اس … آجتک کبھی ایسا خوشگوار عہد نہ آیا ہوگا - اب چہل سواروں کی بہادر جماعت کا شیرازہ تار تار ہوگیا - بس …

پسماندہ اس عجیب غریب دنیا میں نئی شکلوں تازہ صورتوں کے درمیان بے یار اور بے آشنا رہ گیا ہوں اب دنیا تاریک ہے

آرتھر کا دل ان رقت انگیز الفاظ سے موم کی طرح پگھل گیا۔ دلجوئی کے لہجے میں کشتی سے کہا۔

دنیا کا انداز کہن بدل گیا۔ اور دور جدید عالم شہود میں آگیا۔ خدائے برتر اپنے مرضی کو کئی لطیف طریقوں سے پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے مبادا کہ دنیا کی پارینہ نیک رسمیں اس بزم تکوین کی تباہی کا باعث ہو جائیں تسلی رکھ۔ میرا کیا بھروسہ ہے۔ میری زندگی کے دن ختم ہو گئے۔ اور جو کچھ مجھ سے ظاہر ہوا۔ خدا پاک اپنی رحمت سے قبول فرمائے۔ اور تو چونکہ مجھے پھر نہ دیکھیگا۔ میری روح کے لئے دعا کر بہت سے مطالب دعا سے حل ہو جاتے ہیں۔ جو ہمارے گمان میں بھی نہیں آ سکتے۔ اس لئے صبح و شام تیری آواز خدائے عالم کی رحمت کو جوش میں لانے کے لئے چشمۂ آب کی طرح تیرے قلب سے پھوٹتی ہے۔ انسان حیوان سے بدتر ہے کہ اپنی عقل و دانش کے نجم پر اپنے لئے اور اپنے عزیزوں کے لئے دونوں ہاتھ نہ اٹھائے۔ ہم اس کی رحمت کے سہارے سے زندہ ہیں۔ یہ تمام کرۂ عالم عرش مجید کے ساتھ اس کی رحمت کی زنجیروں سے آویزاں ہیں۔ لے اب رخصت۔ میں ان نازنینوں کے ساتھ جنہیں تو دیکھ رہا ہے۔ جزیرۂ آویلاں کی طرف جا رہا ہوں۔ جہاں نہ کبھی مینہ برسا۔ نہ کہر چھائی نہ اولے پڑے اور نہ کبھی تند ہوا چلی ہے۔ وہ ایک سرسبز مرغزار ہے جس میں پھلدار درخت میووں سے لدے کھڑے ہیں۔ گرمی کی موسم میں سمندر کی بیتاب موجیں جبین نیاز سے درختوں کے قدموں کو بوسہ دیتی ہیں۔ مرغزار کی آبپاشی ہوتی ہے۔ اس دیس میں میرے زخموں کا اندمال ہو۔

یہ کہا اور کشتی کنارے سے دور چلی گئی۔ اس راج ہنس کی طرح جو اپنی مرگ سے پیشتر اپنے پروں کو کھول دیتا ہے اسکے سیاہ پنجے چپوؤں کا کام دیتے ہیں۔ وہ ایک آخری نغمہ بلند کرتا ہے۔ اس راج ہنس کی طرح کشتی کے کنارے سے دور چلی گئی۔ بختیار وہاں کھڑا رہا۔ وہ خیالات میں غرق تھا کشتی چلی گئی۔ اور دور افق میں ایک سیاہ داغ کی طرح دکھائی دیکر نظر سے غائب ہو گئی۔

غلام عباس ایم۔اے

خیالاتِ صدیقی

جلوہ ہائے عالم حیرت سے دل لبریز ہے
اللہ اللہ بیخودی بھی کیا تصور خیز ہے

دل کی ہستی کا میں احساس تغیر کیا کروں
اب تو اُف اس کا تصور بھی جنوں انگیز ہے

کر رہا ہے تجھ سے باتیں بیخودئ شوق میں
تیرے دیوانہ کی تنہائی بھی لطف انگیز ہے

محو حیرت ہوں میں جب سے کھل گئی ہے میری آنکھ
ہر جھلک رنگ مجازی کی حقیقت ریز ہے

تیز رو ہوں کس قدر میں عرصۂ ہستی میں اُف
ہر نفس گویا سمند عمر کو مہمیز ہے

دیکھنا ہے گر تجھے نیرنگ فطرت کی بہار
دیکھ اپنے دل کو یہ بھی ایک عالم خیز ہے

جذباتِ ثاقب

مجروح کر دیا مجھے بیمار کر دیا اف تو نے کیا یہ اے نگہِ یار کر دیا
اقرار کر کے مجھ سے پھر انکار کر دیا پھر دل کو تم نے موردِ آزار کر دیا
کیا سحر مجھ پر اے نگہِ یار کر دیا اپنا بنا کے جان سے بیزار کر دیا
دیتا ہوں میں دعا دلِ حسرت نصیب کو جس نے مجھے ستم کشِ اغیار کر دیا
ہے دل سے ایک آگ جگر تک لگی ہوئی اُف تو نے کیا یہ آہِ شرر بار کر دیا
اب تو وفا کرے کہ جفا جو تری رضا جو حالِ دل تھا تجھ پہ سب اظہار کر دیا
ہم جائیں اور تم نہ ملو کوئی بات ہے یہ کس نے اس قدر تمہیں بیزار کر دیا
سویا تھا اک مریض ابھی اے نسیمِ صبح جھونکوں نے تیرے پھر اُسے بیدار کر دیا
ساقی کی چشمِ مست کے اللہ رے کرم محفل کو اک نگاہ میں سرشار کر دیا
درباں کی روز کرتے ہیں جا کر خوشامدیں دل کی لگی نے اور ہمیں خوار کر دیا
ان سرخ آنسوؤں نے ترے اے اسیرِ غم صیاد کے قفس کو بھی گلزار کر دیا
رقت پذیر ہوں میں تری مشقِ جور کا اس نے تو دل کو اور وفادار کر دیا
ہے ناز ہم کو اپنی تمنائے عشق پر دل کو اسی نے تیرا پرستار کر دیا
ثاقب اداس رہتے ہو دن رات کس لئے کس کی نگہ نگاہِ نازنے بیمار کر دیا

سید ابو محمد ثاقب کانپوری

منتخباتِ یاس

اپنی ہستی خود ہم آغوشِ فنا ہو جائیگی موجِ دریا آپ ساحل آشنا ہو جائیگی
نہ کا اندیشہ رہیگا پھر نہ ساحل کی ہوس دل سے جب قطعِ امیدِ بے وفا ہو جائیگی
شب کی شب بزمِ طرب ہے پردہ دارِ انقلاب صبح تک آئینۂ عبرت نما ہو جائیگی
عجیب بھول بھلیاں ہے منزلِ ہستی بھٹکتا پھرتا ہے گم گشتہ کارواں اپنا
کدھر سے آتی ہے یوسف کی بوئے مستانہ خراب پھرتا ہے جنگل میں کارواں اپنا
جرس نے مژدۂ منزل سنا کے چونکایا نکل چلا تھا دبے پاؤں کارواں اپنا

کلام یاس پہ ٹھہری نہ جوہری کی نظر
تو کیا امید کرے کوئی بادشاہوں سے

مرزا یاس لکھنوی

گریۂ مسرت

جب دنیا پر سکوت و سکون کا عالم طاری ہوگیا۔ اور رات کی تاریکی میں کائنات کا ذرہ ذرہ سو گیا۔ دریا پر کیف موجوں سے انگڑائیاں لینے لگا۔ اور نیند کی لہریں سرد ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے سطح آب کی چادر سیمیں میں شکن ڈالنے لگیں۔ ہلال کی کشتی آب پر تیرنے لگی۔ اور تاروں کی مست خواب آنکھیں جھپکنے لگیں۔ تو اس وقت میری آنکھیں بھی ان کا انتظار کرتے کرتے جھپک گئیں

اک ذرا انتظار و اضطراب کی کشمکش سے نجات ملی۔ حواس پر پردے پڑ گئے۔ انتظار کی تکلیف۔ روحانی تکلیف سے بدل گئی اور مجھے معلوم ہونے لگا کہ گویا میں بستر علالت پر پڑا دم توڑ رہا ہوں۔ میرا دل عالم بالا کی سیر میں محو تھا۔ اور میری روح اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھی۔ باطن میں میری یہ کیفیت تھی۔ اور ظاہر میں میرا انتظار آہستہ آہستہ کام کر رہا تھا۔ وہ آئے۔ اور میرے سرہانے بیٹھ کر میری پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے ....

متین! کیا تم سوتے ہو؟

میری رگ جان میں ایک روح پرور جنبش محسوس ہوئی اور میری آنکھوں کے سامنے سے طلسم خواب کا پردہ ہٹنے لگا۔ شوق نے مجھے گدگدا کرکے جگا دیا۔ اور میں نے گھبرا کے آنکھیں کھول دیں،

دیکھا تو سرہانے وہ بیٹھے ہیں جن کا انتظار مجھے نذر اضطراب کر چکا تھا۔ قلب کی حرکت بڑھ گئی، اور مضطرب جذبات میں ایک تموج پیدا ہوگیا۔ آہ میں کیا کہوں کہ اُن کی جھکی جھکی آنکھوں، لبوں کی محبت خیز مسکراہٹ۔ اور ندامت میں ڈوبے ہوئے انداز حیا میں کسی بلا کی بجلیاں بھری ہوئی تھیں جنہوں نے میرے دل میں سرایت کرکے میری دنیائے خیال میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ میں اپنے یاس انگیز خواب کے اس حسن تعبیر پر حیران تھا۔ خیال مرگ تمہید سے دور نکلا +

موت، ہاں وہی موت جو ابھی ابھی میری تمام آرزوں، میرے تمام ارمانوں کی مرجع تھی۔ اب میرے حد ادراک سے بھی باہر تھی۔ اور اس کا تصور میرے لئے ہولناک تھا۔

میں اس کے اس انتظار ندامت و اضطراب لطیف کا شکریہ زبان سے تو ادا نہ کر سکا۔ مگر میری آنکھیں [illegible] اظہار بیکسی کی خاطر لبریز ہوگئیں۔ شاید اب ان سے بھی ضبط نہ ہو سکا۔ انہوں نے بھرائی ہوئی آواز [illegible] میں کہا...... ، متین! گھبراؤ نہیں، اضطراب کی گھڑیاں گذر گئیں ....

میں نے اس وقت جب انہیں غور سے دیکھا۔ تو اُن کی آنکھیں نم تھیں۔ کاش اس وقت جرأت شوق [illegible] تی۔ اور میں اٹھکر ان ساغروں کو چوم لیتا جو شراب محبت سے لبالب تھے۔ یا کاش وہی میری اس

خواہش مجبور کا احساس کرتے۔ مگر گریۂ مسرت کے مضطربانہ جوش نے دونوں کو بیخود بنا رکھا تھا۔
مجھے یاد نہیں کہ میرے دل کا کیا عالم تھا۔ ہاں اتنا یاد ہے۔ کہ ہر چند آنسو نگاہِ شوق کے پاسبان بنے ہوئے تھے۔ مگر میں برابر انہیں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ شوق اضطراب پر غالب آگیا۔ اور یہ میں نے دیکھا کہ وہ میرے سر کو اپنے زانو پر رکھے ہوئے بیٹھے ہیں۔
آہ۔ اس وقت دونوں کے جذبات رقیق رہین تاثر ہو گئے۔ میری آنکھوں سے چند آنسو اُن کے آنچل پر۔ اور ان کی آنکھوں سے چند گوہر درخشاں رقص کرتے ہوئے میرے دامن پر گر پڑے "
غور سے دیکھا تو ان کے آنچل پر لکھا تھا۔" بیتابی" اور میرے دامن پر "محبت"
میں اس پر کیف منظر سے بیخود ہو گیا۔ اور دنیا سے بیخبر۔ ہاں اتنا سنا کہ کوئی فرشتہ آسمانی نغمہ میں الاپ رہا ہے
"محبت کا دوسرا نام ہے بیتابی۔ اور حسن دوسرا نام ہے عشق کا"

قاضی عابد علی عابد بلہوری

ہذیانِ محبت

تن من پہ جان و دل اپنا نثار کرتا ہوں
ستم تو یہ ہے کہ اس کو مری خبر ہی نہیں

لکھوں جو حال دل اپنا تو کس طرح پہنچے
گذر ہو جس کا وہاں تک وہ نامہ بر ہی نہیں

نہ قاصدے نہ صبائے نہ مرغِ نامہ برے
کسے زبیکسی من نمے برد خبرے

کسی کے غم میں مرا سینہ لالہ زار ہوا
جگر کباب گریبان تار تار ہوا

وہ اضطراب ہے وحشت ہے بیقراری ہے
کہ قیس زرد تو فرہاد دلفگار ہوا

شبِ فراق قیامت ہے کب سحر ہوگی
گذر ہی جائیگا جی سے تو پھر بسر ہوگی

یہ کس کے تیرِ نظر نے مجھے کیا گھائل ؟
کہ خودکشی پہ مرا دل ہے خود بخود مائل

الٰہی صبر بڑے میری پردہ داری کا
الٰہی راہِ محبت میں وہ کبھی ہو سائل

میری طرح سے خدا اس کو بے قرار کرے
اسیر درد کرے وقفِ انتظار کرے

میں انتہائے محبت اُسے جتا دوں گا
میں اپنی جان رہِ عشق میں گنوا دوں گا

بنوں گا شمعِ شبستانِ محفلِ دلبر
زبان سوز سے پھر اسکو یہ جتا دوں گا

تو سخت گیری و غیر از جفا چہ میدانی
تو سست مہری و رسم وفا چہ میدانی

ازل سے دشتِ نوردِ رہِ مروت ہوں
میں جاں فروش خریدارِ لعلِ الفت ہوں

رہینِ منتِ اغیار ہو بلا میری
فدا میں اپنے تصور پہ اسے شیدا ہوں

یہ اس کی طلعتِ زیبا مجھے دکھا دیگا
نہ ہوگی ان کو خبر اس طرح ملا دیگا

شیدا عنایت اللہ ...

بچپن کی ولایت

بچپن کی ولایت میں میں رہ چکی ہوں۔ اتنا یاد ہے کہ جب میں اس سرزمین میں رہا کرتی تھی۔ تو ایک دن میں نے اپنے ابا کا قلم تراش قلمدان سے نکال لیا۔ اماں گھبرا گئیں وہ چھینتی تھیں میں نہ دیتی تھی۔ آخر زبردستی لیلیا۔ اور میں دیر تک ضد کرتی رہی۔ کل تصور پھر مجھے اس ولایت میں لیگیا۔ اب یہ مقام میری نگاہوں میں عجیب تھا۔ ہر چیز میرے لئے نئی تھی۔ بچے کھیل کود رہے تھے۔ ان کی زندہ دلی نے مجھ پر بڑا اثر کیا۔ کیا مجال جو محنت سے اکتائیں یا تکان محسوس کریں۔ یہ ایک دوسرے سے بغلگیر ہو رہے تھے ایک دوسرے کو کھینچ رہے تھے۔ کشتی لڑ رہے تھے۔ تکیے پلنگ سے اٹھا کر فرش پر پھینک پڑتے انہیں گود میں لئے پھرتے تھے۔ دنیا ان کی نگاہوں میں صرف سنہری اور سرخ تھی کسی کسی وقت سیاہی کی جھلک آجاتی تھی۔ مگر خاکستری رنگ معدوم تھا۔ چراغ کی روشنی۔ وہ کھلونا اور چاند لیا ہوا ہوا میں سمجھ رہے تھے۔ بادل ان کے خیال میں دوسری دنیا کے پہاڑ پھول پریاں اور گڑیاں شہزادیاں تھیں۔

وہ مجھے مجسم تقلید دکھائی دیئے۔ جو بڑوں کو کرتے دیکھتے تھے وہی کرتے تھے۔ بانس ان کے گھوڑے تھے لکڑی کے تختے ان کی ریل گاڑی اور ان کی چیخیں ریل کی سیٹی۔ تقلید ہر رسائی کا پہلا آلہ ہے۔ اور شوق تجسس یا خواہش ایجاد اس سے بڑھ کر دوسرا۔ وہ ہر چمکدار چیز کو دیکھنے کے لئے کہ اندر کیا چمک رہا ہے۔ توڑ مروڑ رہے تھے۔ والدین کے دماغ پریشان ہو رہے تھے۔ مگر ان کے سوالات ختم نہ ہوتے تھے۔ "کون" "کیوں" "کہاں" "یہ کیا ہے" ان کا تکیہ کلام تھا ان کے سوالات بمنزلہ نردبان تھے جس سے وہ علم کے درخت پر چڑھ رہے تھے +

میں حیران تھی۔ کہ والدین بچوں پر کیوں جان دیتے ہیں وہ کیوں ان کی پرستش کرتے ہیں۔ اس سرزمین میں مجھے معلوم ہوگیا کہ بچے اس لئے پیارے ہیں کہ وہ اپنی مدد خود نہیں کرسکتے۔ وہ کامل اعتبار کرتے ہیں۔ انہیں عجز اور انکسار ہے۔ جلد معاف کردیتے ہیں۔ ان کا یقین اور اعتقاد پختہ ہے۔ سچ ہے بچوں کی امید دار نگاہ سے بزدل شجاع بن جاتے اور کمینہ کا دل پسیج جاتا ہے۔ جبتک بزرگ ان کو شک یا احتیاط نہ سکھائیں بچے کامل اعتبار کرتے ہیں اگر ماں باپ ساتھ ہوں تو جہاں کے کنارے پر بھی انہیں نیند آجاتی ہے۔ وہ اپنی زندگی ہمارے حوالہ کردیتے ہیں۔ انہیں ہم پر بھروسہ ہے والدین ہونا ان کے لئے پیغام وحی ہے۔ امیر کے لئے غریب سے بات کرنا کسر شان ہے۔ مگر امیر کا بچہ غریب کے بچہ سے برابر کھیلتا کر... اس سرزمین میں میں نے دیکھا کہ جب بچے ماؤں کی گود میں مسکراتے ہیں تو انکی مسکراہٹ پژمردہ غنچوں کے لئے ... ہوتی ہے یہاں یہ بھی نے دیکھا کہ بچوں کے دل مثل آئینہ صاف اور شفاف تھے۔ وہ غبار بغض حسد ... سے پاک تھے۔

... اس ولایت میں مجھے تمام عمر رہنا نصیب ہوتا۔

خورشید سلطانہ

تصوّر

تصور۔ اے تصور تو عجوبۂ روزگار ہے۔ تیری قدرت و طاقت عجیب اور تیرے کھیل تماشے عجیب و غریب ہیں۔ تو آن کی آن میں کایا پلٹ دیتا ہے۔ غائب کو حاضر، غیر موجود کو موجود کر دینا تیرا معمولی کرشمہ ہے۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں کوس کی چیزوں کو قریب تر کر دینا تیرا ادنیٰ سا کام ہے۔ تصور میرے مونس، میرے غمگسار تصور، تو جنت نظر ہے۔ تو فردوس گوش ہے، تیرے کرشمے دلکش اور تیری صورت گری نظر فریب ہے۔ میں اپنی بچھڑی ہوئی سہیلیوں کو تیرے اور صرف تیرے ذریعہ سے دیکھتی ہوں۔ اسوقت خیالی ٹیلیفون کا سلسلہ دلوں سے ملا ہوتا ہے۔ جو ہماری خریداری باتوں کا وسیلہ ہے۔ میں گھڑیوں تیری بدولت۔ ہاں اے میرے تصور تیری بدولت اپنا جی بہلاتی اور تیری جادو بال کو دعا دیتی ہوں تو مجھے میرے اُن پیارے عزیزوں ہی سے نہیں ملاتا جو مجھ سے منزلوں دور ہیں بلکہ اُن گذری ہوئی باتوں کی تصویر بھی پیش نظر کر دیتا ہے جو وقت کے ساتھ گذر چکی ہیں، میں انہیں دیکھتی ہوں اور اس طرح دیکھتی ہوں۔ کہ گذشتہ پر حال کا دھوکہ ہوتا ہے،

ہاں اے میرے تصور تو اچھا خاصہ ناصح شفیق ہے۔ میں تیرے ذریعہ سے اپنی اچھائی برائی جان لیتی ہوں، اپنی غلطیوں سے شرمسار اور خوشگواریوں سے خوش ہوتی ہوں۔ اور تیری بتائی ہوئی باتیں میری آیندہ زندگی کے لئے بہتر سبق ہیں۔ اے میرے تصور میں تیری دلچسپ موجودگی میں ایسی محو ہوتی ہو جاتی ہوں کہ کسی بات کا ہوش نہیں رہتا۔ اور اُنھاں کا یہ سلسلہ ناممنا ہی اسوقت تک ختم ہونے کو نہیں آتا جب تک میرا جیتا جاگتا کھاتا (بچہ) پیار سے میرے گلے میں باہیں ڈال کر مجھے ہوشیار نہیں کرتا،

ر ۔ م ۔ از کلکتہ

مشورہ

میاں عبد الصمد عرف صمد مشہور و معروف زمیندار ہیں۔ آپ نہایت شریف۔ سادہ مزاج اور صاف دل ہیں جنکو آپ سے حسد ہے وہ آپکو سادہ لوح کہتے ہیں۔ مگر یہ اُنکی زبردستی ہے۔ آپ بڑے دولتمند ہیں۔ غالباً بیس مربعوں کے مالک ہیں لیکن دیہات کی زندگی بہت پسند ہے۔ شہر میں بہت کم آتے ہیں۔ ایک دفعہ کسی کام کے ساتھ لاہور آنے کا اتفاق ہوا۔ آپ نے مسٹر جنکن بیرسٹر کا نام سنا ہوا تھا۔ اُن کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ بڑا سمجھدار اور سو روپے صرف مشورے کے لیتا ہے۔ اُن کو خیال آیا کہ اتفاق سے لاہور آئے ہیں لگے ہاتھ مشورہ لے چلیں۔ بیرسٹر صاحب کی ملاقات کی۔ اور کہا کہ مشورہ کے لئے آیا ہوں۔ یہ سو روپے کا نوٹ آپ کی فیس ہے [illegible] عنایت کیجئے۔ بیرسٹر صاحب نے کہا کہ کیا کسی پر دعویٰ کرنا ہے۔ میاں صاحب نے کہا نہیں جناب ہرگز نہیں۔ بیرسٹر نے پوچھا کیا کسی نے آپ پر دعویٰ کیا ہے۔ میاں صاحب چیں بر جبیں ہو کر بولے۔ کہ خدا نہ کرے میں تو مشورہ لینے آیا ہوں۔ بیرسٹر صاحب تاڑ گئے ایک کاغذ پر چند الفاظ لکھے۔ اور لفافہ میں بند کر کے لفافہ میاں صاحب کے حوالہ کیا۔

آپ خوش خوش رخصت ہوئے۔ جب شام کے قریب گھر آئے۔ تو آپ کے مکان کے باہر تیس چھکڑے بھوسے کے لدے کھڑے تھے۔ یہ بھوسہ انکے مربعوں سے آیا تھا۔ میاں صاحب نے چاہا۔ کہ انہیں فوراً کوٹھریوں میں رکھوا دیا جائے۔ مگر ان کی اہلیہ اور مختار نے کہا کہ ابھی کونسی جلدی ہے صبح رکھا جائیگا۔ مطلع صاف ہے۔ بارش کی کوئی علامت نہیں۔ تردد کس بات کا ہے۔ میاں صاحب نے سوچ سوچکر کہا۔ کہ میں نے سو روپیہ دیکر مشورہ لیا ہے۔ دیکھوں وہ کیا کہتا ہے۔ آپنے لفافہ سے کاغذ نکالکر دیکھا۔ اسپر لکھا ہوا تھا۔ کہ "آج کا کام کل پر مت چھوڑو"۔ میاں صاحب نے پھر کسی کی نہ سنی۔ رات کے گیارہ بجے تک تمام بھوسہ کئی آدمی لگا کر بند کرا دیا۔ رات کے بارہ بجے دفعتہً ابر آگھرا اور زور کی بارش ہوئی۔ کہ چاروں طرف پانی پانی ہو گیا۔ میاں صاحب نے شکر ادا کیا اور کہنے لگے اگر مشورہ نہ لیا ہوتا۔ تو کئی ہزار پر پانی پڑ گیا تھا۔ واقعی مشورہ چنگن بڑا دانا ہے +

زاہرہ سلطانہ

برسات کا ایک منظر

موسمِ گل ہے چمن ہیں اور بھری برسات ہے ‏ تختۂ سنبل کے نیچے اک اندھیری رات ہے
جلوہ گر ہر ایک ذرّہ سے خدا کی ذات ہے ‏ چشمِ دل محوِ تماشائے حُسنِ مصنوعات ہے
پھولوں کا ہر صفحہ کیا ہو وہی تجرید ہے ‏ غنچۂ سربستہ میں اک عالمِ توحید ہے
… لہریں لے رہا ہے نکہتِ گل بیقرار ‏ ہر طرف ہے جلوہ گر حدِ نظر تک لالہ زار
… دل میں بھرے ہیں نغمہائے آبشار ‏ تازہ پھولوں سے ہے مملو دامنِ [illegible] بہار
گل کھلا ہو جو وہ بلبل کا دلِ صد پارہ ہے ‏ الغرض دنیا تمام اک جنت نظارہ ہے
… فرحت فزا اور تیرا جھولا جھولنا ‏ یہ پپیہوں کی صدا اور تیرا جھولا جھولنا
… دل ربا اور تیرا جھولا جھولنا ‏ اُف یہ جنگل کی ہوا اور تیرا جھولا جھولنا
… جب تو نے لیا دل ہاتھ سے جانے لگا ‏ حسن کے دریا میں جذر و مدِ نظر آنے لگا
… کالے ہوئے دفترِ نگاہِ سحر مگیں ‏ دوش پر بکھری ہوئی مرغولہ زلفِ عنبریں
… خیز اندازہ ہے ہر اک ادائے دلنشیں ‏ کون ہے اے حسن کی دیوی ترا نقشِ آفریں
گود میں ناز و ادا کے کسنے پالا ہے تجھے ‏ حسن کے سانچے میں بتلا کس نے ڈھالا ہے تجھے
… رہی ہیں اے نگار مہ جبیں ‏ باندھے جوڑا غضب ڈھاتی ہے زلفِ عنبریں
… رگی پیدا ہوا میں یا نہیں ‏ خوف ہے مجھ کو سیہ آندھی نہ آجائے کہیں
… جو گیسو کا ہے گویا رہ ظلمات ہے ‏ خیر ہو دل کی الٰہی یہ اندھیری رات ہے
… طرب زیرِ درختِ سایہ دار ‏ وہ جوانی کی امنگیں رنگِ رُخ کا وہ نکھار

ہے سیاہ پتلی میں جادو انکھڑیوں میں ہے خمار — ابرو پیوستہ سے شکل ہلالی آشکار
ہے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی نور ذوق میں — خاص ادا سے ڈوریاں جھولے کی دست شوق میں
چپ ہے تو کرتی ہیں لیکن تری آنکھیں گفتگو — ہے تری چتوں سے پیدا میری شرح آرزو
دیدنی ہے پینگ لینے میں ترا جوش نمو — دوڑتا پھرتا ہے رگ رگ میں جوانی کا لہو
دست پر خود اپنے دلدادہ ہیں دھانی چوڑیاں — زہر کھلوانے پہ آمادہ ہیں دھانی چوڑیاں
تو جھولوں سے [illegible] تری بےچین ہے سیماب وار — تو ہے جھولے میں کہ سینہ میں ہے قلب بیقرار
پینگ لینے [illegible] ہوا دیتی ہے جب فصل بہار — حسن کے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں اڑتے ہیں شرار
میں تو سمجھا تھا فقط دل ہی مرا بیتاب ہے — حسن کی گرمی سے ہر موج ہوا بیتاب ہے
[illegible] سراپا ہے دلکش اک تصویر جذبات شباب — جلوہ ہے یا رخ میں گردش کر رہا ہے آفتاب
[illegible] ماتھے کا ٹیکا ہے وہ نقطہ انتخاب — حسن کے دفتر میں مل سکتا نہیں جسکا جواب

سامنے یہ منظر عشرت فزا دن رات ہو
تو ہو اور گلشن ہو اور معجز نما برسات ہو

[illegible]

تمہیں جگانا بھی نہیں آتا

دبے پاؤں میں تمہاری خلوتگاہ میں پہنچی۔ جاگنے کا وقت ہو چکا تھا۔ مگر تم سو رہے تھے۔ آہ جبھی آج معلوم ہوا کہ تم سوتے وقت کچھ اور ہو جاتے ہو۔ میں تم پر پروانہ وار قربان ہوتی رہی۔ تمہارے [illegible] گرد گھومتی رہی اور تم کو محبت بھری نظروں سے دیکھتی رہی۔ . . . .

. . . . . . میرے سوامی نہیں معلوم میری یہ پرستش قبول بھی ہوئی یا نہیں۔

آہ وہ تمہارا داہنی کروٹ لیٹنا۔ تکئے پر بازو۔ بازو پر سر عجیب بیخودی کے عالم میں رکھا ہوا تھا۔ کبھی دم صبح پر درے ہلکے ہلکے انفاس سے ہوا معطر ہو رہی تھی۔ تمہارا حسن بیدار تھا۔ اور میرا نصیب [illegible] پہروں سوچتی رہی کہ اس سوتے ہوئے جادو کو کیونکر جگاؤں۔ . . . .

آخر میں نے اپنی اشکبار آنکھیں تمہارے تلوؤں سے ملیں۔ تمہارے قدم چومے مگر تم فتنۂ خوابیدہ ہی [illegible] ڈرتے ڈرتے۔ دھڑکتے ہوئے دل سے میں تمہارے سرہانے گئی۔ کچھ سوچکر جھکی مگر [illegible] تمہاری چشم فتاں۔ تمہارے عارض رنگیں۔ تمہاری چاند جیسی پیشانی۔ تمہارے گیسوئے مشکیں۔ تمہا[illegible] کو دیکھ کر میں آپ میں نہ رہی۔ پریتم۔ یقین مانو میں بیخود ہو گئی . . . .

میں نے حالت شوق میں عالم بیخودی میں اگر تمہاری نیم وا آنکھوں کو چوم لیا - تو قابل معافی ہوں - میری بدقسمتی سے تمہاری آنکھ فوراً کھل گئی - متوالی ترچھی نظروں سے تم نے مجھے دیکھا - جی تو یہی چاہتا تھا کہ اس غلطی کو دہراؤں مگر میں جھجک کر پیچھے ہٹ گئی ...... تم انگڑائیاں لیتے ہوئے اُٹھے مگر برہم چیں بر جبیں -

تمہاری بیرخی دیکھ کر ضبط نہ ہوا - دل کڑا کر کے تمہارے قدموں پر گر پڑی اور عتاب کا سبب بڑی لجاجت سے دریافت کیا - آہ تم نے تو کچھ عجیب انداز سے کہا .... تمہیں جیکا ابھی نہیں آتا

اُف مجھے یہ بھی یاد ہے کہ میں نے بھی اسی حالت میں اپنی زبان سے قریب قریب وہی الفاظ دوسرا ... ہاں ہاں - اقبال جرم کر لیا - ہاں ہاں کہدیا ...... مجھے جیکا ابھی نہیں آتا - **یاسط ہوانی**

کلام منظر

خامشی میں مجھکو ملتا ہے مزا تقریر کا | قابل نظارہ ہے عالم تری تصویر کا
انقلاب آئے ہزاروں عالم ایجاد میں | کچھ اثر تم نے نہیں دیکھا آہ بے تاثیر کا
جسکو تو ناوک سمجھتا ہے وہ میری روح ہے | چارہ گر آساں نہیں دل سے نکلنا تیر کا
مرگئے فرقت میں نالے کرتے کرتے ہم مگر | کچھ اثر تم پر نہ دیکھا آہ کی تاثیر کا
عالم گور غریباں دیکھتے رہنا نظر | سب یہ منظر ہے تمہارے خواب کی تعبیر کا

منظر مہدی

جذبات اعظم کریوی

زندگی سے قصد روپوشی ہے مجھ دلگیر کا | چھپ رہو قاتل اگر دامن ملے شمشیر کا
پاؤں میں جس کو پہن کر فخر مجنوں نے کیا | تھا وہ اک اترا ہوا حلقہ مری زنجیر کا
ہوں تو مطلب پر کسی مطلب سے کچھ مطلب نہیں | نقطۂ شک مجھ کو سمجھو خامۂ تقدیر کا
دل میں کیوں رہ رہ کے ہوتی ہے کھٹک کیا بات ہے | کوئی ٹکڑہ تو نہیں اس میں ہمارے تیر کا
میری دلداری پہ مائل ہیں حسینانِ جہاں | بت ارادہ کر رہے ہیں کعبہ کی تعمیر کا
چاک کر ڈالا مرا خط اس ستم ایجاد نے | آج پورا ہوگیا اعظم لکھا تقدیر کا

اعظم ایڈیٹر طوفان

کلام عصری

ہوگیا دل پہ اختیار ترا | معتقد ہوں نگاہِ یار ترا
دیکھ یہ بے رخی نہیں اچھی | جان دیدیگا بیقرار ترا
تونے برباد کردیا دل کو | خانہ آباد ہجر یار ترا!

دل سے جب ہمکلام ہوتا ہوں ذکر آتا ہے بار بار ترا
مرگیا ہجر میں ترے عصری تھا وہی ایک جاں نثار ترا

علی عصری

زبانِ ثناکی

مائل گریہ ہوں اور خواہش فریاد بھی ہے
نگہِ یار کی تعلیم مگر یاد بھی ہے

عرش ہل جاتا ہے وہ چیز ہے مظلوم کی آہ
کسی بیکس کی سنی آپنے فریاد بھی ہے

اب نشیمن کی نہیں خیر، نہ جینے کی امید
شعلہ زن برق بھی ہے تاک میں صیاد بھی ہے

تمنے تصویر بنائی تھی کبھی شوق سے یہ
رنگ آمیزئے الفت کہو کچھ یاد بھی ہے ؟

تمسے شکوہ نہیں، قسمت کا گلہ ہے لیکن
یہ بتاؤ کوئی شے خاطر ناشاد بھی ہے

خواہش مرگ ہے، سرگرم فنا ہے ثناکی
تم سے کچھ کہتا بھی ہے طالب امداد بھی ہے

ثناکی

عورت

۱

آگ - ہوا - پانی - خاک پیدا ہوئے - ان میں اتحاد اور ربط کا رشتہ قائم ہوکر محبت کے کرشمے آشکارا ہوگئے - رنگارنگ کی صورتیں زینت افروز ہوگئیں - پھول پھل - سبزہ زار اپنے اپنے جوہر بکھیرنے لگے - سمندر اپنے اگنت اور انمول موتیوں کو گود میں لوریاں دینے میں مصروف ہوئے - برکھا رت کے سمے آکاس میں بدلیاں سورج کی کرنوں سے گوناگوں دلفریبیاں پاکر اندر کے دربار کو مات کرنے لگیں - باغوں میں پرندے کچھ ایسے چہچہائے کہ انکو زندہ ارغنوں بنادیا فطرت کی قلمکاریاں کمان کے دلاویز رنگوں میں ظاہر ہونے لگیں -

مگر ابھی..... ابھی فطرت کی فسوں کاری کا معراج بہت اونچا تھا - اس کا اضطراب دریا کی لہروں میں نمایاں تھا - اس کا پیچ و تاب ایک طرف عشق پیچہ میں اور دوسری طرف کوئل کی پرسوز اور پردرد کوکو میں نہاں اس کی بیقراری پروانہ کے رگ و ریشہ میں جاگزیں - اس کی بے چینی کا شمہ پارے کی قسمت -

اس شیون شعار لہر کی خواہش تھی کہ ساحل مراد سے ایسی بے تابانہ گلے ملوں کہ مجھ میں اور میری آرزو میں کچھ تمیز نہ ہوسکے - اگر یہ ممکن نہ ہو تو ہزارہا موتیوں میں بکھر کر اس کے قدموں پر نثار ہو جاؤں -

آخرش آرزو پوری ہوئی - مگر عید میں محرم آگیا - صبح کی دلکشائی اس کی جگر چاکی - شفق کی حنا دستی اس کی خونباری - ساون کی پھوہار اس کی اشکریزی - گلاب کے پھولوں پر اوس کے قطرے گویا اس کے دل کے پھپھولے تھے - اگنی پریت کی طرح دل میں ارمانوں کو ابال آیا - دل سے پرارتھنا کا لاوا فوارہ بن گیا - "اے خدا میرے سر کا تاج - میری آرزو کا معراج کس قدر بے پرنا - کس قدر پریم سے ناآشنا"

آواز آئی۔ اے حسن کی دیوی۔ اے پریم نگر کی متوالی۔ صبر جو کرتا رکرے ہو ہو۔

۲

فطرت کا منتہائے نظر۔ اس جنگ کا بم کمال یعنی آدم جس کی سرشت کے متعلق لسان الغیب کا یہ فرمان ؎

دوش دیدم کہ ملائک در میخانہ زدند گل آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند

ابھی کنول کا پھول تھا۔ جس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ کی برقی رو چھوئی تک نہ تھی۔ ابھی ابھی بے انت ساگر سے کنول کی طرح پھوٹا ہی تھا کہ فطرت کی آئینہ جیسی آنکھوں میں جو انتظار میں ابھر رہی تھیں اور حیا سے نیم وا ہو چکی تھیں۔ اس کی تصویر کھنچ گئی۔

مگر آہ۔ اس کی آنکھیں ابھی سفید تھیں۔ پہلوئے آرام جاں تھا۔ کچھ دیر غنچے کی طرح دلگیر رہا۔ شرمگیں نگاہوں کی طرح جھکا رہا۔ پھر خدا جانے دل میں کیا آیا۔ سر اٹھایا۔ اور پر آرزو دل کی طرح کسی کے جھروکے پر ٹکٹکی باندھ دی۔ گویا عجز و خلوص سے آنکھوں کے نور کا خواہشمند تھا۔ اور دعا میں مصروف۔ فطرت کی خوبصورتی کو سمندر کی لہروں اور ہوا کے جھونکوں کی طرح محسوس کرتا تھا۔ مگر دیکھ نہ سکتا تھا۔

آہ اس کی حالت اس فطرت نواز اندھے کی سی تھی جس کی آنکھیں عین نظارے میں کھو گئیں ہوں۔

آہ وہ اس جانکاہ تنہائی کا شکوہ سنج تھا جس کا عشر عشیر یوسف کو اندھیارے کنوئیں میں شاید نصیب ہوا ہو اس کے دل کی سادہ تختی ایک ایسے نقش کو ترس رہی تھی جس سے نہ صرف اسیر فطرت کی دلکش دلفریبیاں منقش ہوں بلکہ اس گنج مخفی کے بیش بہا اور لاثانی خزانوں کی روشنائی سے چمک پیدا ہو جائے جنکے لمعات کا یہ کائنات ادنیٰ سا کرشمہ ہے۔

جذبات کے عالم کا جوش اور کیفیت و جد کا یہ عالم کہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اور کہا ؎ الٰہی غنچۂ امید بکشا گلے از روضۂ جاوید بنما۔

بار خدایا وہ نور عطا کر جس سے فطرت کی صنعت کاریاں نظارہ فروز جاں ہوں۔ باقی جذبۂ محبت کا مولد و مقصود۔ دل کے زخموں کا پھاہا بنے۔

آواز آئی صبر کر۔ جو کرتا رکرے۔ سو ہو

۳

خلاق فطرت کی رحمت ذرہ ذرہ پر حاوی ہے۔ اسنے آفتاب و ماہتاب سے حسن۔ خوشنما پھولوں سے رنگ۔ لالہ اور گلاب کی پتیوں سے لطافت کونپل سے نزاکت۔ فطرت کی گوناگونی سے ناز و ادا۔ موم سے نرمی۔ چھوئی موئی سے حیا۔ ہیرے کی کنی سے عصمت۔ صبح سے دلکشائی۔ شفق سے ہمدردی۔ نسیم سحری سے خرام ناز۔ شمیم سے مشام نوازی۔ شب انجم سے سلیقہ۔ غرض ان قدرت کے راست روی لی اور تصویر کھینچ دی کہ مانی اور بہزاد نے ہاتھ چوم لئے۔ فطرت نے کہا کہ میری ساری خوبیاں جنپر مجھے ناز تھا اس میں جمع ہو گئی ہیں اور یہ ایک میں نہیں یہ نہیں۔ یہ میں ہوں۔

پھر اسنے اپنی رحمت اور رحم۔ اپنی استقبال بینی اور اپنے اخلاق۔ اپنے نور۔ اپنی وفاداری کی روح پھونکی مگر اس کی اس سے تسلی نہ ہوئی۔ ابھی اسمیں ایک چیز کی کمی تھی۔ یعنی آزادی انتخاب کی۔ اسلئے میاں مٹھو سے بے معنی باتیں۔ بندریا سے چڑچڑ۔ مینا سے حسد لیا۔ اس کی سرشت میں رنگ دیا اور آزادی دے دی کہ جو چاہے ان دو میں سے چن لے *

اس سندریا کا نام عورت رکھا۔ اور قطرۂ شبنم کی طرح نہایت دھیمے سے چپ چاپ کنول کے پھول میں رکھ دیا۔ اس نے سمجھا کہ آرزو پوری ہوئی۔ آنکھ کا تارا مل گیا۔ دنیا و مافیہا یعنی فطرت کے کل جوہر مجھ پر نمایاں ہو گئے۔ فطرت نے کہا میرے مدعا کا مدعا حاصل ہوا تو بے اعتنائی جاتی رہی۔ مجھ پر اتنا ہی شیدا ہوگا جتنا اپنے مدعا پر۔ فطرت۔ آدم اور عورت نے ملکر لاپا۔ جو کرتار کرے سو ہو۔

ذکاءاللہ۔ ایم اے۔

پنیر کا گولہ

ایک پنیر کا گولہ خلا میں معلق تھا۔ یہ بہت بڑا گولہ تھا۔ جس کا محیط کرۂ ارض کے قریب قریب تھا۔ یہ باہر سے سخت اور کرخت تھا مگر اندر سے نرم اور لذیذ۔ اس گولے میں چوہوں کی بستیاں آباد تھیں چوہے پنیر کھاتے تھے اور خوشیاں مناتے تھے۔ اس گولے میں سفید چوہے کالے چوہے۔ بھوسلے چوہے اور زرد چوہے موجود تھے بعض چوہے جفاکش اور بعض کاہل تھے۔ یہاں بڑے چوہے چھوٹے چوہے طاقتور چوہے اور کمزور چوہے تندرست اور بیمار چوہے غرض سینکڑوں قسم کے چوہے موجود تھے۔ ان سب میں سفید چوہے بڑے مستعد اور زور آور تھے۔ سفید چوہوں کو ملک گیری کی دھن سمائی وہ بھوسلے چوہوں پر حملہ آور ہوئے۔ اور کہا تم جاہل ہو۔ کم فہم ہو۔ ہم تم کو چند باتیں بتلانے آئے ہیں تم اس قابل نہیں ہو کہ حکمرانی کر سکو آج سے تم ہمارے غلام ہو گے۔ دانت دکھاؤ دیکھو تمہارے دانت تیز ہیں۔ تیز دانت خوفناک ہیں انکو نکلوا دینا چاہیئے۔ دیکھو ہم تمہاری بہتری کے لئے کہتے ہیں۔ بھوسلے چوہوں نے منت کی۔ التجا کی۔ سجدے کئے ہاتھ جوڑے۔ مگر سفید چوہوں نے ایک نہ مانی سب کے دانت نکلوا دیئے۔

اسیطرح سفید چوہوں نے سیاہ اور سرخ چوہوں کو مطیع کر کے غلام بنا لیا۔ اور ان کی جائداد ضبط کر لی جو بہت زمین ملک فتح کر کے شیر ہو گئے ان کی حرص دہ چند ہو گئی۔ پھر ان کا گذر ایسی بستی میں ہوا جہاں زرد چوہے رہتے تھے۔ زرد چوہوں نے نہ تو دم اٹھائی نہ اپنے دانت دکھائے۔ بلکہ صرف راستہ روک کر کھڑے ہو گئے اور کہا تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔ کہ ہمارے ملک میں قدم رکھو۔ سفید چوہے یہ گستاخی دیکھکر حیران ہوئے اور تند ہو کر بولے کیا تم نہیں جانتے ہم فاتح ہیں۔ ہم مالک ہیں۔ زرد چوہوں نے کہا خیر دیکھا جائیگا۔ اب تو سفید چوہوں کے غصہ کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ جھلا کر بولے تمہاری حقیقت ہی کیا ہے۔ ہم سب کو خاک سیاہ کر دینگے زرد چوہوں نے پھر مسکرا کر کہا دیکھا جائیگا۔ پھر کیا تھا دونوں میں خونریز لڑائی ہوئی۔ ایسی لڑائی کہ پنیر کے گولہ میں زلزلہ برپا ہو گیا۔ آخر سفید چوہوں کو شکست ہوئی۔ ان کے دانتوں سے خون بہنے لگا۔ اُن کے کان زخمی ہو گئے۔ یہاں تک کہ ان میں دم ہلانے کی ہمت نہ رہی۔ رات کو سفید چوہوں نے ایک دربار کیا۔ سوال یہ تھا۔ کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو۔ کہ یہ زرد چوہے جنہیں زرد بلا کہنا چاہیئے۔ ہماری تقلید کر کے ہم پر حملہ آور ہوں۔ ایک بڈھے چوہے نے سب کی سنکر کہا۔ ہوش کی دوا کرو۔ از ماست کہ بر ماست۔ اگر تم حد سے باہر نہ جاتے تو اس قدر ذلیل نہ ہوتے اب بھی کچھ نہیں گیا۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے اُسے غنیمت سمجھو اور چپکے سے گھر چلے چلو ؎

حرص است کہ جملہ زرداں را از آسائش بدارند و در رنج مدام اندازد۔

محمد حمزہ خان

پاک اور ناپاک محبّت

[illegible]

یوں تو ہندوستان کے لئے قحط وقف ہوچکا ہے۔ آجکل بھی آٹا روپے کا چار سیر بک رہا ہے۔ مگر جس زمانہ کا ہم ذکر کرتے ہیں۔ اسوقت قحط بلائے ارضی و سماوی کی طرح نازل ہوا۔ بقول سعدی شیرازی یار عشق بھول گئے۔ ملخ باغ تو مردم ملخ کھا گئے۔ آسمان سے ایک قطرہ پانی کا نہ برسا۔ کنوئیں خشک ہوگئے کھیتیاں برباد ہوگئیں۔ بستیاں ویران۔ اناج عنقا ہوگیا۔ مویشی جا بجا چارہ کی قلت سے مرنے لگے لوگ گھروں سے آوارہ ہوگئے اور گرسنگی اور ناداری سے مجبور ہوکر لوگوں نے بچے بیچ ڈالے۔

ایک دن اس قحط کے ایام میں شیخ داؤد ایرانی اپنی دوکان پہ بیٹھے ہوئے محتاجوں کو بھنے ہوئے چنے یا ہنڈیاں بانٹ رہے تھے۔ یہ مٹھی بھر چنے فقیروں کے لیے اس وقت خوانِ موسے سے سوا تھے۔ دوکان پر بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ مرد۔ عورتیں اور بچے جن کے رنگ زرد اور جسم سوکھ کر کانٹا ہو رہے تھے ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے ایک دوسرے پر گر رہے تھے۔ معصوم بچے بلبلا رہے تھے۔ عورتیں گالیاں دے رہی تھیں مرد کوس رہے تھے۔ جب چنے ختم ہوچکے اور سائل چلے گئے تو ایک سرخ مو کشمیری اور اس کی حسین بیوی نمودار ہوئے۔ عورت کی گود میں ایک خوبصورت بچہ گویا گلاب کا پھول تھا۔ بچے کی عمر دو سال کی ہوگی۔ بھوک سے بیتاب تھا۔ کشمیری نے سوال کیا۔ جواب ملا کہ تم دیر سے آئے۔ اب کل آنا۔ اس نے روکر کہا کہ تین دن کا فاقہ ہے۔ پیٹ پر پتھر بندھا ہے۔ بچہ جاں بلب ہے۔ اس پر رحم کرو خدا کے لئے اس بچہ کو خرید لو۔ ہم اسے خوشی سے بیچتے ہیں۔ شیخ داؤد لاولد تھے۔ کشمیری کو بٹھالیا۔ اور عورت اور اس کے بچے کو حرم سرا میں بھیجدیا۔

شیخصاحب کی اہلیہ بچہ کو دیکھتے ہی بیقرار ہوگئی۔ کلیجہ سے لگالیا۔ اور پیار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ماں باپ نے ناداری سے تنگ آکر اپنے لختِ جگر پارۂ دل کو سو روپے کے عوض بیچ ڈالا۔ وہ تین دن شیخصاحب کے ہاں مہمان رہے۔ روانگی کے وقت شیخصاحب نے اُن سے اقرار نامہ تحریر کرالیا۔ کہ آیندہ اُن کو اس بچے سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔ نہ کبھی اُسے دیکھنے آئیں گے۔ نہ خط لکھینگے بچہ ان کے لئے اور وہ بچے کے لئے مرگئے۔ جدائی کا نظارہ قابل دید تھا۔ ماں نے آخری مرتبہ بچے کو سینے سے لگایا۔ اپنی زبان میں بین کئے روتی دھوتی خاوند کے ساتھ چلی گئی۔ اور جب تک بچہ نظر آتا رہا۔ مڑ مڑ کر اُسے دیکھتی رہی۔

ناداری! ناداری!! تیرا برا ہو۔ تو ذلتوں کی کان ہے۔ تو رسوائی کا نشان ہے۔ تو چڑیل ہے۔ تو

ڈائن ہے۔ تو کبھی نکال لیتی ہے۔

۳

شیخ صاحب کی عمر جب انہوں نے سکندر کو خریدا۔ باون سال کی تھی۔ ان کی اہلیہ بھی پچاس کے لگ بھگ تھی۔ دونوں اولاد سے مایوس ہو چکے تھے۔ مگر مالی اعتبار سے تین لاکھ کی جائداد کے مالک تھے۔ یہ تمام انکی اپنی پیدا کردہ تھی۔ سکندر کو پاکر باغ باغ ہو گئے۔ اور فرزند حقیقی کی طرح چاہنے لگے۔ لوگ کہتے ہیں کہ فطرت اپنے بچوں سے نسبت ہوتی ہے۔ اور خون جوش مارتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ غلط ہے سراسر غلط ہے محبت اندھی ہے۔ یہ خون کی پرواہ نہیں کرتی۔ خونی رشتہ داروں سے بڑھ کر دشمن کوئی نہیں ہوتا۔ حقیقی بھائی دشمن مادر زاد ہیں ؎

بھائی ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی		نیچ ہی ڈالیں جو یوسف سا برادر ہوئے

ہم نے دیکھا ہے اور پڑھا ہے باپ بیٹوں کو عاق کر دیتے ہیں۔ اور بیٹے باپ کو قید کر دیتے ہیں۔ ان کی آنکھیں نکلوا دیتے ہیں۔ ہزاروں مرد جو بچوں کو اٹھائے پھرتے ہیں اور انہیں اپنی اولاد سمجھتے ہیں کیونکر گناہ جانتی ہیں کہ یہ اُن کے خاندانوں کے بچے نہیں ہیں۔ مگر محبت حقیقی بچوں سے بڑھ کر ہے۔ ہاں سچ ہے محبت اندھی ہے۔ یہ خون کی پرواہ نہیں کرتی۔ اس کی وجہ سے ہم غیروں کیلئے کنوئیں جھانکتے ہیں۔ اجنبیوں کے لئے تنکے چنتے ہیں۔

خدا کی شان سوکھا ہوا باغ ہرا ہو گیا۔ عین مایوسی میں امید ہلال عید کیطرح جلوہ افروز ہوئی۔ جب سکندر پانچ سال کا ہوا۔ تو شیخ داؤد کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی جو سکندر کی طرح چندے آفتاب اور چندے ماہتاب تھی۔ وجہ یہ تھی کہ سکندر کشمیری نسل سے تھا۔ تو شیخ داؤد ایرانی نژاد تھے۔ اس لڑکی کا نام سکندرہ رکھا گیا۔ سکندر کو سکندرہ سے اتنا پیار ہو گیا۔ کہ ضد کر کے اُسے گود میں لے لیتا تھا۔ اور دیر تک لئے بیٹھا رہتا تھا۔ کیا مجال جو اکتائے یا گھبرائے۔ سکندر پانچ سال کا تھا۔ سکندرہ چند مہینوں کی تھی ہر روز صبح وشام انا اور خدام انہیں بچوں کی خوشنما گاڑی میں بٹھا کر ہوا خوری کے لئے کمپنی باغ میں لیجایا کرتے تھے۔ وہاں ہر روز ایک برقعہ پوش فقیرنی جو کسیکو اپنا موںہہ نہ دکھاتی تھی اور نہ کسی سے بات کرتی تھی آتی اور انہیں پیار کرتی تھی۔ رعب اور وہم کی وجہ سے کسیکی مجال نہ تھی کہ اُسے روکے یا منع کرے

سکندر آٹھ سال کا اور سکندرہ تین سال کی تھی کہ ان کی منگنی ہو گئی۔ سکندر سولہ سال اور سکندرہ گیارہ سال کی تھی کہ ان کی شادی دھوم دھام سے رچائی گئی۔ شیخصاحب نے دریا دلی سے روپے کوڑیوں کی طرح صرف کئے۔ کئی دعوتیں دی گئیں۔ لکھنو۔ آگرہ۔ دہلی اور کلکتہ سے گانے والی رنڈیاں بلائی گئیں

نقال - بھانڈ ڈوم - ڈھاری ہزاروں لے گئے۔ کہتے ہیں کہ یہاں میرا آتش باز کو پانچ ہزار روپے نقد ملے۔ سکندر دولھا بنا ہوا گھوڑے پر سوار تھا - دولہن پالکی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جلوس کو برائے ضرورت شہرت و پابندئ رسم ورواج شہر کا چکر لگا کر پھر شیخ صاحب کے مکان پہ بہر تو امان میں واپس لانا تھا شیخ صاحب کا ایک دوست جس کے مکان سے برات آئی تھی اور جسے رسوم کے لئے مصنوعی سمدھی کہنا چاہیئے۔ دولہن کی پالکی پر سے مٹھیاں بھر بھر کر روپے نثار کر رہا تھا۔ تماشائی اور انعام کے تمنائی روپے لوٹنے کے لئے ایک دوسرے پر گر رہے تھے کہ راہی پر تعجب پوش فقیرنی آئی۔ پہلے پالکی کے گرد چلا گرداں ہوئی۔ پھر دولھا کی بلائیں لیکر چلی گئی روپوں کی طرف نہ دیکھا۔ نہ ان کی پرواہ کی

(۳)

ایک دلکشا مکان میں جسے آرائش او پیرائش کے لحاظ سے نگار خانہ چین کہنا چاہیئے - ایک سولہ سال کی پری چہرہ نازنین نافرمانی بلیش کا لباس پہنے ایک چھوٹے بچہ کو جس کی عمر ایک سال سے کچھ زیادہ تھی پیار کر رہی ہے۔ جاڑے کا موسم ہے۔ یہ نازنین از سر تا پا نافرمانی پوش ہے۔ کان کے آویزوں میں جو نگ چمک رہے ہیں۔ وہ بھی نافرمانی ہیں۔ انگلی میں جو انگشتری ہے اس میں بھی اسی رنگ کا نگینہ نصب ہے۔ سلیپر کی مخمل بھی نافرمانی ہے - لڑکا کچھ علیل ہے - شائد دانت نکال رہا ہے۔ دفعتہً ایک خوشرو خوش پوش جوان سیاہ لباس زیب تن کئے اور گلوبین کے سوراخ میں نافرمانی پھول ٹانکے سرو سہی کی طرح داخل ہوا نازنین سے بغلگیر ہوا اور بیٹھن پہا صوفے پر اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ حور شمائل سکندرہ اپنے پری جمال شوہر کو دیکھ کر جوش مسرت سے باغ باغ ہوگئی۔ اسکی آنکھوں میں محبت نور بنکر رقص کرنے لگی - اس کی آواز کو محبت نے ترنم سے مالا مال کر دیا۔ اور یہ مکان دونوں کے لئے فردوس حیات بنگیا۔ بچے نے مسکرا کر باپ کی طرف دیکھا۔ ہاتھ پھیلا دئے اور ماں کی گود سے باپ کے پاس چلا گیا۔ یہ وہ وقت تھا۔ کہ جس کے لئے ہر پارسا اور صاحب عصمت عورت بخت سکندرہ درعمر خضر نثار کر نیکو تیار ہے اسی وقت کے اشتیاق میں بلبل شوریدہ سر سرگرم فغان ہے - اسی وقت کے لئے شمع تمام رات جلتی ہے - یہ وہ وقت تھا کہ جسکے انتظار میں قیس مجنوں ہوگیا۔ اور فرہاد نے کوہکنی کے ساتھ جانکنی کا تماشا دکھایا۔ یہ وہ وقت تھا کہ جس کے لئے فرشتے بہشتی پھول آسمان سے برسا رہے تھے۔ اور شیاطین جسے تہ و بالا کرنے کو انقلاب کے مہیب اور برق نشاں ہتھیار سان پر لگا رہے تھے۔ وہ ہتھیار وہ اسلاح کہ جن کے لئے دنیائے فانی میں کوئی کارگر زرہ یا پناہ گاہ، سپر آہنگ ایجاد نہیں ہوئی۔

(۴)

شیخ داؤد جہاں دیدہ اور سرد و گرم چشیدہ انسان تھا۔ ساتھ ہی متقی اور پرہیزگار رویہ اس نے نہایت

محنت اور جانفشانی سے کمایا تھا اور بڑی احتیاط سے تجارتی زلزلوں سے بچایا تھا۔ اسے اپنی بیوی سے بڑی محبت تھی۔ جب سکندرہ نے چودھویں سال میں قدم رکھا تو شیخ داود کا چراغ مسرت یکایک گل ہو گیا۔ سکندرہ کی والدہ قلب کی حرکت بند ہونے سے بیٹھے بیٹھے جاں بحق تسلیم ہوئی۔ اسکے آخری الفاظ یہ تھے۔ آہ میں نے سکندرہ کی اولاد نہ دیکھی۔ یہ حسرت ساتھ لیجا رہی ہوں۔ یہ صدمہ جانکاہ شیخ صاحب کے لئے ناقابل برداشت ثابت ہوا۔ زندگی تلخ ہو گئی۔ صحت بگڑ گئی۔ بیوی کو آغوش لحد میں سوئے ابھی چھ مہینے نہ ہوئے تھے۔ کہ وہ بھی اسکے پہلو میں جا لیٹے۔ مرنے سے پہلے شیخ صاحب نے اپنی تمام جائداد بجز ایک باغ کے جو وقف تھا۔ اپنی بیٹی اور داماد کے حق میں ہبہ کر دی۔ جائداد مشترک رہی۔ مگر دونوں بحصہ مساوی مالک و قابض ہو گئے۔ شیخ صاحب کی حیات میں اور ان کے بعد دو سال تک سکندر اور سکندرہ کی محبت گل و بلبل شمع اور پروانہ کی محبت تھی۔ وہ دو قالب اور یک جان تھے۔ انکی محبت شبنم کی طراوت۔ پھولوں کی نکہت اور گوہر کی آب تھی۔ یہ محبت دونو کے دل میں یکساں نہی۔ فرق صرف یہ تھا۔ کہ سکندرہ کی محبت عورت کی محبت اور سکندر کی محبت مرد کی محبت تھی۔ جب سکندرہ نے اٹھارھویں اور سکندر نے تیئسویں سال میں قدم رکھا تو سکندرہ کی محبت بدستور چٹان۔ الماس۔ فولاد بنی رہی۔ اور سکندر کی محبت موم بنکر پگھلنے لگی۔ اس کا دل جو رحمت کے فرشتوں کا بقعۂ نور تھا۔ لہو و لعب کے شیاطین کا ظلمتکدہ بن گیا۔

۸

صحبت بد۔ آہ صحبت بد۔ دیوار عزت کے لئے دیمک۔ چہرۂ زیبائے حرمت کے لئے چیچک ہے۔ قلزم حیات میں یہ ایک خوفناک چٹان ہے جس سے لاکھوں نوجوانوں کے جہاز زندگی اسطرح ٹکرا کر پاش پاش ہوئے۔ کہ تختہ تک ساحل مراد پر نہ پہنچا۔ یہ وہ کالی آندھی ہے۔ جو نونہالوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکتی ہے۔ یہ بلاخیز سیلاب ہے۔ جس سے قصر تندرستی گر کر نابود ہو جاتا ہے۔ شہر کے مہذب بیکار مے پرست اور بادہ گسار جانتے تھے کہ سکندر ناتجربہ کار مگر زردار ہے۔ انہوں نے دام فریب پھیلایا۔ اپنی محفلوں میں بلایا۔ روپیہ کوڑیوں کی طرح لٹایا۔ اور خوب ہی سبز باغ دکھائے۔ تیئیس سال کی عمر میں سکندر نے شرماتے شرماتے اور ڈرتے ڈرتے دختر رز کو منہ لگایا۔ اور ایک ششماہی میں دولت شرابی بن گیا۔ اور شراب خانہ خراب نے بجلی بنکر جامۂ ہوش و خرد اور کشت شرم و حیا کو خاکستر کر دیا۔ پھر کیا تھا۔ امرتسر کی مشہور رقاصہ بیگم جان جسے لوگ مقراض ایمان کہا کرتے تھے۔ نوکر رکھ لی گئی۔ تنخواہ پانسو روپے ماہوار مقرر ہوئی۔ اور شب و روز رقص و سرود ہو حق کی محفلیں گرم ہونے لگیں۔ وہ سکندرہ جسکی جدائی ایک لمحہ کے لئے گوارا نہی۔ اب بری لگنے لگی۔ رات کو گھر جانا دوبھر ہو گیا۔ آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی۔ کہ بیگم جان کے لیے کوٹھی اسکے نام سے خریدی گئی اور حضرت دن رات وہاں رہنے لگے۔ عیاشی اور فضول خرچی کے آگے گنج شائگان اور قارون کے خزانہ کی کیا حقیقت ہے۔ مالک کو دکان سے بیخبر جانکر اور کاروبار سے غافل پاکر ملازمین اور گماشتوں کا طوطی بولنے لگا۔ خوب ہی ہاتھ رنگے۔ دوکان بند ہو گئی۔ کام بگڑ گیا۔ اور وہ وقت قریب آ گیا۔ کہ جائداد رہن کرکے

قدم برداشت کیا جائے۔

(۶)

سکندرہ خاموش ملول مغموم اور بابوس ایک چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس وقت اسکے جسم پر کوئی زیور نہ تھا۔ مگر ایک سادگی ہزاروں زیوروں سے بہتر تھی۔ وہ ویسی ہی حسین اور مہ جبین تھی۔ وہ غم۔ الم۔ یاس و حرماں کیوجہ سے دُبلی ہوگئی تھی آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے۔ مگر نقاہت نے اس کے نقش تیکھے اور اس کا جوبن رسیلا کردیا تھا۔ سکندرہ کا بچہ اسکے روبرو چارپائی پر لیٹا ہوا جان دے رہا تھا۔ گیارہ دن کے بخار سے صاحب فراش ہوچکا تھا۔ بخار محرقہ تھا اسلئے ڈاکٹر جواب دے چکے تھے جب کبھی آنکھ کھولتا تھا۔ تو ظہیر اور ناتواں آواز سے باپ کو یاد کرتا تھا۔ باپ ایک ہفتہ سے غائب تھا۔ کئی پیغام جا چکے تھے۔ وہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ٹال دیتا تھا۔ جب آخری پیغام گیا۔ کہ اگر ننھے کا منہ دیکھنا ہے تو آجاؤ۔ تو وہ جز بز ہوکر کوٹھی سے نکلا۔ سکندر فٹن پر سوار کوٹھی سے گھر کی طرف آرہا تھا۔ اور ننھے کی حالت لحظہ بلحظہ بگڑ رہی تھی۔ سکندرہ چمچہ سے دودھ اور کیوڑا اسکے منہ میں ڈال رہی تھی۔ دفعۃً بچے نے آنکھیں کھولیں۔ اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ زبان سے ابا کہا۔ اور ہمیشہ کیلئے خاموش ہوگیا۔ ادھر بچے نے جان دی اور ادھر سکندر داخل ہوا۔ اُسے دیکھ کر سکندرہ شکوہ شکایات بھول گئی۔ اُٹھ کر خاوند کیطرف دوڑی۔ اور کہنے لگی "ننھے کے ابا میرا ننھا ——" اتنا کہا اور روتے روتے بیہوش ہوگئی۔ سکندر بچے کو جس سے اُسے کسی زمانہ میں بڑا پیار تھا۔ بیجان دیکھکر بیقرار ہوگیا۔ اور اس سے لپٹ کر چیخ چیخ کر رو دیا۔

آہ! یہ پشیمانی عارضی تھی۔ یہ مثل اُس آفتاب کے تھی۔ جو بارش میں صرف چند لمحوں کے لئے بادل چیر کر اپنا چہرہ دکھاتا ہے۔ اور پھر فوراً غائب ہوجاتا ہے۔ سکندر اپنے نور بصر کو اس کی نانی کے پہلو میں دفن کرکے تنہا اور پاپیادہ بیگم جان کی کوٹھی کی طرف روانہ ہوا۔ ایک موڑ پر برقعہ پوش فقیرنی کھڑی تھی۔ اس وقت اُسنے خلاف عادت چہرے سے برقعہ اٹھا لیا۔ اور سکندر نے دیکھا۔ کہ وہ ایک خوبصورت ادھیڑ عورت ہے۔ فقیرنی کا چہرہ غصہ سے گلنار تھا۔ اس کی آنکھیں خون کبوتر کی طرح سرخ تھیں۔ وہ کڑک کر بولی۔ او کمبخت کمینے تو اپنی اصلیت کو بھول گیا۔ کمبل کبھی دوشالہ نہیں ہوسکتا۔ تو اس قابل تھا۔ کہ کشمیر کی گھاٹیوں میں مزدوری کرے۔ جس حور جنت کی بدولت تو امیر کبیر بنگیا۔ اسی کا دل چکنا چور کردیا۔ ڈر او ظالم خدا سے ڈر۔ خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ ننھے کی موت کچھ کم صدمہ نہیں ہے۔ یہ کہکر وہ رونے لگی۔ اور پھر زور زور سے اپنے شکم اور سینہ پر ہاتھ مارنے لگی۔ سکندر گھبرا گیا۔ اور یہ سمجھ کر فقیرنی کا دماغ چل گیا ہے۔ قدم برداشتہ وہاں سے روانہ ہوا۔

(۷)

سکندر اور بیگم جان ایک کمرے میں تنہا بیٹھے تھے۔ راز و نیاز کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اگرچہ حسن و جمال کے لحاظ سے بیگم جان کو سکندرہ سے کچھ نسبت نہ تھی۔ مگر قدرت نے ملاحت اسمیں کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی

آنکھیں آہو مثال تھیں۔ دیدۂ خنداں کا رقص دیکھنے والوں کو بیقرار کر دیتا تھا۔ وہ دختر گناہ تھی۔ اور ابلیس کی خواص۔ مگر سکندر کی محبت نے اس کے دل میں گھر کر لیا۔ وہ اب رقص و سرود سے بیزار تھی بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے سکندر کی طرف غور سے دیکھا اور کہا۔ سکندر پیارے تو مجھے پہلے کیوں نہ ملا۔ اگر تو مجھے اس وقت ملتا۔ جب میں نے گناہ کا پھل نہ چکھا تھا تو میں اس وقت کچھ اور ہوتی۔ اب میں ملعونہ ہوں خدا کی ماری ہوں۔ میری ماں ملعونہ ہے۔ اور میرا باپ ملعون تھا۔ میرا حسن ایک خوفناک جال ہے۔ آہ میں پردار سانپ ہوں۔ ہر ایک کو ڈستی ہوں۔ میں جس درخت کے نیچے بیٹھتی ہوں اس کو کاٹتی ہوں۔ سکندر مجھے یہاں سے لے چل۔ اور میرے ساتھ نکاح کر لے۔" یہ کہکر وہ سکندر کے گلے سے چمٹ گئی۔ اور روتے روتے بیتاب ہو گئی۔ سکندر نے اسے تسلی دی اور کہا میں تمہارا غلام ہوں۔ میرے نصیب اگر تم سے نکاح ہو جائے۔ اس کا خیال تھا۔ کہ وہ تنہا ہیں۔ مگر بیگم جان کی والدہ جس کا چاٹا ہوا درخت کبھی ہرا نہیں ہوا پس در کھڑی ہوئی ان کی گفتگو سن رہی تھی۔ یہ گفتگو سنکر وہ شل ہو گئی۔

سچ ہے عورتوں کی سرشت میں تعجب اور حیرت ہے۔ جب انکو تعجب ہوتا ہے۔ تو یہ بال کی کھال کھینچتی ہیں اور جب بال کی کھال کھینچتی ہیں تو شرارت پر اتر آتی ہیں اور جب شرارت پر اترتی ہیں تو شیطان ان سے پناہ مانگتا ہے۔

(۸)

گلباز خان افغان جھکی۔ تند خو آتش مزاج جوان تھا۔ یہ کابل کا شہزادہ کہلاتا تھا۔ ہمیں اس کی اصلیت معلوم نہیں۔ لیکن اس کے باپ کو سرکار سے وظیفہ ضرور ملتا تھا۔ باپ کے مرنے پر وظیفہ بند ہو گیا مگر ایک گراں بہا الماس جسے وہ ہمیشہ بازو پر باندھے پھرتا تھا۔ اس کے ہاتھ لگا جو کئی ہزار کو بکا۔ گلباز میں پانچوں شرعی عیب تھے۔ یہ بیگم جان کے پرستاروں میں تھا۔ جب اسے معلوم ہوا۔ کہ بیگم جان اب سکندر سے نکاح پڑھا لیگی۔ تو آتش رقابت سے جلکر کوئلہ ہو گیا۔ ایک تو کریلا خود کڑوا۔ دوسرا نیم چڑھا۔ بیگم جان کی والدہ نے اور بھی اشتعال دیا۔

ایک دن سکندر اور بیگم جان کوٹھی کے باغ میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ کہ درختوں کے پیچھے سے گلباز جوش رقابت سے عفریت بنا ہوا برآمد ہوا۔ اور سکندر کو دشنامہائے مغلظ دینے لگا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ سکندر نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ گلباز جامہ سے باہر ہو گیا اس نے پستول داغ دیا۔ بیگم جان دیکھ رہی تھی برق لامعہ کی طرح طرارہ بھر کر درمیان میں آ گئی۔ اور گولی اس کے صندوق سینہ کو چھیدتی ہوئی پار نکل گئی مقتولہ کی نے آہ کی اور سرد ہو گئی۔ گلباز نے دوسرا فائر کیا۔ اب کے درختوں کے جھنڈ سے ہی برقعہ پوش نجڑنی نکلکر

سینہ چھلنی ہوگیا۔ دوسری گولی اُسے لگی۔ زخم کاری آیا۔ وہ زمین پر گر کر چلائی۔ او احسان فراموش بھیڑیئے بھیڑیے کا بچہ بھیڑیا ہوتا ہے۔ میں تیری ماں ہوں۔ تیرے باپ نے تجھے بیچا۔ مجھے تیری جدائی گوارا نہ ہوئی میں طلاق لے کر تیرے پیچھے پیچھے پھرتی رہی۔ شیخصاحب کا حکم تھا۔ تجھے نہ مل سکی۔ فقیرنی کے بھیس میں تجھے دیکھا کرتی تھی۔ آج محبت کا ثبوت دیتی ہوں۔ لیکن یاد رکھ اگر سکندرہ کو ستائیگا۔ تو میں تجھے دودھ نہ بخشونگی۔ یہ کہکر اس نے آنکھیں بند کرلیں۔

گلباز یہ حال دیکھ کر حیران سا ہوگیا تھا۔ اب چونکا اور اسنے تیسرا فیر کیا۔ جس سے سکندر کی ران زخمی ہوگئی۔ وہ چاہتا تھا کہ چوتھا فیر کرے کہ لوگوں نے جو اس اثنا میں جمع ہوگئے تھے اُسے دست بدست گرفتار کرلیا۔

(۹)

سکندرہ کی حالت شوہر کے فراق اور فرزند کے داغ سے ناگفتہ بہ تھی وہ نہ زندوں میں تھی نہ مُردوں میں۔ اس کی بھوک سوکھ گئی تھی۔ خونِ دل پیتی اور لختِ دل کھاتی تھی۔ ہر وقت منہ ڈھانپ کر پلنگ پر پڑی رہتی اور رویا کرتی تھی۔ ایک دن روتے روتے اس کی آنکھ لگ گئی اور اس نے دیکھا کہ اس کے والدین اس کے سرہانے کھڑے ہیں۔ ننھا نانی کی گود میں ہے۔ اور کہہ رہا ہے۔ اماں اٹھو ابا آگئے ہیں اب نہیں جائینگے

سکندرہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی یہ وہ وقت تھا۔ کہ کہاروں نے سکندر کی ڈولی ڈیوڑھی میں رکھدی۔ شور مچ گیا کہ کسی نے شیخصاحب کو گولی ماردی۔ سکندرہ ننگے سر سیڑھیوں کی طرف دوڑی۔ اس وقت دنیا اس کی آنکھوں میں تاریک تھی اور وہ پردے سے باہر نکلی پڑی تھی۔ مہریوں اور ماماؤں نے بدقت روکا اور دالان میں لیجاکر دروازہ بند کردیا × × × × × × × × × .

× × × × × × × × × × × × ×

عمل جراحی کامیاب ہوا۔ سکندر بچ گیا گولی نکالی گئی۔ زخم اندمال ہونے لگا۔ زخم کی وجہ سے جو بخار تھا وہ اتر گیا۔ اب صرف ضعف باقی ہے۔ اس وقت سکندر چارپائی پر لیٹا ہوا ہے آنکھیں بند ہیں۔ سکندرہ ریشمی رومال سے مگس رانی کر رہی ہے۔ دفعتہً سکندر نے آنکھیں کھولیں۔ محبت بھری نگاہوں سے شکستہ دل بیوی کی طرف دیکھا کانپتے ہوئے ہاتھ جوڑے۔ معافی مانگی۔ اور آنکھوں سے اشارہ کیا کہ گلے سے لگ جاؤ۔

سکندرہ اور سکندر بغلگیر ہو رہے تھے۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور دروازے کے آئینوں میں سے آفتاب عالمتاب کی روشنی چھن چھن کر خانہائے زر سُرخ ان کے سر پر سے نثار کر رہی تھی۔

ا۔م۔ ط

دورنگئ زمانہ

عجب مختلف ہے زمانہ کی حالت نہ دیکھا کسی کے برابر کسی کو
بنایا ہے خود خالقِ داد گر نے معزز کسی کو محقر کسی کو
کسی کو چڑھایا ہے عرشِ بریں پر گرایا ہے فرشِ زمیں پر کسی کو
کسی کو سکونِ شبِ ماہ بخشا کیا صورتِ برقِ مضطر کسی کو
رُلایا کسیکو ہے شبنم کی صورت ہنسایا ہے مثلِ گُلِ تر کسی کو
کیا ہے کسی دِل کو نرمی میں پانی دیا ہے عوض دل کے پتھر کسی کو
کسی کو ملی کلفتِ شامِ ہجراں ملی راحتِ وصلِ دلبر کسی کو
کسی کا ہے خونِ جگر پر گذارہ دیا بادۂ نابِ احمر کسی کو
کسی کو جو آئینہ سیما بنایا دکھایا ہے حیران و ششدر کسی کو
کوئی اِس جہاں کو سمجھتا ہے دوزخ یہ دنیا ہے فردوس منظر کسی کو
یہ سب کچھ بجا ہے مگر آخر اک دن کرے گی اجل ایک سا ہر کسی کو

[illegible]

غزل

جذبِ دل نے نام زندہ کردیا بہزاد کا آنکھ کے پردے پہ فوٹو لےلیا صیاد کا
کیسی آزادی پھڑک کر جان دیدونگا ابھی پھول سا چہرہ جو کملایا مرے صیاد کا
سخت جانی پاؤں پڑتا ہوں نہ یہ اندھیر کر دل کہیں تھوڑا نہ ہوجائے مرے صیاد کا
کچھ نہ پوچھو آجکل کیسی گذرتی ہے مری ہر رگِ گل دام ہے میرے لیئے صیاد کا
دیکھ کر کنجِ قفس میں ہائے میری بیکسی گود میں مجھ کو اٹھا لیتا ہے ڈر صیاد کا
طایرِ رنگِ حنا میں تاب اُڑنے کی نہیں پنجۂ نازک بنا گویا قفس صیاد کا
راہِ الفت راہگیروں کے لئے وہ دام ہے جسمیں ہر نقشِ قدم حلقہ ہے اک صیاد کا
یاد آتا ہے مجھے جسدم پھڑک جاتا ہوں میں تاکنا اور جھانکنا چاروں طرف صیاد کا
باغِ عالم میں رہے جاری الٰہی چھیڑ چھاڑ ڈر رہے گلچیں کا اور کھٹکا رہے صیاد کا
کیا غضب کرتا ہے احمد نالۂ آہن گداز یہ نہ جانے بنکے آنسو اب قفس صیاد کا

[illegible]

جلد ۴ نمبر ۲ - بابت ماہ ربیع الاول سنہ ۱۳۴۰ھ مطابق نومبر سنہ ۱۹۲۱ء

شذرات

جناب اڈیٹر صاحب کی کہانی میں دیکھئے صفحہ سات سطر اول جھانکنے کو غلطی سے جھانکے لکھ دیا گیا ہے۔ حضرات ناظرین درستی فرمالیں ۔

عزیزہ محترمہ خورشید سلطانہ نے شباب اردو کے قلمی معاونوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بزم شباب کے معزز اور ممتاز رکن جناب نواب شمشیر بہادر اخگر کا سہواً ذکر نہیں کیا۔ نواب صاحب موصوف شباب کے محسن ہیں۔ آپ کو اس رسالہ سے اس قدر انس ہے کہ حالت علالت میں بھی اپنا گراں قدر کلام سلسلہ وار عنایت فرمایا کرتے ہیں۔ شباب کا ستارہ ان کا مرہون منت ہے ۔

حضرت جوش ملیح آبادی مصنف روح ادب کی تازہ تصانیف میں سے مقالات زریں کو ہم نے دیکھا۔ یہ کتاب اسم بامسمیٰ ہے کتاب کیا ہے ایک قلزم زخار کو کوزے میں بند کر دیا ہے اسے صوفیانہ خیالات کا مرقع کہنا چاہئے۔ ہر ایک صفحہ پر تجربات و حقائق معانی کی زندہ تصویریں متحرک نظر آتی ہیں ۔

جناب جوش تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ اس وقت آپ کا نام تمام ادبی حلقوں میں نہایت عزت سے لیا جاتا ہے آپ شاعرِ فطرت اور ایک جدید اور دلچسپ طرز تحریر کے موجد ہیں۔ آپ جب نظم لکھتے ہیں تو آپ کے جذبات اور محسوسات باطنی و دلکش اور دلگداز انداز میں جادہ افروز ہوتے ہیں۔ اور جب نثر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو محسوسات طبعی کا بادل امڈا چلا آتا ہے۔ اور کوئی صاحب کرامت سے سحرِ حلال کے ذریعہ سے طلسم بندی کر رہا ہے ۔

یہ کتاب حسن ظاہری و باطنی سے مالا مال ہے۔ اور گیارہ آنہ کو جناب رئیس احمد خان رئیس ملیح آباد لکھنؤ سے دستیاب ہو سکتی ہے ۔

اس دفعہ ہم اپنے علم دوست رفیق جناب رائے صاحب دیوان کھلندہ رام صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل ہائی کورٹ لاہور کی تصویر نہایت مسرت سے شائع کرتے ہیں۔ آپ شاعر ہیں وفا تخلص کرتے ہیں ود ناول انگریزی زبان میں لکھ چکے ہیں۔ آج کل جناب لاٹ صاحب بہادر سر ایڈورڈ میکلیگن بالقابہ کی بیوگرافی کے لئے مصالح جمع کر رہے ہیں۔ جو یقین ہے قابل دید ہوگی ۔

حضرت جوش ملیح آبادی کا کلام "لمعات جوش" فہرست مطالب کی کتابت کے بعد موصول ہوا۔ اس لئے ہم نے اس کے لئے صفحہ ۳۲ پر جگہ نکالی ہے۔ افسوس ہے کہ فہرست مطالب میں اس کا ذکر نہیں ہو سکا ۔

برکت علی ایم۔اے

جائنٹ اڈیٹر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شبابِ اُردو

نقلی ہیرا

کالج کے ایام میں نہال چند میرا ہم جماعت تھا۔ آپسمیں بڑی محبّت تھی۔ خدا جانے یہ دوستی کس طرح ہوگئی۔ میری اور نہال چند کی طبیعت میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ میں صُلح کل آزاد رو تھا تو نہال چند متعصب اور شُتر کینہ نہال چند کو مسلمانوں سے قدرتاً نفرت تھی۔ وہ ہمیشہ بلا وجہ اُنکے درپے آزار رہتا تھا۔ وہ مسلمان جو نہایت خلیق اور بامروّت تھے اُن سے بھی اُسے مخاصمت تھی۔ میں نے اُسے ہرچند سمجھایا مگر اُس کی عادت کو نہ بدل سکا۔ نیشِ عقرب کی سرشت کو بدلنا ناممکن ہی سچ ہے زہر کو شہد بنانا خیالِ خیام نہیں تو کیا ہے؟ قلبِ سیاہ کوئی لاکھ زمزمِ مروّت یا کوثرِ محبت سے دھوے۔ کبھی سفید نہیں ہوسکتا۔

میں تلاشِ روزگار میں ہندوستان سے باہر چلا گیا۔ دس سال تک چین جاپان افریقہ کے ریگستانوں میں خاک چھانتا پھرا۔ دس سال کے بعد فارغ البال ہوکر جب واپس ہؤا۔ تو مجھے نہال چند یاد آیا۔ اب تو گردشِ روزگار نے آسمان اور زمین کی کایا پلٹ دی ہے۔ ہمارے وقت میں وہ محبّت جو ہم سبق یا ہم مکتب طلبا میں ہونی چاہیئے۔ جزوِ بدن یا رگِ جاں بن جایا کرتی تھی۔ اس زمانہ میں لوگوں کے دل

مطلب پرستی کے زنگ سے اکثر صاف ہوا کرتے تھے۔ میری محبت بدستور تھی۔ وہ مقدس شعلہ میرے خانۂ دل میں برابر روشن تھا۔ میں اُسے ملنے گیا۔ نہال چند کی صورت دیکھ کر میں تصویرِ حیرت بن گیا اب اُسے پہچاننا آساں نہ تھا۔ اگرچہ وہ اب زیادہ موٹا تازہ تھا۔ مگر اب وہ مجھے بیقرار۔ بے تاب۔ خوف زدہ اور وہمی مزاج دکھائی دیا۔ اب اُس کا یہ حال تھا۔ کہ باتیں کرتا کرتا چونک پڑتا اور دفعتاً اٹھ کر دروازہ کھول کر ادھر ادھر جھانکنے لگتا تھا۔ گویا یہ تسلی کرنا چاہتا ہے کہ اس کی گفتگو کوئی شخص تو نہیں سن رہا۔ ہنگامِ گفتگو میں کئی بار اُس نے پسِ پشت نگاہ ڈالی جیسے کسی خفیہ دشمن سے ہراساں ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ اب اُسے نسیان کا عارضہ ہے۔ کسی کسی وقت تو اس کی آنکھیں پھرا سی جاتی تھیں اور گمان ہوتا تھا کہ اس کی شمع عقل گل ہونیکو ہے۔ اور وہ دیوانگی کی تاریک وادی میں آوارہ ہونیوالا ہے۔

نہال چند کی یہ حالت دیکھ کر میرے دل میں درد اُٹھا اور میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میرے اصرار پر اُس نے میری طرف دیکھا۔ اس وقت اُس کا چہرہ پتھر کا ٹکڑا بنا ہوا تھا۔ البتہ آنکھیں خانۂ چشم میں غیرمعمولی سرعت کے ساتھ متحرک تھیں اور گردش کر رہی تھیں۔ اُس نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا بکس نکالا جس پر سبز مخمل منڈھی ہوئی تھی۔ اس بکس کو کھولا۔ اُس میں ایک الماس گول اور مقدار میں بیضۂ کبوتر کے برابر آفتاب کی چمک کو خیرہ کر رہا تھا۔ جب اس پر روشنی پڑتی تھی۔ تو اس میں قوسِ قزح کے بوقلموں رنگ آب و تاب سے جلوہ نما ہوتے تھے۔ میں نے اُسے ہاتھ میں لیا۔ اور اس کے گرد ایک سنہری روشنی کا ہالہ بن گیا۔ اس ہیرے کو دیکھ کر میری آنکھیں چندھیا گئیں نہال چند نے مسکرا کر میری طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا کہ جن میں خوف۔ عیاری۔ فتحمندی اور رشک کی جھلک تھی۔ اور کہا کہ یہ الماس میں نے ایک مندر سے چوری کر کے لیا ہے۔ جہاں کسی زمانہ میں سومنات کا مندر تھا جسے غزنی کے قزاق پیشہ خدا پرستوں نے لوٹا اور غارت کیا۔ اس مقام کے قریب کھنڈرات میں ایک پرانا مندر ہے۔ جس کی عمارت سنگ موسےٰ کی ہے۔ اس مندر میں ایک بلند قامت بت سنگِ سیاہ سے تراشا ہوا رکھا ہے۔ تم نے تاریخ یونان پڑھی [illegible] کے آتش کدہ کے واحد العین جنات سے ملتا جلتا ہے۔ یہ الماس جو میں تمہیں [illegible] کی آنکھ ہے میں نے اُسے دیکھا۔ اور میرے دہانِ آز میں پانی بھر آیا۔ مندر [illegible] لچھمن اور اس کی پری جمال لڑکی رادھکا ہے۔ یہ دونوں مندر کے ساتھ ایک

ایک دن برہمن شہر گیا ہوا تھا۔ مندر خالی تھا اور میں گھات لگائے ہوئے تھا۔ میں نے موقعہ پا کر یہ الماس
بُت کی پیشانی سے اُڑا لیا اور ہوا ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس واردات کا حال جلد معلوم نہ ہوگا۔
کیونکہ بُت کے چہرہ پر نقاب پڑا رہتا ہے۔ اور صرف رشی یا مُنی اُس کا درشن کر سکتے ہیں۔ لیکن
میں کیا کہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اتنا کہا اور میرے دوست نے دانت نکالے۔ لیکن یہ ہنسی نہ تھی
اُسے زہرخند کہنا چاہیئے۔

میں نے کہا کہ نہال چند! مجھے معلوم ہے کہ تم متعصب ہو۔ قدرت نے بجائے دل تمہیں لوہے
کا تودا دے رکھا ہے۔ تم اُن لوگوں کو جنہوں نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا اور جو بیگناہ ہیں۔ ناحق
[illegible] پہنچانے کے منتظر رہتے ہو۔ لیکن مجھے یہ علوم نہ تھا کہ تم [illegible] بھی ہو اور ہوا و ہوس نے
تمہیں یہاں تک غلام بنا لیا ہے کہ مندر جیسے مقدس مقام [illegible] بھی تمہیں جرم کرتے ہوئے شرم
نہ آئی۔ خیر جو ہونا تھا سو ہوا۔ اب تم پریشان کیوں ہو اور تمہاری قلب ماہیت کیوں ہو گئی
[illegible] دوست نے اُٹھ کر پہلے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر دراز سے ایک خط نکالا اور مجھے دیا۔ میں نے
[illegible] کاغذ پر [illegible] سے تین بار چاند کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ اس کے آگے آنکھ کی صورت
[illegible] کے آگے ایک مہیب بُت کا نقشہ ہے۔ اس کے آگے ایک ہاتھ خنجر لئے ہوئے اور سب
[illegible] ایک انسانی کھوپری دانت نکالے موجود ہے۔ نہال چند نے کہا کہ کچھ سمجھے میں نے تامل
[illegible] کہا کہ ہاں سمجھا اس کے معنے یہ ہیں کہ اگر تین قمری مہینوں میں یہ الماس جو بُت کی آنکھ ہے
اصلی جگہ میں واپس نہ رکھ دیا گیا۔ تو خنجر سے تمہیں قتل کر دیا جائیگا۔ نہال چند اپنے گناہوں سے
[illegible] اور اس جواہر کو جہاں کا ہے وہیں پہنچا دو۔ مانا کہ یہ بیش بہا ہے۔ فرض کیا کہ یہ دریائے نور اور
[illegible] نور کا ہم پلہ ہے۔ مگر پھر بھی مال مسروقہ ہے۔ جب سے یہ تمہارے قبضہ میں آیا ہے۔ تمہاری زندگی
[illegible] ہے۔ تم آرام و راحت سے محروم ہو چکے ہو۔ اور اطمینانِ دل تمہارے لئے عنقا ہے۔
[illegible] چند نے پہلے تو دیوانہ وار طمع اور حرص کی آنکھوں سے الماس کی طرف دیکھا۔ پھر ٹھنڈی
[illegible] کہا اچھا جو تمہاری مرضی۔ لیکن ممکن ہے یہ خط خالی دھمکی ہو۔ مجھے یہ سُنکر آگ لگ
[illegible] ہو کر کہا کہ آخر کمینہ پن اور حرص کی کچھ انتہا بھی ہے۔

[illegible] ال فرصت تھی آخر قرار پایا کہ میں اور میرا دوست اکٹھے جائیں اور الماس کو اُس کی اصلی

جگہ پر رکھ آئیں۔ قصہ مختصر ہم دونوں گھر سے روانہ ہوئے۔ مجھے اس طویل سفر میں کچھ لطف نہ آیا۔ میرا دوست راہ میں نہایت خاموش اور اُداس تھا۔ میں نے چاہا کہ کسی طرح اس کی وحشت کم ہو مگر ممکن نہ ہوا آخر کار ہم منزل مقصود پر پہنچکر ایک سرائے میں فروکش ہوئے۔ رات ہمیں تکان کی وجہ سے نیند نہ آئی صبح میرے دوست نے کہا کہ میرا سر درد سے پھٹا جاتا ہے۔ آج ضعفِ دل کی بھی سخت شکایت ہے مجھ میں دو قدم چلنے کی بھی طاقت نہیں۔ تم نے مجھ پر احسان کیا ہے۔ تم کو میری زندگی بہت عزیز معلوم ہوتی ہے۔ ورنہ کون کسی کے لئے اس قدر زحمت اُٹھاتا ہے اور خصوصاً آجکل جبکہ جسے دیکھو بندۂ مطلب ہے۔ اب اتنی تکلیف اور گوارا کرو کہ خود ہی جاؤ اور یہ مکروہ ہیرا بت کی آنکھ میں رکھ آؤ۔

مجھے یہ گفتگو سنکر بہت تعجب ہوا مگر یہ سمجھ کر کہ میرا دوست نہ صرف کمینہ ہے بلکہ بزدل بھی۔ طوعاً و کرہاً تنہا جانے پر آمادہ ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ درختوں کے جھنڈ میں سنگِ سیاہ کا ایک وحشت خیز مندر ہے اور اس مندر میں ایک مہیب اور دہشت انگیز یک چشم بت ہے۔ اس وقت بُت کے چہرہ پر نقاب نہ تھا۔ اس کی پیشانی میں صرف ایک آنکھ تھی اور چونکہ اس میں سے الماس نکالا ہوا تھا وہ آنکھ پھوٹی ہوئی آنکھ کی طرح بھیانک اور ڈراونی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے جیب سے بکس نکالا۔ جو نہال چند نے چلتے ہوئے مجھے دیا تھا۔ اب مندر میں تاریکی تھی۔ میں نے دیا سلائی جلائی اور ہیرا بُت کی آنکھ میں بہ آسانی رکھدیا۔ لیکن اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا کہ الماس میں وہ درخشانی نہ تھی۔ جو پہلی نمائش میں میں نے دیکھی تھی۔ دفعتہً کسی سرخ برقی روشنی سی میرے عقب سے آئی۔ بت کا چہرہ روشن ہو گیا۔ اور میرے کان میں آواز آئی کہ او دغاباز۔ چور۔ کیا بُت کا مال سرقہ کرنا کافی نہ تھا۔ کہ آج تو اُسے دھوکا دینے آیا ہے میں کچھ بت کی آواز سن رہا ہوں۔ وہ صاف کہہ رہا ہے کہ میں ویسا ہی اندھا ہوں۔ جیسا کہ پہلے تھا۔ یہ آنکھ میری وہ آنکھ نہیں ہے جس سے میں کئی صدیوں سے لوگوں کے دلوں اور اُن کی رُوحوں کو دیکھتا ہوں اور اُن کا حال معلوم کرتا ہوں۔

میں نے اتنا ہی سُنا تھا کہ کسی نے میرے منہ پر ایک رومال جو کسی خوشبو سے تر تھا ڈالدیا۔ میرا سر معاً چکرانے لگا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ مندر رحام یا گرد کی طرح گردش میں ہے۔ مندر کا فرش ایسے جہاز کی طرح جو طوفان میں گرفتار ہو تھپیڑے کھا رہا ہے۔ بت کا سنگھاسن غول بیابانی کی طرح مصروفِ رقص ہے۔ اور میرے ہوش و حواس رخصت ہو رہے ہیں۔ پھر میں زمین پر گر پڑا۔ اور بیہوش ہو گیا۔

جب مجھے ہوش آیا۔ تو میرے کان میں ایک نازک آواز آئی جو کہہ رہی تھی۔ ابا یہ وہ چور نہیں ہے۔ میں اُسے خوب پہچانتی ہوں۔ وہ سانولا تھا یہ گورا ہے۔ اُس کے منہ پر سیتلا کے داغ تھے۔ یہ گلرو ہے۔ یہ سنکر

میں نے آنکھیں کھول دیں اور اٹھ بیٹھا۔ لچھمن پوجاری اور اس کی بیٹی رادھکا میرے سرہانے کھڑے تھے۔ میں آپ سے کیا کہوں یہ نازنین اِندر کے اکھاڑے کی پری تھی۔ میں نے اسے دیکھا۔ اور قریب تھا کہ پھر بیہوش ہو جاؤں۔ رادھکا کے ہاتھ میں گلاب پاش تھا۔ اس نے مجھ پر گلاب چھڑکا اور میری طبیعت سنبھل گئی۔ لچھمن نے میری طرف غور سے دیکھا اور کہا۔ کہ مجھے اپنے علم سے معلوم ہو گیا کہ تیرا کوئی قصور نہیں ہے۔ تیرے دغاباز دوست نے اصلی جواہر تجھے نہیں دیا۔ طمع نے اس کی آنکھیں بند کر دی ہیں اور حرص نے اُسے دیوانہ بنا دیا ہے۔ یہ جواہر جو تو لایا ہے نقلی ہے اور مصری کا بنا ہوا ہے۔ تیرا دوست نہ صرف چور اور دغاباز ہے۔ بلکہ مجہول بھی ہے اور دیوتا بزدل سے ہمیشہ نفرت کرتے ہیں۔ میں تجھے بتاتا ہوں اُس کی قسمت پر مہر لگ چکی ہے۔ قسمت کا لکھا کوئی بدل نہیں سکتا۔ تین مہینوں کے اندر وہ قتل کیا جائیگا۔ اور اصلی ہیرا اس مندر میں آ جائیگا۔ تیرا خیال غلط ہے۔ وہ کبھی نہیں پائیگا۔ وہ کبھی اپنی خوشی سے ہیرا واپس نہیں دیگا۔ جا۔ میں افسوس کرتا ہوں کہ تجھے غلطی سے بیہوش کیا۔

میں نہیں جانتا کہ وہ خواب تھا یا عالمِ بیداری۔ ایک کل کی طرح جو اشارہ سے چلتی ہے میں اُٹھا اور چلا رادھکا اسی جگہ پر کھڑی تھی۔ اس کی سیاہ موٹی موٹی آنکھوں سے جادو چھن کر مجھے مسحور کر رہا تھا۔ جب میں مندر سے نکلا۔ تو مجھے معلوم ہوا کہ پہلو سے میرا دل رخصت ہو چکا ہے۔

میں سرائے میں آیا۔ مگر سرائے میں نہال چند نہ تھا۔ تمام شہر چھان مارا۔ مگر اس کا نشان نہ پایا۔ اُس کی اس حرکت سے مجھے سخت رنج ہوا۔ اُس کی خاطر میں نے سفر کی تکلیف اُٹھائی۔ اپنا وقت ضائع کیا۔ اپنی جان کو خطرے میں ڈالا اور اُس نے میری خدمت اور محنت کا یہ صلہ دیا کہ مجھے اندھیرے کنوئیں میں دھکیل کر آپ رفوچکر ہو گیا۔ اس کو یقین تھا کہ اس مندر سے میرا زندہ آنا ناممکن ہے۔ آہ دنیا میں دوستی کا بھروسہ کس پر کیا جائے۔ دوستی دوستی۔ تو کہاں ہے؟ کیا تو واقعی کوئی شے ہے۔ یا ہُما کی طرح فرضی خیالی [illegible] ہے۔ اگر ہے تو پردہ دنیا پر کیوں نہیں ملتی؟

میں مایوس اور محزون واپس ہوا۔ جب میں گھر آیا تو حیران تھا۔ پریشان تھا۔ بیخوابی۔ بیتابی۔ قلق اور اضطراب گلے کا ہار تھے۔ میرا جسم گھر میں تھا۔ لیکن روح ایک چشم بُت کے مندر کے طواف میں مشغول تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میرا خیال خام ہے۔ میری زندگی اب وہ بے آب و علف بیاباں ہے جس میں امید کے پھول ابر نیساں کی مدد سے بھی شگفتہ نہیں ہو سکتے

تین مہینے گذر گئے یکایک مجھے خبر لگی کہ نہال چند کو کسی دشمن نے اُس کے گھر میں نہایت بیرحمی سے

قتل کر دیا ہے لیکن قتل کا سبب معلوم نہیں ہوا - لوگ متحیر ہیں - کہ مال و اسباب کا مطلق نقصان نہ ہوا تھی کہ ہاتھ کی انگوٹھی اور جیب کی گھڑی بھی بجنسہ موجود پائی گئیں صرف ایک سبز مخمل کا بکس جسے وہ رات دن جیب میں رکھا کرتا تھا - غائب تھا -

ایڈیٹر

مُرجھایا ہُوا پھول

میں نے دیکھا ایک دن اک پھول مرجھایا ہوا — تھا غبارِ راہ جس پر جا بجا چھایا ہوا
خشک ہو کر پنکھڑی ہر اک جدا ہونے کو تھی — یعنی ہستی اس کی اب صرف ہوا ہونے کو تھی
کہہ رہا تھا گویا ہر اک سے کہ ملتے جائیے — خاک ہو جاؤں ذرا مجھ کو کچلتے جائیے
اشک بھر لایا میں اس کی ایسی حالت دیکھ کر — جھک کے میں نے رکھ لیا اس کو اٹھا کر ہاتھ پر
پھر کہا میں نے یہ اس سے اے وجودِ مضمحل — میں بھی ہوں تیری طرح اک خستہ تن افسردہ دل
کچھ بیان کر مجھ سے اپنی داستانِ رنج و غم — راز کیا جب دو دل بیمار ہوں یکجا بہم
اس نے اک بے چین کروٹ لے کے مجھ سے یہ کہا — کیا سناؤں تم کو اپنا دکھ بھرا میں ماجرا
بات یہ کل کی کہ تھا میں اک وجودِ شادماں — تھا نہ واقف چیز کیا ہیں حسن کی بیدادیاں
اک نہالِ تر گلشن میں مرا کاشانہ تھا — میں تھا محوِ خواب اور گلبن مرا گہوارہ تھا
جنبشِ بادِ صبا تھی نرم و نازک لوریاں — نغمۂ بلبل سر بستر مرا افسانہ خواں
پتیاں ہمدرد میری جن کو تھا میرا پیار — وجہِ راحت تھی کنارِ دایۂ نسیم
صبح کو میں نے جمائی لے کے آنکھیں کھول دیں — منہ دھلانے کو مرا بس آگئی شبنم دو
کیا ہی منظر تھا پیارا دلستان و دلفریب — تھے جوانانِ بہاری کیسے کیسے جا بجا
فرش سبزہ مخملیں لالے کے اس میں سرخ پھول — ہائے وہ نہریں مصفا - آنکھ میں دشمن کے دھول
مست ہو ہو کر درختوں کا وہ پیہم جھومنا — وہ شعاعِ مہر کا منہ آ کے چومنا

تھا غرض اک ملک جس میں روشنی و رنگ و بو
حکمران تھے تین یہ دستور تھا ان کا نمو

اس دیارِ پر فضا کا میں بھی اک باشندہ تھا — لوگ کہتے ہیں کہ دلکش [illegible]
گو میں کم سن تھا ابھی لیکن یہ تھا سب کا خیال — ہو گا اک قہرِ جہاں [illegible]
میں بھی غش تھا کیسا اپنی ہستی مسرور پر — اپنے ارمانوں پہ اپنے [illegible]

ناگہاں لیکن کی مجھ پر پڑ گئی ظالم نظر — کر دیا مجھکو جدا ہمراہیوں سے توڑ کر
ایک سوزن سے پرو دیا اس نے مجھ کو تار میں — ٹوکری میں رکھ کے پھر وہ لے گیا بازار میں
پھر وہاں سے بھی تن مجروح میرا لے چلے — حسن انسان کے یہ ہیں، یہ اللہ کے لینے والے
تھا مرا اک حسن دوشیزہ کے سینے پر قیام — کیسا رنگیں کیسا نکہت بیز کیسا شاد کام
لگ گئی ایسی جو صحبت پھر نہ یاد آیا چمن — مٹ گئے یکلخت دل سے سب تمنائے وطن
لے گیا سیمیں بدن تھا مست جو نے کر دیا — یہ وہ نکہت جو کہ اپنی بو سے مجھ کو بھر دیا
بڑھ گئی وہ رنگی حسن اور ہی بن کھل گیا — رنگ دو ہو کر پسینے میں اس کے مل گیا
صبح تک گو حسن کی حدت سے پھٹکتا ہی رہا — رات بھر اس شوخ کے سینے سے لپٹا ہی رہا
مٹ گیا جب روپ پر تازگی جاتی رہی — کام جوش حسن کے جب میری ہستی آ چکی
کر کے سینے سے جدا یوں مجکو پھینکا راہ میں — کیسی نفرت ہو گئی بس ایک شب کی چاہ میں
رودانی ہے شعار حسن کب تھی یہ خبر — ورنہ میں پہلے ہی کرتا عشق کرنے سے حذر
رنج اس کا کچھ نہیں گر مٹ گیا خاک ہو گیا — میں تو خوش ہوں زندگی کا قصہ سب پاک ہو گیا
گلہ ہے مجھ کو لیکن حسن کے دربار میں — دل نوازی کچھ نہیں ہے آپ کی سرکار میں
بس یہ کہنا ہی تھا اتنا اور کرتے انتظار — خاک کو ہو جانے دیتے اپنے قدموں پر نثار

اخگر (راج گڈھ)

طوفانِ مرگ

...وارڈ کے قحط زدہ لوگ چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بنائے پڑے ہیں۔ دن بھر مرد ...یاں کرتے ہیں۔ بھیک مانگتے ہیں۔ عورتیں بھی شہر کے گھروں میں محنت مزدوری کر کے ...پھر انہیں جھونپڑیوں میں واپس آ جاتی ہیں۔

...تی ہیں۔ اس سے اپنا اور اپنے چھوٹے بچوں کا پیٹ پالتے ہیں۔ غور کیا جائے۔ تو نہ ...خطر ہیں۔ نہ ان کی غذا اچھی ہے۔ نہ اُن کا کوئی لباس ہے۔ نہ سردی سے بچ سکتے ...اُن کے لیے کوئی طبی امداد بہم پہنچ سکتی ہے۔

... تناسل ... و توالد کس قدر وسیع ہے۔ سامنے ایک عورت اپنے چھوٹے ... ہے۔ پاس ایک چھوٹی سی لڑکی جھولا جھول رہی ہے۔ اُس سے ذرا بڑا لڑکا

جھونپڑی کے نیچے بچوں کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ اس لڑکے سے بڑی ایک لڑکی دادی کے ساتھ چکی پیسوا رہی ہے۔ اس لڑکی سے بڑا لڑکا باپ اور دوسرے دو بھائیوں کے ساتھ شہر میں بھیک مانگنے کو گیا ہے۔ ایک بڑی لڑکی بیاہی گئی ہے۔ دو ایک مر بھی گئے ہیں۔ حساب تو کرو۔ تقریباً ایک درجن بچے اسی ایک عورت کے پیٹ سے پیدا ہو چکے ہیں اور ابھی کیا عمر ہے دونوں میاں بیوی جوان ہیں

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

شہر کی زندگی دیکھو۔ کس قدر نفاست۔ آسائش اور سامان تعیش سے بھری ہوئی ہے۔ ہوادار مکان۔ ہوا خوری کی سواریاں۔ رہنے کے بنگلے۔ کھانے کے کمرے۔ باورچی خانے۔ کھیلنے کے میدان۔ لباس کی نفاست۔ مکان کا فرنیچر دیکھو۔ تو ایک مکان کے فرنیچر کی قیمت سے دو سو قحط زدہ مارواڑی غریب مہینہ بھر تک اپنا پیٹ پال لیں۔ حالت یہ ہے کہ صبح و شام ڈاکٹر مزاج پرسی کو آتا ہے۔ چھوٹی سی دوائی کی شیشی بھی ضرور جیب میں ہوتی ہے۔ آج درد سر ہے۔ کل سوء ہضمی۔ رات دودھ میں الائچی اچھی نہ تھی۔ تو افرا کی شکایت ہے۔ صبح چاء میں میٹھا تیز تھا۔ ہوا کی نالی میں خراش ہے۔ پرسوں چارپائی بچھنے میں ذرا دیر ہوئی۔ تو نزلہ کی تحریک ہوگئی۔ دہلی کے یونانی دواخانہ سے خمیرہ کا جو پارسل آیا ہے اس کے استعمال نے بعض عوارض میں تو فائدہ کیا۔ مگر جگر کی حرارت کو اس نے بھی کوئی فائدہ نہ پہنچایا ڈاکٹر صاحب کی دوائی خشک گرم ہوتی ہے۔ طبیب صاحب کا معالجہ شروع کیا جائیگا۔

اس نزاکت کو دیکھئے اور پھر یہ بھی ملاحظہ ہو۔ کہ میاں کو دس سال سے زیادہ عرصہ گزرا۔ شادی ہو چکی ہے۔ گھر میں اولاد نہیں ہوتی۔ مقویات کی تلاش ہے۔ پیر صاحب سے اولاد کے لئے تعویذ گنڈے لیتے ہوئے عرصہ گزرا۔ گو اس کی تاثیر سے کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوا۔ مگر خوش اعتقادی کا بھلا ہو۔ اب بھی حضرت کے لئے دو سو روپے کا سامان پیش کرنے کے لئے تیار کرایا گیا ہے۔ ان کی خدمت میں عرس کے موقع پر پیش کریں گے۔ اور تعویذ لکھوایا جائیگا۔ خیال کیا جاتا ہے۔ کہ اب کے جو تعویذ حضرت عطا کرینگے تیر بہدف ہوگا۔ ضرور بارگاہ الٰہی سے بیٹا دلوا دینگے۔

شہری اور دیہاتی زندگی کا مقابلہ نہیں کیا جا رہا۔ بات یہ ہے۔ کہ بالاوسط ان لوگوں میں جن کو غذائی موسمی اور ہوائی ضروریات کے سامان بھی میسر نہیں ہیں۔ اولاد کی کثرت ہے۔ ناز و نعم میں پرورش پانیوالوں میں بھی اولاد ہو رہی ہے۔ مگر اس کی مقدار محدود ہے۔

اس تناسل کا اثر دنیا کے گزشتہ مردم شماریوں کے مقابلہ سے معلوم ہو سکتا ہے۔ صرف یہی نہیں ہے۔ بلکہ پیدائش اموات کے تناسب کو اگر ملحوظ رکھا جائے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ دنیا میں انسانی

آبادی سنہ ۱۹۱۱ء تک نہایت سرعت اور کثرت کے ساتھ بڑھتی اور ترقی کرتی رہی ہے۔

پنجاب کے لوگوں کو تو اپنے ملک میں رہنے کے لئے بھی دشواری محسوس ہونے لگی ہے اور آپ پڑھ چکے ہونگے کہ پنجاب کے زراعت کار لوگ اپنے اصلی مساکن کو چھوڑکر نو آبادیوں اور نئی نئی دور و دراز نہروں پر نکل بسے ہیں۔ تمام دنیا کی یہی حالت ہے۔ آج سے بیس سال پیشتر جہاں سنسان جنگل اور دشوار گذار صحرا تھے۔ اب وہاں چمن ہیں۔ آبادیاں ہیں۔ باغ ہیں۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

۲

اس تصویر کا دوسرا رُخ بھی ملاحظہ ہو۔

پاؤنیر میں ایک تار چھپا ہے۔ کہ سمندر میں فلاں مقام پر ایک مسافروں کا بھرا ہوا جہاز طوفان کے صدمہ سے غرق ہوگیا۔

ریلوے تصادم سے جسقدر نقصانِ جان ہو رہا ہے۔ اُس کا اندازہ مشکل ہے۔ دریاؤں میں چلتی ہوئی کشتیاں بھنور میں آکر سامان اور انسان کی جماعتوں کو بحرِ حیات سے پار اُتار رہی ہیں۔ دنیا کی متواتر جنگوں کو نظر انداز کرتے ہوئے تنہا عظیم ترین جنگ میں جو انسانی جانوں کا اتلاف ہوا ہے۔ وہ کسی شمار میں نہیں آسکتا۔

انفلوئنزا ہیضہ۔ طاعون نے جو انسانی آبادیوں کا صفایا کیا ہے۔ اس کا اندازہ صرف وہی لوگ کرسکتے ہیں۔ جنہوں نے اس سیلاب میں کسی نہ کسی طرح شامل ہوکر اس کا نظارہ کیا ہے۔

اس طوفانِ مرگ سے قطع نظر کرکے اتفاقیہ حادثات پر اگر نظر ڈالی جائے۔ تو انسان حیرت کے دریا میں غرق ہوجاتا ہے۔

شہر میں ایک ساہوکار کا محل تیار ہو رہا ہے۔ ہندوستان کا ایک کاریگر دو روپے روز پر نوکر ہے۔ اور وہ خانہ کی منڈیر پر کام کر رہا ہے۔ کہ اتفاقاً اس کا پاؤں پھسلا نیچے پکا فرش تھا۔ گرا اور دماغ پھٹ گیا۔

ایک فقیر نابینا بازار میں بھیک مانگتا ہوا لاٹھی کے سہارے حسبِ معمول گزر رہا ہے۔ کہ بازار میں سے ایک ٹمٹم والے کی ٹمٹم سے دھکا لگا۔ گر گیا۔ پہیہ اوپر سے گزر گیا۔ سینہ کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں اور شفاخانہ تک لیجاتے ہوئے دم نکل گیا۔

باغبان ایک اونچی کھجور پر پھل چن رہا ہے۔ معمولی طور پر اُدھر سے اِدھر کھسکا۔ کہ پاؤں اکھڑ گیا۔ دھڑام سے نیچے گر پڑا ہڈی ٹوٹ گئی۔ علاج ہوا۔ مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ آخر زندگی اسی اتفاقیہ حادثہ کی نذر کر گیا۔

ایک فیشن ایبل جنٹلمین اپنے سونے کے کمرے میں رات کو گیا۔ سگار پی رہا تھا۔ کہ اتفاقاً چنگاری رضائی پر جا پڑی مست خواب اس کو نہ دیکھ سکا۔ اسوقت آنکھ کھلی کہ کمرہ دھواں اور آگ سے بھرا ہوا تھا۔ جو آگی [illegible] نہ نکل سکا۔ جلکر راکھ ہوگیا۔

ٹرین ایک سٹیشن پر ٹھہری۔ ایک بیچارہ بہت دُور کا مسافر اُترا۔ کہ پانی کا گلاس بھر کر پی لے۔ ابھی وہ گلاس پانی کا لے رہا تھا۔ کہ ٹرین چل پڑی۔ بیچارہ دوڑ کر گاڑی میں لپکا۔ بدقسمتی سے پاؤں پھسل گیا۔ پلیٹ فارم سے نیچے گر گیا۔ گاڑی اس کے اوپر سے گذری۔ بیچارہ کچلا گیا معلوم بھی نہ ہوا۔ کہ کون تھا۔ کہاں کا باشندہ تھا۔ کس غرض سے کہاں جا رہا تھا۔

رات کا وقت ہے۔ ایک نیک بخت عورت بستی کے قریب کنوئیں پر پانی بھرنے گئی۔ گھڑا لٹکایا تھا۔ کہ اتفاقیہ پاؤں پھسل گیا۔ کنوئیں میں گر گئی چیختی چلاتی رہی۔ مگر رات کے وقت کسی نے بھی اس کی فریاد نہ سُنی دوسرے دن مردہ لاش کنوئیں پر تیرتی ہوئی دکھائی دی۔

بند گاڑی میں دو عورتیں اور ایک مرد کرایہ پر سوار ہو کر شہر کے کچھ فاصلہ پر سفر کر رہے ہیں۔ ایک نہر کے پل کا شتیہ اتفاقیہ ٹوٹ گیا۔ گاڑی گر گئی۔ ایک عورت کا اسیوقت دم نکل گیا۔ دوسری عورت کو زخم آیا۔ مگر علاج سے بیس دن کے بعد اچھا ہو گیا۔ مرد اور گاڑیبان بھی زخمی ہوئے۔ گاڑیبان کی تو ایک ٹانگ ہمیشہ کے لئے بیکار ہو گئی۔ مسافر بیچارہ مہینہ بھر تک صاحب فراش رہا۔

اس قسم کے اتفاقی حادثات کا سیلاب روزمرہ سننے میں آتا ہے۔ اور کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ کہ اس قدر خونریزی اور اس قدر مختلف اسبابِ مرگ کس قدرت پر مبنی ہیں۔ بہرحال یہ طوفانِ مرگ بھی ایک عبرت کا تازیانہ ہے۔ اے غافل اور مغرور انسان۔ دیکھ خوا اپنے آپ کو بھی ایسے ہی نامعلوم اسباب کیلئے آمادہ رکھ۔ اور اپنے آئندہ سفر کے لئے کچھ سامان مہیا کر سکتا ہے تو اس وقتِ موجودہ کو غنیمت سمجھ اور کچھ کر لے۔ وقت پھر ہاتھ نہ آئیگا

محمد حفیظ الرحمن حفیظ بہاولپوری

موجِ تخیل

دستِ نسل کو دخل کیا ہے خامۂ تقدیر میں — جائے نقطہ بھی نہیں باقی کسی تحریر میں
دیکھئے انجام کیا ہو ہستیٔ موہوم کا — پڑ گیا ہے اختلاف اس خواب کی تعبیر میں
خودکشی بھی بن نہ آئی پھر دوا پینا پڑی — ہائے یہ تلخی کہاں تھی زہرِ بے تاثیر میں
کافر و دیندار میں ہے رشتۂ واحد وہی — سب کے سب جکڑے ہوئے ہیں ایک ہی زنجیر میں
اصل کے آگے فریبِ نقل چل سکتا نہیں — بوئے مستانہ کہاں پیراہنِ تصویر میں
شوخیاں کیا کیا دکھائیں حسنِ مشتِ خاک نے — عالمِ جاں سے نکلکر عالمِ تصویر میں
خاک کا پتلا بھی یوں باتیں بناتا کیا مجال — راز ہے پنہاں کوئی اس بولتی تصویر میں
آئینہ دکھلا رہا ہے صورتِ آبادِ جہاں — حسنِ معنی جلوہ گر ہے پردۂ تصویر میں

مرزا [illegible] آسی لکھنوی

عزیز لکھنوی کی ایک تازہ غزل

گذشتہ اگست میں جناب حکیم منے آغا صاحب فاضل لکھنوی کے دولتکدہ پر ایک مشاعرہ ہوا تھا جسمیں استاد معظم جناب مولوی مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی نے مندرجہ ذیل غزل پڑھی۔ ارباب فہم و کمال کا مجمع تھا بے حد تعریف ہوئی اور اکثر اشعار بار بار پڑھوائے گئے۔ ناظرین ملاحظہ فرمائینگے کہ خیالات کی رفعت اور مضامین کی ندرت کے ساتھ ہر شعر کا اثر کسقدر ہے۔ یہی شاعری کی معراجِ کمال ہے۔ استعارہ کی بندش چست اور نشستِ الفاظ ایسی ہے گویا نگینے جڑ دئے ہیں۔

لوحِ حیات آپ کی تقریر ہوگئی جو بات کی نوشتۂ تقدیر ہوگئی

معشوق کی تقریر میں جو اثر ہوتا ہے کس خوبی سے اس کا اظہار کیا ہے۔ عاشق کے لئے ایسی تقریر حدیث و آیت سے کم نہیں۔ جو کچھ معشوق کی زبان سے نکلا اس کے دل پر نقش ہوگیا۔ اس پر عمل پذیر ہوا۔ اور تعمیل احکام میں ایسی بلند ہمتی کی کہ نوشتۂ تقدیر کو پلٹ دیا۔ حتیٰ کہ معشوق کی تقریر قسمت کی تحریر ہوگئی۔ گویا ہر بات معشوق نے کی تحریرِ الٰہی ہوگئی۔ اگر معرفت کے رنگ میں اس شعر پر غور کیجئے تو اور زیادہ لطف حاصل ہوگا۔ انسان کی تقدیر بجز حکم الٰہی کچھ نہیں۔ "لوحِ حیات" یعنی ایسی لوح جس پر زندگی کے تمام واقعات لکھے ہوں کس قدر پُر مغز جملہ ہے۔ ان دو لفظوں میں مضمون کو ادا کرنا جس کے واسطے پورے جملے کی ضرورت تھی۔

شاید کہ میری آہ میں تاثیر ہوگئی دنیا تمام درد کی تصویر ہوگئی

تصنیفِ معانی کا اقتضا ہے کہ جو کیفیت اس پر طاری ہوتی ہو دنیا کی ہر شے اسی رنگ میں رنگی نظر آتی ہو۔ اگر خوش ہو تو ہر شے خوش اور غمگین ہو تو ہر شے غمگین معلوم ہوتی ہے۔ لفظ "شاید" کی بلاغت اور استاد انہ صرف قابل داد ہے۔ اس سے یہ مطلب پیدا ہوتے ہیں کہ اگرچہ دل ہمیشہ سے درد آشنا تھا۔ مگر آہ میں تاثیر نہ تھی۔ یکایک طبیعت میں ایسا انقلاب پیدا ہوا کہ آہ میں اثر پیدا کر دیا۔ صاف الفاظ میں یوں کہئے کہ گدازِ دل حاصل ہوا۔ لفظ "شاید" نے ایک لطف اور یہ پیدا کیا کہ کرب و اضطرار میں منہ سے آہ نکلی کہ اسوقت تاثیر یا غیر تاثیر کا ہوش نہیں رہا۔ جب نظامِ عالم کو درہم و برہم حال ہوا۔ آہ کا ثمرہ ہے۔ یہ انتہا کا مبالغہ تھا لفظ "شاید" نے اس کی بھی اصلاح کی۔ ممکن ہے کہ آہ کی تاثیر سے دنیا تصویرِ درد ہوگئی یا کسی اور وجہ سے۔ ایک نازک معنی یہ بھی پیدا ہوتے ہیں کہ میرے دردِ عشق میں اتنا اثر تھا کہ تمام دنیا ستائی گئی درد میں مبتلا ہوگئی۔ تاہم اس کے دل میں رحم نہ آیا۔ اس کو مطلق خبر نہ ہوئی۔ یہ مسلّمات شاعری میں سے ہے کہ آہ کا اثر معشوق کے دل کے متاثر ہوتی ہے۔ کسی استاد کا شعر ہے ؎

سامنے اسکے جھکے ہے میرا نالہ ورنہ نشانے اکثر مارے ہیں بال باندھے

شیخ شعر ہے

تھی جو مصیبتیں نصیب میں وہ لکھدیں کاتب نے پہلے بس ختم سعی کاتب تقدیر ہوگئی

مسئلۂ صبر و رضا اور دل کے درد آشنا ہونے کو کس خوبی سے بیان کیا ہے۔ پہلے مصرع سے شکایت پائی جاتی تھی۔ مگر دوسرے مصرعے طنزیہ استفہام نے اس کی تلافی کی۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ پہلا مصرع محض ایک واقعہ کا اظہار ہے۔ ایسی باریک نقاشی اور اس قسم کے مضمون میں اثر کو قائم رکھا ہے جو ایک اہم کام تھا۔ الفاظ کی ترتیب بھی عجیب شے ہے جو ایک طلسمی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ استفہام و لفظ "بس" سے یہ معنی پیدا ہوئے کہ باوجودیکہ تمام مصیبتیں میرے ہی نامۂ اعمال میں درج کر دی گئیں۔ تاہم میرا دل اس قدر درد آشنا ہو کہ مجھے مطلق ہراس نہیں۔ بلکہ یہ اشتیاق ہو کہ اگر اور مصیبتیں ہوں یا پیدا ہو سکتی ہوں وہ بھی میرے ہی نام لکھدی جائیں۔

تھا نزع میں بھی سلسلۂ قیدِ غم وہی　　　اینٹھی جو رگ وہ حلقۂ زنجیر ہو گئی

میری خیال میں یہ شعر بالکل نیا ہے۔ رگوں کے اینٹھنے کو حلقۂ زنجیر سے تشبیہ دینا ایک دلپسند جدت ہے۔ جس سے نزع کی سختیاں پوری قوت سے پیشِ نظر ہوتی ہیں۔ تناسبِ الفاظ بھی قابلِ تعریف ہے۔

دل کو جلا کے دولتِ جاوید پا گیا　　　اتنی سی خاک مایۂ اکسیر ہو گئی

سبحان اللہ! قناعت پر کیا خوب شعر کہا ہے۔

ناسور آج ہر بنِ مو ہے زہے نصیب　　　اے کاوشِ مژہ تری تفسیر ہو گئی

یہ شعر تعریف سے مستغنی ہے۔ کاوشِ مژہ سے ہر بنِ مو کا ناسور ہونا بجائے خود اعجازِ شاعری ہے۔ اسپر "زہے نصیب" سونے میں سہاگا۔

اے سعیٔ نامراد بتا کیا جواب دوں　　　تقدیر کہہ رہی ہے کہ تدبیر ہو گئی

ردیف کس خوبی سے صرف ہوئی ہے۔ شعر تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے۔ عبرت و نصیحت کا سبق ہے۔ اگر انسان صدق دل سے قسمت پر شاکر رہے تو تقدیر آپ درپے تدبیر ہو جائے۔ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سعی و کوشش کبھی رائگاں نہیں ہوتی۔ کیونکہ تقدیر کا یہ پوچھنا ہی کہ سب کوششیں ختم ہو گئیں اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ اب تقدیر یاوری کو آمادہ ہے۔ تقدیر پر تدبیر کو ترجیح نہیں، ہوگا وہی جو قسمت کا نوشتہ ہے۔ اس صورت میں سعیٔ نامراد سے تخاطب خالی از لطف نہیں۔ دوسرا مصرع طنزیہ ہے۔

کہیئے کہ اب میں اپنی حقیقت کو کیا کہوں　　　جو سانس لی وہ آپ کی تصویر ہو گئی

دوسرے مصرع کی تعریف نہیں ہو سکتی جس کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ معشوق ہماری جان و روح ہے۔ روحِ انسانی دراصل وسیلہ ہے "روحِ عالم" یعنی ذات باری تعالےٰ سے متحد ہونے کا۔ اسی کے ذریعے سے "کل" کو "جزو" حاصل کرتا ہے۔ یہ ایک طولانی بحث ہے۔ جس کے متعلق ایک علیحدہ مضمون بعنوان "ادراکِ روح" رسالۂ زمانہ کے کسی نمبر میں لکھ چکا ہوں۔ معشوق کا تصور اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہو کہ ہر سانس میں اسکی تصویر کھنچتی جائے۔

دوسرا مصرع اتنا بلیغ و دقیق تھا کہ اس پر مصرع لگانا جناب عزیز ہی کا کام تھا اور غالباً اس سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ میری حقیقت وہی ہے جو آپ کی ہے۔ من و تو کا فرق ظاہر ہے۔ اور خود معشوق سے تجاہلِ عارفانہ نے تو قیامت کر دی۔ تصوّف و فلسفۂ ویدانت کی رو سے وحدتِ وجود کا پورا ثبوت ہے۔ انسان صفاتِ الٰہی کا بہترین نمونہ اور تجلیاتِ یزدانی کا امین ہے۔ پھر بھی عبد و معبود کا فرقِ مراتب قائم رکھا ہے۔ بڑے پایہ کا شعر ہے

وارفتگانِ ذبح ذرا ہوش میں رہو خنجر گلے پر آ گیا تکبیر ہو گئی

شوقِ ذبح میں اس قدر محویت تھی کہ گلے پر خنجر رکھ دیا گیا۔ اور تکبیر بھی ہو گئی۔ مگر انہیں خبر بھی نہیں دمِ آخر قاتل کے دیدار کا بھی ہوش نہیں۔ عشق پر حرف آتا تھا۔ قاتل کی سبکی ہوتی تھی۔ لہذا ہوشیار کرنے کی ضرورت تھی

ہاتھوں سے میرے دامنِ رحمت چھڑا نہ لے ہاں ہاں یہ جانتا ہوں کہ تقصیر ہو گئی

بہت پامال مضمون تھا مگر کس خوبی سے نظم ہوا۔ اپنی خطاؤں پر ندامت کے ساتھ ہی ساتھ ناز ہے کیونکہ انہیں کے سبب سے سزاوارِ رحمت ہوئے۔

آزاد ہوں قیودِ جہنم سے دوستو! میری حیات ہی مجھے تعذیر ہو گئی

بعض فلسفیوں کا خیال ہے کہ عذاب ثواب اسی دنیا میں ختم ہو جاتا ہے۔ اور سب سے بڑی عقوبت انسان کے واسطے اس کے ضمیر کی ملامت ہے۔ اس کے علاوہ شاعر نے اس بات کو کس خوبی سے ظاہر کیا۔ ہے کہ میری تمام زندگی وقفِ مصائب و آلام رہی جو نتیجہ عشق ہے اور میرے اعمال کی مکافات۔

یہ کہہ کے میری روح نے منزل تمام کی اے میرے ساتھیو مجھے تاخیر ہو گئی

بہت پُر تاثیر شعر ہے۔ الفاظ کی ترتیب پرواز روح کی تصویر پیشِ نظر کر دیتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ روح اس جسمِ خاکی میں قید رہنے سے گھبراتی اور آزادی کی جویا رہتی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی اشارہ ہے کہ دوستوں کی جدائی سوہانِ روح ہے۔

آتا ہے کوئی گورِ غریباں پر اس طرح زندہ اگر یہ محفلِ تصویر ہو گئی

عجب مزے کا شعر ہے اور تخیّل میں بے حد ندرت ہے۔ "اس طرح" کے لفظ نے جو بظاہر مبہم ہے۔ شعر میں کس قدر لطف پیدا کر دیا۔ اس طرح یعنی ایسی سج دھج سے ناز و ادا سے۔ بیباکی سے۔ یا یں محشر خرامی۔ شرمندہ و منفعل ہو کر وغیرہ اور "محفلِ تصویر" کے ٹکڑے کی تو تعریف نہیں ہو سکتی۔ دوسرا مصرع ایک دنیائے معانی ہے۔ جس کی شرح الفاظ میں ناممکن ہے۔ اگر یہ محفلِ تصویر زندہ ہو گئی۔ تو معشوق کی اس وقت کیا حالت ہو گی۔ اور

ان زندہ ہونے والوں کے جذبات کیا ہوں گے۔ اسی کے ساتھ شعر سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ قاتل کو رشک ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ اس کا معشوق گورِ غریباں پر جائے۔

ہستی کی طرح نزع میں کرتا مگر عزیز دو ہچکیوں میں ختم یہ تفسیر ہو گئی

مقطع بھی بہت نازک ولطیف ہے۔ شعر کا حاصل یہ ہے کہ رموزِ ہستی پر وقتِ نزع آگاہی ہوئی۔ مگر فرصت اتنی کم تھی کہ ان کا اظہار نہ ہو سکا اسی کے ساتھ دنیا کی ناپائداری اور ہستی کے موہوم ہونے کی طرف اشارہ ہے اور اگر غور کیجئے تو زندگی کے تمام راز انہیں دو ہچکیوں میں مضمر تھے۔

حجعفر علی خان اثر بی اے

جذباتِ رزمی

اب دمِ نزع وہ پیمانِ وفا کرتے ہیں ہائے کس وقت مکافاتِ جفا کرتے ہیں
دل تو کیا شئے ہے متاعِ خرد و ہوش بھی ہم اب نثارِ نگہ ہوش رُبا کرتے ہیں
خاک کر دیں نہ ترا خانۂ زنداں ظالم روز شعلے جو مرے دل سے اُٹھا کرتے ہیں
نہ ہنسو اُن کے مقدر پہ مری جاں اتنا جو غریب اپنی تباہی کا گلہ کرتے ہیں
تنگ آکر دلِ بےتاب کے ہاتھوں رزمی
آج پھر حوصلۂ عرضِ وفا کرتے ہیں

رزمی

زندگی

گلشنِ ہستی میں فانی۔ ہے بہارِ زندگی ہیں یہ سب دو دن کے مہماں برگ و بارِ زندگی
جو عنادل محوِ نظارہ ہیں گل کے عشق میں دام ہے اُن کے لئے ہر تارِ تارِ زندگی
باغِ ہستی سے چلے جاتے ہیں جو گل توڑ کر ہیں وہی کامل سبکدوشانِ بارِ زندگی
بلبلو! شیدا نہ ہونا!! یہ ہے باغِ دلفریب گل سمجھتے ہو جسے تم ہے وہ خارِ زندگی
اہلِ دنیا ہو کہ اہلِ حق فقیر و متقی کس کے چہرہ پر نہیں ہوتا غبارِ زندگی
زندگی پر تم ہماری ہنستے کیوں ہو واعظو! شرع بھی رہتی ہے دائم پاسدارِ زندگی
قدر ممکن ہے نری ہر جا اے نخلِ پُر ثمر استنال بندگی ہے افتخارِ زندگی
خود غرض اپنی غرض پر بنتے جاتے ہیں رفیق کون ملتا ہے جہاں میں رازدارِ زندگی
محفلِ ہستی میں اے محمود کیوں آئے ہو اب
شمع سی دل کو جلائے گی یہ نارِ زندگی

محمود اللہ ...

خون کے پیاسے

سلسلہ کے لئے دیکھو اکتوبر نمبر

انہوں نے ذیلدار کے لئے خانصاحب کے خطاب کی بھی سفارش کی تھی لیکن نعارٹن صاحب کے پرانے نوٹ اور رائے بہادر ملکھی رام کی زبانی شکایت کے سبب نامنظور ہوئی۔ ان رائے صاحب کو اسی نواح میں کچھ زمین سرکار سے ملی تھی وہ ذیلدار کے چال چلن سے بخوبی واقف ہو گئے تھے۔

مہر عبداللہ نے ڈپٹی انسپکٹر سے تمام حال راست راست بتادیا۔ اور کہا کہ آج شام کو آپ مُلّا جمال کے گھر چلیں۔ میں ایک ہزار روپیہ رشوت آسانی سے دلادونگا۔ لالہ گیا چند نے کہا۔ مجھے ایک شرط سے یہ بات منظور ہے۔ کہ آپ مجھے سردار بیساکھا سنگھ کے پھنسانے میں مدد دیں۔

ذیلدار نے کہا۔ کہ ہمسائیگی کا تعلق ہے۔ اور سردار صاحب سنتوک پورہ سے پرانی خاندانی دوستی چلی آتی ہے۔ وہ علانیہ مدد تو نہیں دے سکتا۔ مگر خفیہ طور سے مدد دینے کو طیار ہے۔ اتنے میں نہ معلوم اتفاق سے یا سمجھوتہ سے لالہ گوبند رام بھی شکور پورہ میں آوارد ہوئے یہ بھی لالہ گیا چند کے بے تکلف دوست اور رازدار بنگئے تھے۔ یہ تینوں صاحب چلکر شام کے وقت مُلّا جمال کے گھر گئے۔ مُلّا جمال اُسی روز چند گھنٹے پہلے ایک ہفتہ کی غیر حاضری کے بعد شر قپور کی طرف سے واپس آئے تھے۔ انہوں نے سنتوک پور کے قتل کا حال اور بندوق کا موقعہ پر پایا جانا کمال کی والدہ کی زبانی سن لیا تھا۔ اور کمال کی ماں کے منہ پر ہوائیاں اُڑتی دیکھ کر مُلّا جمال کا ماتھا ٹھنکا۔ مُلّا جمال نے فوراً پوچھا کہ کمال کی بندوق کہاں ہے۔ اس کی ماں نے جھٹ بندوق اندر سے لاکر دکھادی۔ مُلّا جمال نے دور سے ہی بندوق کو دیکھ کر کہا اچھا رہنے دو۔ اور اس کا اطمینان ہو گیا۔ کہ کمال تو قاتل نہیں۔ در مہر عبداللہ تو گوبند رام کے کان میں کچھ بات کہہ کر نمازِ مغرب کے بہانہ سے چلدیا۔ اور لالہ گوبند رام اور لالہ گیا چند مُلّا جمال کی بیٹھک میں بیٹھ گئے۔ جب مُلّا جمال نماز اور وظیفہ سے فارغ ہو کر آیا۔ تو پولیس کو بیٹھا پایا۔ لالہ گیا چند نہایت تلخی سے مخاطب ہوئے کہ ملا صاحب آپ تفتیش میں شامل کیوں نہ ہوئے؟۔ مُلّا صاحب نے عذر کیا۔ اور کہا کہ وہ شر قپور کی طرف گئے ہوئے تھے۔ لالہ گیا چند نے پوچھا۔ کہ مُلّا صاحب آپکے پاس بھی تو بندوق ہے۔ لائسنس تو میری سفارش سے آپ کو دسمبر میں مل چکا ہے۔ آپ نے بندوق خرید لی ہوگی۔ مُلّا صاحب نے کہا۔ ہاں تین ماہ ہوئے بندوق خرید کر چکا ہوں۔ اور اس کا استعمال بھی شروع ہو گیا ہے۔ اور کبھی کبھی آپ کا غلام زادہ بھی اس کا استعمال کرتا ہے۔ اگر حکم ہو تو بندوق حاضر کروں۔ لالہ گیا چند نے کہا۔ ہاں میں بندوق کو دیکھنا

چاہتا ہوں۔ ملا صاحب نے بندوق لیکر ڈپٹی انسپکٹر کے ہاتھ میں دیدی۔ ڈپٹی انسپکٹر نے بندوق کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ تو وہ بالکل نئی تھی۔ ایک دفعہ بھی استعمال نہ ہوئی تھی۔ ڈپٹی انسپکٹر نے لالہ گوبند رام کے کان میں کچھ کہا۔ لالہ گوبند رام ملا صاحب کو ایک طرف لے گئے اور چپکے سے ان سے کہا کہ تمہاری بندوق بالکل نئی ہے اصلی بندوق گم ہو تو تمہارے لڑکے پر مقدمہ ثابت ہے۔ یہ سنکر ملا صاحب کے قدموں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ اُن کے تمام شبہات دور ہو گئے۔ اور وہ فوراً سمجھ گئے کہ اب کمال کا بچنا محال ہے۔ اسوقت یہ دونوں مہر عبداللہ کے پاس گئے۔ تینوں نے مل کر مشورہ کیا۔ اور یہ صلاح ٹھہری کہ اسوقت فوراً ایک ہزار روپیہ رشوت کے طور پر ڈپٹی انسپکٹر کو دیا جائے اور وہ بندوق جو موقعہ سے دستیاب ہوئی ہے۔ واپس لی جائے۔ اور یہ بندوق ایک دفعہ پیدا کر اس کی جگہ رکھدی جائے۔ مہر عبداللہ نے کہا کہ میں کوشش کرونگا کہ کسی طرح ڈپٹی انسپکٹر پانسو روپیہ پر راضی ہو جاوے وہ میری معرفت بہت اکھا پکا ہے۔ کیا اتنا بھی لحاظ نہ کریگا۔ ملا صاحب نے کہا۔ کہ یہ وقت سودا کرنے کا نہیں ہے۔ پولیس والے کسی کے میت نہیں ہوتے آپ دیر نہ کریں۔ لالہ گوبند رام نے اس وقت ساٹھ گنیاں جیب سے نکالیں اور کہا کہ اسوقت اس کلال کا منہ کالا کرو۔ دھیلا بھی نہیں سو روپیہ مہر عبداللہ گھر سے لایا۔ ایک ہزار روپیہ ڈپٹی انسپکٹر کو دیا گیا۔ گوبند رام نے اسوقت ملا جمال سے ایکہزار روپیہ کا پرونوٹ بشرط ادائگی ۹ سیکڑہ لکھوا لیا اور وعدہ لے لیا کہ ایک ہفتہ کے بعد ملا صاحب اپنا ایک اور چاہ گوبند رام کے پاس گروی کر دینگے لالہ گیا چند نے فوراً گنیاں اور روپیہ جیب میں رکھ لئے۔ اور بندوق جو موقعہ سے برامد ہوئی تھی۔ ملا جمال کے حوالہ کر دی۔ ذیلدار سے کہا کہ اس وقت بندوق چلاؤ گے۔ تو شبہ ہوگا تم بندوق بھر کر مجھے دیدو میں رستہ میں چھوڑا لونگا۔ نئی بندوق تو لیکر ڈپٹی انسپکٹر تو اسی وقت چلدیا جب ڈپٹی انسپکٹر چلا گیا۔ تو مہر عبداللہ نے ملا صاحب سے ذکر کیا کہ آپ نے جلدی کی۔ آپ ذرا صبر کرتے میں پانسو روپیہ میں اس کو راضی کر لیتا کیونکہ میں کمال کی ماں کے زیورات گروی کرکے پانسو روپیہ اس کو پہلے بھی دے چکا تھا۔ اشارتاً تو میں نے آپ سے کہدیا تھا لیکن گوبند رام کی موجودگی میں صراحتاً کہنا مناسب نہ تھا۔ ملا جمال کو یہ سنکر بہت صدمہ ہوا۔ لیکن وہ اپنے بیٹے کے بچ جانے سے اس قدر خوش تھے کہ وہ زیورات کا ذکر پھر کبھی زبان پر بھی نہ لائے۔ لیکن ذیلدار کی انصاف کرتے ہوئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اپنے ناظرین کو مطلع کر دیں کہ یہ زیورات اور روپیہ ملا جمال کے مرنے کے بعد مہر عبداللہ نے کمال کی ماں کو واپس دیدیا تھا۔

اسی وقت ذیلدار نے ملا جمال سے یہ ذکر بھی کر دیا کہ یہ کمبخت تھانہ دار سردار بیساکھا سنگھ کو پھنسانا چاہتا ہے۔ اور کل صبح سے اس کے برخلاف کارروائی شروع کریگا اور مجھ سے اور آپ سے مدد مانگتا ہے آپ کی

کیا رائے ہے ملّا صاحب نے کہا کہ سردار بیسا سنگھ کا باپ میہورن سنگھ میرا ہم عمر اور بڑا دوست تھا اور سردار کو میں کماں سے کم عزیز نہیں جانتا۔ مدد دینی کا تو کیا ذکر ہے اگر تھانہ دار نے ایسا کیا تو میں علانیہ اس کی مدد کرونگا اور تم نے بھی اگر اس معاملہ میں سردار کے برخلاف کوئی کاروائی کی تو تمام نواح میں ہمارے گاؤں اور خاندان کا منہ کالا ہو جائیگا۔ اور یہ کمبخت کلال تو آج یہاں ہے کل چلتا نظر آویگا۔ ہماری اور سرداروں کے درمیان عداوت کی بنیاد پڑ جاویگی۔ مہر عبداللہ یہ جواب سنکر خاموش ہو رہا۔ ملّا جمال کو اطمینان نہ ہوا۔ اُس نے فوراً ذیلدار کے دونوں گھٹنے پکڑ کر ہائے اور کہا بھائی اس معاملہ میں ذرا سوچ سمجھ کر قدم رکھیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم آیندہ سرداروں کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں۔ ذیلدار نے کچھ سوچکر جواب دیا کہ بھائی صاحب آپ اطمینان رکھیں میں اس کلال کو ایسی پٹنی سناؤنگا کہ تمام عمر یاد رکھیگا اور سرداروں کے مقابلہ میں حق ہمسائیگی ادا کرکے دکھلادونگا تم سردار کا اطمینان کر دینا۔ سرکاری کاروائی میں تو مجھے پولیس کی تحریروں پر دستخط کرنے پڑینگے۔ ورنہ مجھے پولیس ایکدن میں موقوف کرادے۔ لیکن میں سردار کا بال بیکا نہ ہونے دونگا اور اس حرام خور کلال کو دیکھنا کیسا نیچا دکھاتا ہوں۔ لیکن مُلّا صاحب آپکو خیال رہے کہ آپکا دوست میہورن سنگھ دیوالیہ ہو کر مرا ہے۔ اُس نے شراب خوری میں تمام جائداد تلف کردی ہے اور بیسا کھا سنگھ کے پاس اس قدر گنجائش نہیں ہے کہ وہ تنہا اس مقدمہ کے اخراجات برداشت کرسکے آپ کو اور مجھے دونوں کو اُس کا ہاتھ بٹانا چاہیئے۔ اگرچہ اُس کا چچا زاد بھائی سردار انوکھا سنگھ بہت مالدار ہے لیکن وہ کمبخت ایسا کنجوس ہے کہ اپنے لئے بھی ایک کوڑی خرچنے والا نہیں بھائی کی تو کیا مدد کریگا۔ میں اپنے پاس سے اس کو پانسو روپیہ دونگا اور لالہ گوبند رام سے بھی جس کا سرداروں کے خاندان سے کئی پشتوں سے لین دین چلا آتا ہے پانسو روپیہ قرضہ بلا سود دلادونگا۔ آپ بھی پانسو روپیہ سے اس کی مدد کریں۔ ملّا جمال نے کہا کہ اگرچہ میں قرضہ میں بالکل دبا ہوا ہوں اور اس وقت بیس ہزار سے کم کا مقروض نہیں ہوں لیکن ایسے موقعہ پر ہٹنا بھی کسر شان اور شرافت کے برخلاف سمجھتا ہوں تم اس وقت گرپوری صاحب کے پاس چلے جاؤ۔ اور عدالت ماتحت اور سیشن کورٹ کے لئے اس کو وکیل کر لو میں یہ پانسو روپیہ اس کو اپنے پاس سے ادا کردونگا اور اپنے بھانجے نورالدین بیرسٹر کو بھی جو ہونہار معلوم ہوتا ہے۔ سو روپیہ دیکر روک لیتا ہوں۔

باب ۱۱

دوسرے دن علی الصبح لالہ گیا بخند ڈپٹی انسپکٹر معہ گرداور نواح کے نمبرداروں کے موقعہ پر آموجود ہوئے وہاں سے ذیلدار اور ملّا صاحب کو ساتھ لیکر سنتوکھ پورہ گئے اور خود دھرم سالہ میں بیٹھکر ایک ایک شخص کو تخلیہ میں بلاکر اُس سے گفتگو کرنے لگا۔ ان میں سے ایک شخص نے جو بیسا کھا سنگھ کا دور کا عمزاد تھا اور اس سے عداوت دیرینہ رکھتا تھا۔ تھانہ دار سے یہ ذکر کردیا کہ مقتول کی عورت نہایت خوبصورت ہے اور عمر میں بالکل

نوجوان ہو۔ اس کی آشنائی نکاح کے قبل سے بیساکھا سنگھ
کے ساتھ چلی آتی ہے۔ ممکن ہے کہ بیساکھا سنگھ نے اس
عورت کے سبب سے اس چنگڑ کو مار ڈالا ہو۔ ڈپٹی انسپکٹر
نے ایک دو اشخاص سے گفتگو کر کے مسماۃ بیگاں کو بلوا بھیجا۔ اسکے
باپ کو بھی جو سرداروں کے اصطبل میں رہتا تھا بلوایا۔ اور مقتول کے بڑے
بھائی کو بھی جو شکور پور میں رہتا تھا طلب کیا۔ یہ شخص مہر عبد اللہ کے چاہ پر مزدوری
کیا کرتا تھا۔ تین روز تفتیش کی کارروائی ہوئی۔ ڈپٹی انسپکٹر مقتول کی عورت
کو مع اس کے جیٹھ اور باپ کے اپنے ساتھ لاہور لے گیا
رات بھر عورت کو اس کے جیٹھ اور باپ سے علیحدہ رکھا
مقتول کے بھائی اور اس کے خسر پر حوالات میں پولیس
والوں نے طرح طرح کی زیادتی کی۔ تمام رات ان کو جگایا۔
اور صبح کو دونوں کے مرچوں کا توبڑہ بھی چڑھایا گیا۔
آخر تین روز کے بعد انہوں نے کہا کہ جو کچھ تھانہ دار صاحب
کہلانا چاہتے ہیں۔ وہ کہنے کو تیار ہیں۔ ڈپٹی انسپکٹر
کی ہدایت کے بموجب چوتھے روز انہوں نے یہ بیان
لکھوایا کہ مسماۃ بیگاں کی آشنائی کنوارپن سے
بیساکھا سنگھ کے ساتھ تھی اور اب بھی بیساکھا سنگھ
اُس کا خیال نہیں چھوڑتا۔ مقتول ایک سخت مزاج
اور باغیرت آدمی تھا۔ اس نے قتل کے چند روز پہلے بیساکھا سنگھ
کو ہمارے سامنے منع کیا تھا کہ وہ اس کی عورت سے بات
چیت نہ کیا کرے اور اُن کے گھر نہ آیا کرے۔ ان بیانوں
پر مقتول کے بھائی اور خسر نے اپنی نشانی کر دی۔ اور
چند نمبرداروں اور ذیلداروں نے تصدیق کر دی کہ ان کے
سامنے یہ بیان اُن دونوں نے کیا۔

مسماۃ بیگاں کے ساتھ یہ کارروائی کی کہ رات
کو اُسے اپنے مکان ہی میں رکھا۔ اور آدھی رات کو اُسے
اپنے کمرہ میں بلوایا۔ بیگاں نے بگڑ کر جواب دیا۔ کہ خبردار
رات کے وقت کوئی شخص اس سے گفتگو نہ کرے
دن میں جو چاہو کر لینا۔ اور آنے سے صاف انکار کر دیا
ڈپٹی انسپکٹر سمجھ گیا۔ کہ یہ عورت بڑی پختہ ہے۔ مہربانی
سے قابو آوے گی۔ اس کا جواب سُن کر دم بخود ہو گیا۔ دوسرے
دن علی الصبح مسماۃ بیگاں کو اپنی عورت کے پاس
زنانہ میں بھیجدیا۔ اور اپنی عورت سے کہا کہ اس سے
بہناپا جوڑے۔ اس کے کپڑے میلے تھے۔ تھانہ دار کی
عورت نے اپنی سلوار اور اپنا کرتہ اور اوڑھنا اس کو
دیدیا۔ یہ نیا جوڑا تھا اور کسی سے کم پندرہ بیس روپیہ میں
بنا ہوگا۔ دوسرے دن ایک چندن ہار جو مالیت میں
سو روپیہ سے کم نہ ہوگا۔ اپنے گلے سے نکال کر اس کے
گلے میں یہ کہہ کر ڈال دیا۔ کہ تیری شکل کی ایک میری
بہن تھی جو پارسال ہیضہ سے مر گئی تیری شکل دیکھ کر
مجھے وہ یاد آتی ہے اور تجھ پر مجھے بے اختیار پیار آتا ہے
میں تو آئندہ تجھے اپنی بہن سے زیادہ عزیز سمجھونگی۔ اور
تھانہ دار سے منت سماجت کر کے تجھے دو تین روز
رہا کرا دونگی۔

الغرض تھانہ دار صاحب کے گھر میں بیگاں کی خاطر
تواضع ہونے لگی۔ دونوں وقت اچھے سے اچھا
کھانا ملنے لگا۔ لیکن جب ایک دن ڈپٹی انسپکٹر نے
کہا کہ بہن بیگاں۔ تو ایسا ایسا بیان کر دے گی تو تیرا
اور تیرا دونوں کا چھٹکارا ہو جائیگا۔ اور میں تجھے اچھی طرح
رخصت کر دونگا۔

باقی

تہذیبِ حاضرہ پر تمدّنِ اسلام کا اثر

(گذشتہ سے پیوستہ)

گزشتہ ایام سے فلسفہ ارتقاءِ طبیعی نے مشرق اور مغرب کے علماء کی توجہ اپنی طرف منعطف کرالی ہے۔ ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔ کہ حکیم ڈاروِن اس فلسفہ کا شارح ہی ہے یا موجد بھی۔ حکیم ابنِ مسکویہ نے ارتقاءِ طبیعی پر چند رسائل لکھے۔ الخوارزمی کی بعض تصانیف بتلاتی ہیں۔ کہ عربی دماغ اس فلسفہ سے ناآشنا نہ تھا۔ جلال الدین رومی نے اپنے اشعار میں اس کا اجمالاً ذکر کیا ہے۔ اور بارھویں صدی عیسوی میں اس مسئلہ نے عربی اور اسلامی درسگاہوں میں کافی فروغ حاصل کیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ یہ مسئلہ کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ ایک غلط خیال ہے کہ ڈاروِن اس کا موجد ہے۔ ڈاروِن سے قبل کئی ایک جرمن فلسفیوں نے اس پر قلم فرسائی کی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ڈاروِن نے اس کو ایک خاص اہمیت اور رنگ دیا۔ مسلمان حامیانِ ارتقا نے اس کو حیوانات تک ہی محدود نہیں رکھا۔ بلکہ انہوں نے حیوانات کے علاوہ جمادات اور عالمِ بالا کے لئے مدارج بھی قائم کئے ہیں۔ اور جو سچ پوچھیے تو ابن الصائغ نے آج سے کئی سو سال پیشتر قرطبہ کے کالجوں میں اس کی بنیاد کو استوار رکھا۔ اور اسی بیج سے یہ شگوفے پھوٹے جو آج تناور درختوں کی صورتوں میں نظر آرہے ہیں۔

بعض دوست خیال کرتے ہونگے کہ میں نے اسلامیوں اور خصوصاً اہلِ عرب کی مدحت سرائی میں مبالغہ سے کام لیا ہے۔ [illegible] رہے اصول مورخوں کی طرح کسی خاص مرد یا قوم کی مدحت سرائی کو اپنا نصب العین قرار دینا ہرگز نہیں۔ [illegible] کام واقعات کی تحقیق اور تدقیق ہے۔ اگر کوئی قوم سزاوارِ تعریف ہے۔ تو ہمارا دل ہماری [illegible] اور ہماری قلم اس کی ثناخوانی میں ایک ہوں۔ یہ کہاں کی ایمانداری ہے۔ کہ مذہبی تعصب اور نسلی امتیاز [illegible] کسی قوم کے محاسن کو نظر انداز کرکے اس کے عیوب پر کی پردہ دری کی جائے۔ اور جو سچ پوچھیے۔ [illegible] نہایت اختصار سے کام لیا ہے۔ میں نے ابھی تک اس بات کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ کہ طبی معلومات میں ان کا کیا [illegible] ہے۔ ان کو علم جراحی میں کس قدر دسترس تھی۔ ان کی تعمیر کی شان و شوکت سے کس قدر لوگ انگشت بدنداں ہیں۔ علم موسیقی میں انہوں نے کیا کمال حاصل کیا۔ ان کے دلاویز نغموں سے کتنے سینے چاک ہوئے۔ کتنے جگر مجروح ہوئے۔ اور کتنے دل بیقرار ہوئے۔ اور نہ میں نے اس بات کا کوئی تذکرہ کیا۔ کہ اسلام کے اصولِ مساوات اور حریت نے اشتراکیت کی آئینی صورت یعنی ڈیموکریسی کی نظم و نسق میں کیا حصّہ لیا۔ اور یہاں تک عمومیت کے وہ اصول جو عرب کے کملی والے نے عالم کی رہنمائی کے لئے پیش کئے تھے بالواسطہ [illegible] سوسائٹی کے ارتقا میں شمعِ راہ ہوئے۔

میرا ارادہ نہیں کہ میں اس موقعہ پر عربی طب پر قلم فرسائی کروں کہ موجودہ طب کہاں تک عربوں سے وابستہ ہے اور کہاں کہاں اس کی تہ میں عربی حکمت کے موتی باصرۂ بصیرت کو آنکھ مار رہے ہیں۔ حکیم ابو القاسم اور ابن سینا نے طب کی استواری اور ضبط میں کیا حصہ لیا۔ اور جالینوس کی شہرت کس قدر ان کے منبع سے آنکھ چُراتی ہے۔ ابن زہر نے جراحی کے کون کون سے اوزار اختراع کئے اور کس طرح علم جراحی کو منتظم کیا۔ ابن بیطار نے خصوصیاتِ ادویات کی خاطر کون کون سے پہاڑ اور جنگل طے کر ڈالے اور کس طرح سالرنو کا طبی کالج موجودہ طبی تعلیم کا منبع اور مخرج قرار دیا جا سکتا ہے۔

مضمون کی طوالت کے باعث میں اس پر بھی بحث نہیں کرنا چاہتا کہ عربی تعمیر کن تین مدارج ارتقاء سے گزری اور گوتھک طرز پر اس کا کیا اثر ہوا۔ ہندوستان میں جمنا کے کنارے تاج محل کا روضہ ان بد نصیبوں کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ ہاں اس طرح کی عمارت مغرب میں الحمرا کا قصر لالہ پوش ہے۔ جو مسلم آرٹ کی بہترین یادگار ہے۔ یہی ایک ایسا بے نظیر نمونہ ہے۔ جسے تکبرِ انسانی بڑے غرور سے پیش کر سکتا ہے۔ میرا ارادہ نہیں کہ میں مسلم آرٹ یا کرسچن آرٹ کے درمیان رشتہ مماثلت دریافت کروں اور یہ بتلاؤں کہ قرطبہ کی مساجد کے محرابی نمونے نارمن گرجا کے محرابی راستوں کی اب تک زیب دہی کر رہے ہیں۔ اور الحمرا کے چھوٹے چھوٹے کلرنک ستون ڈرہم کے گرجا "انٹری ڈوم" کی زینت کاری میں معروف ہیں۔ نہ میں اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہتا ہوں کہ آیا مسلم آرٹ کرسچن آرٹ کا خوشہ چین ہے یا کرسچن آرٹ مسلم آرٹ کا مرہونِ منت۔ میں تو ایک جرمن محقق کا ہمخیال ہوں کہ مسلم آرٹ کی سبقت بیّن اور لا متنازعہ ہے کیونکہ یورپ نے ازمنہ وسطیٰ میں تمام علوم و فنون اہل عرب سے حاصل کئے۔ اور ضروری ہے کہ فنونِ لطیفہ میں سے اس فن کو بھی ان سے حاصل کیا ہو جس کی تحصیل قانون مذہب جائز ٹھہراتا ہے۔"

میں یہ بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتا کہ ابن الہیثم نے ڈوبے ہوئے جہازوں کو عمیق سمندر سے نکالنے کا طریقہ ایجاد کر لیا تھا۔ اور آبدوزوں کے متعلق تحقیقات جاری تھیں۔

یہ بذاتِ خود ایک طویل مضمون ہو سکتا ہے کہ کس قدر عربی الفاظ یورپین السنہ میں مُروّج ہیں کس قدر عربی امثلہ اور خوشگوار جملے مغربی عبارت آرائی کی شان کو دوبالا کر رہے ہیں۔ اور کس قدر عربی مصطلحات مغربی سائنس کی بیخ و بن کو مضبوط کر رہی ہیں اور کہاں تک مُتفقہ عبارتیں اور فقرے عربی اوزان کی تتبع پر قائم ہیں۔ پراونس کی شاعری اور ہسپانیہ کی ترانہ گوئی نے عربی وطن کے زیرِ اثر یورپ کے حُسن و جمال کو کہاں تک فروغ دیا۔ اور قرأت کی علامتیں (؟ - ، - ! - : وغیرہ) کہاں تک عربی الفاظ [(استفہام سے ہم) (وقفہ سے و) (ندا سے !) (وقف سے ؛)] سے وابستہ ہیں اور موجودہ یونیورسٹیوں کا طریقہ ترکانِ آل عثمان کی بدولت یورپ میں

[illegible] نما ہوئی اور کس قدر ناز و نعم کے کارخانے خوبصورت گھڑیاں۔ ڈولیاں۔ فٹن گاڑیاں فیشن ایبل لباس۔ پتلون وغیرہ جن کا رواج مسلمانوں سے یورپ میں رائج ہوئے۔ [illegible] علما کی بدولت نظام حکومت کے فن صیغۂ محاصل صیغۂ محاسبات بیت المال۔ نظارت نافعہ (پبلک ورکس) سیاست مدن۔ صیغۂ تعلیم نے ترقی اور منتظم صورت اختیار کی یورپ کی مہذب اقوام کا دعویٰ ہے کہ اشتراکیت۔ اصول مساوات حریت اور ان سب کی انتہائی صورت یعنی ڈیموکریسی وجود اسی گزشتہ تمدنوں کا پیدا شدہ ہے اور یورپ میں اشتراکیت کے زبردست تحریک پیدا ہوئے۔

اٹھارویں صدی کے [illegible] جرمن فلاسفر ہیگل نے حریت۔ مساوات اور اشتراکیت کے اصولوں کو پورے طور پر نظام ترکیبی (سسٹم) بنا کر قرار دیا۔ ۱۸۴۷ء میں جرمن [illegible] سوسائٹی قائم ہوئی جو ینگ جرمن کے نام سے مشہور تھی۔ در اصل یہ انجمن اشتراکیت تھی۔ رفتہ رفتہ تمام یورپ پر اس کا اثر ہونے لگا۔ اور کارل مارکس اس فلسفہ و تعلیم کا روح رواں تھا۔ اسے اپنے جوش پرستانہ [illegible] کی پاداش میں جلا وطن ہونا پڑا اور آخر اس نے لندن کی [illegible] میں پناہ لی۔

انقلاب فرانس اور موجودہ انقلاب روس کے محرک بھی اشتراکیت کے یہی اصول ہیں اور یہی اصول تھے اور ناجبروت بادشاہوں کی تباہی کا باعث ہونگے۔ جہاں فرعون تمنائی کے ذریعہ [illegible] کے نام سے نا آشنا ہیں۔

کارل مارکس نے اپنی کتاب [illegible] سوشلسٹ [illegible] میں ان اصولوں پر سائنٹیفک طریقہ سے بحث کی ہے۔ اور وہ سوشلزم کو دو اقسام میں منقسم کرتا ہے۔ ہر دو کے چیدہ چیدہ نقاط مفصلہ ذیل ہیں۔ توازن و تماثل کے لئے یہی کافی ہے

قسم اوّل	قسم دوم
(۱) مخلوق انسانی [illegible] سے لبریز ہے۔	(۱) اس انداز سے مبرا ہے۔
(۲) قدامت پسند ہے۔	(۲) لبرل ہے۔
(۳) علم النفس کی روشنی میں اس کا وجود مافوق الطبیعات پر قائم ہے۔	(۳) علم النفس کی روشنی میں اس کی بنیاد سائنٹفک اصولوں پر قائم ہے۔
(۴) جذبات تحریک اس کا ممتاز عنصر ہیں	(۴) افکار و تخیل اس کا طرۂ امتیاز ہے
(۵) اس کا مقصود سوسائٹی کے حصۂ غالب کی خوشی کا سامان مہیا کرنا ہے	(۵) اس کا فرض افراد کو اس قابل بنانا ہے کہ ہر ایک اپنی خوشی کو خود حاصل کر سکے۔
(۶) اصول مساوات اچھا ہے لیکن یہ تب ہی حاصل ہو سکتا ہے کہ ہر فرد کو انتہائی ترقی کا موقع دیا جائے۔	(۶) عدم ترجیح انسانی اصول مساوات کا معیار ہے۔
(۷) تہذیب کے انتہائی مراحل میں بھی محنت کا دکھ لازمی ہے	(۷) آخر کار دنیا کامل امن و سکون میں آجائیگی۔

کارل مارکس قسم دوم کا حامی تھا۔ موجودہ اضطراب کا باعث ہر دو خیالات کی باہمی چپقلش ہے اور یہ چپقلش عرصے جاری ہے اور جب تک ایک خیال کو پوری شکست نہ ہو جائیگی اس ہلچل سے بریت کی امید نہیں۔ قسم اول کے حامی دعویدار ہیں کہ موجودہ زمانے میں سوسائٹی کے لئے اس سے بہتر فلسفہ نہیں۔ قسم دوم کے حامی طلبگار ہیں کہ مستقبل کی روش قسم دوم پر ہو۔

آمد اسلام کے وقت اگر ایک جانب رومی استبداد نے اقوام عالم کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ تو دوسری طرف مزدک کی اشتراکیت تند وتیز تلوار کے سایہ میں افراد ملت کو علیحدہ علیحدہ کر رہی تھی۔

اسلام نے اللہ تعالیٰ کی مطلق العنانی کے سوا ارباب من دون اللہ کی الوہیت کا ازالہ کیا۔ خود سر افراد۔ مغرور اور متکبر ہستیوں کو وضاحت کے ساتھ بتلایا کہ اللہ کے نزدیک وہی باعزت اور بڑا ہے جو زیادہ دیندار اور متقی ہے۔ حکومت خلافت میں تبدیل ہوئی جس کی منشا نمرودیت کی سرکوبی تھی۔ دارالشوریٰ قائم ہوا۔ مسلمان بلا تفریق حکومت میں داخل ہوئے۔

عدم ترجیح انسانی کے اصول بنائے گئے۔ خلفاء راشدہ کی سوانح عمریاں۔ اصول مساوات کی تفسیر ہیں۔ ۔۔۔ اورنگ شاہنشاہی نے غلاموں کے قدم چومے۔ اکلیل دارائی محتاجوں کے سر پر نثار ہوا۔ اور کئی بار قوم کے غریب بچوں نے تخت قضاۃ اور کرسی وزارت کو زینت بخشی۔ مذہبی رواداری۔ غیر مسلموں کے حقوق کی ۔۔۔ سکھلائی گئی۔ الغرض اسلام اس تعلیم سے اٹھا کہ ؎

بنانا نہ تربت کو میری صنم تم　　　نہ کرنا میری قبر پر سر کو خم تم
نہیں بندہ ہونے میں کچھ مجھ سے کم تم　　　کہ بیچارگی میں برابر ہیں ہم تم
مجھے دی ہے حق نے بس اتنی بزرگی　　　کہ بندہ بھی ہوں اس کا اور ایلچی بھی

اس تعلیم کا پہلا اثر مسلم سپین کے ذریعے کاتھولک فرانس میں البن جنس الحادی کی صورت میں ۔۔۔ کے خیالات کو ابن رشد نے فروغ دیا۔ اور دنیاوی شہرت کے کئی ذی فکر آزاد خیال ۔۔۔ ابر بھینا۔ برنگیریس۔ ابی لارڈ ولیم آف اوکم ایریجینا اس تعلیم کی برکت سے شمع ہدایت بن بن کر چمکے۔ ۔۔۔ میں جان ہیلبسن۔ ساوانرولا۔ لیوتھر۔ برونو اور کیمپیلا پیدا ہوئے۔ جنہوں ۔۔۔ تعلیم اور دھواں دھار تقاریر سے پاپائیت کے قصر کہن میں تہلکا ڈالا۔ اور ہر طرح کی ۔۔۔ کی آواز کو سرافراز کیا۔ پاپائیت نے آزادی کی لہر کے دبانے کی ہزار کوشش کی۔ ۔۔۔ ابن رشد اور لیوتھر کے نام اور تصاویر کو نہایت ہیبت ناک طریق سے پیش کیا۔ ۔۔۔ کام لیا کہ بھولے بھالے دل قدسی پیکر ۔۔۔ دل ہر حق اور دل بہ عشق باختہ حریت نوازوں کے نام سے ۔۔۔

آخر کیا ہوا۔ اسلامی تعلیم کے اثر سے مذہب استبداد کے سلاسل سے آزاد ہو گیا۔ بس کا لیست [illegible] ازمنہ
عصرِ کہن تاریخ و دین سے نکل گیا۔ احیائے علوم کا دور آیا۔ شبِ عنبر پوش بے نقاب ہوئی۔ اور جہاں جہاں شمشیرِ
لاہ ہلالِ تہذیب بنا چمکی۔ وہ قطعہ آفتابِ تمدن کی ضوفشانیوں سے آتش باش ہو گیا۔ اسی تعلیم کا تیسرا اثر یہ ہوا
انقلابِ فرانس کے بعد خود انسان اور حکومت فرعونیت کی آہنی سلاسل سے آزاد ہو گئے

تاریخی حیثیت سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ اسلام کی تاریخ دانی اور تاریخی پوزیشن پر بھی چند سطور
[illegible] جائیں۔

تم [illegible] یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ [illegible] زمان کا واقعہ نگار ہر دوس [illegible] تاریخ کا موجد ہے۔ [illegible] دکھانا یہ ہو کہ فلسفۂ تاریخ کا
[illegible] اور وجود، تاریخ کا مخترع کون ہے؟ [illegible] نگاہوں [illegible] کی [illegible] روشنی میں [illegible] کی جوہری مثل ہر دوس
[illegible] طبری [illegible] ابنِ خلکان۔ ابنِ جوزی [illegible] دکھائی دیتے ہیں۔ [illegible] ابنِ خلدون
[illegible] ہے۔

دنیا کے مؤرخوں نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ [illegible] شخص [illegible] فنِ تاریخ کی طرح اسی
[illegible] خلدون [illegible] ایشیاٹک ریویو [illegible] ۱۹۲[illegible] [illegible] کی کامیابی کے [illegible] تحقیق کو نہایت دلی
[illegible] میں اس طرح رقم [illegible] ہے۔

[illegible] کہ فلسفۂ تاریخ ایک اوکھا [illegible] اور [illegible] مضمون ہے۔ میں نے بڑی گرم بحث اور غور و خوض
[illegible] مجھے اپنی عمر کی قسم مجھے یہ مضمون کسی نے نہیں سمجھایا ..... مجھے معلوم نہیں کہ مؤرخوں
[illegible] بے اعتنائی رہی۔ میں اُن کی لاپروائی کو نہ تو اُن کے نام سے منسوب کرتا ہوں۔ نہ اُن کے
[illegible] شاید اُن کی کلکِ جواہر نگار سے اُن کے متعلق کچھ لکھا گیا ہو۔ اور زمانے کی دستبرد سے محفوظ
[illegible] نے تاریخ کی حقیقت اور غرض و غایت اور تاریخی واقعات کی [illegible] کے متعلق اس

[illegible] انی سوسائٹی سے تعارف کراتا ہے۔ دنیا کی تہذیب [illegible] کے طبعی
[illegible] کی تنظیم اور ایک دوسرے پر اُن کا تغلب [illegible] تمدنوں
[illegible] علوم [illegible] ارتقائے تہذیب کی [illegible]
[illegible] ہے۔

[illegible] ہے کہ علم [illegible] تغیراتِ [illegible] ملکی اور مذہبی [illegible]
[illegible] معاشرت، عادات و رسوم اور ادراک و افہام کی قابلیت رکھتا ہو۔ واقعات

حاضرہ اور معاملاتِ سابقہ پر اُسے عبور ہو۔ انقلابات کے وجوہات۔ اصولاتِ مذاہب و سلاطنہ سے کماحقہٗ آگاہی ہو واقعات کی دُور رس۔ ہر گوزا اور مُختصر باتوں کے سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہو۔۔۔۔ پھر تمام مجموعی حالات پر نظرِ غور کرکے دیکھے کہ فلاں واقعہ صحیح ہے یا غلط۔ کیا وہ ممکن الوقوع ہے یا نہیں۔ غیر ضروری امور کو پس انداز کرتا ہُوا وہ سائنٹیفک طور سے ایک ایسے درست نتیجے پر پہنچ سکیگا۔ جس کی مضبوطی کو ذاتی آرا‌ؤں کے تلاطم خیز سمندر ہرگز ہرگز نہیں ہلا سکتے۔ یہ ایک ایسا عمدہ طریقہ ہے۔ کہ ایک مؤرخ ذاتی رائے سے بالاتر ہو کر ہر تاریخی معاملے کی صحت کو معلوم کر سکتا ہے۔"

تاریخِ اسلام ابنِ خلدون پر جس قدر ناز کرے بجا ہے وہ ایک محیط النظر۔ تعصب سے بالاتر مؤرخ تھا۔ واقعات کی عقدہ کشائی اُس کا ذاتی جوہر تھا۔ اُس کے فلسفیانہ طریق نے کئی ایک مہربلب واقعات کو اعجازِ گویائی عطا کیا اُس کی ذاتی قابلیت زمانۂ سلف کے کسی مؤرخ سے متأثر نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کے روحانی فرزند ازمنہ وسطیٰ اور دورِ حاضرہ کے بڑے بڑے یورپین مؤرخ میکاویل۔ وائیکو اور گِبن جیسے جیّد عالم اور تاریخ داں ہیں۔

گذشتہ عبارت پر نظر ڈالتے ہوئے ہم اس امر پر رائے دینے کی پوزیشن میں ہیں۔ کہ تمدنِ اسلام نے یورپ کی موجودہ تہذیب پر کہاں تک اثر کیا اور یہ دَور کہاں تک اہلِ اسلام کا خوشہ چین ہے؟ موسیو بری کے الفاظ میں جب ہندوستان کے برہمن اور یونانی کے زیرک فہم و فراست۔ علم و ادب کے دفینوں کی حفاظت سے دست کش ہو چکے تھے۔ جب تمدن کے قلاع و حصار ظلمت کی چیرہ دستیوں سے ازپا تا سر متزلزل تھے۔ جب تمدن اور تہذیب کے اورنگِ شاہنشہی پر جہالت کے اہرمنِ ناپاک سفریت متمکن ہو چکے تھے یعنی جب دنیا کی ترقی کی امید جاتی رہی۔ تو عرب کے بدوی اُٹھے۔ دشت و جبل طے کئے۔ اور ایک پیامِ امید لائے۔ وہ نشاۃ ثانوی کے پیامبر تھے۔ اُن کی آمد پر ملکہ تمدن نے علم و ادب کے گوہر نثار کئے۔ اگر انکو تاریخ سے علیحدہ کر دیا جائے۔ تو احیائے علوم کا زمانہ صدیوں نہیں بلکہ قرنوں پیچھے جا پڑتا ہے۔ اُن کی برکت سے۔ مذہب علم اور سوسائٹی ہر سہ استبداد کی آہنی زنجیروں سے آزاد ہوئے ؎ گھٹا اک پہاڑوں سے بطحا کے اُٹھی پڑی چار سو یک بیک دھوم جس کی کڑک اور دمک دُور دُور اسکی پہنچی جو ٹیگس پہ گرجی تو گنگا پہ برسی رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی ہری ہوگئی ساری کھیتی خدا کی ✦ انسان مر جاتا ہے۔ قوموں کو زوال آتا ہے۔ کائنات کی چیزیں بدل جاتی ہیں۔ آرائیں اور نظریے تبدیل ہو جاتے ہیں۔ صرف واقعات قائم ہیں۔ اور تغیّر کے متلاطم خیز سمندر میں اُستواری کی چٹان پر قائم ہیں۔ ایک نیا دَور آئیگا۔ اور یہ اندازِ کہن نئے عہد کیطرح تبدیل ہو جائیگا۔ دنیا کے عالم حقیقت کی عینک لگا لگا کر ان واقعات کو بغور دیکھینگے اور مسلمانوں کو تاریخِ عالم میں اصلی پوزیشن عطا کرینگے ؎

قریب آتا ہے روزِ محشر چھپیگا کشتوں کا خون کیونکر جو چپ رہیگی زبانِ خنجر لہو پکاریگا آستیں کا۔

ا . ب

[redacted]

جگن ناتھ

قدیم ہندوستان کی ایک پُراسرار کہانی

آپ کو اپنی کہانی قابل فہم بنانے کے لئے مجھے اسے شروع سے بیان کرنا چاہئے۔ بہت مدت کا ذکر ہے یعنی اتنی مدت کا جب سے کہ آپ کو تاریخ شروع ہونے کا یقین ہے۔ اس سے کہیں پہلے کا۔ دُور دراز برِاعظم میں ایک زبردست تہلکہ نے پرانے فطرت پرستی کے مذہب کے بعض معتقداؤں کو بے خانماں کر دیا بہتیری خاک چھان کے وہ تھکے ماندے اس مقام پر آ بسے۔ جو اب جگنا تھ کہلاتا ہے۔ عناصر پر اُن کو جو قابو حاصل تھا۔ اسے وہ برسوں تک صرف بھلائی کے لئے استعمال کرتے تھے۔ اس سے باشندوں میں اُن کا رُعب اور خوف بیٹھ گیا۔ لیکن زمانے گزرنے پر اُن کے جانشین انتہائی خودغرضیوں میں ایسے ملوث ہوئے کہ ان کا مدرسہ ناپاک جادو کا ملجا و ماوا بن گیا۔

آخرکار ایک نمایاں شخص جو اپنے پیشرؤں سے زیادہ غیر محتاط یا زیادہ دلیر تھا۔ دہشت انگیز طاقت کے ایک خبیث دیو کو بلانے اور کسیقدر تابعدار بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کی مدد سے وہ ایسے نفرت انگیز مظالم کرنے لگا۔ کہ خود اس کے برادری سے خارج مرید اُس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے اسے مار ڈالا لیکن اگرچہ انہوں نے اسے تو مار ڈالا تھا۔ لیکن اس دیو کو کس طرح دور کرتے جو اس نے جا کے کھڑا کر دیا تھا۔ اس نے ضلع بھر میں دُور دُور وہ تباہی اور غارتگری پھیلا دی۔ کہ خوف زدہ پیشوا بھی گھبرا اُٹھے کہ کیا کریں کیا نہ کریں۔

آخر اُنہوں نے شمال کے ایک مشہور و معروف جادوگر سے مدد مانگنے کا ارادہ کیا۔ جو اُن لوگوں کے برعکس ہمیشہ اپنی طاقت کو پاک اور شریفانہ مقاصد کے لئے استعمال کیا کرتا تھا۔ بڑی منت و سماجت پر وہ اُن کے لئے نہیں بلکہ چاروں طرف کی بیکس و بے بس مخلوق کی خاطر رضامند ہو گیا۔ کہ اسوقت جو کچھ بن پڑے اس پلید اثر کی جسے نہایت ناعاقبت اندیشی سے اُن کے سروں پر ڈالدیا گیا تھا۔ روک تھام کرے۔ لیکن بُری بات بھی سب سے اچھی بھلائی تھی جو کی جاسکتی تھی۔ کیونکہ شاید آپ کو یہ عجیب بات معلوم ہو۔ جادو کے قاعدوں کے بموجب اس کی ضرورت ہے کہ اس قسم کے دیو جن بھوت کے ساتھ بھی عدل کا برتاؤ کیا جائے جو کچھ ممکن العمل پایا گیا یہ تھا۔ کہ اس آفت کو محدود کیا جائے۔ اور معاملات کو اس طرح سرانجام دیا جائے کہ وہ پوجاری اس دیو سے ایک قسم کا معاہدہ کریں کہ اس طرح بیدھڑک تباہی کے عوض وہ صرف اِن جانوں کے لینے پر قناعت کرے۔ جو برضامندی اس کے بھینٹ چڑھیں۔ اس کے بعد صدیوں سے یہ عجیب و غریب

وحشیانہ معاہدہ بخوبی تکمیل پا رہا ہے

جب میں اس واقعہ کو بیان کرونگا آپ کو عہدنامہ کی قرارداد میں معلوم ہو جائینگی کہ ہر سات سال بعد جو بڑا میلہ
اس نام نہاد دیوتا کی تعظیم میں باقاعدہ لگتا ہے، اس میں کیا ہوتا ہے۔ پہلی پہل وہ رسم ہوتی ہے۔ جسے لکڑی کا دن کہا
جاتا ہے۔ ایک خاص صبح کو لمبی چوڑی لیکن خاموش بھیڑ پو پھٹنے سے ہی سمندر کے کنارہ پر جمع ہو جاتی ہے۔
کنارہ کے پتھروں پر مندر کے پجاری اپنے سرداروں کے گرد حلقہ باندھ کے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان سے کچھ
ہی آگے [illegible] سیدھے سادے آدمی۔ پجاری اور بڑھئی۔ کھڑے ہوتے ہیں جو اس خوفناک عہدنامہ کے موجب
موت کے منہ میں پھاندتے ہیں۔۔

کیونکہ جب پہلے پہل یہ ناپاک عہدنامہ ہوا تھا۔ موروثی پجاریوں کے سات خاندانوں اور بڑھیوں کے سات
خاندانوں نے (آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں پیشے بھی موروثی ہیں) دنیاوی آسودگی کے وعدہ کے معاوضہ
میں۔ جس وعدہ کو ہمیشہ بڑی توقیر سے پورا کیا جاتا رہا ہے۔ قسم کھائی کہ ہفت سالہ میلوں پر ہر ایک باری
باری ایک قائم مقام دیوتا کے حضور میں پیش کریگا۔ چنانچہ دونوں جو اس موقعہ کی پُرخوف عزت حاصل کرنے کے
لئے منتخب کئے جاتے ہیں الگ الگ کھڑے ہوتے ہیں اور ان سے لوگ وحشت کھاتے ہیں۔ کیونکہ وہ پہلے
ہی مافوق الفطرت دنیاؤں میں آ پہنچے خیال کئے جانے لگتے ہیں

جیسے ہی سورج سمندر سے باہر نکلتا ہے سب کی آنکھیں مشرقی اُفق پر لگی ہوتی ہیں۔۔ اور وہ شخص قابل
رشک متصور ہوتا ہے جو سب سے پہلے سمندر میں دور فاصلہ پر ایک چھوٹا سا سیاہ دھبہ دیکھ پاتا ہے
جو کنارہ کے اس خوفزدہ مجمع کے برابر قریب آتا جاتا ہے۔ جب یہ چیز پاس پہنچ جاتی ہے تو دیکھتے ہیں کہ
تین لکڑیوں کے شہتیر ہیں جو [illegible] ہونے کے باوجود برابر بہتے آتے ہیں ذرا آگے پیچھے نہیں ہوتے
حالانکہ ان میں کوئی چلانیوالی قوت دکھائی نہیں دیتی۔ آپ خیال کرینگے کہ [illegible] کی کوئی [illegible]
ہے؟ میرے دوست! اگر آپ خود اسے دیکھتے تو یہ بات ہرگز نہ کہتے۔ ممکن ہے آپ کی مایۂ ناز مغربی [illegible]
پیچیدہ اور قیمتی کلوں کی بدولت اس کیفیت کی نقل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ لیکن یہ بات اُن [illegible]
سے کیسے بن پڑسکتی ہے جو اُن ذرائع سے بالکل ناواقف ہیں۔۔ اور علاوہ اس کے ایسے گروہ کے
ہوتے ہیں جو ان کی ہر ایک نقل و حرکت کو دیکھتا رہتا ہے؟

خیر جو کچھ بھی ہو۔ یہ لکڑیاں آخر ساحل پر پہنچ جاتے ہیں اور انہیں پجاری بڑے ادب و احترام [illegible]
لیتے ہیں۔ اور مندر کے احاطہ کی ایک جھونپڑی میں لے جاتے ہیں جہاں اس منتخب بڑھئی کو اپنا کام
دینا ہوتا ہے۔ وہ ذوق و شوق سے اپنے کام میں لگ جاتا ہے جو یہ ہوتا ہے کہ وہ ان [illegible]

تین مورتیں بنانا ہے جو بعینہ ویسی ہوتی ہیں جو مندر کے سب سے اندر کے عبادت خانہ میں پہلے سے کھڑی ہوتی ہیں۔ وہ ہر روز اپنے کام میں خاص سرگرمی سے اس قدر مصروف ہوتا ہے کہ اسکو کھانے یا سونے کے لئے بھی مشکل ہی سے وقت ملتا ہے پہلے دو مصاحب یا برابر کی مورتیں طیار کی جاتی ہیں۔ پھر وہ بیچ کی مُورت بنانا شروع کرتا ہے جو خود اس دیوتا کی شبیہہ ہوتی ہے۔ پاس والے پھولے ہوئے سانس سے کہتے ہیں کہ اپنی کٹھن محنت کے اس مرحلہ پر خود دیوتا کا سایہ برابر اس کی ہمت بڑھاتا رہتا ہے۔ یہ سایہ صرف اُسے ہی نظر آتا ہے اور اس کے بعد پھر کبھی اس کے ہوش و حواس سے محو نہیں ہوتا۔ اور جوں جوں اس کا کام قریب الاختتام ہوتا جاتا ہے۔ وہ بالاستقلال زوال کے قریب پہنچتا جاتا ہے۔

انجام کار مورت بن چکتی ہے اور محنت کرنے والا جو اس پر اپنی اس قدر محبت بھری توجہ اور سرگرم دیدہ ریزی صرف کر چکتا ہے۔ اس کے برابر لیٹ جاتا ہے۔ اور اپنے آپ کو بالکل اس خوفناک گھٹنے کے سپرد کر دیتا ہے۔ یہ برابر اس غریب کے قریب ہوتا جاتا ہے اور اس شدید مقناطیسی کشش کا فعل زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ جو اس آدمی کی زندگی کو چوسے چلی جاتی ہے۔ آپ کہینگے یہ خیال کا نتیجہ ہے! شاید! لیکن نتیجہ وہی ہے کہ کسی صورت میں بڑھئی اپنے کام کے پورا ہونے کے بعد بارہ گھنٹے بھی نہیں جیا۔

اس کے تقریباً فوراً بعد جلوس کا دن آتا ہے جو اس میلہ کا منتہیٰ ہے۔ اس موقعہ پر وہ شامت کا مارا پجاری اس خوفناک عہد نامہ میں کا اپنا حصّہ پورا کرتا ہے۔ مقررہ دن کو صبح ہی بہت بڑے مجمع کے سامنے پجاری نہایت عزت و احترام سے اس نئی مورتوں کو بالکل اندر کی عبادتگاہ میں اُٹھا لے جاتے ہیں۔ اور اس مجموعہ کے سامنے جو پچھلے سات سال سے پُرانی تینوں مورتیں کھڑی ہوتی رہیں۔ زمین پر رکھدی جاتی ہیں۔ منتخب پُجاری کے سوا سب عبادتگاہ سے باہر نکل جاتے ہیں اور بڑے دروازے جو اس حصّہ کو اصلی مندر سے علیحدہ کرتے ہیں بند کر دیئے جاتے ہیں اور اس دیوتا کے خاص خادم کو ان پُراسرار مراسم کی ادائیگی کے لئے جن کو سوائے اسکے کسی اور انسان کی آنکھ نہیں دیکھ سکتی تن و تنہا چھوڑ دیا جاتا ہے

ان بند دروازوں میں جو کچھ ہوتا ہے کسی کو آجتک معلوم نہیں ہوا اور نہ آئندہ کبھی معلوم ہوگا۔ کیونکہ ان میں سے کوئی بھی جو صرف خود اس بات کو بیان کر سکتا اتنا نہ جیا کہ اس پُرخوف راز پر سے پردہ اُٹھاتا۔ دروازہ کے باہر سر بسجود پڑے محافظ پہرہ کا کام دیتے ہیں کہ کسی قسم کا خلل یا دخل واقع نہ ہو سکے۔ ان کا یہ کام محض برائے نام ہے کیونکہ کسی ہندوستانی کو اس خاموشی کے گھنٹہ میں اس عبادتگاہ میں داخل ہونے کے لئے کسی طرح کا لالچ نہیں دیا جا سکتا۔ خواہ اُسے گولکنڈہ کے خیالی زر و جواہرات ہی کیوں نہ دیئے جائیں۔ مندر کے اصلی حصّہ کا ہجوم کثیر نہایت عمیق سکوت میں مستغرق رہتا ہے حتے کہ گھنٹہ ختم

ہو جاتا ہے۔ اور بڑا پجاری زمین سے اُٹھ کے مؤدبانہ دہشت سے ان بڑے دروازوں کو ایک دفعہ پھر کھولتا ہے، ادھر بٹتے ہوئے کانوں کو باہر ذرا سی بھی آواز نہیں سنائی دیتی باینہمہ پجاری مورتوں کی جگہ تبدیل ہو گئی نئی نئی سپوترہ پہ قائم ہو گئیں۔ اور پرانی الگ زمین پہ پڑی ہوئی ہیں اور ان کے برابر میں وہ پجاری زبان بند بیٹھا ہوا دم توڑتا نظر آتا ہے۔ یہ بتایا جاتا ہے کہ دروازے کھولنے کے چند لحظہ بعد ہی وہ ختم ہو جاتا ہے۔ آج تک ان میں سے کوئی مرنے والا بات سے یا اشارہ سے اتنا بھی تو نہ بتا سکا کہ اسپر کیا بیتی!

صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ بڑھئی کو ان بتوں کے بناتے وقت یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ ہر مورت میں ایک خاص قطر کا گول سوراخ بنائے جو اندازے سے آدمی کی ریڑھ کی ہڈی کے برابر ہوتا ہوگا۔ اور کانوں کان یہ روایت مشہور ہے کہ اس مرنے والے پجاری کا ایک یہ بھی فرض ہوتا ہے کہ پرانی مورتوں کی اس عجیب نالی میں سے جسے دیکھ کے کوئی زندہ نہیں رہ سکا۔ نکال کے نئیوں کے اسی مقام میں رکھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد اس دیوتا کی طبیعت اپنے قربان خادم کے دل پر اس ریت رسم کا القا کرتی ہے جو واجب الادا ہوتی ہے

اسی اثنا میں مندر سے باہر بڑے جلوس کا پورا سامان ہو چکتا ہے اور دیوتا کی بڑی چوبی گاڑی دروازہ تک کھینچ کے لائی جاتی ہے۔ یہ گاڑی کچھ عجیب صورت کی ہوتی ہے۔ جسکو تصویر یا مجسمہ کے بغیر بیان کرنا ذرا مشکل ہے۔ اس کا نچلا حصہ ایک بڑے مستطیل صندوق سے مشابہ بتایا جا سکتا ہے جسکے پہلوؤں کے اردگرد دیوتاؤں کی تصویریں اپنے علیحدہ علیحدہ مقام پر گہرے گڑھوں میں کھدی ہوتی ہیں اور وہ عمدہ گھڑے ہوئے ستونوں سے محفوظ کی ہوئی ہوتی ہیں اور اس پر چبوترہ یا گھمبا کے طور پر ایک پچھلی ٹانگوں پر کھڑے شیر کا بڑا بھاری بت ہوتا ہے جس کی پشت پر چھتری دار منبر سا ہوتا ہے۔

جب وہ وقت آتا ہے بڑا پجاری نئی مورتی کے سامنے زمین تک جھک کے معمولی سجدہ وانی طریقہ سے اس کی گردن میں پھولوں کا ہار ڈالتا ہے اور اس کی کمر میں نہایت مرصع پیٹی لگاتا ہے۔ اپنے شکاروں کے خون سے تروتازہ ہو کرکے یہ دیو اپنے وفادار جاتریوں کو ازراہ عنایت اپنی غیر معمولی طاقت کا حیرت انگیز کرشمہ دکھاتا ہے۔ بیس فٹ لمبا باریک ریشمی فیتہ بت کی پیٹی میں سے نکالا جاتا ہے اور اس کے سرے دو پجاری پکڑ لیتے ہیں جو اس کے راستہ کی سیدھ میں تو نہیں ہوتے لیکن اس سے دس فٹ آگے ہوتے ہیں۔ مندر کا وسطی راستہ خالی کر دیا جاتا ہے۔ اور دونوں پجاری آہستہ سے فیتے کو ٹھوکا لگاتے ہیں۔ اس ٹھکی کے لگنے سے بھاری چوبی بت اس خالی کئے ہوئے راستہ پر لمبی لمبی قلانچیں لگاتا ہے۔ پجاری اس کے سامنے آگے بڑھ جاتے ہیں اور ہر قلانچ پر ویسا ہی نرم ٹھوکا لگاتے جاتے ہیں۔ آپ کہینگے بالکل ناممکن؟ یا اگر واقعی ایسا ہی ہے تو پجاریوں کی کوئی عیاری ہے؛ جو آپ کا جی چاہے خیال کیجئے۔ لیکن بھلا یہ تو بتائیے کہ کیونکر ایسا ہوتا

ہے! بچاری جو ٹھمکی دینے میں اُنگلی اور انگوٹھے کی ایک ذرا سی حرکت ہوتی ہے جو فیتہ کو کس کے کھینچنے کے لئے بھی کافی نہیں ہوتی اور یہ یقینی بات ہے۔ کہ اور کوئی جر ثقیل کی قسم کی قوت استعمال نہیں کیجاتی۔

لیکن اس سے بھی بڑی حیرت انگیز بات اب پیش آتی ہے۔ جب بُت اس اوپر والے طریقہ سے دروازہ پر جہاں اُس کی گاڑی اُس کے لئے کھڑی ہوتی ہے پہنچ جاتا ہے۔ دونوں پجاری اسی طرح اس فیتہ کے سرے ہاتھوں میں لئے چبوترہ پر چڑھ جاتے ہیں۔ اُن کے دوسرے ٹھوکے پر مورت پھدک کے ان کے برابر چبوترہ پر آکھڑی ہوتی ہے۔ اور پھر کسی مزید رہنمائی کا انتظار کئے بغیر وہ ایک تاریخ لگا کے اُس کے منبر پر چڑھ جاتی ہے اور اپنے آپ کو آدھا موڑ دیتی ہے تاکہ گاڑی کے سامنے اس کا منہ رہے۔ عقل میں یہ بات نہیں آتی۔ یہی بات ہے نا! لیکن ہزاروں آدمی ہیں ہزاروں جو اس کی گواہی دے سکتے ہیں۔ آخر معلوم تو ہو کیوں ایسا اعتبار نہیں آتا؟ اگر مغرب میں ایک بھاری میز ادھر اُدھر ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ آپکے بعض سائنسدانوں نے اس طرح ہوتے دیکھا ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کیوں ایک بھاری مورتی مشرق میں ویسا ہی نہ کرے؟ زمین و آسمان میں ایسی بہت سی باتیں ہیں جن کا آپکے فلسفہ کو خواب و خیال بھی نہیں آیا۔ اور ایک واقعہ بہت سے نظریوں سے اچھا ہے۔

طاقت کے اس حیرت انگیز تماشہ کے بعد بڑا جلوس چلنا شروع ہوتا ہے اور مورت بڑی دھوم دھام سے شہر کی چاروں طرف پھرائی جاتی ہے اُس کے چلنے میں ہر قسم کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہے۔ بہت سے گھنٹے و گھنٹیاں جو اُس میں لگی ہوتی ہیں عجب مزے کی ٹن ٹن کی آواز نکالتی ہیں اور ہجوم عقیدت سے جے کارے لگاتا ہے۔ اس گشت کے وقت معتقد لوگ بعض اوقات گاڑی کے پہیوں کے نیچے خود جا پڑتے اور اس کے نیچے کچل کے جان دینے کو اپنے خونخواہ دیوتا پر رضامندی کی قربانی چڑھانا سمجھتے ہیں۔ اور اپنے لئے اسمیں بہتری خیال کرتے تھے آپ کی حکومت سمجھتی ہے کہ اُس نے ان سب باتوں کا انسداد کر دیا ہے۔ لیکن جانثاری اور عقیدتمندی ایک حکم سے نہیں مٹ سکتی ہیں۔ غالباً ایک طرح جگناتھ اتنی ہی جانیں لے لیتا ہے۔ جتنی وہ کبھی لیا کرتا تھا۔ جس قرار نامہ کی رُو سے وہ کھلم کھلا کشت و خون کرنے سے بند ہو گیا اُسے اُس سے منع نہیں کرتا کہ وہ ان جانوں کو قبول نہ کرے جو برضا و رغبت اس کی نذر ہوں یا وہ ضعیف الاعتقاد عبادت گزاروں پر اُس کے مندر میں بھینٹ چڑھنے کا اثر نہ ڈالے اور بلا شبہ جب ممکن ہو وہ ایسا کرتا رہتا ہے۔

حقیقت میں یہ نہایت حیرت انگیز اور ہیبت ناک کہانی ہے۔ کیوں ہے کہ نہیں؟ لیکن ہندوستان کے دُور دُور گوشوں میں بہت سی عجیب باتیں واقع ہوتی رہتی ہیں جن کا حکمران جماعت کو شان گمان بھی نہیں۔ یہ ایسی باتیں ہیں جو انکے لئے بالکل ایسی ہی ناقابل یقین ہیں جیسے جگناتھ کے میلہ کے یہ من و عن سچے حالات۔

محمد ظفر

کلامِ فطرت

ہر وقت آئینے میں ہے وہ محوِ دیدِ حُسن ۔ مشاطۂ جمال نے پائی کلیدِ حُسن
ہو کر رہے گا خونِ تمنا بہار میں ۔ نسرین و نسترن کی اسی میں ہے عیدِ حُسن
دیکھے کوئی جمال کی ناز آفرینیاں ۔ شوخی غلامِ ناز حیا ہے مریدِ حُسن
وہ جلوہ بے نقاب تو دیکھا نہ جائیگا ۔ صورتکدے میں حُسن کے ہوں ناامیدِ حُسن
کیوں مست ہو نہ کوئی یہ آئینہ دیکھ کر ۔ رُخسارِ لالہ رنگ ہے جامِ نبیدِ حُسن
کیا کہیے دل کا حال کیا کیا بہار نے ۔ گلزارِ رنگ و بُو میں ہوں فطرتؔ شہیدِ حُسن

تفضل حسین فطرت

لمعاتِ جوش

ایدل وہ آستان ہے اب کیوں دھڑک رہا ہے؟ ۔ وہ اُڑ رہا ہے پرچم، وہ در جھلک رہا ہے!
اک عکس پڑ رہا ہے رگ رگ میں ہے تلاطم ۔ طالع ہوا ہے سورج دریا چمک رہا ہے
ہنگامۂ طرب سے ہر ذرّہ میکدہ کا ۔ شیشے کھنک رہے ہیں ساغر چھلک رہا ہے
غفلت شباب کی ہے دل معرفت کا جویا ۔ جھونکوں میں آندھیوں کے شعلہ بھڑک رہا ہے
مُطرب نے آج کیسا سوز و گداز پھونکا ۔ پتھر سُلگ رہے ہیں، کانٹا مہک رہا ہے
جذبات کا ہے طوفاں محفل میں اُنکی آمد ۔ آنکھیں اُٹھی ہوئی ہیں پردہ سرک رہا ہے
یہ کون ہنس رہا ہے رُخ سے نقاب اُلٹے؟ ۔ آنچ اُٹھ رہی ہے طورِ سینا دھک رہا ہے
ہے دیدنی چمن میں بادِ سحر کی شوخی ۔ شاخیں لچک رہی ہیں غنچہ چٹک رہا ہے
بیساختہ کسی کی یاد آرہی ہے دل میں ۔ جنگل ہے۔ جھٹپٹا ہے کوندا لپک رہا ہے
آثار کہہ رہے ہیں شاید وہ جلوہ گر ہوں ۔ اس طرح جوشؔ دل کا چھالا ٹپک رہا ہے

جوش ملیح آبادی

حُرُوفِ مُنفردہ

۱۔ چھاپہ کے حُروف ۔ عربی فارسی اردو کے حروف تہجی کی رائج الوقت صورتیں اسکے موجدوں نے ایسی قائم کی ہیں کہ جنکے سیکھنے میں عرصۂ کثیر صرف ہوتا ہے اور مفردات کو جب مرکبات میں لکھتے ہیں تو اکثر حرف کی وہ صورت بدل جاتی ہے ۔ مثلاً بائے موحدہ مفرد کی صورت ب ہے مگر الف کے ساتھ یہ صورت ہوتی ہے مثلاً با میں دیکھو اور جیم کے ساتھ ملنے میں یہ صورت ہوتی ہے مثلاً بج میں دیکھو اور لفظ کے بیچ میں اور ہی صورت یعنی بہ ہو جاتی ہے مثلاً دہر شبیہ میں جب لفظ کے آخر میں آتی ہے تب البتہ اپنی صورت میں نظر آتی ہے وعلی ہذا القیاس اور کتنے ہی حرفوں کا یہی حال ہے ۔ ادنیٰ توجہ سے ہر حرف کا حال معلوم ہو سکتا ہے ۔

۲ ۔ قدیم طرز تحریر میں حرفوں کے جوڑ بندیں جو مشکل پیش آتی ہے اس کا علاج ٹائپ بنانے کیلئے یہ کیا ہے کہ مختلف قسم کے جوڑ ایجاد کئے ہیں اور حرفوں کی صورتوں کو توڑ مروڑ کر کچھ کا کچھ کر دیا ہے اور ان کا نام ابتدائی وسطی اور آخری حروف رکھا ہے ۔ جو بجائے خود نہایت پریشان کن ہیں ان سے چھاپہ کے کام میں سخت رکاوٹ پیدا ہوتی ہے کیونکہ اس میں روپیہ اور وقت اور جگہ کا زیادہ صرف ہے ۔ مجھکو مدت دراز سے درس و تدریس کے شغل اور تجربہ سے یہ حاصل ہوا ہے کہ حروف کی یہ بوقلمونی کیفیت خاص خاصیت بہروپیاپن کہ جب چاہیں جس صورت میں متشکل ہو جائیں مبتدیوں کی ہمت کو توڑ دیتا ہے ۔ اور انکو حیرت میں ڈالدیتا ہے اور مہذب دنیا کو ان فوائد سے محروم رکھتا ہے جو چھاپہ سے بہت کچھ زیادہ حاصل ہونا ممکن تھا

عرب ۔ ایران ہند میں جہاں اس خط میں تمدنی لکھی پڑھی اور درس و تدریس میں تھی اور اب بھی درس و تدریس میں ہیں بلکہ یورپ میں بھی یونیورسٹیاں علم و ادب کا منبع و مخزن ہے کسی نے اس طرف توجہ نہیں فرمائی ۔ کتابت کی پیچیدگیاں اور مشکلات دور دانشور دور کرکے ایک ایسے حروف تہجی تجویز کئے جاتے جن کے ذریعہ سے چھاپہ سہل اور خواندگی اسہل ہو جاتی ۔ اور ملنے کی وجہ سے جو صور بعض حروف حاصل کرتے ہیں ان کی تعداد کم ہو جاتی اس سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ رائج الوقت حروف تہجی کو قطعاً چھوڑ کر ایک جداگانہ حروف تہجی ایجاد کئے جاتے ۔ بلکہ منشا یہ ہے کہ ہر ایک حرف کی رائج الوقت صورتوں میں سے صرف ایک ایک صورت پسند کیجاتی اور وہ صورت حسب تفصیل مندرجہ ذیل شرائط پر منتخب ہوتی ۔

شرطِ اوّل حرف لفظ کے آخر میں ہو یا وسط میں یا اول ہمیشہ ایک ہی صورت پر لکھا جائے ۔

شرط دوم رائج الوقت حروف کا اوّل حصہ ہو یا آخر حصہ جو کار آمد نہ ہو یا زائد حصہ سمجھا جائے قطع کر دیا جائے اور کوئی ایک حصہ قائم رکھا جائے جس سے اب تک مطلب حاصل ہوتا رہا ہے۔

شرط سوم اگر کسی حرف میں کچھ اضافہ

کیا جائے تو مرف آنا ہی کیا جائے کہ رائج الوقت تحریر کے پڑھنے والے کو اس قدر اضافہ ہونے پر حروف کی شناخت میں زیادہ تکلف نہ ہو اگر خفیف تکلف ہو تو مضایقہ نہیں ہے۔

شرط چہارم حروف کی اونچائی برابر ہو تاکہ چھوٹے توازی کے درمیان ہر حرف آجائے اور اگر کوئی حرف خط متوازی مذکورہ سے باہر نکلا ہوا ہو تو وہ حرف ⅓ یعنی ایک ثلث سے زائد اونچا نہ ہو۔

شرط پنجم اکثر حروف کے عرض طول میں تفاوت کم ہو۔

شرط ششم ہر حرف واضح ہو اور علامت ایسی ہو کہ حرف اپنی ہمصورت سے تمیز ہو سکے صاف ہو۔

شرط ہفتم ہر حرف میں سادگی ہے پیچیدگی نہ ہو

شرط ہشتم بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ انکے اعراب میں لوگ غلطی زیادہ کرتے ہیں اور خاص حرف پر اعراب لگانے سے لفظ صحیح پڑھ لیا جاتا ہے تو وہاں اعراب لگا یا جائے۔

شرط نہم بعض حروف کے تلفظ خاص مقام پر خاص قسم کے ہوتے ہیں انکی علامت بھی حرف میں موجود ہو۔

شرط دہم جملہ حروف علیحدہ علیحدہ رہیں۔ کوئی ایک دوسرے سے نہ ملے اور لفظ کے درمیان بھی فاصلہ لازم ہے تاکہ پڑھنے میں دقت نہ ہو

وتلک عشرۃ کاملۃ

صور حروف منفردہ

۵۔ حروف منفردہ کی اساس صرف (۱۴) صور پر منحصر ہے

ان ح د ر س ص ط ع و ر م ہر د

ان چودہ صوروں میں علامتیں اور نقطے لگا کر پورے ۳۶ حروف کے صور بنالو ا ب پ ت ٹ ث ج چ ح خ د ڈ ذ ر ڑ ز ژ س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک گ ل م ن ہ ر ی

۳۶ حروف متذکرہ بالا میں پانچ حرف یعنی ا ن و ہ ی آسانی تلفظ کے لئے چند اور علامتوں کے محتاج ہیں۔ اور اس طرح پر ان پانچ کے علاوہ انہیں سے پندرہ صورتیں اور بنتی ہیں آ ں ئ یٔ ے ں ٹ ؤ ؤ ۂ ۂ ہ ہ ہ

پس ۳۶ اور ۱۵ حرف ملکر ۵۱ صور حروف ہوتے ہیں اکیاون صور حروف منفردہ ۱۱ آ ب پ ت ٹ ث ج چ ح خ د ڈ ذ ر ڑ ز ژ س ش ص ض ط ظ ع غ و ؤ ؤ ف ق ک گ م ن ں ہ ۂ ہ ہ ہ ی ئ یٔ ے ں ل

ان اکیاون حروف میں سے جن پر ہو سکے ان پر حرکات ثلثہ زیر زبر پیش لگاؤ تو قریب یکصد و بست و پنج (۱۲۵) اصوات کے پیدا ہونگے اور غالب ہے کہ دنیا کی کل زبانوں کے حروف تہجی کی آوازیں معمولی ہدایت تھوڑی سی مشق سے زبان پر جاری ہو سکیں گی۔

حروف قدیم سے حروف منفردہ کا انتخاب

۶۔ حروف قدیم سے حروف منفردہ کے جو صور ایسے کو پسند کئے ہیں۔ ان کی تفصیل اور ان کے جدید نام مختصر و مطول بچوں کے سمجھنے کو اور معمولی طور سے بولنے کو اور کتب لغات وصرف ونحو و علمی کتابوں میں اصطلاحا تحریر کرنے اور بولنے کی غرض سے اور وجہ وضع علامات بالتفصیل لکھتا ہوں +

حروف قدیم

ا ب پ ت ٹ ث ج چ ح خ

د ڈ ذ ر ڑ ز ژ س ش ص ض ط ظ ع غ

ف ق ک گ ل م ن و ہ لا ی ے ۔

کیفیت حروف منفردہ

۱ آ

	اسم مختصر	اسم مطول
ا ۔ ا	آ	راست
آ	آی	ممدودہ

الف نسخ کی صورت بمقابلہ الف نستعلیق کے
ہم نے اس لئے پسند کی ہے کہ واضح تر ہے اور نیز یہ کہ ایک کے
عدد (۱) سے مشتبہ نہ ہو جائے۔ یہ صورت قدیم ہو طعواو
بندہ نے یہ ہے ایک الف عاری از علامت ہو اس کا اسم
مختصر آ ہے اور اسم مطول آ راست دوسرے پر مد (~)
کا ہو ہے اسکا اسم مطول آ ممدودہ ہو زیر زبر پیش اسی طرح
پہ لگائیں گے آ اِ اُ یہ ہی اعراب اور حرفوں پر لگائے جاتے ہیں
۔ بِا بَا بُا

۲ ب با بائے موحدہ تحتانی اس کے نیچے
ایک نقطہ ہے۔ اصل بائے موحدہ تحتانی کی صورت
ب ہے ہم نے اسکی کشش کو قصر کر کے قطع
کر دی صورت قدیم کی صورت قدیم کی طرح اس کو نیا
حاصل صورت ایجاد بندہ نہیں ہے۔ کیونکہ تحریر قدیم میں
الف کے ملنے میں یہ صورت پیدا ہوتی ہے چنانچہ با
سے الف دور کرو تو یہ صورت ب باقی رہتی ہے۔
اس کا اسم مختصر با اور اسم مطول بائے موحدہ تحتانی

		اسم مختصر	اسم مطول
۳	پ	پا	پائے فارسی اسکے نیچے تین نقطے ہیں۔
۴	ت	تا	تائے مثناۃ فوقانی اس پر دو نقطے ہیں
۵	ٹ	ٹا	ٹائے ہندی اس پر ط ہے۔
۶	ث	ثا	ثائے مثلثہ فوقانی اس پر تین نقطے ہیں

ان سب یعنی چار حرفوں مندرجہ بالا کو
اسی طرح پر بنایا ہے جس طرح پر بائے موحدہ کو بنایا اور تخفیف کیا ہے

ج چ ح خ

		اسم مختصر	اسم مطول
۷	ج	جا	جائے عربی
۸	چ	چا	چائے فارسی
۹	ح	حا	حائے حطی
۱۰	خ	خا	خائے معجمہ

یہاں حروف قدیم کے دوائر خارج
کئے ہیں اور سرے قائم رکھے ہیں۔

د ڈ ذ

		اسم مختصر	اسم مطول
۱۱	د	دا	دای مہملہ
۱۲	ڈ	ڈا	ڈای ہندی
۱۳	ذ	ذا	ذای معجمہ

چونکہ نستعلیق کی دال اکثر واو سے
ملتبس و مشتبہ ہو جاتی ہے۔ اس لئے نسخ کی دال
پسند کی ہے۔

ر ڑ ز ژ

		اسم مختصر	اسم مطول
۱۴	ر	را	رای مہملہ
۱۵	ڑ	ڑا	ڑای ہندی
۱۶	ز	زا	زای معجمہ
۱۷	ژ	ژا	ژای فارسی

+ ۔

کیا جائے تو صرف اتنا ہی کیا جائے کہ رائج الوقت تحریر
کے پڑھنے والے کو اس قدر اضافہ ہونے پر حروف کی شناخت
میں زیادہ تکلف نہ ہو اگر خفیف تکلف ہو تو مضایقہ نہیں ہے

شرط چہارم حروف کی اونچائی برابر ہو تاکہ دو خطوط
متوازی کے درمیان ہر حرف آجائے اور اگر کوئی حرف خطوط
متوازی مذکورہ سے باہر نکلا ہوا ہو تو وہ حرف ⅓ یعنی
ایک ثلث سے زائد اونچا نہ ہو۔

شرط پنجم اکثر حروف کے عرض طول میں تفاوت
کم ہو۔

شرط ششم ہر حرف واضح ہو اور علامت میں سے
حروف اپنی ہم صورتوں سے تمیز ہو سکے صاف ہو۔

شرط ہفتم ہر حرف میں سادگی رہے پیچیدگی نہ ہو

شرط ہشتم بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ انکے
اعراب میں لوگ غلطی زیادہ کرتے ہیں اور خاص حرف پر
اعراب لگانے سے لفظ صحیح پڑھ لیا جاتا ہے تو وہاں اعراب
لگایا جائے۔

شرط نہم بعض حروف کے تلفظ خاص مقام پر خاص
قسم کے ہوتے ہیں انکی علامت بھی حرف میں موجود ہو۔

شرط دہم جملہ حروف علیحدہ علیحدہ رہیں۔ کوئی
ایک دوسرے سے نہ ملے اور لفظ کے درمیان بھی فاصلہ
لازم ہے تاکہ پڑھنے میں دقت نہ ہو

وتلک عشرۃ کاملۃ

صور حروف منفردہ

۵۔ حروف منفردہ کی اساس صرف (۱۴) صور پر منحصر ہے
ا ں ح د ر س ص ط ع و ل م ہ ی

ان چودہ صوروں میں علامتیں اور نقطے لگا کر پورے ۳۶ حروف
کے صور بنالو ا ب پ ت ٹ ث ج چ ح خ د ڈ ذ
ر ڑ ز ژ س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق
ک گ ل م ن و ہ ی

۳۶ حروف متذکرہ بالا میں پانچ حرف یعنی ا ن و ہ ی
آسانی تلفظ کے لئے چند اور علامتوں کے محتاج ہیں اور
اس طرح پر ان پانچ کے علاوہ انھیں سے پندرہ صورتیں
اور بنتی ہیں آ ں ۓ ئ ں ٔ ں ٔ ں و ؤ ۏ ہ ۂ ہ ہ ہ
پس ۳۶ اور ۱۵ حرف ملکر ۵۱ صور حروف ہوتے
ہیں اکیاون صور حروف منفردہ ۱۱ آ ب پ ت ٹ ث
ج چ ح خ د ڈ ذ ر ڑ ز ژ س ش ص ض
ط ظ ع غ ف ق ؤ ۏ ک گ م ن ں
ہ ۂ ہ ہ ہ ہ ی ئ ۓ ں ں ں

ان اکیاون حروف میں سے جن پر ہو سکے ان پر حرکات
ثلثہ زیر زبر پیش لگاؤ تو قریب یکصد و بست و پنج (۱۲۵)
اصوات کے پیدا ہونگے اور غالب ہے کہ دنیا کی کل زبانوں
کے حروف تہجی کی آوازیں معمولی ہدایت تھوڑی سی مشق
سے زبان پر جاری ہو سکیں گی۔

حروف قدیم سے حروف منفردہ کا انتخاب

۴۔ حروف قدیم سے حروف منفردہ کے صور ایسے کیوں
پسند کئے ہیں۔ ان کی تفصیل اور ان کے جدید نام مختصر
و مطول بچوں کے سمجھنے کو اور معمولی طور سے بولنے کو
اور کتب لغات و صرف و نحو و علمی کتابوں میں اصطلاحاً
تحریر کرنے اور بولنے کی غرض سے اور وجہ و غرض علامات
بالتفصیل لکھتا ہوں +

حروف قدیم

اب پ ت ٹ ث ج چ ح خ
د ڈ ذ ر ڑ ز ژ س ش ص ض ط ظ ع غ
ف ق ک گ ل م ن و ہ لا ی ے ۔

کیفیت حروف منفردہ

ا آ اسم مختصر اسم مطول
۱- ا ا آ راست
آ آی ممدودہ

الف نسخ کی صورت بمقابلہ الف نستعلیق کے ایسی اس لئے پسند کی ہے کہ واضح تر ہے اور نیز یہ کہ ایک کے ہندسہ (۱) سے مشتبہ نہ ہو جائے یہ صورت قدیم ہی ہے ایجاد بندہ نہیں ہے ایک الف عاری از علامت ہے اس کا اسم مختصر آ ہے اور اسم مطول آ راست دوسرے کے پر مد (~) لگا ہوا ہے اسکا اسم مطول آ ممدودہ ہے زبر زیر پیش اصطلاح پر لگائیں گے اَ اِ اُ یہی اعراب اور حرفوں پر لگائے جاتے ہیں

ب پ ت ٹ ث

۲ ب با (اسم مختصر) بائے موحدہ تحتانی (اسم مطول) اس کے نیچے ایک نقطہ ہے۔ اصل بائے موحدہ تحتانی کی صورت (ب ب) ہے میں نے اسکی کشش کو مختصر کر کے قطع دائرہ کی صورت قدیم کی طرح اس کو بنا لیا ہے یہ صورت ایجاد بندہ میں ہے۔ کیونکہ تحریر قدیم میں الف کے ساتھ ملنے میں یہ صورت پیدا ہوتی ہے چنانچہ با میں سے الف دور کردو تو یہ علامت ب باقی رہتی ہے۔ اس کا اسم مختصر با اور اسم مطول بائے موحدہ تحتانی ہے۔

۳ پ پا (اسم مختصر) پائے فارسی (اسم مطول) اسکے نیچے تین نقطے ہیں۔
۴ ت تا تائے مثناۃ فوقانی اس پر دو نقطے ہیں
۵ ٹ ٹا ٹائے ہندی اس پر ط ہے۔
۶ ث ثا ثائے مثلثہ فوقانی اس پر تین نقطے ہیں

ان سب بنی چار حرفوں مندرجہ بالا کو اسی طرح پر بنایا ہے جس طرح پر بائے موحدہ کو بنایا اور منتخب کیا ہے

ج چ ح خ

اسم مختصر اسم مطول
۷ ج جا جائے عربی
۸ چ چا چائے فارسی
۹ ح حا حائے حطی
۱۰ خ خا خائے معجمہ

یہاں حروف قدیم کے دوائر خارج کئے ہیں اور سرے قائم رکھے ہیں۔

د ڈ ذ

اسم مختصر اسم مطول
۱۱ د دا دای مہملہ
۱۲ ڈ ڈا ڈای ہندی
۱۳ ذ ذا ذای معجمہ

چونکہ نستعلیق کی دال اکثر واو سے ملتبس و مشتبہ ہو جاتی ہے۔ اس لئے نسخ کی دال پسند کی ہے

ر ڑ ز ژ

اسم مختصر اسم مطول
۱۴ ر را رای مہملہ
۱۵ ڑ ڑا ڑای ہندی
۱۶ ز زا زای معجمہ
۱۷ ژ ژا ژای فارسی

رائے نستعلیق اگرچہ خطوط متوازی کے درمیان میں
بے تکلف آجاتی ہے۔ مگر دونوں طرف باریک نوکیں
ہونے کی وجہ سے کچھ کم رواں اور کم حیثیت سا حرف
معلوم ہوتا ہے اس لئے نستعلیق کی را پسند نہیں
کی نسخ کی پسند کی ہے چاروں حروف مذکورہ کی
ایک صورت ہے صرف علامات کا فرق ہے۔

		اسم مختصر	اسم مطول
	س ش		
۱۸	س	سا	سائے مہملہ
۱۹	ش	شا	شائے معجمہ

قدیم سین سے دائرہ خارج کیا گیا مگر
اس حرف کا پہلا دندانہ موٹا بنایا ہے تاکہ واضح رہے اور
تین کے مشابہ ہونے سے شبہ نہ ہو اس کے اوپر تین
نقطے لگانے سے شین بنتا ہے اور اس (شـ)
صورت شین کی ضرورت نہیں رہی۔

		اسم مختصر	اسم مطول
	ص ض		
۲۰	ص	صا	صائے عربی
۲۱	ض	ضا	ضائے عربی معجمہ

ان دونوں کے دائرے خارج کئے گئے

		اسم مختصر	اسم مطول
	ط ظ		
۲۲	ط	طا	طائے حطی
۲۳	ظ	ظا	ظائے مؤلف الف دار

یہ دونوں حرف بدستور رہیں گے۔

		اسم مختصر	اسم مطول
	ع غ		
۲۴	ع	عا	عائے مہملہ
۲۵	غ	غا	غائے معجمہ

ان دونوں کے دوائر خارج ہوگئے ہیں صرف سرا باقی
رکھا ہے اب یہ صورت عین کی ضرورت باقی نہیں ہے
عین پر نقطہ لگانے سے غین بن گیا۔

		اسم مختصر	اسم مطول
	و وٗ وَ وِ		
۲۶	و	وا	وائے مجہول

یہ واو مجہول ہے اس پر کوئی علامت نہیں

وٗ	وا	وائے معروف اس پر الٹا پیش ہے
وَ	وا	وائے ماقبل مفتوح واو سے پہلے

حرف پر زبر ہے واو پر سکون ہے۔

وِ	وا	وائے معدولہ واو کے نیچے ایک

عرضی خط ہے

۲۷	ف	فا	فائے یک نقطہ

قدیم ف سے کشش کو خارج کیا۔ یا
یوں کہو کہ واو پر ایک نقطہ لگا دیا تو فا بن گئی

		اسم مختصر	اسم مطول
۲۸	ق	قا	قائے دو نقطہ

صرف دائرہ قدیم دور کرنے سے بن گیا یا واو
پر دو نقطے لگانے سے

ل ک گ

۲۹	ل	لا	لائے عاری

قدیم لام سے صرف دائرہ دور کرنے سے حاصل ہوا

۳۰ ک کا کائے یک مرکزی ک کی کشش
قطع کردی کہ رہ گیا یا ل پر مرکز لگانے سے بن گیا
۳۱ گ گا گائے دو مرکزی ل پر دو مرکز لگانے
سے بنا ہے کاف اور گاف کے مرکز خطوط متوازی
کے اوپر پہلے حصہ نکلے رہیں گے۔

۳۴ م ما ماے وصار یہ حرف بدستور جو حالت وقف میں ؟ پڑھی جاتی ہے۔

ہے مرف اس کی دم ½ حصہ خطوط متوازی کے نیچے کو نکلی ہوئی ہے۔

ن ن اسم مختصر اسم مطول

۳۳ ن نا ناے ظاہر یہ نون ظاہر کی صورت ہے اس کے پیٹ میں نقطہ ہے۔

ں نا ناے غنہ اس میں نقطہ باہر ہے

ہر ہر ہر ہر ہر ہر

۳۴ ہر ہا اسم مختصر اسم مطول ہائے ظاہر اس کے نیچے

ا علامت استادان قدیم نے جملہ اقسام ہائے ہوز

مختصر صورت جو بنائی ہیں جیں لے مر بیلی ہر

اور اسکے نیچے ا علامت لگائی ہے اور نام ہے

ظاہر ہے اس میں سادگی ہے اور حروف سے دونو

طرف کے ملنے میں آسانی ہے۔

ھر ہا اسم مختصر اسم مطول ہائے مخلوط یا ہائے مخلوط التلفظ

مثلاً بھیوٹ لغات ہندی اور انگریزی میں یہ ہا بکثرت

آتی ہے اس کے نیچے ا علامت ہے اور اوپر حرف

ما سبق سے ملنے کو ہ علامت ہے

ۂر ہا ہائے ظاہر (مع الہمزہ) مع مثنی

اوپر ء علامت ا نیچے تلفظ یا ٹ ت جیسے

زبانۂ رنگ میں

ہر ہا ہائے ہوز مختفی اس پر کوئی علامت

نہیں ہے مثلاً بندہ

ۂر ہا ہائے ہوز مع الہمزہ مختفی مثلاً بندۂ خدا

ۃر تا ہائے وقف یا تائے موقوف یہ وہ تا ہے

۳۵ ڑ ڑا ڑای مثنی

ﮮ ﯽ ﯾ ں ٮٔ ںٰ

۳۶ ی یا یائے معروف جیسے گہی تختی

ی یہ صورت یائے معروف کی ہے اس کے نیچے دو نقطے ہیں اس کو ی میں سے جو قدیم ہے اس طرح بنایا ہے کہ اوپر کا سرا اور وسطی نقطہ نکال دیا تو (ی) باقی رہ گیا

ﭗ یا اسم مختصر اسم مطول یائے معروف مخلوط اس کے دو نقطے قائم ہیں اور اوپر ہ ہے جیسے کیا معنی چہ میں اور کیوں یعنی چہ را میں ہے

یٔ یا یائے معروف مع الہمزہ اس کے دو نقطے قائم ہیں اور اوپر ہمزہ ہے جیسے بیئی

ں یا یائے مجہول اس پر کوئی علامت نہیں اور دو نقطے حذف کئے گئے۔

ںٔ یا یائے مجہول مع الہمزہ اس کے نیچے کے دو نقطے گرا دئے اوپر ہمزہ ہے۔

ںٰ آ اے مقصورہ یہ حرف صورت میں یائے مجہول کی طرح بلا نقطہ لکھا جاتا ہے مگر اس پر ایک چھوٹا سا الف استادہ ہوتا ہے مثلاً مرتضیٰ اعلیٰ میں۔

۷۔ آسانی فہم کے لیے حروف منفردہ کے مختصر نام ایک جگہ لکھتا ہوں۔

آ با پا تا ٹا ثا جا چا حا خا دا ڈا ذا را

زا ژا سا شا صا ضا طا ظا عا غا وا

تا لا کا گا م نا ہا ئ یا

۸۔ حرفوں کے مختصر نام جو میں نے اوپر لکھے ہیں انکی مصلحت یہ ہے کہ اگر بیتکے (۱) دو یا دو تو حرف کی وہ صورت بن رہیگی جس کو زیر زبر پیش کے ساتھ دوسرے حرف کے ساتھ ملا سکتے ہیں قدیم اسما حروف میں نصف حرفوں کے نام سے صحیح اصوات کا نکالنا اتنا آسان نہ تھا مثلاً الف جیم دال ڈال ذال سین شین صاد ضاد عین غین قاف کاف گاف لام میم نون واو ہمزہ۔

۹۔ حروف منفردہ کے خط میں دو نقص بیان کرتے ہیں اوّل یہ کہ جگہ زیادہ گھیرتا ہے۔ دوسرے دیر میں لکھا جاتا ہے جگہ کی نسبت تو یہ عرض ہے کہ اگر ایک صفحہ پر تحریر کیجئے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ قدیم تحریر کی ایک سطر میں زیادہ لفظ سمائیں گے۔ اور تحریر منفردہ کی ایک سطر میں کم لفظ آئیں گے لیکن صفحہ میں قدیم تحریر کی سطریں کم آئینگی اور حروف منفردہ کی زیادہ سطریں آئینگی قدیم میں عرضی جگہ کم اور طولی جگہ زیادہ گھرتی ہے اور حروف منفردہ میں عرضی جگہ زیادہ اور طولی کم گھرتی ہے اس لئے حساب برابر ہی پڑجائیگا رہا یہ کہ لکھنے میں دیر لگتی ہے تو لگو کیونکہ لکھنا ایسی چیز ہے کہ سینکڑوں برس تک قائم رہتا ہے اس لئے اگر گو نہ دیر لگے تو کیا مضائقہ ہے بشرطیکہ فوائد کثیرہ اس میں موجود ہوں علاوہ اسکے زیادہ مشق اور تجربہ آئندہ سکھائیگا کہ قدیم سے جدید میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

۱۰۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ بچے عورتیں اس کا لکھنا اور پڑھنا ایسی جلدی سیکھتی ہیں کہ جس کی تعریف نہیں ہوسکتی ہے امتحان کر لیجئے۔

۱۱۔ اس تحریر میں آدمی خوشنویس جلد ہوسکتا ہے اس لئے کہ حرفوں کا بنانا سہل ہے صرف چودہ صورتوں کی مشق پر منحصر ہے۔

۱۲۔ چھاپہ کے حروف ڈھلجانے کے بعد کیا ذکر کردں روپیہ وقت اور جگہ تینوں کی بے انتہا کفایت ہوگی اب تو تین سو ساٹھ صورتیں مطلوب ہیں اس وقت ٹائپ کا کام پورا ہوتا ہے۔

۱۳۔ ٹائپ رائٹر تو اس کا بنا کر دیکھو اسکے لئے تو یہ خط ایک نعمت غیر مترقبہ ہے تھوڑی فکر کے صرف کرنے سے صرف ۴۴ کیز میں ٹائپ رائٹر بنتا ہے جس میں کل حروف و نقاط و علامات و ہندسہ و [illegible] خواہ تین میں بنائے جاسکتے ہیں۔ تو اب [illegible] چاہتے ہو

۱۴۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حروف منفردہ کی تحریر کی مشق کے لئے ہم کو تیرہ سو برس پیچھے لوٹنا پڑتا ہے یہ بالکل سچ ہے۔ اگر اسوقت ٹائپ [illegible] ہو چکا ہوتا تو نہ معلوم اب تک کس قسم کی تحریریں رائج ہوگئی ہوتیں یہ نہ ہوتی جواب ہے۔

ٹائپ رائٹر ا ب ج د ہ و ز ح ط [illegible]

د ذ ۔ : ؛ ؟ ۔ ÷ +

۸ ۞ .. ۷ ط ، ،

حساب جمل ابجد ہوز

حطی کلمن سعفص قرشت ثخذ ضظغ

پ چ ژ گ

صور حروف پنجاہ و یک ۱ آ ب پ ت ٹ ث ن ن ی ئ ی ں ں ن چ ج ح خ د ڈ ذ
ر ڑ ز ژ س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک گ ل م ن و ہ ھ ء ی ے

ن م ؤن مر ہرن دی

[illegible]

ت م ؤن مر اُرا دو

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ن م ؤن مر عرا ب پ و وارا ب

[illegible]

[illegible]

ن م ؤن مر ان گرا ن زی

[illegible]

[illegible]

پ پ

[illegible]

سید عبداللہ

کلام محشر

ب سے چھپنا اگر ہے خو تیری کیا کرے کوئی جستجو تیری
کسی پر ہو کیوں نگاہ کرم ستم عام اگر ہے خو تیری
اتحاد ظاہر و باطن دیکھ ہے گل زخم دل میں بو تیری
کر دیں نذر شوق وصال ہم ہیں اب اور جستجو تیری
ابیں بھر میں جھیلیں سب کی شاہد ہے آرزو تیری
اور وفا کیسی صاف کہتی ہے گفتگو تیری
سے کس طرح کھینچوں لپٹی جاتی ہے آرزو تیری
کیوں کچھ جواب دے محشر پوچھتے ہیں وہ آرزو تیری

حشرِ جذبات

یہ کس دل سوز نے سایہ زمینِ دشت پر ڈالا
کہ ذرہ ذرہ اُس کا بن گیا آتش کا پرکالا

بدن پر سوزشِ تپ و جگر نے یہ اثر ڈالا
جہاں آنسو کوئی ٹپکا اسی جا پڑ گیا چھالا

سناؤں حالِ غم کس کو دکھاؤں داغِ دل کس کو
نہ کوئی سننے والا ہے نہ کوئی دیکھنے والا

ارے او جانیوالے باز آ محشر خرامی سے
زمیں گورِ غریباں کی نہ ہو جائے تہ و بالا

مبارک باد میرے نیم جاں ہونے کی دو اُس کو
نظامِ زندگی جس نے نگاہوں سے بدل ڈالا

خدا حافظ مریضِ دردِ فرقت کا خدا حافظ
کہ آنکھیں پونچھتا آیا ہے اس کا دیکھنے والا

اثر انداز ہر آواز ہے جس میں صداقت ہو
ہو بلبل کا ترانہ یا کسی دلگیر کا نالا

خزاں اب اے جنوں کیسی کہ سبزے پر چھڑکنے کو
بھرے ہے ایک مشکیزہ مرے تلوے کا ہر چھالا

وہاں تدبیر کیا ہو سوزِ الفت کے چھپانے کی
جہاں ڈنکا بجائے سینۂ پُر سوز کا چھالا

کہاں کی داد رسی کوئی کب سنتا ہے محشر میں
مجھے کب دیکھتا ہے اُن کی صورت دیکھنے والا

اب اس کے بعد آخر کون دن ہو جسپہ ٹالوگے
بڑا خوش ہوں میرے وعدے کو جو تم نے حشر پر ڈالا

جلاتا ہے دلِ حاسد کو یہ آتش بیانی سے
خدا کے فضل سے فکری بھی ہے آتش کا پرکالا

فکری

کلامِ زلالی

بحث کیا اس کی۔ ملا قرب کہ ہم دُور رہے
اُس نے جس حال میں رکھا ہمیں مسرور رہے

ہم تھے نافہم سمجھتے جو اُنہیں دور رہے
کیا گلہ ان کا ہمیں تم میں وہ مستور رہے

دشمنِ صبر و تحمل ہیں حیائیں اُن کی
اتنے ہنگامۂ اظہار پہ مستور رہے

دوسرا لفظ سوا حق کے نہ منہ سے نکلے
یاد پاداشِ انانیت منصور رہے

فرصتِ دم ہے تو پھر صرفۂ نالہ بے سود
کیا خبر ہے کہ رہے یا نہ یہ مقدور رہے

موت ہے چارہ گر بیچارگئی دل۔ لیکن
کیا وہ بیچارہ کرے جس سے قضا دُور رہے

کیا زمانہ ہے کہ پوچھا نہ کسی نے ہم کو
عمر بھر غمکدۂ دہر میں رنجور رہے

ہم وہ غم دوست ہیں امید بر آئی۔ لیکن
ناامیدی کے جو غم تھے وہ بدستور رہے

ہم کو بیدادِ محبت کا مزا لینا ہے
دل میں ہوں زخم تو ہر زخم میں ناسور رہے

پی ہے اوروں نے بھی وہ جس پہ ہی مہر غالب
اس کے نشہ میں زلالی نہ تمہیں [illegible]

میں نے تجھے دیکھا ہے

یہ تو میں ضرور کہونگا میں نے تجھے دیکھا ہے مگر یہ نہ پوچھ کہ کب اور کس طرح! ہاں یہ یاد ہے کہ میں نے تیری جلوہ باریاں خواب میں دیکھی ہیں اور عین اسوقت جبکہ پہلے پہل تو ایک غبار کی صورت میں نمودار ہوا تو میں نے سمجھا کہ میری سیاہ بختی کی تیرگی بڑھ رہی ہو۔ مگر پھر ایک نور سا دکھائی دیا اور میں نے سمجھا کہ میری صبح تمنا کا سفیدہ ہو۔ لیکن اب ایک پیکر دل پسند نظر آیا تو میں نے خیال کیا کہ میں خواب میں کسی فرشتہ کو دیکھ رہا ہوں۔ لیکن اس جسم میں ایک حرکت سی محسوس ہونے لگی تو میں نے اپنی آنکھیں ملیں اور پھر دیکھا تو ایک تصویر سی معلوم ہوئی جس کے یوسف طلعت چہرہ پر زلف برہم کی پریشانیاں ہلکی ہلکی سیاہی کی صورت میں ابھرتی باقی حصہ میں گھیرا ہوا کیونکہ اب یہ خیالی تصویر تیرے نور علیٰ نور پیکر سے ملتی جلتی نظر آنے لگی۔ میں نے پھر آنکھوں کو ملا اور دیکھا تو یہ تصویر بہ کمال متانت و خموشی کھڑی تھی مگر اب اس نے اپنی نازک سی انگلی کو دانتوں میں دبا لیا تھا۔ گویا وہ میری دیوانہ وار خستگی پر حیران و ششدر تھی۔ لیکن اب اس تصویر کے خال و خط مبہم زبان کی لعابوں میں نمایاں ہوتے جاتے تھے۔ اب میرے جسم میں ایک لرزش سی محسوس ہوئی اور میں نے بکمال جرأت چاہا کہ اس عالم آرا تصویر سے پوچھوں کہ یہ تصویر تو نہیں بلکہ "تم ہو" مگر آہ کہ اس خیال کے آتے ہی تو کھل کھلا کر ہنس پڑا اور غائب ہوگیا۔

...... ❖ ❖ ......

میں نے ایک چیخ ماری اور اٹھ بیٹھا۔ پھر میں نے مدتوں تک خاموشی اختیار کی گویا وہ میرا سکتہ تھا جو اس خواب پریشاں کے بعد مجھ پر دنوں طاری رہا۔ پھر ایک عرصہ دراز تک کسی سے نہ بولا اور چپ رہا۔ مگر اب میں نے … چلا کر ڈالا تھا اور جب لوگوں نے مجھ پر جنون و خودرفتگی کے طنز آمیز آوازے کسے تو میں ایک سنسان طرف چلا گیا اور پھر خبر نہیں کہ میں نے کیا کیا۔ لیکن یہ ضرور یاد رہی کہ تجھے پکارتا پھرتا تھا۔ اور کئی بار تیری … مجھے دھوکہ دیا اور میں نے بکمال شادمانی پیچھے پلٹ کر دیکھا کہ "شاید تو آگیا" مگر آہ کہ "تو نہ تھا" پس … حیف اور میری مایوسی کی بھی تجھے خبر ہے؟

❖ ❖ ———

اچھا اچھا۔ میں ممنون ہوں کہ تو نے دیدار کا وعدہ کر لیا مگر میں یہ نہیں چاہتا کہ تیرے حسن منور کی جلوہ آرائیاں نمایاں ہو جائیں۔ پس تو اپنے جمال جان پرور کو جلوہ فرما تو کر مگر اس طرح کہ پہلے موجودات عالم کی ان نشانیوں کو مٹا دے جس کے ذریعہ رقیبان عقلمند تجھے جان جاتے ہیں۔ پہلے تو اجرام سماوی کو نیست و … کر دے کہ ان سے بھی تیری خدائی بادشاہت کا پتہ ملتا ہے۔ تو لوح و قلم کو بھی توڑ دے کہ یہ بھی ایک ذریعہ ہیں تیری … کا۔ تو اجسام انسانی کو روح کی قید سے آزاد کر دے کہ یہ بھی تیری دل کش رنگینیوں کے شاہد ہیں۔ تو عالم ناسوت

کی اس شستش گوشہ کرسی کو چکنا چُور کردے کہ اُس سے بھی رقیبوں پر تیری دلربائیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ جو تیرے حسنِ غیور کے لئے زیبا نہیں تو چاند و تاروں کو فرشِ زمین پر گرادے کہ اُن کا نورانی بدن پاش پاش ہو جائے کیونکہ اُن میں بھی تیرے حُسنِ منوّر کی دلفریبیاں جلوہ آرا ہیں زُحل و مشتری کو غرقِ آب کردے۔ اور سیارگانِ فلک کی اس پُرنور انجمن کو برہم کردے کہ جس کا ہر رکن تیری عالمتاب کرشمہ سازیوں کا نمونہ ہے تو لیل و نہار کے اس مفید نظام کو بھی تہ و بالا کردے جس کے ہر لمحہ میں رقیبانِ عشق کار کو تیری تلاش و جستجو کا موقعہ ملجاتا ہے۔ تو اس چرخِ فیروزہ رنگ کے سکوت و حرکت کو بھی فنا کردے کہ اس میں بھی تیری پیاری پیاری عشوہ طرازیاں جلوہ ریز ہیں تو آب و آتش اور خاک و باد کے اس حیرت فزا آئینہ کو بھی چکنا چُور کردے جسمیں تیرے عکسِ روشن کی لمعہ فروغیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ اور ان تیرہ دماغ افلاک شناسوں کے دفتر جلا دے جن میں تیری مستانہ ادائیاں موجود ہیں تو ان خورشید پرستوں کو اندھا کردے جو تیرے حُسنِ پرتاں کی ایک جھلک پہ مرمٹنے کے لئے تیار رہتے ہیں تو اپنی مہرِ قہر کے جملہ افسانوں کو دریا بُرد کردے کہ ان سے بھی تیری معصوم پاکدامنی پر حرف آتا ہے۔ تو زبانوں کو خشک کردے۔ جا و بیجا ۔ حسن بیاب کی مدح خوانی کرتی ہیں اور .... باغ و بہار اور گل و نسرین کی اُن رنگینیوں کو چھین لے جن سے تیرے حسنِ گل کار کا جانفزا نکھار نمایاں ہے۔ ہاں مزہ تو جب ہے کہ ایک ہُو کا عالم ہو اور میرا تجسس و حرکتِ دل مو جس میں یکماں خامشی تو سما جائے اور بس ۔ ابوالقدس توحید

غزل

(۱)

سوزِ غم سے دلِ مضطر کو جلا ہی دینگے
ہم تو مٹتے ہیں مگر اس کو مٹا ہی دینگے

بس یہی نا کہ وہ خفا ہو کے سزا ہی دینگے
حالِ دل ہم تو انہیں آج سنا ہی دینگے

فرق سے تا بقدم آگ لگا ہی دینگے
شعلے جب دل سے اُٹھینگے تو جلا ہی دینگے

ناوکِ انداز تیری تیر سے پہنچے ہیں جو زخم
وہ مرے قتل کی محشر میں گواہی دینگے

کوششیں چارہ گروں کی ہیں دوا تک محدود
دردِ دل داغ نہیں ہے کہ مٹا ہی دینگے

تم خفا ہوتے ہو اچھا نہ کریں گے شکوہ
منہ میں جبتک ہے زبان خیر دعا ہی دینگے

تمنے مرتے نہیں دیکھا ہے کسیکو اب تک
خیر زندہ ہیں تو ہم مر کے دکھا ہی دینگے

نزع کی سختیاں آساں ہوں بلادو اُن کو
رحم آئے گا تو مرنے کی دعا ہی دینگے

گو غم انگیز ہیں، گو درد میں ڈوبے ہیں۔ مگر
پھر بھی قصے ہیں محبت کے مزا ہی دینگے

اُن کے آگے مجھے بے ہوش پڑا رہنے دو
جب ترس آئیگا دامن کی ہوا ہی دینگے

خنجر اس دور میں اپنے چمن آرادں کو
کچھ نہیں اَور تو ہم دل سے دعا ہی دینگے

فدا علی خنجرؔ [illegible]

طالب اولاد

میرا عالم شباب تھا۔ میں بائیس سال کی عمر تھی اور سیر و شکار کا دلدادہ۔ انتظام الدین جو میری طرح پٹھان تھے
اور میر دارالاسلام میرے نہایت عزیز دوست تھے۔ دونوں شکار کے شوقین اور قادر انداز نشانہ باز تھے
خانصاحب بچارے عالم شباب ہی میں داغ مفارقت دے گئے۔ اُس کی موت کا واقعہ یاد آتا ہے۔
تو بیتاب ہو جاتا ہوں۔ یہ ماں باپ بن جاتا ہوں۔ ماں باپ بیمار رہ جانے کو تھے کہ موت نے دولہا بنا دیا مجھے
اور میر دارالاسلام کو انتہا کا قلق ہوا۔ مگر دو تین روز ہی میں جوانی کی خود فراموشانہ بیخودیوں نے پھر پہلی سی
معروفیتوں میں ڈالدیا۔

ایک دن میں اور میر صاحب اپنی اپنی توڑیدار بندوقیں لیکر گھر سے نکلے۔ ابر چھایا ہوا تھا۔ اور پہاڑیوں
کی سرسبز گھاٹیاں سبز پریاں بنی ہوئی تھیں۔ ہم نے ایک ہرن کا شکار کیا۔ ہرن کے گوشت کا زیادہ حصہ اُس صادق کی نذر ہوا
ہم پہاڑی چشموں کے کنارے اُن پرلطف نظاروں میں کچھ ایسے محو پھرتے تھے کہ جب شام ہوئی تو معلوم
ہوا کہ ہم بستی سے بہت دور نکل گئے ہیں۔ برسات کی مسافرنواز بوندیا ندی کا خیال نہ ہوتا۔ تو رات وہیں
کسی چٹان پر گذار دیتے۔ مگر شب دیجور نے اندھیر برپا کر رکھا تھا۔ بادل گرج رہے تھے۔ ہوا زناٹے بھر رہی تھی
اور اس کی عجیب سرگوشیاں بھوت پریت کی ہستی کا یقین دلا رہی تھی۔ مگر حد درجہ کی احسان فراموشی
ہوگی۔ میں نہ مانوں۔ اگر بجلی بدرقہ وار ہماری رہبری نہ کرتی۔ تو یقیناً ہم گم کردہ راہ
سکا ری اس تاریکی میں کسی مصیبت کا شکار ہو جاتے۔ بڑی دیر کے بعد ہمکو معلوم ہوا کہ ہم قبرستان میں ہیں
اس کے متعلق لوگوں میں دہشتناک اور ڈراؤنی روایات مشہور تھیں۔ میر صاحب نطرتاً ظریف تھے۔
ایسے وقت میں جب کہ میرے اوسان خطا ہو رہے تھے اور میں گھر پہونچنے کی خواہش کی پُر اصرار
تکبیروں سے مخمور ہو رہا تھا بیت الخلا یاد آیا۔ وہ ایک طرف کو چلے گئے اور میں سڑک پر کھڑا رہا۔ کہ
اسی دم میں انتظام الدین خان مرحوم کی روح نے میرا دامن پکڑا اور میں اُس کی یاد میں بیتاب ہو کر اس کی
قبر تلاش کرنے لگا۔ جو وہاں سے کچھ زیادہ دور نہ تھی

میں بندا سے خوف و ہراس کا قایل نہیں تھا۔ گو ذاتی آسائش اور تن پروری کی خواہشات نے مجھ
سے زیادہ پابند نہیں دیکھا ہوگا۔ میں مانتا ہوں کہ میرے دماغی تخیلات بڑے حافظے اور یاد داشت سے خوف
کی تمام سماعی حکایتیں دوہرا رہے تھے۔ جو اس پراسرار قبرستان سے وابستہ تھیں۔ اور میرا دل اُن
سے متاثر ہونے لگا تھا۔ مگر میں نے کہا "پٹھان ہو کر ڈرتا ہے۔ شرم نہیں آتی۔ تیرے بہادر مورث شجاعت

کے کیسے کیسے زریں کارنامے چھوڑ گئے ہیں۔" اس وحشیانہ انگیخت نے مجھے ایسا دلیر بنا دیا کہ اس وقت میں جنات کے مقابلے میں خم ٹھونک کر کھڑا ہونے کو تیار تھا۔

میں بے خوف بڑھتا چلا گیا۔ مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا کہ میری دیرینہ آشنا کی قبر کھلی ہے۔ اینٹیں اور تختے پریشان پڑے تھے اور مدھم چمکنے والی بجلی میں بکس میت کے کفن کی سفیدی کا وحشتناک اُجلاپن نظر آرہا تھا۔ مگر میرا دل اس خیال کے نشے میں کہ میں پٹھان ہوں کافی قوی تھا۔ میں نے غصے میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے اس نابکار جانور کو گولی سے مار ڈالنے کی آرزو ظاہر کی جو بتقاضائے وحشت میرے دوست کی خاموش جائے عافیت میں خلل انداز ہوا تھا۔ میں نے بڑھ کر نیم کے ایک گھنے درخت سے ہرن کے گوشت کا پسماندہ حصہ لٹکا دیا۔ اپنی بندوق رکھدی اور خوف و ہراس نے جب میرے دل کی کمزوریوں کے جواب میں پھر لبیک کہا تو میں نے اپنے ہمراہی کو آواز دی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہ میں نسبتاً زیادہ دلیر ہوں قبر میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ یکایک میت نے جنبش کی اور میں سچ کہتا ہوں کہ میری روح فنا ہو جاتی۔ اگر یہ خیال میرے دل میں مضبوطی سے جاگزیں نہ ہوتا۔ کہ میں پٹھان ہوں۔ پھر بھی میری یہ حالت تھی۔ کہ کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں۔ میں مرجھائے ہوئے تبسم سے وحشیں اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں پکارا کہ اُو۔ انتظام۔ ظالم اپنے دوست کو ڈراتا ہے۔ اگر تو زندہ ہے تو دفن کیوں ہوا۔ اتنا کہا اور میری زبان بند ہو گئی۔ مگر یہ کہتے ہوئے بھی برابر میرے دل میں خیال تھا۔ کہ شاید میت کی حرکت میرے دماغی تخیلات کے تلاطم کا نتیجہ ہو

میرا ستم ظریف ہمراہی آنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ اور میں دل ہی دل میں اُسے کوس رہا تھا۔ یہ ایک ناقابل معافی اور خودکشی پر مائل کر دینے والی طویل تاخیر تھی

میں نے ایک بار پھر گلے کو درست کیا اور ایک نہایت بھیانک صدا میں میر صاحب کو پکارا۔ مگر خدا جانے قضا نے اس آواز میں کس قیامت خیز دہشت کس وحشت ناک ہراس اور کس مر جانے کی تمنا پیدا کر دینے والے خوف کے سامان مہیا کر رکھے تھے کہ معاً انتظام کی وحشت خیز میت اُچھل کر ایک بگڑی ہوئی ایک ہولناک ہستی جس کی بلندی کم از کم اُس وقت مجھے آسمان تک دکھائی دی۔ سر کے لمبے لمبے اور کھلے بالوں کو ہلاتی ہوئی بجلی کی سرعت سے مجھ پر آن گری۔ میں پیچھے کو گر گیا۔ اور قریب تھا کہ بیہوش ہو جاؤں مگر میری خوش قسمتی سے اس نادر الوجود آفت نے مجھے بائیں کندھے پہ کاٹ کھایا۔ مجھے درد محسوس ہوا اور میرا خوف و خطر جاتا رہا۔ احساس درد سے مجھے غصہ آ گیا۔ اس اثنا میں وہ آفت برابر چیخیں مار رہی تھی۔ رفتہ رفتہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ وہ مجھ سے قوت میں زبردست نہیں ہے۔ میرا خوف کسی قدر دور ہوا۔ اور میں نے اس کی شکل کو غائر

اور حقیقت بین نظر سے دیکھا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ وہ بھا ہے جو کچھ پُرا سرار ہستی ہو بہر حال ایک عورت سے بالکل مشابہ تھی۔ اُس نے قیمتی زیور پہنے ہوئے تھے کسی رنگ کا جس کی تمیز اندھیرے میں نہیں ہو سکتی تھی ریشمی لباس تھا جوان عمر تھی اور گو اس وقت حسن اور بد صورتی کے اندازہ لگانے کی طاقت کا فور تھی۔ تاہم یہ کہہ سکتا ہوں۔ کہ قرائن سے خوش وضع معلوم ہوتی تھی۔

میں نے دلیر ہو کر اپنا پیش قبض نکالا اور اس کو جھٹکے سے نیچے گرا کر اس کی نوک اس کے سینے پر رکھ دی اور کہا " او دس ہزار بھوتوں کی نانی او ذلیل اور بدمعاش ڈائنوں کی بچی بلکار چڑیل بتا تو کیا ہے۔ اور کون ہے۔ ورنہ یہ پیش قبض ہے اور تیرا کلیجہ۔

میری حیرت اور استعجاب کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے مجھ سے کہا کہ میرا نام گلزار ہے اور میں آپ کے محلے کے فلاں شریف گھرانے کی عورت ہوں

میں "اری تشفتل کیوں جھوٹ بکتی ہے۔ میں اس عورت کو خوب جانتا ہوں۔ وہ ایک شریف باعصمت نازنین ہے۔ اور بظاہر ایسی ڈرپوک معلوم ہوتی ہے کہ ایک بلّی سے ڈر جائے۔ میں ہرگز تیری باتوں میں نہیں آئیگا۔ تو یقیناً ڈائن ہے۔ اب ایک پٹھان کے قابو میں آکر بے بس ہو گئی ہے۔ تو نے میرے انتظام کی مردہ ہڈیوں کو ہلانے کی کوشش کی ہے۔ میں تجھے ہرگز زندہ نہیں چھوڑونگا۔

مسمات گلزار "(گڑگڑا کر) ہائے میں وہی عصمت مآب گلزار ہوں میں ہاتھ جوڑتی ہوں خدا کے لئے مجھے رسوا نہ کر اولاد کی تمنا میں مجبور ہو کر یہاں آئی ہوں۔ مجھے ایک عورت نے عمل بتایا تھا۔ کہ ایک ایسی لاش پر جسکو تین راتیں قبر میں دفن ہوئے گذر چکی ہوں چند شرائط کے ساتھ عمل پڑھوں اور اس جادو کے زور سے مجھے اولاد نصیب ہوگی"

اس اثنا میں تغافل شعار میر صاحب تشریف لائے۔ آپ نے رات کی سنسان تاریکی میں متواتر چیخیں اور شور و فغاں کی آوازیں سنی تھیں اور بیحد خائف تھے۔ یہاں اس حیرت افزا تماشے کو دیکھکر حیران رہ گئے۔ مگر اپنی مردانگی جتانے کے لئے اس عورت کو ایک درخت سے باندھنے لگے اور مجھے بڑے وثوق سے یقین دلاتے رہے کہ وہ ضرور غول بیابانی ہے جبکہ بجلی چمکی اور میر صاحب نے دیکھا کہ کوئی کالی سی چیز نیم کے درخت سے لٹکتے ہوئے گوشت کی طرف اُچھلتی ہے تو چلا کر کہا " ستم ہوگیا۔ خانصاحب یہ عورت یقیناً چڑیل ہے۔ وہ دیکھو اس کی دوسری بہن ہرن کے گوشت پر لپک رہی ہے۔ اگر سلامتی درکار ہے۔ تو بھاگئے۔ ورنہ ان ڈائنوں کا جمگھٹا ہماری تکا بوٹی کر ڈالیگا۔

گلزار نے بدر الاسلام کو ہراساں دیکھکر اپنے تئیں بلا تعرض آسانی سے چھڑا لیا۔ اور ایک بار پھر اپنی عزت

اور نالوں کو بھلانے کے لئے خوفناک چیخیں مارنا شروع کیں تاکہ ہم لوگ ڈر کر بھاگ جائیں۔ مگر میرا خوف کافور ہو چکا تھا میں نے اندھیرے میں اپنی بندوق سنبھالی اور بجلی کی چمک میں گوشت پر اچھلنے والی نظر چیز پر نہایت احتیاط سے شست باندھی۔

ٹن کی آواز ہوئی۔ گلزار یہ سمجھتے ہوئے کہ اُسے گولی ماردی گئی ہو گرگئی میر صاحب سناٹے کے عالم میں رہ گئے۔ اور اس خوفناک رات کی سنسان فضا میں اردگرد کی پہاڑیاں بندوق کی آواز سے دیر تک گونجتی رہیں۔ میں درخت کے نیچے گیا اور دیکھا کہ ایک بھیڑیا مرا پڑا ہے +

ملک محمد خدا بخش ٹوانہ

انوکھی لوری

"انوکھی لوری" کے عنوان سے میں آج ایک انگریزی نظم کا ترجمہ پیش کرتا ہوں۔ میں نے لفظ بلفظ تتبع نہیں کیا مگر اس کے مفہوم کو پوری طور سے ادا کرنے کی حتے الوسع کوشش کی ہے۔ مصنف کا نام نامعلوم ہے لکھنے والے نے غالباً اپنا نام مصلحتاً پردۂ خفا میں رکھا۔ یہ ۱۷۲۲ء کی تصنیف ہے جسکو آج دو سو برس کے بعد مجھ جیسے نااہل نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ لیڈی این باتھرل کی آہ وزاری کی سرخی سے لکھی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ خاتون مذکور اپنے چاہنے والے کے جذباتِ دلی سے متاثر ہو کر کچھ ایسی جوشِ اُلفت و محبت میں اندھی ہو گئی کہ اُس دغاباز کے خواہشاتِ نفسانی کا تسکا بن گئی اور اس ناجائز تعلق کا نتیجہ قبل شادی ایک بچے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس موقعہ پر اُس دعویدار محبت نے بیوفائی کی۔ ماں بچے کو چھوڑ کر میدان جنگ کو چلدیا نظم میں اس پشیمان عفت باختہ عورت کے جذبات کا اظہار ہے اسوقت کے خیالات کا آجکے خیالات سے موازنہ کیجئے تو زمین آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ اس زمانے میں ایسے تعلق کو خود ایک مغربی عورت ناجائز خیال کرتی تھی اور ایسی اولاد کو کلنک کا ٹیکا۔ مگر آج مغرب کے بیشتر پرستارانِ آزادی شادی کو ایک ڈھکوسلا اور اس قسم کی پابندی کو آفت جان سمجھتے ہیں یہ گویا معنی کہ آزادی کا دور دورہ ہوتے ہوئے ایک آدمی ایک عورت کا اور ایک عورت ایک آدمی کی پابند ہو جائے۔ اِن باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ناظرین کرام اس منظوم ترجمہ کو ملاحظہ فرمائیں۔

سوجا میرے پیارے سوجا سوجا آنکھ کے تارے سوجا
تیرا سونا میری راحت تیرا رونا میری مصیبت
مرے مایۂ عیش و عشرت باپ کی پیدا کی ہوئی آفت
سوجا مرے پیارے سوجا
سوجا راج دلارے سوجا

دم بھر سو رہ اے مرے پیارے جب تو جاگے ہنستا اُٹھے
لیکن ایسے ڈھنگ نہ آئیں حُسن کی دیویاں دھوکا کھائیں
اُسکی شکل ہو صورت تیری جسنے عزت لے لی میری
سوجا مرے پیارے سوجا
سوجا راج دلارے سوجا

میٹھی میٹھی باتیں کر کے میرا دل جب چھینا مجھ سے مجکو نہ رولے میرے جانی تیری ذلت کی یہیں بانی
میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا میں نے اچھا دھوکا کھایا مرے کئے کی سب یہ سزا ہے ساری میرے دل کی خطا ہے
لیکن ایسا ظالم نکلا میری نہ تیری کچھ نہیں پروا عقل پہ رکھے کیوں نہ سمجھے باتیں بنانے والے جھوٹے

سوچا مرے پیارے سوچا سوچا مرے پیارے سوچا
سوچا راج دلارے سوچا سوچا راج دلارے سوچا

اے ظالم بدمست جوانی جھوٹے عاشق دشمن جانی باپ کی خاطر کوئی بلا ہے چھوڑ کے تجھ کو بھاگ گیا ہے
بھولی بھالی رتنک پری کو دھوکا دینا ہے نہ کسی کو دھیان نہ آیا عہد کا اصلا چھوڑ کے ہمکو جنگ میں پہنچا
بیشک وہ بھی ظلم سہیگی مری طرح ناکام رہیگی آؤ ہمارے رنگ دکھائے اپنے کئے کا پھل وہ پائے

سوچا مرے پیارے سوچا سوچا مرے پیارے سوچا
سوچا راج دلارے سوچا سوچا راج دلارے سوچا

تو نے ایسی چاہ دکھائی بیری ہاتھوں لاج گنوائی کون یوں - تو یاد آتا ہو شاداب و پچھتاتا ہو
مجکو سکھائے عشق کے آئین عہد وفا پر قسمیں کھائیں ممکن ہے رنجور ہوا ہو زخموں سے وہ چور ہوا ہو
لیکن وہ اقرار کہاں اب چاہ کہاں وہ پیار کہاں اب حکم خدا سے موت ہو گھیری اس پیارے دمساز کو میری

سوچا مرے پیارے سوچا سوچا مرے پیارے سوچا
سوچا راج دلارے سوچا سوچا راج دلارے سوچا

حسرت ہے پھر کنواری ہوتی مردوں سے بیزاری ہوتی پہلو میں نہیں اس کے ہوتی اشکوں سے ہر زخم کو دھوتی
ہو گیا اب یہ روشن مجھ پر سب ہیں جھوٹے سب ہیں ستمگر منہ سے میرا نام نکلتا الفت کا انجام نکلتا
حسن نے کھویا قول ہی سچا شاہد میری گود کا بچا گو میں غم کی یاد سے مرتی بھولنے جاتی عفو تو کرتی

سوچا مرے پیارے سوچا سوچا میرے پیارے سوچا
سوچا راج دلارے سوچا سوچا راج دلارے سوچا

اس سے بڑھکر ظلم ہے سہنا دایہ بنکر ہے کہیں رہنا کپڑا کفن کا گر کم ہوتا دل کا نرالا عالم ہوتا
کیونکر اپنا لال جیئے گا غیر کا بچہ دودھ پئے گا جو میرے تن کی چادر ہوتی اسکے کفن کی چادر ہوتی
سو جا مرے پیارے واری دکھیاری ہے ماں بیچاری کیا بکتی ہوں زندہ ہو وہ جان سے پیارا اچھا ہو وہ

سوچا میرے پیارے سوچا سوچا مرے پیارے سوچا
سوچا راج دلارے سوچا سوچا راج دلارے سوچا

روتی ہوں میں تیری خاطر　روئیگا تو پھر میری خاطر　|　رنج پڑیگا تجھ پر بھاری　صبر تجھے ہو میں تیرے واری
میری بدولت رنج سہو گا　بدقسمت بدنام رہیگا　|　سوجا مرے پیارے سوجا　سوجا راج دولارے سوجا

باسط - بسوانی

مَیں تجھے ایک بھید بتانا چاہتا ہوں

مَیں اپنے دل کا بھید تجھ پر ظاہر کرنا چاہتا ہوں - لیکن کیا یہاں ؟ نہیں میری جان یہاں نہیں ! اف ایسی جگہ نہیں جہاں دنیا کی آنکھ کھلی ہو - مَیں اس بھید کو تیرے نازک کان میں چپکے سے ڈالنے کے لئے ایسا کنارہ ڈھونڈوں گا - جہاں گرمیوں کے موسم کی لہر بغیر سرسراہٹ کے دم توڑ رہی ہو - اور چشمہ کی روانی پانی کی پری بھی نہ سُن سکے - جہاں کوئی شب بیدار آبی پرندہ ذرہ سا بھی سُر لگائے تو کنول اُسے گھبرا کر کہہ اٹھے "چُپ میری جان چُپ" !

اس جگہ ہائے اس جگہ اس وقت کے گہرے سناٹے ہیں جبکہ تاروں کے پانی میں ڈبڈبانے کی آواز سنائی دیتی ہو - میرے شب چراغ تو گلاب کے پودوں کے کنج میں اپنے لب پر اُنگلی رکھے چپ چاپ بیٹھی ہو مصہکے خاموشی کے دیوتا لڑکے کی طرح جو دریائے نیل پر شرماتے ہوئے پھولوں میں پیدا ہوا ہے اس طرح بیٹھا اور زمین آسمان کو صرف ایک گیت سناتا ہے "خاموش سب خاموش" !　**محمد ظفر ایم - اے**

جذباتِ سوختہ

بند حیرت نے کیا شاید دہن فریاد کا　بن گیا مَیں آئینہ مُنہ دیکھ کر بیداد کا
آب دوانہ گر دکھائے گھر ستم ایجاد کا　ہم بھی منہ میٹھا کریں گے خنجرِ جلاد کا
رہ گئے بلبل کے پر صحنِ چمن میں آخر آہ　یہ نشانِ زندگی ہے عاشقِ ناشاد کا
کھینچ لیتا ہے تصور ہو بہو تصویرِ یار　خوبیٔ قسمت سے یہ ہمزاد ہے بہزاد کا
جامۂ صبر و تحمل اے جنوں ہو دھجیاں　پیار تیرے صدقے بننے سر اسیرِ صیاد کا
ہائے لگتے ہی میرے سینے میں ٹھنڈک پڑ گئی　کیا بجھا تھا زہر میں خنجر مرے جلاد کا
کونسا گم گشتہ طائر یاد آیا ہے اُسے　دام پھر سلجھا الٰہی خیر ہو صیاد کا
بنکے خنجر بن کے ابر جلوہ گر ہے چرخ پر　اے تو بھی ہو گیا عاشق مرے جلاد کا
صبر اک دن پڑ گیا گر سوختہ سامان کا　آتشِ گل پھونک دیگی آشیاں صیاد کا

مُخَاطَبَات

اسلم۔ پیاری ثریّا! غالباً وہ زمانہ آپ کو یاد ہوگا۔ جبکہ سب سے پہلے میری نگاہِ شوق نے آپ کے نوخیز حسن و شباب کا استقبال کیا تھا۔ سب سے اوّل مَیں نے ہی نازپروردہ اور ارمانوں سے بھرا ہوا دل نذرانہ میں دیا تھا!

ثریّا۔ (پُرانفعال تبسم کے ساتھ) کیوں مجھے شرمندہ کرتے ہو۔

اسلم۔ آہ! اسیوقت سے میں حسن و عشق کے راز و نیاز اور سوز و گداز سے واقف ہوا۔ اُسی دن سے میرا دل ایک پُرلطف درد کا لذت شناس ہوا۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کہ آپ نے مجھے اپنا سمجھ کر اپنی کوائف زندگی کے پُرسوز نغموں سے آشنا کیا۔ اور اپنی نوائے سحر طراز سے مجھے بیخود ہی نہیں۔ بلکہ میری لوحات پر نمک افشانیاں کیں۔

ثریّا۔ خیر ہے۔ آج آپ کو کیا ہوگیا؟

اسلم۔ آپ مجھے سزاوارِ نکوہش نہ قرار دیں۔ اگر مَیں یہ دعوےٰ کروں کہ مَیں آپ سے محبت ہی نہیں کرتا بلکہ آپ کی پرستش کرتا ہوں۔

ثریّا۔ آپ کے اس خیال کی مَیں قدر کرتی ہوں۔

اسلم۔ دنیا کے حوادث۔ دنیا کے انقلابات اور دنیا کے مصائب یہ سب چیزیں آپس میں ملیں۔ ایک ہوئیں میرے بیقرار دل پر اپنا مجموعی اثر ڈالا۔ لیکن کچھ نہ ہوسکا۔ یہ جیسا تھا۔ ویسا ہی رہا۔ اور جو چیزیں اس میں پنہاں تھیں۔ ویسی ہی رہیں۔ اور آیندہ بھی رہینگی۔ پیاری مَیں احسان فراموش نہیں۔ لطفِ ہمکلامی مجھے میسّر ہے۔ مگر یہ ملاقات گاہ گاہ میرے درد کی دوا نہیں۔

ثریّا۔ آخر ان باتوں کا مطلب؟

اسلم۔ مَیں ان باتوں کا مطلب کیا بتاؤں۔ مَیں خود نہیں جانتا کہ میری ان باتوں کا کیا مطلب ہے۔

ثریّا۔ نہیں جو کچھ آپ کے جی میں ہے۔ وہ آپ کہہ ڈالئے۔

اسلم۔ لیکن پیاری سچ بتانا یا شائد میری ان باتوں کا یہ مطلب ہے۔ کہ آپ نے مجھے اب تک اپنی زندگی کا ہمدم اپنی تاریک خلوتوں کا ہمنفس۔ اپنے شباب کی خواہشات کا ہمراز سمجھا یا نہیں۔

ثریّا۔ مجھے اس طرزِ زندگی سے نفرت ہے۔ اور مَیں محکوم ہونے کی ذلّت برداشت کرنے سے مجبور ہوں

اسلم۔ جانِ دلنواز! زندگی کا جو دراصل مفہوم ہوسکتا ہے۔ وہ محض "جوانی" ہے۔ اور جوانی خوشگوار جب ہی ہوسکتی ہے۔ کہ اس کی وابستگی کسی دوسری ذات سے ہو۔

ثریا۔ سچ ہے۔لیکن ان خواہشات کا ترک کر دینا جنکو اپنی زندگی کا جزوِ لاینفک سمجھ رہی ہوں مجھے ہرگز منظور نہیں۔

اسلم۔ جب .... خودداری حُسن کو قائم رکھنا۔ آپ کا ادعا رنفس ہے۔ تو سُن لیجئے! لاریب مذہبِ عشق میں معشوق سے عاشق کا بے نیاز ہو جانا خلافِ قانون یا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر عاشق پابندی سے بے نیاز ہوتا ہے۔ راہِ مجازی سے جادۂ حقیقی پر ہر عاشق اپنے ظرف کے موافق پہنچ جاتا ہے۔ کوئی بعجلت کوئی بہ تاخیر۔ لہذا میں تارکِ مجازی ہو کر عازمِ حقیقی ہوں۔ اے وہ ذات جو سعیٔ نامشکور کے بعد مدرکانہ برہانی، حسیات استدلالی سے گذر کر کہیں قریب ہی جاگزیں معلوم ہوتی ہے۔ کیا فی الحقیقت تو کہیں ہے؟ جب ہماری ناکام عزفریزیاں، ہماری بے شود جانفشانیاں، ہماری پامال جستجوئیں، ہمکو ہماری مقدار و ہستی سے آشنا کر دیتی ہیں، تو ہماری مایوس گردن، ہماری مضمحل آنکھیں، بے اختیار اوپر اُٹھ کے کیوں استقرارِ تسلی چاہتی ہیں۔ جب ہم اپنے تراکم جستجو میں کھو کھو جاتے ہیں، جب ہماری تمام کوششیں حیلہ فرسودہ تدابیر ایک ایک کر کے ہماری آنکھوں کے سامنے خاک ہو جاتی ہیں۔ تو وہ کیا چیز ہے جو ہم کو اذعانی تسلیاں دیتی ہے تو جہاں کہیں بھی ہو ما تو ایک وجود ہے۔ جو معرفت کی قدرت سے باہر، حیطۂ تطابق سے دُور اور کہیں کا براجنے والا امین نشین ہے۔ تو قیوم ہے قدوس ہے۔ تو احد ہے صمد ہے، تو قادر ہے مجبور نہیں، تو حاجت روا ہے حاجتمند نہیں۔ تو بے نیاز ہے نیازمند نہیں، خوشا نصیب قابلِ رشک ہے وہ جس سے تو بے نیاز ہو جائے۔ شکر ہے تو مجھ سے بے نیاز ہے جسمیں ایک جانگداز لطف اور تیاہ کن سرور معمور ہے۔

ناشاد سہرامی

شگفتگی

سورج کی جستجو میں سحر کی سیاہ چشم — بنتی ہے صبح برقِ جگر پارۂ کلیم
کرتا فلک ہے دُرِ ثمیں اوس کے نثار — پاتا ہے اُن کو غنچہ۔ سحر زادۂ نسیم
نازک لبوں سے دیتی ہے بوسے شعاعِ مہر — کِھلتا ہے غنچہ پھر صفتِ طفلکِ یتیم
ہوتا ہے کِھل کے زندگیٔ باغ میں شریک — خوشبوئے گل اُڑاتی ہے چاروں طرف شمیم
گلشن میں چند روز دکھا کر بہارِ حُسن — ہوتا ہے وہ شگفت ہوس سے زبیں ند
بنتا ہے۔ دستِ باد میں مصداقِ نونِ نشر — ہاتھوں سے چھوڑتا ہے جونہی وہ خودی کا

جس طرح اس شگوفہ کو کھلنا شکستِ ساز مضمر شگفتگی میں مری زندگی کا راز
ذرّات کے وجود سے خورشید نور پاش محتاجِ ہستیٔ دگراں میری بود و باش
زینت مذاقِ دہر ہیں۔ آئینہ دار وہ میں منسلک ہوں تار کی مانندِ تار وہ
نیساں کو چھوڑتا ہوں تو بنتا ہوں میں گہر دیتا ہے مجھ کو تاب صدف خانۂ گہر
جب تک ہوا آفتاب نہ قطروں پہ نور بار قوسِ قزح کے ہوتے نہیں جوہر آشکار
جام دگر نہ ہو تو ہو برباد مے اُلٹ برباد جیسے ہوتی ہے صحرا میں بوئے گل
صد گونہ کیفِ زندگی اَوروں کے دم سے ہے اَوروں کا دم غنائم یزداں کرم سے ہے

اس وقت جبکہ دیتی ہے لو سے شعاعِ ہوش اُٹھتی امنگیں بنتی ہیں طوفانگۂ خروش
خود بینیوں کو چھوڑ جوانِ شباب مست دنیا میں دیکھتا ہے مآلِ شکست و پست
مانندِ تخمِ شکستہ جسم۔ نورِ مہرِ غرب کھاتا ستارہ ہائے شب تار سے ہے ضرب
کھوتا ہے زندگی کو وہ جینے کے واسطے لگتی ہے پیاس پانی ہی پینے کے واسطے
سامانِ پختگی ہے اسے جسام ٹوٹنا اس کے لئے ہمیشہ کی عشرت ہے لوٹنا
مینچے کی زندگی سے نمایاں ہے فرق کیا دیدہ ورانِ عقل و خرد دیکھئے ذرا

یہ میری زندگی کی ہے تصویر ہو بہو مجھ کو شگفتگی نہیں بے سود آرزو

ذکاء اللہ بسمل ایم آر

کمالِ حُسن

میں نے سحر تبسّم کا جمالِ جہاں آرا دیکھا۔ جی میں آیا کہ اس کے مستانہ انداز دل میں رکھ لوں لیکن سورج نکل آیا اور افسوس میری تمنا خون ہو کر اُس سرخی میں جھلکنے لگی جو افقِ آسمان پر اپنی نیرنگیاں دکھا رہی تھی ——— یعنی شفق !!

میں نے آفتابِ درخشاں کا خیرہ کن نظارہ کیا، آرزو تھی کہ اس کی شعاعوں کے زرّیں تار اپنے دامن میں بھر لوں۔ مگر صد حیف !! اُن پر اُس تیرگی نے پردہ ڈالدیا جو دن کے اختتام پر جلوہ طراز ہوتی ہے ——— یعنی شام !!

میں نے باغ میں پھول دیکھے خوشنما اور نظر فریب پھول!! خواہش ہوئی کہ اُن کا ہلکا ہلکا رنگ بھینی بھینی خوشبو، چھین لوں، لیکن آہ! جب میری نظر چند خاک نشیں اور پژمردہ پنکھڑیوں پر پڑی۔ تو دامنِ مژگان اُس نمی سے تر ہوگیا جو فرطِ مسرت یا کثرتِ غم کی مظہر ہوتی ہے ـــــــ یعنی اشک!!

میں نے صنفِ جمیل کا وہ نمونہ دیکھا، جسے میں اعجازِ "حسن" یا "سحرِ نزاکت" کہ سکتا ہوں، حیران تھا، کہ اس کے ناز۔ اُس کے انداز، اُس کے عشوے، اُس کے غمزے اور ہاں اُس کی نزاکت کا کون متحمل ہوسکے گا ـــــ لیکن دوسرے روز جب میں وہاں گیا، تو مجھے کچھ نظر نہیں آیا مگر ایک تو دۂ خاک ـــــ یعنی قبر!!

پس اے کائنات کی گوناگوں چیزو، تم فانی سہی مگر تم میں ایک قسم کی شعریت، ایک نوع کا حسن در پردہ مضمر ہے جو بزبانِ حال شاہد ہے کہ تمہارا صانع، تمہارا خلّاق فی الحقیقت "جمالِ مطلق" ہے ـــــ یعنی "کمالِ حُسن"

تسکین قریشی (سورونی)

مہملاتِ غالب

چونکہ آجکل اردو علم ادب ترقی پر ہے۔ اس خیال سے علّامہ مولوی محمد عبد المالک صاحب مشیر مال ریاست بہاولپور نے ایک پرانے قصے کو دہرایا ہے کہ غالب کے بعض اشعار مہمل ہیں۔ اس سے علامہ ممدوح کا یہ مطلب تھا کہ جس طرح غالب نے خود اپنے ہاتھ سے مہمل اشعار کا ایک دفتر بے معنی غرقاب کردیا۔ اسی طرح جو باقی اشعار مہمل ہیں۔ ان کو بھی دیوان سے نکالدیا جاے۔ اور یہ خیال کوئی نیا خیال نہ تھا، بلکہ مشاعروں میں لوگ مرزا صاحب کے روبرو بعض اشعار کو مہمل کہتے تھے اور اُنپر ہنستے تھے۔ یہاں تک مشہور ہے۔ کہ لوگ غالب کے بعض اشعار کے معانی خود ان سے دریافت کرتے تھے۔ تو غالب کہدیتے تھے۔ کہ عالمِ مستی میں کوئی مضمون باندھا تھا۔ اب عالمِ ہشیاری میں بھول گیا ہوں۔ اسی طعن پر غالب نے تنگ آکر کہا ؎

نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اسپر جناب گوہر صاحب جالسی تلافاضل نے غالب کے اشعار مہملہ پر من گھڑت تاویلیں کرکے پر کا کوا بنادیا گرہمیں مکتب است ویں ملّا۔ کار غالب تمام خواہد شد۔ مثلاً غالب کے اس شعر کی بحث میں ؎

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

ملائے موصوف فرماتے ہیں۔ کہ اس شعر میں تلمیح ہے۔ افسوس ہے کہ ملا صاحب نے تلمیح کی تعریف پر غور نہ کیا۔ تلمیح کی تعریف یہ ہے۔ کہ شعر میں کسی خاص قصہ یا حقایق معلومہ وغیرہ کی طرف اشارہ ہو۔ مثلاً قول الشاعر

تَوَاللهِ مَا اَدْرِیْ اَ اَحْلَامُ نَائِمٍ اَلَمَّتْ بِنَا اَمْ کَانَ فِی الرَّکْبِ یُوْشَعُ

اس شعر میں یوشع علیہ السلام کے قصہ کی طرف اشارہ ہے کہ ان کی دُعا سے سورج واپس ہو گیا۔ یہ حقائق معنوی کی مثال ہے۔

چو از آبائے علوی ام سفلی بہرہ در گردد ۔ بدریا در صدف ہم قطرۂ لا شئے گہر گردد

مشہور ہے۔ کہ ابر نیساں کا قطرہ صدف کے منہ میں پڑتا ہے۔ تو اس سے موتی پیدا ہوتا ہے۔ اگر غالب کے اس شعر میں کسی خاص قصہ کیطرف اشارہ ہوتا تو غالب کے شاگرد مولوی عبدالرزاق اس شعر کا مطلب غالب سے کیوں دریافت فرماتے۔ افسوس ہے کہ گہر صاحب کو سرقہ مقبولہ غیر مقبولہ۔ اقتباس۔ حل عقد اور تلمیح میں امتیاز کی ضرورت نہیں۔ اور غالب کے مہملات کی حمایت کی آڑ میں وہ اپنی فضیلت دنیا کو منوانا چاہتے ہیں۔ اور طرفہ یہ ہے کہ طرفہ بن عبد اور امرالقیس دو مشہور شاعروں کے شعر کے متعلق آپ لکھتے ہیں۔ کہ انہیں "میرے دوست" کیلئے کوئی لفظ نہیں ملتا حالانکہ لفظ "صحبی" صاف موجود ہے۔ مگر ملا صاحب نے اس کو "سجی" لکھا ہے۔ نہ معلوم کون لفظ ہے۔ اور کس سبعہ معلقہ سے نقل کیا ہے۔ اگر ملا صاحب "صحبی" کو صحیح سمجھتے تو کیوں فرماتے۔ کہ "میرے دوست" کے لئے کوئی لفظ نہیں ملتا۔ امرالقیس کا یہ شعر ہے۔ ؎ وُقوفاً بها صَحْبِي عَلَيَّ مَطِيَّهُم ۔ يَقُولُونَ لا تَهْلِكْ أَسًى وَتَجَمَّلِ۔ اور طرفہ بن عبد کے شعر میں بجائے تجمل تجلد ہے۔ دونوں شعروں میں "صحبی" "میرے دوست" واقع ہے۔ گہر صاحب جب غالب کے سر سے سرقہ کا الزام دفع کرنے میں قاصر رہے۔ تو بمصداق تنگ آمد بجنگ آمد۔ انوری۔ جامی۔ حافظ۔ ازرقی اور حزین وغیرہم مشہور و مسلم شعرا پر حملہ کر دیا۔ ناظرین خیال فرمائیں۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جاوے۔ کہ متقدمین کے اشعار میں سرقہ ہے۔ تو کیا غالب اس الزام سے بری ہو سکتا ہے؟

یہ تو ایسا دعویٰ ہے۔ کہ زید ملزم کو اس لئے بری کیا جائے۔ کہ بشل اس کے عمرو نے بھی چوری کی تھی۔ انشاءاللہ تو اس کے جواب کے لئے ہم عنقریب قلم اٹھائینگے۔ متقدمین شعرا کے اشعار میں تو ایک یا دو شعر کا توارد کہا جا سکتا ہے۔ مگر غالب کے سرقہ کی تفصیل پر جیسی مرزا یاش صاحب لکھنوی۔ علامہ ممدوح۔ اور فاضل اجل مولوی الف دین صاحب وکیل نے کی ہے۔ اضافہ کیا جائے۔ تو شباب اردو کے چند صفحے کئی مہینوں کے لئے وقف کرنے پڑینگے۔ گہر جائسی صاحب کا بڑا اعتراض (ازالۂ حرکت) پر تھا۔ کہ "اس کو زیادہ تو مزیل حرکت یا زوال حرکت کہنا چاہئے تھا مگر ملا صاحب کا اعتراض تار عنکبوت سے بھی زیادہ بودا ہے۔ واضح رہے۔ کہ جس طرح ہر ایک مصدر اپنے اسم فاعل اور اسم مفعول کے معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔ اسیطرح وہ اپنے لازم حاصل مصدر کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ دیکھئے اقامتہ جس کے معنی قائم کرنے کے ہیں۔ مثلاً أَقِيمُوا الصَّلٰوةَ اور اقامتہ المسافر بمعنی قیام المسافر بھی آیا ہے۔ اکرام تعظیم۔ انعام اور اعلان ایسے مصادر متعدی ہیں۔ کہ اپنے لازم حاصل مصدر کے معنی میں بھی آتے ہیں۔ یہ امر مسلم ہے۔ کہ مصدر کبھی اپنے فاعل اور گاہو اپنے مفعول کی طرف مضاف ہوتا ہے مثلاً اعجبنی ضرب زید اس مثال میں جیسا زید کا فاعل ضرب ہونا موجب تعجب ہو سکتا ہے۔ اسیطرح زید کا مفعول ضرب ہونا بھی باعث

حیرت قرار دیا جا سکتا ہے اگر اس پر بھی ملا صاحب کا اطمینان نہ ہو۔ تو ہم رسالہ میر زاہد محشی بحاشیہ علامۃ الدہر مولوی اللہ داد خان صاحب مطبوعہ مطبع نظامی کانپور ۱۸۸۶ء کا حوالہ دیکر ملا صاحب کی تشفی کئے دیتے ہیں۔ وہذا توضیحین [illegible] ان العلم متصف بالمطابقۃ واللامطابقۃ والازالۃ لاتتصف بہما۔ اس کی دلیل مولوی اللہ داد صاحب یوں الفاظ بیان کرتے ہیں۔ لانہا زوال محض غیر صالح للاتصاف بشے اصلاً۔ دیکھیے یہاں تو مولوی اللہ داد صاحب محشی میر زاہد نے ازالہ کو زوال محض قرار دیا ہو۔ اگر مولوی اللہ داد صاحب کی تحریر میں یقین نہ ہو۔ تو پھر رسالہ انوار الہدیٰ فی مصباح الدجیٰ معنفہ مولوی عبد الحی صاحب لکھنوی کی بحث ازالہ کو مطالعہ کریں۔ علامہ ممدوح نے جہاں (ازالہ حرکت) فرمایا ہے وہاں مراد مزیل حرکت یا زوال حرکت ہو۔ اگر غور کیا جائے۔ تو معلوم ہو جائیگا۔ کہ ملا صاحب اس کے بھی قائل ہیں۔ کہ مصدر لازم اسم فاعل مصدر متعدی کے معنوں میں آتا ہی۔ کیونکہ انہوں نے خود فرمایا۔ ازالہ حرکت کی بجائے مزیل یا زوال حرکت کہنا چاہیے۔ اس سے صاف ظاہر ہو کہ ملا صاحب کے نزدیک زوال اور مزیل ہم معنی ہیں۔

غالب کا یہ شعر ؎ کہیں نظر نہ لگے ان کے زورِ بازو کو - یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں شعر ذیل کا سرقہ ہے ؎ بیک کرشمہ کند قتل صد تماشائی - ز چشم زخم۔ خدا چشم بواد مصئوں۔

گوہر صاحب جائسی حسب عادت سہو کاتب کو بھی زیر بحث لاتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی انہوں نے کیا ہو حالانکہ خود ان کے اپنے مضمون میں سہو کاتب کے باعث اغلاط ہیں ع طعنۂ غربال بر کوزہ شد از سوراخہا۔ اس شعر میں بواد کا الف دعائیہ کاتب سے رہ گیا ہے۔ ملا صاحب کی قابلیت کا بھی عجب عالم ہے۔ بالفرض اگر بواد کا الف رہ گیا تھا۔ تو وہ لفظ مصئوں کو مصئوون پڑھ کر وزن صحیح خیال کرتے۔ کیونکہ مصئوں بدو واو بالتعلیل پڑھنا مستعمل ہے ؎ وکم من عائب لفظا صحیحا وآفتہ من العقل السقیم - حضرت گوہر صاحب کی ضد کا ایک اور کرشمہ ملاحظہ ہو۔ کہ کرشمہ کو جوارح کا فعل سمجھتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ آنکھ کے ساتھ کو تعلق نہیں ہوتا۔ ملا صاحب اپنی طبیعت سے مجبور ہوکر ایک مستند شاعر پر جہالت کی تہمت لگاتے ہیں۔ ذیل میں ملا صاحب کی غلطی کو اہل نظر کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ اگرچہ وہ ایک قابل محقق کا سیتھ موصوف [illegible] نام سے چکراتے ہیں۔ جیسا کہ انہوں نے ایک جگہ اشارہ کیا ہے۔ مگر واضح ہو کہ بموجب لا تنظر الی من قال وانظر الی ما قال۔ ہم اسپر نظر نہیں کرتے۔ کہ یہ کسی ہندو کی تالیف ہو یا کسی مسلمان کی بلکہ ہمیں بہر صورت تحقیق کی قدر کرنی چاہیئے۔ جو منشی ٹیک چند بہار نے کی اور نیز ملا صاحب پر یہ ثابت کرنا ہے۔ کہ جس فضیلت پر انکو ناز ہو۔ اس زمانہ میں بھی کئی ہندو انگریزی میں بی۔ اے ہوکر مولوی اور منشی کی فضیلت حاصل کر چکے ہیں۔ قارئین کرام ملاحظہ فرمائیں۔ ہم کتب لغت سے شہادت پیش کرتے ہیں۔ کہ کرشمہ آنکھ ابرو کے اشارہ سے تعلق رکھتا ہے۔ ملاحظہ ہو خلاصہ کتب لغت۔ کرشمہ بکسر تین و فتح آخر و ...

بفتحتین اشارہ چشم و ابرو۔ بہار عجم کرشمہ اشارہ بچشم و ابرو کشف کرشمہ با برو چشم اشارہ کردن شیدی ناز و غمزہ و اشارہ بچشم و ابرو منتخب کرشمہ بفتحتین و بکسر غمزہ و اشارہ بچشم ابرو۔ برہان قاطع وغیرہ کتب لغت شاید گہر صاحب ان کتابوں کو بھی تسلیم نہ کریں۔ ہم اساتذہ کے اشعار پیش کرتے ہیں ؎

دو چشم مست بتاں تا کرشمہ پرداز ست — مدار اہل محبت بدیدہ باز ست

نیز ؎ گل بستر او دم ز دل و دیدہ تا نظر — بر نرگس کرشمہ طرازش فگندہ ام

ولدالزنا الی آخرہ فارسی شعر سرقہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ عربی شعر اتنکرانے آخرہ کا ترجمہ ہے۔ عربی ؎

اَتُنکِرُ مَوتَہُم وَاَنَا سُہَیلُ — وُلِدتُ لِمَوتِ اَولَادِ الزِّنَاءِ فارسی ؎ ولدالزنا است حاسد من آنکہ طالع من — ولدالزنا کش آمد چو ستارہ یمانی۔ اگر گہر صاحب بھی غالب کے اشعار کو دیگر شعرائے متقدمین کا ترجمہ کہیں۔ تو ہمکو تسلیم کرنے میں عذر نہیں ہو سکتا۔ مگر ان کا دعوی ہے کہ غالب نے کبھی سرقہ کیا ہی نہیں یا دوسروں کے مضمون کو چرا کر غالب بہتریں طریق سے ادا کرتا ہے۔ حالانکہ اہل نظر جانتے ہیں کہ کجا اساتذہ کے اشعار اور کجا غالب کے اشعار

جناب مرزا یاس صاحب لکھنوی نے غالب کے اس شعر پر

ہسارہ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی — سو رہتا ہے باندازہ چکیدن سرنگوں وہ بھی

سرقہ کا حکم لگایا ہے کیا اس کا جواب کبھی ممکن ہے ؟ غالب کا یہ شعر نعمت خاں عالی کے لاجواب شعر کا سرقہ ہی کہنا ہے ؎ دریاب کہ ماندہ است ز دل قطرۂ خونے — آن قطرہ ہم از دست تو لبریز چکیدن

نعمت خان عالی کے اس شعر کی فصاحت و بلاغت روانی کلام اور ندرت تخیل کا کیا کہنا۔ غالب نے اس [illegible] کا خون کر دیا ہے۔ کیا اب بھی جناب گہر صاحب غالب کے اس سرقہ قبیح بلکہ اقبح کو دیکھ کر یہ فرمانے نہ کرینگے ؟ کہ غالب نے کبھی کسیکا سرقہ نہیں کیا۔ یا کسی کے شعر کا ترجمہ کیا۔ تو اصل ماخذ سے [illegible] بنا دیا۔ کیا غالب کا یہ شعر نعمت خان عالی کے شعر کا سرقہ قبیح نہیں ہے ؟ کیا غالب کا یہ [illegible] نعمت خاں عالی کے شعر سے زیادہ حسین ہے ؟ یا اس کی بگڑی ہوئی شکل ؟

آخر میں ہم ناظرین شباب اردو سے اپیل کرتے ہیں۔ کہ للہ انصاف فرمائیں۔ گہر صاحب امور خارجہ عن البحث کو اس قدر طول دیتے ہیں۔ کہ اس سے صاحب مذاق کا دماغ پراگندہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً بحث مجاز و حقیقت کو جسے اصل بحث سے کوئی تعلق نہیں۔ ملا صاحب نے اس قدر پھیلایا ہے۔ کہ اصل مضمون بھی بھول گیا ہے۔ اور علی ہذا القیاس اپنی فضیلت کے اظہار کی خاطر توارد۔ اقتباس اور تلمیح کے باب میں انہوں نے بلا ضرورت ناظرین شباب اردو کا بیش بہا وقت ضائع کیا ہے۔

خیالاتِ پریشاں

آنا تو میری سوزشِ غم کا نشاں رہے — تربت پہ آسمان کے بدلے دھواں رہے
کیوں میرے دم سے جورِ فلک کا گماں رہے — میرا مزار بھی نہ تہِ آسماں رہے
بالیں پہ آئے ہیں وہ عیادت کیواسطے — اے آہ چپ کہ رازِ محبت نہاں رہے
بعدِ فنا بھی چین نہیں سوزِ عشق سے — یعنی کہ ہم اسیرِ غم جاوداں رہے

ہمصفیرو بائے تسکیں مرے شیون میں ہے — گو قفس میں ہوں قفس رکھا ہوا گلشن میں ہے
دستِ وحشت طوق کی صورت مری گردن میں ہے — آجکل میرا گریباں بھی مرے دامن میں ہے
جل بجھا جو دل میں تھا صبر و شکیب اے برقِ حسن — اب فقط اک مشتِ خاک اس سوختہ خرمن میں ہے
یہ دلِ وحشی رہا کرتا ہے ان کے ساتھ ساتھ — آج سنتا ہوں کہ شانہ محفلِ دشمن میں ہے
پھر شبِ غم کا خیال آیا اندھیرا چھا گیا — پھر وہی تاریک عالم دیدۂ روشن میں ہے

تم اس طرح مری بالیں پہ اشکبار نہ ہو — دمِ اخیر کہیں راز آشکار نہ ہو
چمک رہی ہیں یہ کیوں آج بجلیاں پیہم — کہیں فلک پہ مری آہ شعلہ بار نہ ہو
ہیں دل کی بات زباں پر کبھی نہیں لاتا — یہ خوف ہے کہ کہیں اُن کو ناگوار نہ ہو
یہ ٹھوکریں ہیں غضب مست ناز دیکھ کے چل — کسی غریب کا ٹوٹا ہوا مزار نہ ہو
وہ نالے کیا ہیں جو چکر آسمان کو دیں — وہ آہ کیا ہے جو تا قب جگر کے پار نہ ہو

غزل

شبنم تھی - شمعِ گور تھی - ابرِ بہار تھا — جو تھا غرض وہ میرے لئے اشکبار تھا
بیتاب اس طرح نہ دلِ بے قرار تھا — یہ آج پردہ در ہے - کبھی پردہ دار تھا
تم وقتِ نزع دیر سے آتے تو دیکھتے — اب کیا کہوں کہ موت کا کیوں انتظار تھا
اس غم میں رو رہا ہوں کہ کیوں آنکھ کھل گئی — ہیں اُس سے - مجھ سے خواب میں جو ہمکنار تھا
پامالِ جور کرکے وہ کہنا کسی کا ہائے — ہمکو خبر نہ تھی کہ یہ تیرا مزار تھا
دم کے نکلتے ہی مجھے پھینک آئے قبر میں — اللہ اس قدر میں عزیزوں پہ بار تھا
گر طور پر نہ دیکھتے موسےٰ تو دیکھتے — خود بینیاں ذرہ ذرہ میں وہ آشکار تھا

میلہ کا تماشہ

داروغہ جی۔ مجھ غریب کو کہاں لئے جاتے ہو میلہ ٹھیلہ سے کسی کمبخت کو ذوق شوق ہو۔ یہاں آپ کام کی کثرت کہ کھانے تک کی مہلت نہیں دیتی۔ ہجوم کار سے ناک میں دم ہے۔

داروغہ جی۔ اجی میر صاحب رہنے بھی دو۔ کام کاج تو چلا ہی جاتا ہے۔ ہو رہیگا۔ چلو بھی دیکھو تو سہی کیا رنگ ہے۔ کیسا میلہ ہے کیسی بہار ہے۔ دیوی کے درشنوں کو دور دور سے جاتری آتے جاتے ہیں۔ تفریح بھی ہے جادو کا کھیل بھی ہے۔ پھرکی بازی بھی ہے۔ ناچ رنگ کی کیا پوچھتے ہو کوئی ڈیرہ ہوگا۔ جہاں رنگ رلیاں نہ ہوتی ہوں گی۔ حسن کی دیویوں کی تو گنتی نہیں ہے۔ حضرت میرٹھ کی نوچندی کو بھول جاؤ گے۔ اور ہاں ذرا کان تو لاؤ۔ یہاں بھی خوب کام بنے گا۔ پولیس کی کیا کہنی ہوتی ہے۔ یا تجارت اتنی تنخواہ میں اس گرانی کے وقت کیا ننگی نہائے اور کیا نچوڑے۔ ایک سب انسپکٹر اور ہزار آفتیں۔ جان عذاب میں ہے جو کہتا ہے [illegible] اسوقت نانی جی کا گھر یاد آتا ہے جب دورے ہوتے ہیں اور پل پکار پڑتی ہے۔ انڈا لاؤ۔ مرغی لاؤ۔ بطخ لاؤ۔ دودھ لاؤ۔ مکھن لاؤ۔ لکڑی لاؤ۔ بھوسہ لاؤ۔ [illegible] لاؤ۔ ہر ایک طرف لاؤ لاؤ کی پکار ہیں چار طرف سے بتلاؤ کہ کمبخت داروغہ کیا لائے اور کیا نہ لائے۔ پچھلے [illegible] میں ایک سیکڑہ پر پانی پھر گیا۔ اور پھر شکایت کی۔ ایک مہتر صاحب بگڑ بیٹھے تھے کتوں کے دودھ کے پہنچنے میں کچھ دیر ہو گئی تھی۔ بس اتنا ہی کہا تھا کہ مہتر صاحب ابھی تازہ دودھ آتا ہے کتے بھوکے نہیں رہینگے۔ مگر اس ظالم نے ایک نہ سنی وہاں پہنچ گئی۔ اسوقت جو کہا سو کہا۔ اس کی نوبت دور تک پہنچی۔ اب کیا تھا لینے کے دینے پڑ گئے۔ آخر بچاؤ کہا اور پھر دیکھا۔ کہاں تک کوئی [illegible] جھونکے۔ کہاں تک کوئی کتوں کے منہ میں لقمہ دے۔

لو حضرت اب دیر نہ کیجئے۔ کب سے سواری کے لئے کنور صاحب کی فٹن کھڑی ہے۔ ایک ہاتھی بھی بھیج دیا گیا ہے اگر جی چاہے ہاتھی پر گھومیے۔

آخر ایک بھولے بھالے سید کو داروغہ جی کھینچ تان کر میلہ کی سیر کو لے ہی گئے

۲

ایک بڑا ڈیرہ نصب ہے اسکے آگے ایک دلکش شامیانہ۔ شامیانہ کے بیچ میں ایک گول میز اور اسپر خوش رنگ چادر اور تازہ تازہ گلدستے گرداگرد کرسیاں۔ شامیانہ کے ایک طرف ڈیرہ سے ملی ہوئی ایک چھوٹی میز اسپر قلمدان کاغذ وغیرہ لکھنے کا سامان ڈیرہ کے آگے دور دور تک چھڑکاؤ۔ سپاہی پہرہ دار شامیانہ کے آگے ٹہل رہا ہے۔ کانسٹیبل اور چوکیدار پرا جمائے کھڑے ہیں۔

جب فٹن قریب پہنچی۔ سب کانسٹبلوں نے حسب قاعدہ سلامی دی۔ داروغہ جی نہایت آن بان اور شان و شوکت کے ساتھ فٹن سے اتر کر آرام چوکی پر جا جمے۔ میر صاحب ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔

ابھی کھانے میں دیر تھی۔ خدمتگار دوڑا ہوا آیا۔ اور کہا سرکار گرم پانی تیار ہے۔ ابھی چار لاتا ہوں۔ کہ اتنے میں بڑوس میں شور وغل ہوتا ہوا سنائی دیا۔ سب نے گردنیں اُٹھا کر دیکھا۔ تو ایک کانسٹیبل اور ایک چوکیدار ایک اُٹھائی گیرے کو پکڑے ہوئے لا رہے ہیں تماشا بیوں کے غول کے غول پیچھے ہیں۔ مدعی بھی ساتھ ہے اور مال بھی کانسٹیبل نے آگے بڑھ کر کہا۔ کہ سرکار اس اُٹھائی گیرے نے ایک لوٹہ اور ایک گلاس اُٹھایا ہے۔ یہ بادام نمبردار بھی حاضر ہے۔ جس کا مال ہے ٹھیک سندر کے سامنے اس اُٹھائی گیرے کو پکڑا ہے۔ **داروغہ جی** - اب کہو نمبردار کیا معاملہ ہے۔ اور کس طرح تمہارا لوٹا اور گلاس اُٹھایا گیا ہے؟

بادام نمبردار - داروغہ جی میں راستہ کے پاس پیپل کے نیچے اپنا بستر جمائے لیٹا تھا اور لوٹہ گلاس سرہانے رکھا ہوا تھا۔ اتنے میں میری آنکھ جھپک گئی تھوڑی دیر میں جب کھلی تو لوٹہ اور گلاس غائب۔ میں اِدھر اُدھر دیکھنے بھالنے لگا۔ کچھ پتا نشان نہ چلا۔ میں اپنے بیٹے کو بستر پر بٹھلا کر گھبرایا ہوا مندر کی طرف بھاگا۔ وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ شام سندر کانسٹیبل اور یہ چوکیدار اس آدمی کو پکڑے ہوئے ہیں اور یہ گواہ موجود ہیں۔ **داروغہ جی** ابے اُٹھائی گیرے تیرا کیا نام ہے۔ کہاں رہتا ہے بچہ اچھا ہاتھ مارا سچ سچ بتا کے دفعہ سزا پا چکا ہے۔ صورت تو اچھی بنائی ہے گویا آپ بڑے بیوپاری ہیں ماتھے پر ٹیکہ بھی ہے۔ اور گردن میں جنو بھی۔ شام سندر ذرا اس کی کمر تو دیکھو کہیں بیدوں کے نشان تو نہیں ہیں ہمیں تو پُرانا چپا معلوم ہوتا ہے اس کی صورت کہے دیتی ہے

پہلے تو یہ اُٹھائی گیرا چپ سا ہو رہا اور کچھ جواب نہ دیا۔ جب داروغہ جی ذرا گرمائے اور بگڑے اس نے ایک لمبا سانس بھر کر کہا۔ **اُٹھائی گیرا** - دھرماتما میں اٹھائی گیرا یا اُچکا نہیں ہوں۔ نہ میرے باپ دادا نے یہ کرم کیا ہے۔ میں تو آپ کا ایک غریب برہمن ہوں۔ میرا نام اجودھیا پرشاد ہے باپ کا نام۔ پنڈت کرپا رام۔ موضع بیر پورہ میں رہتا ہوں بھگوانی اور کھیتی باڑی سے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پال لیتا ہوں۔ کمبختی کا مارا دیہی کے درشنوں کو آ نکلا تھا۔ یہاں اس آفت میں پھنس گیا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ یوں کلنک کا ٹیکہ میرے ماتھے پر لگے گا۔ اور رسوائی ہوگی۔ ہائے میں تو کسی کرم کا نہ رہا۔ نہ کلانے کا ٹھکانا ہے یہ لوٹہ اور گلاس ضرور میرے پاس سے نکلا ہے۔ میں نے اس کو نہیں چرایا۔

بات یہ ہے کہ جب میں میلہ میں آیا۔ تو راستہ میں پیپل کے نیچے چار آدمی بیٹھے تھے۔ وہاں میں بھی سستانے لگا اور ذرا دم لینے لگا۔ اتنے میں ان آدمیوں میں سے ایک نے کہا۔ کہ بھائی تم کون ہو۔ میں نے کہا برہمن ہوں اس نے کہا کہ آہا اچھا۔ مہاراج ذرا لوٹا تو بھر لا دو وہ دیکھو سامنے کنواں ہے۔ میں نے کہا کہ میں تو تھکا ہوا ہوں مجھ پر تو کرپا کرو۔ پھر وہ بولا واہ مہاراج واہ جل کے لئے تھکے ہوئے ہو۔ جل کا پلانا تو دھرماتماؤں کا دھرم ہے۔ آپ برہمن ہو کر جل لانے سے انکار کرتے ہیں اس وقت مجھے بھی کچھ کچھ پیاس لگی ہوئی تھی۔ میں لوٹا دور اُٹھا کر پانی لانے چل کھڑا ہوا۔ تب ایک آدمی نے گلاس دیا کہ مہاراج کہاں بار بار جاؤ گے۔ اس کو بھی بھر لانا۔ میں لوٹا اور گلاس لیکر چلا گیا۔ اور دونوں کو اچھی طرح مانج کر بھر لایا جب پیپل کے پاس آیا۔ تو وہاں کوئی بھی نہیں اِدھر اُدھر دیکھا کوئی نظر نہ پڑا۔ آواز دی کوئی نہ بولا۔ اب میں حیران تھا۔ کہ کیا کروں کہاں ڈھونڈوں۔ تب میں آگے

بندھ کر دیکھنے لگا اور مندر تک ڈھونڈھتا ڈھونڈھتا چلا آیا۔ مندر کے سامنے اس کانسٹیبل نے پکڑ لیا اور کچھ دیر کے بعد آدمی آگیا جو کہتا ہے کہ میرا لوٹہ اور کلسہ ہے۔ سرکار میں نے نہ لوٹا چرایا ہے نہ کلسہ۔ یہ سب بناوٹ ہے سرکار اب جو چاہے سو آپ کریں اب تو اس غریب برہمن کی آبرو آپکے ہاتھ میں ہے

داروغہ جی - ابے بدذات ہم خوب جانتے ہیں اٹھائی گیروں کو یہ تو اچھی بات بنائی ہے لے اب بول اور مال کہاں ہے جو یہاں سے اڑایا ہے سچ سچ بتلا دیگا۔ تو چھوٹ جائیگا۔ ورنہ یاد رکھ چھوٹنے کا نہیں جوگی اور تو ہو اور ہم اچھا یہ تو بتلا کہ کوئی تجھے جانتا بھی ہے تیرا یہاں کوئی جان پہچان -

اوٹھائی گیرا - سرکار بھلا مجھ غریب برہمن کو اس شہر میں کون جانتا ہے میں کس کو بتاؤں۔ اس وقت تو میرے ہوش ٹھکانے نہیں ہیں ہاں آتے ہوئے تو یہ سے گاؤں کے لالہ گنیشی لال دوکان لگاتے ہوں - یا کہیں کو [illegible] گئے ہوں **داروغہ جی** - اچھا ان کی دوکان کہاں ہوگی - **اوٹھائی گیرا** - داروغہ جی مجھے کیا معلوم کہاں دوکان ہے - ہاں میرے ساتھ کوئی چلے تو میں ڈھونڈ ڈھانڈ کر بتلا دوں گا - **داروغہ جی** - جاؤ شام سندر تم ہی اس کو لیجاؤ۔ دیکھو اسکو بتلاتا ہے جو کہیں اگر تو بھی ساتھ لیلو۔ دیکھنا ہوشیار رہنا۔ ایسا نہ ہو کہ یہ کہیں کھسک جائے اور تم تاپتے پھرو۔

شام سندر مہاراج کرپا ندھان پنڈت اجودھیا پرشاد کو پکڑے ہوئے دوکان دوکان گھومنے لگے - آخر مہاراج ایک دوکان پر ٹھٹھک گئے - اور کہا یہ ہیں لالہ گنیشی لال ہمارے گاؤں کے مجھے جانتے ہیں جب لالہ گنیشی لال نے مہاراج اجودھیا پرشاد کو اس حال میں دیکھا کہ ایک کانسٹیبل پنڈت جی کا ہاتھ پکڑے ہوئے اور لٹھ لئے ہوئے ایک چوکیدار ساتھ ہے تو ایک اچنبھا سا ہو گیا - پوچھا مہاراج خیر تو ہے کیا ہوا

پنڈت جی نے جواب دیا - خیر ویر کچھ نہیں ہے کیا پوچھتے ہو - لالہ جی پولیس نے دھر لیا ہے کہ میں نے لوٹہ اور کلسہ اٹھایا ہے بھلا لالہ جی کبھی میں نے ایسا کرم کیا ہے یا میری پرکھوں سے ایسا کام ہوا ہے - اب پولیس ہے کون کہے کس کی مجال ہے -

لالہ گنیشی لال چونک پڑے - جب چوری کا حال سنا - اور کانسٹیبل سے کہا - بھائی یہ مہاراج چور نہیں ہیں یہ ایسا کام نہیں کرتے یہ بچارے تو سیدھے سادھے برہمن ہیں -

کانسٹیبل نے کہا - اچھا لالہ جی ذرا کھڑے کھڑے تھانہ تک تو چلئے - اور داروغہ جی سے کہہ دیجئے ہم ان مہاراج کو جانتے ہیں اچھا بے - جو ان مہاراج کا پھندا کٹ جائے اور ان کے سر سے آفت ٹل جائے - ادھر پنڈت جی بھی گڑگڑائے - کہ پرمیشر آپ کو بنائے رکھے - ذرا چلئے لالہ جی اور مجھے بچا لیجئے -

اسوقت لالہ کی دوکان پر خوب بکری ہو رہی تھی - اس وقت کا جانا اور دوکان چھوڑنا برا معلوم ہوتا تھا - مگر کیا کریں گاؤں کا معاملہ ہے - اور پھر ایک غریب برہمن کی آبرو جاتی ہے - دھوتی اور پگڑی سنبھال کر ساتھ ہو لئے بیٹے کو دوکان پر چھوڑ گئے جب تھانہ میں پہنچے تو داروغہ نے کہا کہ شام سندر کیا ہے کسکو لائے ہو

شام سندر - داروغہ جی دیکھئے یہ لالہ جی آئے ہیں اس اوٹھائی گیرے کے حمایتی بنکر - **داروغہ جی** - اہو لالہ جی آپ اس اوچکے کی صفائی دینے آئے ہیں - پہلے تو یہ بتلائیے کہ وہ مال کہاں ہے جو اس نے یہاں سے اڑایا ہے - ہم تو پہلے ہی سے جانتے ہیں کہ اوٹھائی گیرے اور اوچکے سب مال ٹھکانے پر پہنچا دیتے ہیں - اس کے بغیر تو کام ہی نہیں چلتا

اربے کوئی ہے۔ ذرا لالہ جی کو علیحدہ تو بٹھلاؤ۔

اچھا لالہ ٹھیرئے آپ کا بھی چالان ہوگا چور کا ساتھی ہے۔

اب تو لالہ کے ہوش اڑ گئے تھر تھر کانپنے لگے۔ منہ سے کچھ نہیں نکلتا کچھ ہے۔ دل میں کہنے لگے آہ یہ کیا ہوا۔ آئے تھے غریب برہمن کو بچانے آپ دھرے گئے۔ اب کیا ہوگا۔ اتنے میں ایک کانسٹیبل نے جھپٹ کر لالہ کے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر زور سے ایک جھٹکا دیا اور کہا لالہ چل بھایا ہی کبھی حوالات دیکھا۔ اب کوئی دم میں ہتھکڑیاں بھری جاتی ہیں اور بڑے گھر کو جانا ہے۔

اب لالہ گنیشی لال اور مہاراج اجودھیا پرشاد جی الگ الگ بٹھلا دئے گئے اور داروغہ جی کچھ لکھنے میں مصروف ہوگئے

جب ذرا دیر ہوئی۔ تو لالہ کا بیٹا دوکان پر سے دوڑا ہوا آیا۔ کہ لالہ جی اب تک کیوں نہیں لوٹے۔ یہاں تھانہ میں آکر کیا دیکھتا ہے کہ لالہ جی چوروں کی طرح الگ زمین پر بیٹھے ہیں جب پاس جانے لگا۔ پہرے والا سپاہی للکارا کہ ہیں خبردار الگ رہنا۔ پاس نہ جانا۔ دیکھنا کچھ بات نہ کرنا۔ تب تو لالہ جی چونکا کہ میں یہ کیا ماجرا ہے۔ اب کس سے پوچھے۔ اور کون بتلائے حیران پریشان ششدر کھڑا ہے۔

اتنے میں دور سے لالہ جی نے بیٹے کو اشارے اشارے میں کچھ سمجھایا۔ اور آواز دی کہ داروغہ جی۔ اب حکم دیجئے۔ مجھے جانے دیجئے۔ میرا بہت نقصان ہوتا ہے۔ دوکان مٹی ہوئی جاتی ہے۔ آپ جانیں اور مہاراج۔

اس پر داروغہ جی نے زور سے چلاکر کہا کہ لالہ چپ بیٹھا رہ۔ ہونے دے دوکان مٹی۔ جب کیا ہوگا جب بڑے گھر جائے گا۔ اب کوئی دم جاتا ہے کہ چالان ہوگا۔ اس وقت نانی جی کا گھر یاد آجائیگا۔

اب لالہ کا بیٹا داروغہ جی کے پاس آیا اور جھک کر سلام کیا۔ اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔

لالہ کا بیٹا۔ داروغہ جی لالہ جی کا کیا قصور ہے کس خطا پر بہ حراست میں ہیں۔ لیجئے اپنے غریب بیٹے پر رحم کیجئے اور چھوڑ دیجئے۔ لالہ جی کیوں پرائی آگ میں جلیں۔

داروغہ جی نے تیوری چڑھاکر اور آنکھیں بدلکر کہا۔

داروغہ جی۔ جا لالہ جا اپنا کام کر اب تو لالہ جی چکی پیسینگے اس اوٹھائی گیرے کے ساتھی لالہ ہیں سب مال تھال چوری کا انہیں کے پیٹ میں ہے۔

لالہ کا بیٹا۔ سرکار اب جانے دیجئے اور الگ ایک بات تو سن لیجئے۔ **داروغہ جی**۔ نہیں لالہ ہمیں فرصت نہیں ہے ہم چالان تیار کر رہے ہیں۔ ارے کوئی ہو تو دیوان جی کو جلدی بلاؤ۔ دیوان جی آئے۔

دیوان جی۔ کہیے داروغہ جی کیا حکم ہے۔ کیوں یاد کیا ہے

داروغہ جی۔ حکم وکم تو کچھ نہیں ہے۔ سب کاغذ مکمل ہوئے چالان بنجانے پر کس کس کانسٹیبل کی نوکری بولی گئی۔

اب تو لالہ کا بیٹا بہت سٹ پٹایا۔ اور دوڑ کر داروغہ جی کے پیروں میں گر پڑا۔ اور رو کے کہنے لگا۔ سرکار دو باتیں ذرا الگ سن لیجئے۔ غرض بمشکل داروغہ جی اٹھے اور ڈیرہ میں کانا پھوسی ہونے لگی۔ بہت رد و قدح کے بعد دس [illegible] پر فیصلہ ہوا۔ کس کی دوکان کہاں کا سودا

خیر سے لالہ جی دوکان پر آگئے

کنور صاحب کنور صاحب کنور صاحب

کنور صاحب ہکا بکا کہ کون پکار رہا ہے۔ آپ نے کھولا پھیرا

جب تھانہ کے سامنے آئے تو کیا دیکھتے ہیں۔ کہ مہاراج اجودھیا
ناد براج سہے ہیں اور پکار رہے ہیں۔
ور صاحب خیر ہی مہاراج بتائیے بیٹھے ہو۔ آپ اور تھانہ
ہاراج اجودھیا پرشاد ۔ کنور صاحب۔ ہونی جو تھی سو کر
دی کے درشن کو آئے تھے۔ اب تو اٹھائے گیرے ہیں۔
نور صاحب کو اس بات کے سننے سے ایک تعجب سا ہو گیا
نور صاحب داروغہ جی کے پاس آئے۔ دعا سلام کے بعد ادھر اُدھر
ی باتیں ہونے لگیں۔ کنور صاحب افسوس کرنے لگے کہ آج مٹن
دراد یر سے پہنچی ہو گی۔ کمبخت سائیس اسباب صاف کرنے
لگا تھا۔ یہ کمبخت عین وقت پر اسباب صاف کرنے کو لے بیٹھتے
ہیں۔ داروغہ جی نے کہا کہ نہیں کنور صاحب مٹن وقت پر پہنچ گئی
تھی۔ ہم ذرا دیر سے سوار ہوئے تھے۔ یہ سیٹھ صاحب جو بیٹھے ہیں
میلہ میں آنے کو ہچر مچر کرنے لگے تھے۔ باتوں باتوں میں مہاراج
اجودھیا پرشاد جی کا بھی ذکر آ گیا۔ کنور صاحب نے کہا کہ داروغہ جی اس
غریب برہمن کو چھوڑ دیجئے۔ یہ اٹھائی گیرا نہیں ہے یہ تو ایک خاندانی
برہمن ہے۔ یہ سننا تھا کہ داروغہ جی لال پیلے ہو گئے اور آنکھیں
پھیر کر بولے۔ **داروغہ جی**۔ کنور صاحب آپ کو ان باتوں سے
کیا مطلب ہے۔ مہاراج نے لوٹا اور کلسا اوٹھایا ہے۔ مدعی اور
گواہ موجود ہیں۔ پورا پورا ثبوت مل گیا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ
اوٹھائی گیرا نہیں ہے۔ بھلا اس بات کا بھی کچھ ٹھکانا ہے
بس رہنے دیجئے۔

کنور صاحب نے داروغہ جی کی اس کج خلقی پر دل میں تو پیچ و تاب
تو بہت کھایا۔ مگر ہنس کر کہا۔

کنور صاحب۔ واہ داروغہ جی آپ تو خفا ہو گئے۔ کیا آپ
کے نزدیک یہ برہمن اٹھائی گیرا ہے۔ یہ تو نہایت شریف ہے
آپ کو دھوکہ ہوا ہے۔ اس کی بابت جو کچھ کیا گیا ہے سب
بناوٹ ہے۔ میں اس بادام فروش کو جانتا ہوں اس کا یہی کام
ہے پولس سے ملا ہوا ہے۔ مہاراج اجودھیا پرشاد میلہ میں
اوٹھائی گیری کے لئے آئے تھے۔ اب مہاراج کا چالان کر کے
بھجوائیں گے۔ اور لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔
اب کیا تھا۔ داروغہ جی مارے غصہ کے سرخ ہو گئے اور آنکھوں
میں خون اتر آیا۔ اور تیوری بدل کر کہنے لگے۔

داروغہ جی۔ اچھا کنور صاحب اچھا جانے آپ کو قسم ہے
جو آپ مہاراج کو نہ چھڑائیں۔ ایک دو بیر سٹر بھی ضرور بلوائیے۔
دیکھیں آپ کتنے پانی میں ہیں۔ یہ یاد رہے کہ مہاراج
اجودھیا پرشاد آپکی ان باتوں سے جیل میں چکی پیستے پیستے
نہ مر جائیں تو سہی۔ اور آپکو تو کیا کہوں۔ مگر ہاں اتنا سن
لیجئے۔ کہ آپ شاید قانون سے واقف نہیں۔ کار منصبی میں
مداخلت بھی جرم ہے۔

چونکہ کنور صاحب ہمیشہ صلح پسند تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے
کہ پولس کے منہ چڑھیں۔ انہوں نے داروغہ جی سے آشتی آمیز
باتیں شروع کر دیں اور کہنے لگے۔

کنور صاحب۔ داروغہ جی اتنی خفگی غریبوں پر نہ چاہیئے
ہم لوگ تو آپ کی رعایا ہیں ہماری مجال ہے کہ آپ سے کچھ
کہیں یا آپ کی بات میں دخل دیں بے تکلفی کہا گیا۔
جو کچھ کہا گیا آپ کی عنایتیں تو ہم پر ہمیشہ رہتی ہیں
ہمارا آپ کا ایک ہی معاملہ ہے۔ اب غصہ کو تھوک
ڈالئے۔ اور ذرا کان میں ایک بات سن لیجئے۔

داروغہ جی۔ بس رہنے دیجئے۔ کنور صاحب ہمیں
آپ کا بہت لحاظ پاس ہے۔ ہم تو آپ کو اپنا دوست

سمجھتے ہیں اس واسطے آپ کے گھر کو اپنا گھر جانکر جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے ۔ منگا بھیجتے ہیں ۔ دیکھئے صبح آپ کی مٹن آئی تھی اب آپ کا ہاتھی موجود ہے ۔ اور شام تک یہیں کھڑا رہیگا ۔ اب داروغہ جی اور کنور صاحب ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے ڈیرہ میں چلے گئے ۔ اور دیر تک راز و نیاز کی باتیں ہوتی رہیں ۔ اب یہ نہ پوچھئے کہ کس طرح داروغہ جی راضی ہوئے ۔ اور کنور صاحب نے کیونکر جان بچائی ۔ اور کیونکر مہاراج اجودھیا پرشاد کے گلے کی رسی کٹی ۔

جب مہاراج چھوٹ گئے ۔ ہاتھ جوڑ کر داروغہ جی کو آشیرباد دینے لگے اور زور سے چلا کر کہا ۔ دھن باد پولیس کو اجیارہ کہتے ہیں کچھ منٹ باقی ہیں اس جھگڑے میں کھانا کہاں ۔ آنتیں قل پڑھ رہی ہیں ۔ داروغہ جی نے باورچی کو پکارا ۔ ارے کمبخت کھانا بھی تیار ہے ۔ یا نہیں ۔ **باورچی** ۔ سرکار کھانا کب سے تیار ہے تو دیر روٹی ڈالنے کی دیر ہے ۔ بریانی بگھاری اور کھانا لایا ۔

(باقی)

سید نثار حسین ڈپٹی مجسٹریٹ

"خدا کو ثابت کر"

لوگ مجھ پر ہنستے ہیں ۔ منادرہ پر آمادہ فلسفہ میں الجھے ہوئے ، اور کہتے ہیں تو نے جس کی خاطر اپنی یہ حالت بنائی ہے ۔ اس خدا کو ثابت کر ۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں منقول یا معقول سے خدا کو ثابت کروں ، انکی خواہش ہے کہ میں فلسفہ سے خدا کو ثابت کروں ، ان کی تمنا ہے کہ منطق سے خدا کو ثابت کروں ، مقدمات ترتیب دوں ، اور الفاظ کا گھروندا بنا کر ، معانی کو الفاظ سے جکڑ کر خدا کو ثابت کروں ، مذہبی کتابوں سے استدلال پیش کروں ، اصول اور کلیے قائم کروں ، صانع و مصنوع ، خالق و مخلوق روح اور مادہ کے مباحث چھیڑوں اور خدا کو ثابت کروں ، ....

میں انکی باتیں سنتا ہوں ...... اور مسکرا دیتا ہوں ...... ان کو پہچانتا ہوں اور مسکرا دیتا ہوں ، وہ بار بار کہتے ہیں ۔ "خدا کو ثابت کر" .... اور میں ہر بار مسکرا دیتا ہوں ،

وہ سمجھتے ہیں یہ علمی مباحث کا اہل نہیں اگر اس کا دماغ دلائل و براہین سے خالی ہے اور اس کا علم نہایت محدود ہے یہ اوہام پرست اور دل کا کمزور ہے ۔

میں ان کی نادانی اور کمزوری پر ہنستا ہوں اور دل ہی دل میں کہتا ہوں ، ان بیچاروں کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ وہ مدرسہ کے ملا سے باتیں کر رہے ہیں یا ایک خود فراموش شاعر کے سامنے ہیں ،،

میں نے تو خدا کو آیات فطرت کے اندر دیکھا ہے بہتے ہوئے دریا ، گاتے ہوئے آبشار ، خاموش میدان ، رنگین وادیوں ، چمکتے ہوئے تاروں اور ہنستی ہوئی صبح کے دھندلکے میں خدا کو دیکھا ہے اور در اصل یہ بات کس قدر مشکل ہے کہ میں ان لوگوں کو شاعر بنا کر محفل فطرت میں پہنچا دوں اور آنکھوں کے اشارہ سے بتا دوں کہ دیکھو "یہ ہے صدر مجلس جسے **خدا** کہتے ہیں "

شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی ۔

صراحی کی آہ

ایک بلور کا گلاس ایک گلی صراحی سے یوں ہمکلام ہوا۔ تو کس قدر ذلیل ہو اور بد شکل ہو کہ تجھ کو میز پر تک لوگ نہیں لیجاتے۔ سب تجھ کو حقیر جانتے ہیں اور آبدار خانہ میں ڈال دیتے ہیں۔

صراحی۔ تجھکو اس کا بڑا فخر ہے۔ کہ تو میز پر جا کر بیٹھتا ہے اور سفید ہونے کی وجہ سے تو اپنی سفیدی پر نازاں ہے او ناداں تو مجھے کیوں ذلیل جانتا ہے۔ خدا کے غضب سے ڈر حقیقت جو پوچھتا ہے تو تیرا اور میرا خالق ایک ہے۔ ظاہری اسباب ترجیح کے مجھکو حاصل ہیں نہ تجھکو اس کے وجود۔ سن گو میں معمولی چیز ہوں۔ مگر کوئی ایسا گھر نہیں۔ جہاں میرا گذر نہ ہو اور بغیر میرے کسی انسان کو صبر نہیں۔ مجھ میں پانی آتے ہی ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ حالت تشنگی میں خصوصاً موسم گرما میں ٹھنڈا پانی کس قدر خوشگوار ہوتا ہے۔ ہر شخص اس کا جویا ہوتا ہے۔ میں ٹھنڈے پانی سے اپنے مالک کا دل ٹھنڈا کرتی ہوں۔ لوگوں کی تشنگی بجھاتی ہوں۔ میں اس چیز سے بنائی گئی ہوں جس سے انسان جیسے اشرف المخلوقات بنائے گئے ہیں۔ اور پھر ہر ایک چیز اسی میں فنا ہوتی ہے۔ اور مٹی ہو جاتی ہے۔ پھر اس مٹی سے میں بنائی جاتی ہوں۔ کیا تو خیال کر سکتا ہے کہ میرا یہ جسم انوکھی مٹی سے بنایا گیا ہے جس زمین میں بڑے بڑے شاہ و شہریار اور اولیائے کرام دفن ہوئے۔ اور ان کے مزار مٹ گئے۔ اور اسی جگہ کمہار نے اپنا آوا لگایا۔ اور مجھے بنایا۔ میں ایک بڑے بادشاہ کے مزار کی مٹی سے بنائی گئی ہوں۔ ایک اور صراحی جو اس کے برابر رکھی۔ بول اٹھی۔ "ارے مورکھ گلاس تجھے کچھ معلوم ہے۔ میں کس مٹی سے بنائی گئی ہوں؟ میرا آقا مجھے عراق عرب سے لایا۔ میرا جسم اس خاک پاک کا ہے۔ جہاں رسول کے پیارے نواسہ کا خون بہا۔ جس زمین کو مسلمان بوسہ دیتے ہیں اور خاک آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ اور اس فعل کو عبادت خیال کرتے ہیں"

گلاس۔ او نادان صراحی میں دیکھتا ہوں تیری چرب زبانی بہت بڑھی جاتی ہے۔ تو میرے مقابل بک رہی ہے۔ تجھکو جاننا چاہئے۔ کہ میں اس جگہ کا ہوں جہاں وہ بادشاہ رہتا ہے جسکے ملک میں آفتاب غروب نہیں ہوتا۔ اور جس کی حکومت سمندر کی موجوں پر ہے۔ اور جس کے ملک میں تیری اور تیرے ٹھنڈے پانی کی ضرورت ہی نہیں۔ وہاں ہمیشہ پانی ٹھنڈا ملتا ہے۔ مگر سبکو اس کی پروا نہیں۔ تجھے یہ بھی معلوم ہو۔ کہ میں ایسا ہر دلعزیز ہوں کہ ہر شخص کے ہونٹوں سے جا کر لگ جاتا ہوں اور سب مجھکو پیار کرتے ہیں۔ تجھ کو جو کوئی منہ لگاتا ہوگا۔ وہ ادنیٰ غریب آدمی ہوگا۔ جو تیرے برابر کا ہوگا۔ اور تیرے سر پر میں اکثر سوار رہتا ہوں گویا تیرے سر کا تاج میں ہوں۔ بغیر میرے تیری عزت نہیں ہو سکتی۔ صراحی نے خجل ہو کر ایک آہ سرد بھری۔ اور اپنے دل میں کہنے لگی یہ سب قصور ہمارے آقائے نامدار کا ہے۔ کہ ایک پردیسی چیز کی اس قدر قدر و منزلت کرتے ہیں کہ ہمیشہ اس کو منہ سے لگایا کرتے ہیں۔ اور یہ اُن کے منہ لگانے کا ثمرہ ہے۔ کہ گلاس کا دماغ

آسمان پر چڑھ گیا۔ ہمارے مالک یہ خیال نہیں کرتے۔ کہ پردیسی چیز کو اُن سے ہمدردی کیا ہو سکتی ہے۔ انس کیا ہو سکتا ہے۔ جب کبھی یہ گلاس عداوت پر آئیگا۔ تو گر کر ٹوٹ جائیگا۔ اور ہمارے آقا منہ دیکھ کر رہ جائینگے۔ اور ممکن ہے۔ کہ کہیں ہاتھ پاؤں میں چبھ کر زخمی بنا دے۔ کم سے کم دو ایک روپیہ کا تو ضرور نقصان دیکر جائیگا۔ اور بغیر نقصان پہنچائے تو غیر ملکی چیز جاتی نہیں۔ گو ہم بہت وفادار ہیں۔ اگر ہم ٹوٹینگے بھی تو زیادہ سے زیادہ مالک کا چار پیسہ کا نقصان کر جائینگے۔ دوسری صراحی نے کہا۔ ہم کو چاہیئے کہ اپنے مالک کو نیک صلاح دیں اور اس وقت کا سارا قصہ کہہ سنائیں۔ اسی اثنا میں گھر کا مالک صراحیوں کے پاس آگیا۔ اور پانی لینا چاہا۔ تو صراحی نے سارا قصہ دہرایا اور باصرار التجا کی کہ دیسی چیزیں استعمال کی جائیں اور پردیسی چیزیں ہرگز گھر میں نہ آنے پائیں۔ جن سے سوائے نقصان کے کوئی فائدہ نہیں۔ اور یہ کہا کہ مراد آبادی گلاس منگایا جائے۔ جو ایک عرصہ دراز تک کام دیگا۔ اور جو قیمت دی جائیگی۔ وہ دیس میں صرف ہوگی۔ ایک دیسی کاریگر متمتع ہوگا۔ برعکس اس کے ولایتی شیشہ کے گلاس ہر مہینے میں چھ سات ٹوٹتے ہیں۔ دوسرے معنوں میں ماہانہ چھ سات روپیہ کا نقصان اور وہ روپے ملک کے باہر جاتے ہیں۔

صاحب خانہ نے صراحی کی نصیحت بگوش دل سنی۔ اور فوراً جس قدر گلاس گھر میں تھے توڑ کر پھینک دینے کا حکم دیا۔ اور مراد آبادی گلاس منگوانے حیدرآبادی بڑی تھالی کٹورے بازار سے منگوانے کا حکم دیا۔ اور اورنگ آباد کے تھالی کٹوروں کیلئے بھی آرڈر بھیجنے کا حکم دیا۔ یہ حالت دیکھ کر گلاس نے بہت معافی مانگی۔ ہاتھ جوڑے۔ اور گڑگڑا کر توبہ کی اور بولا آیندہ کبھی گستاخی نہیں کرونگا۔ اور کبھی دیسی چیز کے ساتھ سخت کلامی نہیں کرونگا۔ نہ اس کو سیاہ سمجھ کر ذلیل سمجھونگا۔ للہ میری گردن زدنی کا حکم منسوخ کیا جائے۔ صراحی کو دل کی بھڑاس نکالنے کا یہ خوب موقع ہاتھ آیا۔ وہ بولی سرکار ہرگز اس کے قول وفعل کا اعتبار نہ کیجئے۔ یہ بیحد خودغرض وقت پرور اور مطلبی ہے۔ اس نے ہم دیسیوں کو ہمیشہ حقیر و ذلیل جانا کبھی اس کا معروضہ قبول نہ کیا جائے۔ وقت ٹلتے ہی پھر بہ شیر ہو جائیگا اور زیادہ ہم دیسیوں کو ستائیگا اور ذلیل کرے گا۔

صاحب خانہ نے اپنا حکم بحال رکھا اور بٹلر (خانساماں) کو حکم دیا۔ کہ ابھی میرے سامنے سب گلاسوں کو توڑ کر چور کر دو۔

صراحی نے چلا کر کہا۔ کہ دیکھا میں ایک بادشاہ کے مزار کی مٹی ہوں اور دیسی ہوں۔ تو ایک معمولی کانچ کا ٹکڑا ہے۔

اہلیہ سید ہمایون مرزا
ایڈیٹر النساء

صغرا منزل حیدرآباد دکن

کلام عصمت

آشیاں اپنا جہاں تھا وہ چمن بھول گئے
ہم وطن کو تو ہمیں اہلِ وطن بھول گئے

ڈر ہے گلچیں کا ابھی سر خزاں کا کھٹکا
بات کرنا بھی مرے غنچۂ دہن بھول گئے

کیا اسے ڈھونڈنے آئے تھے عدم سے عریاں
اسکو پاکے ہیں مشتاقِ کفن بھول گئے

بیخودی لطف وکرم پر تیرے صدقے جائیں
تیرے ہوتے ہوئے سب رنج ومحن بھول گئے

نرگس مست کے وحشی کی جو آنکھیں دیکھیں
چوکڑی دشت وبیاباں میں ہرن بھول گئے

سرد مہری سے زمانے کی پڑا ہے پالا
سرو قمری کو تو بلبل کو چمن بھول گئے

لب ورخسار کو انسان کے جس نے دیکھا
لعلِ رُماں اُسے اور برگِ سمن بھول گئے

ظلم اپنا ہے جہاں ۔ ہے جو پرانا دُکھڑا
تنگ آکر گلہ چرخِ کہن بھول گئے

طالبِ جیفۂ دنیا کو جو دیکھا عصمت
سچ تو یہ ہے کہ ہمیں زاغ وزغن بھول گئے

عصمت (مسز میر شہامت علی)

چاند سے دو دو باتیں

ٹھہر ٹھہر اے قاصدِ نور ٹھہر ۔ اے آسمانی سیاح ٹھہر ۔ اے پیکِ جمال افروز ٹھہر ۔ دیکھ بری عبرتناک حالت دیکھ ۔ جو میں کہنا چاہتی ہوں ۔ سُن ہاں سُن تجھے ایک تغافل شعار تک میرا پیام پہنچانا ہوگا ۔

تیری کشتی تو بڑھتی ہی چلی جاتی ہے روک لے اے روشن جبیں روک لے ۔ کیا تو نے مجھ کو نہیں پہچانا غور سے دیکھ ۔ اور پہچان ۔ کہ میں کون ہوں ۔ کیا تو نے مجھکو پہلے نہیں دیکھا ۔ نہیں نہیں دیکھا اور ضرور دیکھا ۔ اور وہیں دیکھا جہاں دیکھنا چاہئے تھا ۔

خیر اے بھولے مسافر میں پتہ بتاکر یاد دلاتی ہوں ۔ یاد ش بخیر وہ زمانہ بھی کیا زمانہ تھا جب پہلے پہل تو نے مجھ کو دیکھا تھا ۔ اسوقت میں خوش تھی ۔ میرا چہرہ تیرے رخساروں کی طرح چمکتا تھا ۔ اور میرا رنگ جوشِ جوانی سے کُندن کی طرح دمکتا تھا ۔ آنکھیں دو چھلکتے ہوئے پیمانے تھے یا نرگس کے پھول ۔ گلاب کی طرح تر و تازہ تھی ۔ میرا تبسم خندۂ صبح تھا ۔ میں سر سے پانوں تک دلکش اداؤں کا ایک دلفریب مجموعہ تھی ۔

اے بھولنے والے نور آگیں مسافر ۔ اب تو نے مجھ کو پہچانا ۔ میں وہی ہوں ۔ وہی جسکے حُسن کی بہار کو تو رات بھر ٹکٹکی باندھے دیکھا کرتا تھا ۔ لیکن میرے مستغنی حُسن کو تیری پرواہی نہ تھی ۔ تو میرے بسا

خواب پر لوٹا کرتا تھا اور میری نگاہِ غلط انداز کا امیدوار رہتا تھا - مگر میں تیری طرف رخ بھی نہ کرتی تھی - گو تیرا شباب بھی جوش پر تھا - مگر میرا غرورِ حسن اس سے زیادہ پُرجوش

آہ میں نہ جانتی تھی کہ آج اس حسرت و مایوسی سے تیرا چہرہ تکونگی - اور تیرے سامنے دستِ التجا پھیلاؤنگی - میں تو سوائے آئینہ کے کسیکو دیکھنے کی عادی نہ تھی - مگر زمانہ کی ہوا بدلگئی - میری زندگی کا وہ مرقع نہ رہا - پہلا دور ختم ہوا - اور دوسرا دور شروع ہوا - میری عبرتناک صورت دیکھ اور انقلاب کا خیال کر گذری ہوئی باتیں خواب و خیال ہوگئیں - اُمنگیں مٹ گئیں - ولولے فنا ہوگئے - اب نہ وہ تبسّمِ برق آفریں ہے - نہ وہ گلاب سا چہرہ - جو نرگسی آنکھیں جام پیمائی کرتی تھیں - ان میں حلقے پڑے ہوئے ہیں نہ دل میں ترنگیں ہیں نہ چہرے پر انبساط کی لہریں - میں ہوں اور گوشۂ تنہائی - میں ہوں اور خیالِ جانسوز

ہاں اب تونے مجھکو پہچان لیا - تو مجھکو ہمدردی کی نظروں سے دیکھ رہا ہے - اچھا تو دیکھ - میری زلفوں کی پریشانی - میری آنکھوں کی ویرانی - چہرے کی زردی - جسم کی لاغری دیکھ تجھ پر یہ حالت کسی بے نیاز کی محفل میں بیان کرنی ہوگی - اگر تو میری باطنی جذبات کی ترجمانی نہیں کرسکتا - تو نہ سہی - جو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ------ کے حضور میں بیان کر دینا + م بیگم از لکھنؤ

نغمۂ توحید

جو فہم سے بالا وہ سب ہے خیال تیرا
جس پر نظر نہ ٹھہرے وہ ہے جمال تیرا

قیدِ حیات میں تو کرتا ہے فکرِ راحت
دیوانے ہنس پڑینگے سنکر خیال تیرا

آنکھیں جو دی ہیں مجکو ہوا نہیں نورِ وحدت
ہاں کچھ نظر نہ آئے - آئے تو اک جمال تیرا

پروردگارِ عالم وہ زندگی عطا کر
سودا ہو سر میں تیرا دل میں خیال تیرا

گر معرفت کا ساقی تلچھٹ بھی مجکو دیدے
اے خضر میں نہ چکھوں آبِ زلال تیرا

ہیں اشکبار آنکھیں اور دل بھی مضطر
فرقت کی یہ گھڑی ہے یا ہے وصال تیرا

چھوڑ اے حنا یہ سودا کوئی نہیں کسیکا
خالق پہ کر بھروسا یہ ہے کمال تیرا

حنا زینت کبریٰ ڈاکٹر محمد



پرنس آف ویلز

آپ وایٹ لاج واقع رچمانڈ پارک میں ۲۳ جون ۱۸۹۴ء کو جب کہ آپ کی دادی صاحبہ ملکہ معظمہ وکٹوریہ تخت حکومت پر جلوہ گر تھیں۔ عالم وجود میں تشریف لائے۔ آپ ملکہ وکٹوریہ آنجہانی کے خاص منظور نظر ہوتے تھے۔ جب آپ ۸ سال کے ہوئے تو آپ کی باقاعدہ تعلیم شروع کرائی گئی۔ اور اس غرض کے لئے ایک نہایت لائق اُستاد مقرر کیا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آپ کو تعلیم اور کھیل کود کے مشغلوں سے یکساں دلچسپی تھی

آپ کرکٹ ٹینس۔ شہسواری تیراکی شکار وغیرہ شائستہ فنون میں کامل مہارت رکھتے ہیں۔ ۱۹۰۷ء میں جبکہ آپ کی عمر ۱۳ سال کی تھی۔ آپ کو آپکے والد محترم ملک معظم حضور جارج پنجم بادشاہ کی طرح اوسبورن کے بحری کالج میں جہازرانی کی تعلیم حاصل کرنیکے لئے داخل کرایا گیا۔ آپ کالج میں دو سال تک زیر تعلیم رہے۔ کالج میں آپ کی اندرونی بود و باش ہر لحاظ سے عام طلباء کی سی تھی۔ پرنس آف ویلز ہونے کے باعث کوئی خاص رعایت نہیں رکھی گئی تھی۔ آپ کی سادہ مزاجی اور مساوات پسندی کا بہترین ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ ایک مرتبہ آپکے علیل ہو جانے پر ڈاکٹر نے اشتہا کی رغبت پیدا کرنے کی غرض سے آپ کے لئے خاص طور پر ایک تیار کرائی جو لطافت کے لحاظ سے عام طلباء کی خوراک سے بدرجہا بہتر تھی۔ مگر آپنے اس کو استعمال کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اور فرمایا کہ "والد صاحب کا حکم ہے۔ میں عام طلباء کی خوراک سے [illegible] استعمال نہ کروں۔"

[illegible] کے جملہ امتحانات میں ممتاز طریق سے کامیاب ہونے کے بعد ۱۹۱۱ء میں آپکو جہاز "ہندوستان" کا "مڈشپ مین" [illegible] بحری سفر کے لئے بھیجا گیا۔ اس کے بعد آپ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخل ہوئے [illegible] السنہ مختلفہ۔ تواریخ۔ فلسفہ سیاست مدن۔ علم الاقتصاد۔ علم سیاحت اور آئینی قانون میں علم امتیاز بلند کیا۔ بحری کالج [illegible] کی تعلیم کے زمانہ میں بھی آپ کے طور طریق عام طلبا کے سے تھے۔ اس عرصہ میں آپنے پبلک لائف سے تقریباً بالکل بے تعلقی رکھی [illegible] "آفیسرز ٹریننگ کور" میں فنون سپہ گری سیکھ رہے تھے۔ کہ یورپ کی "جنگ عظیم" چھڑ گئی اور اس کے تیسرے ہی دن [illegible] "سیکنڈ لفٹننٹ" مقرر کر دیا گیا۔ یہاں بھی آپنے سادہ مزاجی اور مساوات پسندی کے اصول پر عملدرآمد کیا یعنی عام [illegible] طرح فوجی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ آپکی خواہش تھی کہ آپ کو میدان کارزار میں جانے کا موقع دیا جائے۔ [illegible] فوج کی صف اول میں رکھا جائے۔ مگر لارڈ کچنر نے آپ کے حفظ مراتب کے خیال کو پیش نظر رکھ کر یہ آرزو پوری [illegible] آپ لارڈ فرنچ کے سٹاف میں شامل ہو کر فرانس چلے گئے اور چار سال تک فوج کے ساتھ میدان جنگ [illegible] آپ کو ہر قسم کے خطرات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ۱۹۱۵ء کے آغاز میں آپ کی موٹر پر جس میں سوار ہو کر آپ [illegible] تھے گولا [illegible] اور آپ کا "شوفر" مارا گیا۔ [illegible]

خدمات انجام دیں اور کسی قرینہ سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ آپ پرنس آف ویلز ہونے کے باعث اپنی جان کو زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ فرانس سے واپس آکر آپنے ہندوستانی سپاہیوں کی خوشحالی کے متعلق اطمینان کرنے کی غرض سے ہندوستانی فوج کا معائنہ کیا۔ پھر جب ہندوستانی فوج فرانس سے روانہ ہوئی تو آپنے فوج کے روبرو ملک معظم کا ایڈریس پڑھا جس میں ہندوستانی سپاہیوں کی جان نثاری پر اظہار پسندیدگی کرتے ہوئے انکا شکریہ ادا کیا گیا تھا آپ ایک سے زیادہ مرتبہ ہندوستانی سپاہیوں کی بہادری اور جوانمردی کا اعتراف کر چکے ہیں۔ چنانچہ اسی سال کے آغاز میں آپنے برٹن میں "ہندوستانی سپاہیوں کی یادگار قائم کرنے کی تقریب پر تقریر کرتے ہوئے کہا "ضروری ہے کہ ہم اور ہماری آیندہ نسلیں اس بات کو فراموش نہ کریں کہ ہندوستانیوں نے عین اس وقت جبکہ ہمیں امداد کی سخت ضرورت تھی۔ ہماری مدد کی اور یہ دیکھ کر کہ فریق مخالف ہمارے مالک بادشاہ کا دشمن ہے اپنی جانیں نثار کردیں۔ اہل برٹن نے اُن ہندو اور سکھ بہادروں کی یادگار قائم کر کے اپنی محبت کا ثبوت دیا ہے۔ جو نہایت بہادری سے لڑے اور اپنے دیہاتی مکانات سے اس قدر دور دراز فاصلہ پر بے بسی کے ساتھ پڑے رہے۔ اگرچہ یادگار ہندو اور سکھ بہادروں کی ہے مگر میں اس دفعہ پر مسلمان سپاہیوں کو نہیں بھولا ہوں ووکنگ میں اُنکی تجہیز و تکفین قومی اعزاز کے ساتھ کی گئی اور میں نے سنا ہے کہ ہندوستانیوں کی طرف سے شرقی وضع کا ایک پھاٹک عنقریب نصب کیا جانیوالا ہے۔ خدا کرے کہ یہ دونوں یادگاریں ممدات ہوں اور ہندوستان اور انگلستان کے درمیان رشتۂ اتحاد مضبوط ہو۔

جنگ ختم ہو چکنے کے بعد ہز رائل ہائی نس انگلستان واپس آئے اور پبلک فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہو گئے۔ اسی زمانہ میں آپ نے اپنی جاگیر واقع کنگٹن میں اصلاحات کیں اور باشندوں کے پرانے مکانات کو مسمار کرا کر از سر نو تیار کرایا۔ جب کبھی مزدوروں کے مکانات کی اصلاح کا ذکر ہوتا ہے۔ تو آپکے تیار کردہ مکانات کی خوبیاں مثال کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔ اسکے بعد اگست ۱۹۱۹ء میں آپنے سلطنت برطانیہ کے خاص خاص حصوں کا دورہ کیا۔ کینیڈا کے باشندوں نے آپ کا نہایت پرجوش خیر مقدم کیا۔ لوگوں کی خوشی کا یہ عالم تھا کہ آپ جدھر سے گذرتے تھے اُدھر لوگ جوق در جوق جمع ہو کر آپ کو "چیرز" دیتے تھے۔ اسیطرح امریکہ میں آپ کا شاندار استقبال کیا گیا۔

اس دورہ سے واپس آکر آپنے گلڈ ہال واقع لندن میں ایک تقریر کی جسکے دوران میں فرمایا کہ "سلطنت برطانیہ میں آزاد قومیں شامل ہیں جو ایک ہی قسم کے تاج کی تابع اور ایک ہی قسم کے آزادانہ مقاصد کی حامی ہیں اس لحاظ سے سلطنت برطانیہ کی اس ہیئت کی نسبت بہت زیادہ ہے جو لفظ سلطنت کے پرانے اصطلاحی معنوں سے مفہوم ہے۔ اب کینیڈا آسٹریلیا۔ نیوزیلینڈ۔ جنوبی افریقہ اور ہندوستان کی قومیں متفقہ طور پر قومیں تسلیم کی جانے لگی ہیں۔ کیونکہ انہوں نے صلحنامہ پر دستخط کئے ان قوموں میں ہندوستان کی قوم ممتاز درجہ رکھتی ہے اس نے جنگ عظیم میں بڑی بہادری دکھلائی ہے۔ اور ہم اسکی رعایا سپاہ اور گورنمنٹ کے زیر بار ہیں۔ کہ انہوں نے مشترک مفاد کے معاملہ میں نہایت سخت تکلیفات برداشت کیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ میں عنقریب اس حیرت خیز ملک کا دورہ کرنے کے قابل ہو سکوں گا۔

موجودہ سیاحت ہند کا سیاسیات سے کچھ تعلق نہیں ہے وہ صرف اس امر کی معلومات حاصل کرنے کے لئے تشریف لا رہے ہیں کہ ہندوستانیوں کی رسم و اور انکی شکایات و تکلیفات کیا ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ آپکے ہندوستان آنے کی غرض و غایت وہی ہے جو ہندوستان کے کے انگلستان جانے کی یعنی حصول معلومات اور واقفیت حالات۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ہندوستان آپکے شایان شان خیر مقدم دے کے سلطنت برطا

بیکل عورتیں

دوسروں کی تکالیف کے مشاہدہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جو بیوی خانہ داری میں غیر معمولی حسن انتظام اور سرگرمی کی صفات سے متصف ہوتی ہے وہ مسرت ازدواج کو بہت جلد تباہ کر دیتی ہے۔ جو عورت اقتصادی مشکلات کے باعث خانگی بکھیڑوں میں مبتلا ہو اس کے لئے ہر شخص کے دل میں ہمدردی کے سوا اور کوئی جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن ایسی جماعت کے برعکس ایک دوسرے قماش کی جماعت بھی موجود ہے۔ میں بعض ایسی منکوحہ عورتوں سے واقف ہوں (اور میں مرد ہونیکی حیثیت میں لکھ رہا ہوں) کہ جنکو خدا نے علم و محبت اور اسی نوع کی نادر خوبیوں والے شوہر عطا کئے ہیں۔

انہی خوبیوں کا ایک شخص شادی کرنے سے پہلے برسوں تک میرا نہایت عزیز دوست رہا تھا۔ اور اقبال و ادبار کی متضاد کیفیات میں اس کی قدر و قیمت کو میں نے اچھی طرح پرکھ لیا تھا۔ ہم دونوں جنگ میں اکٹھے لڑے اور اکٹھے زخمی ہوئے اور ہماری دوستی بڑھتی گئی۔ لیکن مردوں کی دوستی پر جنگ میں بھی اتنی تباہی نہیں آئی جتنی شادی سے آتی ہے۔ ہماری دوستی کا دائرہ رفتہ رفتہ اتنا تنگ ہوا ہے کہ اب ہم بالکل غیر ہو گئے ہیں۔ پچھلے دنوں میں نے اسکے مکان پر چھٹیوں میں ایک ہفتہ بسر کیا۔ اسکی بیوی واقعی خوش منظر کہلانے کے قابل ہے۔ اور اپنی خانہ داری کی خوبیوں پر علی الاعلان فخر کرتی ہے۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ مسلسل پانچ منٹ تک نچلی نہیں بیٹھ سکتی۔ ہاں حسن اتفاق سے ایک مرتبہ چند لمحوں کے لئے اسے سکون جسمانی میسر ہو گیا تھا۔ تو وہ میرے کان میں یہ ہیبتناک قصہ سنانے لگی۔ کہ نوکر روز بروز نالائق ہوتے جاتے ہیں۔ ناقابل اعتبار ہوتے جاتے ہیں۔ گستاخ ہوتے جاتے ہیں۔ اسکا خاوند مالدار ہے اور اسکے واسطے بیس نوکر رکھ لینے پر رضامند ہے لیکن وہ تین خدمتگاروں سے زیادہ ملازم رکھنا پسند نہیں کرتی۔ ایک باورچی ایک خادمہ اور ایک دایہ اور اسکی وجہ وہ یوں بیان کرتی ہے کہ "ملازم جتنے زیادہ ہوتے ہیں اتنا ہی میرا ذمہ کام زیادہ ہو جاتا ہے"۔ وہ دن بھر خانہ داری کے ایک سے ایک بکھیڑوں میں مصروف رہتی ہے۔ جنکی نسبت اسکا قول ہے۔ کہ مرد نہ انکو سمجھ سکتا ہے نہ انکی قدر کر سکتا ہے۔

دوپہر کے کھانے پر وہ آشفتہ دماغ اور گھبرائی ہوئی نظر آتی تھی اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہوتا تھا۔ کہ وہ تکان محسوس کر رہی ہے۔ اور اسلئے اسکو آرام کی ضرورت ہے۔ ہر معقول انسان یہ توقع رکھ سکتا تھا۔ کہ شام تک وہ تمام دوا دوش ملتوی کر دیگی۔ لیکن وہ ایسی کب ہے۔ ہم ملاقات کے کمرے میں مشکل سے دو منٹ بیٹھے ہونگے۔ کہ کسی خانگی پیام کی بنا پر وہ کمرہ سے چلی گئی۔ یہی عمل شام تک سات دفعہ دہرایا گیا۔ اور آخری مرتبہ وہ ایک جرابوں کا بنڈل اور سینے کی متعلقہ اشیا لئے ہوئے آئی۔ اور ہمارے سامنے بیٹھ کر انکو درست کرنے لگی۔ قصہ مختصر اس ہفتہ کے آخری ایام میں اسنے ہماری سب تفریحات میں شریک ہونے سے قطعاً انکار کر دیا۔ اور اسکے شوہر نے بہت رنجیدہ ہو کر مجھ سے یہ کلمات کہے۔ کہ "اسنے اپنی زندگی کی ذمہ داریوں کا معیار بہت بلند قائم کر رکھا ہے وہ اپنے مقاصد کو بہترین عملی لباس میں دیکھنا چاہتی ہے۔ اور جو کچھ اسکے نزدیک بہترین ہے۔ اسکے انجام دینے سے ہشیار سے ہشیار نوکر قاصر رہتے ہیں۔"

بیکل عورتوں میں ایک دوسری قسم کی عورت بھی قابل توجہ ہے ۔میرا خیال ہے کہ اس کی سرگرمیاں اگرچہ اس حد تک قابل اعتراض تو نہیں ہوتیں۔ لیکن متوسط مرد کو تھکا دینے والی ضرور ہوتی ہیں۔ وہ اپنے فرائض خانہ داری کو صبح کو فقط ایک گھنٹہ میں ختم کر دیتی ہیں اور پھر تمام دن گھر کے کاموں سے آزاد پھرتی ہے۔ گویا مصروفیت کی کتاب اسکے پیش نظر رہتی ہے وہ ہر اس مقامی کمیٹی میں جسمیں عورتیں بروئے قانون دخل دے سکتی ہے۔ ایک سرگرم رکن کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو عورت اسوقت میرے ذہن میں ہے۔ وہ اپنی مصروفیات عامہ میں پھنسی ہوئی ہے۔ وہ ہر بات کے لئے تیار ہے وہ ہر مشکل کے مقابلہ پر مستعد ہے۔ اسکے سامنے تاش کی ایک بازی کھیلنے کی تجویز پیش کرو۔ تو وہ ہر دو کھیلنے پر اصرار کریگی۔ اور تمہیں ہرا دے گی۔ وہ تمام رات ناچتی رہے گی۔ اور تکان بالکل کا نشان تک ظاہر نہ ہوگا۔ وہ شام سے صبح تک تاش کھیلتی رہیگی۔ اور اس دماغی تفریح کے تمام خوش لمحات میں۔ صنعت، سیاست، سائنس اور مذہب کے متعلق بحث کا سلسلہ بھی ٹوٹنے نہیں دیگی۔ مجھے اس کا ایک واقعہ معلوم ہے کہ ایک مرتبہ شیر خوار بچوں کی نگہداشت پر لیکچر دینے کے لئے اسنے دن ڈھلے موٹر میں سو میل کا سفر کیا۔ اور واپس آتے ہی ایک مقامی سوسائٹی میں ایک جواب مضمون اس موضوع پر سنایا۔ کہ بدھ مت نے انگلستان میں مذہبی خیالات پر کیا اثر کیا۔ اس کے ماتحتوں چین اور قرار فریاد کر رہے ہیں۔ لیکن وہ ذرا بھی التفات نہیں کرتی۔ سرا فراز۔ بی اے

فانوسِ خیال

صبح ہوتی ہے تو طیور خوش الحان کی نغمہ سرائی میں اس کی دلکش آواز سنتا ہوں۔ دن پھر اس کے دیارِ حسن کی گرم بازاری یاد آتی ہے۔ شام ہوتی ہے۔ تو سورج کی آخری کرن میں اسکی چمپئی رنگت کی جھلک پاتا ہوں۔ اور جب رات یہ دوپٹہ اوڑھے اور سر پر نیلگوں چھتری لگائے جسمیں چمکدار تارے ٹانکے ہوئے ہیں آتی ہے۔ تو مجھے اپنے دلِ ماتم زدہ کی آرزو کی شکستگی اور اس سراپا ناز کی غم فرقت کی درد افزائی پست ہمت اور سرنگوں کر دیتی ہے۔ اور پھر میں اپنے بے ثمر زندگی کی بیشمار ناکامیوں کے تصور سے آب دیدہ ہو جاتا ہوں اور میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے ہیں۔ میری گود میں پانی کی جھیل بنجاتی ہے۔ پھر اس سے میرے دل کی مالکہ کا خوبصورت ہاتھ نمایاں ہو کر مجھے موتیوں کا ہار پہناتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہار اتار کر پھینکدوں۔ مگر میری حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ جب ہار کے موتی آنکھوں سے ٹپکے ہوئے آنسو بنجاتے ہیں جو اس وفا شعار نے میری یاد میں پروئے تھے۔

میں اس سے ناواقف نہیں۔ اس پری پیکر اور مجھ خستہ جاں کے درمیان عمیق سمندر حائل ہے۔ جسمیں بغض و حسد کی سخت چٹانیں، عداوت و خود غرضی کی ہیبت ناک پہاڑیاں ہیں۔ جو ہر کشتی کو گردابِ بلا کی نذر کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں رقیبوں کے آنسوؤں کی بارش، اور انکی آہوں کی طوفان خیزی الگ ہے۔ جو کہ:

اوقات ہولناک خطرات کی صورت میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ مگر اے دل بدنصیب کی آخری آرزو میں عزم راسخ کی کشتی کو اس سمندر میں ڈال دونگا۔ اور اس بحر بے پایاں کو عبور کرنے کیلئے مدد ایزدی اور فضل خداوندی کی دعا کرونگا۔ اگر میں منزل مقصود تک پہنچ گیا۔ تو مجھے طمانیت کی انتہائی منزل مل جائیگی۔ اور اگر میں نشان کامرانی کو نہ پا سکا۔ تو پھر بھی مجھے بے حد شادمانی ہوگی۔ کیونکہ کسی کا نقش پا ہو کر مٹ جانا ہی جہان کی نظروں میں سما جانا ہے"۔

عبدالحق تہامی۔ بی۔ اے۔

نیند نہیں آتی۔

نیند! پیاری نیند۔ میٹھی نیند۔ مجھے نہیں آتی۔

نومبر کا ہفتہ ہے۔ موسم خوشگوار ہے۔ مہتاب کی چاندنی آدھی دنیا پر تنی ہوئی ہے۔ اور میں بیقرار ہوں۔ چاہتا ہوں کہ سو جاؤں۔ مگر نیند نہیں آتی۔

سارے گہری نیند میں جا رہے ہیں۔ میرے کمرے میں لیمپ جل رہا ہے۔ ایک پروانہ اس کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ لیمپ میری طرف غور سے دیکھ رہا ہے۔ میری بیقراری بڑھتی جاتی ہے۔ ایک تانگہ سڑک پر سے گذر رہا ہے۔ گھڑی کی آواز مجھے بیتاب کر رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ یہ بند ہو جائے۔ اور میں کسیطرح سو جاؤں۔ مگر نیند نہیں آتی

بارہ بج چکے ہیں۔ ایک کا عمل ہے۔ ہر طرف سناٹا ہے۔ مسجد میں موذن سو گیا۔ شوالے کا پجاری سو گیا۔ سڑکوں پر خانہ بدوش سو گئے۔ ہوا سو گئی۔ درخت سو گئے۔ درختوں پر پرند سو گئے۔ چراگاہوں میں چرند سو گئے قفس میں جانور اور زنداں میں قیدی سو گئے۔ سرائے میں مسافر سو گئے۔ جھونپڑی میں فقیر سو گئے۔ محلوں میں امیر سو گئے۔ مگر میں جاگ رہا ہوں۔ کیونکہ نیند نہیں آتی۔

نیند! او نیند! تو بچوں کو لوریاں سناتی ہے نوجوانوں کو گلے لگاتی ہے۔ تو تندرستوں کو بستر آرام پر سلاتی ہے۔ اور مجھ سے آنکھیں چراتی ہے۔ تو جانتی ہے کہ یہ غم سے نڈھال ہے۔ سیماب مثال ہے۔ مضطرب ہے بیقرار ہے۔ شکستہ دل ہے بیمار ہے۔ اس لئے او بیوفا تو مجھ سے بیزار ہے۔ بس بس معلوم ہو گیا۔ تو بھی بیوفا ہے۔ تو بھی شکمہ کی ساتھی ہے۔ آہ تڑکا ہونیکو ہے۔ تارے جھلملا رہے ہیں۔ لیمپ ٹمٹما رہا ہے۔ پروانے جل بجھ کر خاک ہو چکے۔ پسنہاری سو چکی۔ مرغ سحر سو چکے۔ پپیہے سو چکے۔ پھیپھرے سو چکے۔ سب سو چکے۔ کچھ جاگ اٹھے اور کچھ جاگ رہے ہیں۔ مگر میں کروٹیں بدل رہا ہوں۔ اور کہہ رہا ہوں۔ کہ نیند نہیں آتی۔

محمد حمزہ خان

عورت

مرسلہ نواب شمشیر بہادر ظفر سوہر

میری رائے ناقص میں نواب اخگر
زمانہ میں بیوی ہے شوہر کی ہمسر

اگر مرد گل ہے تو یہ بوئے گل ہے
اگر مرد گوہر ہے۔ یہ آب گوہر

اگر مرد ہے جسم یہ اس کی جاں ہے
اگر مرد ہے عرض عورت ہے جوہر

اگر مرد ہے چاند۔ یہ چاندنی ہے
یہ اس کی کرن۔ گر ہے وہ مہر انور

کہیں شمع افروزِ خلوت ہے عورت
کہیں بزم آرائے جلوت سراسر

نزاکت کو دیکھو تو چینی کی مورت
جو خوشبو کو سونگھو تو ہے مشکِ اذفر

جو ہنستی ہے یہ پھول جھڑتے ہیں منہ سے
جو روئے۔ برستے ہیں آنکھوں سے گوہر

خجل اس کے ہونٹوں سے لعلِ بدخشاں
گل و لالہ و رنگِ یاقوتِ احمر

چھٹی ہے جو پلکوں پہ افشاں حیا کی
وفا کا ہے آنکھوں میں سرمہ برابر

فرشتہ ہر ہونٹوں پہ عفت کا لاکھا
چمکتا ہے ماتھے پہ عصمت کا جھومر

سدا لیلیٔ محملِ دل نوازی
زلیخائے مصرِ محبت ہے اکثر

تسلی کو ہے اس کے دم سے تشفی
یہ ہے جوہرِ عطرِ قندِ مکرر

پتنگے بہت شمع کے لاڈلے ہیں
ستی کا نہیں ان کو رتبہ میسر

میرے خواب میں رات آئے نظامی
لگے کہنے ہنس ہنس کے اے مردِ خودسر

زمانے میں گو آفتیں ہیں ہزاروں
مگر سب سے بڑھ کر ہے تریا چلتر

خدا جانتا ہے جو عورت کا دل ہے
خجل اس کے آگے ہیں فولاد و مرمر

مناسب نہیں اس کو دلدار کہنا
میرا تجربہ ہے کہ عورت ہے دلبر

اسے آبِ گوہر نہ کہنا کہ یہ ہے
دمِ تیغ۔ نوکِ سناں۔ آبِ خنجر

بہاتی ہے یہ ہمکو آنسو بہا کے
گراتی ہے یہ بجلیاں ہم پہ ہنس کر

اگر رہزنِ ہوش ناری نہ ہوتی
تو ہندو اسے نار کہتے نہ جل کر

ہزاروں نے اس کے لئے زہر پھانکا
کروڑوں نے الماس توڑے دیا سر

یہی ہے دم مقراض زمان کہ کاٹے
سدا طائرِ ہوش کے جس نے شہپر

ادب نے اجازت نہ دی کچھ کہوں میں
کریں آپ اب فیصلہ بندہ پرور



Mahatma BUDHA.

جلد ۱۴ نمبر ۳ بابت ماہ جمادی الاول ۱۳۴۱ھ مطابق جنوری ۱۹۲۳ء

شذرات

شباب اردو کے معاونین - ناظرین اور قارئین کو سال نو مبارک ہو -

---

شباب اردو کے پیکٹ بدستور ڈاک خانہ کے ڈاکوؤں کی دستبرد کے نذر ہو رہے ہیں۔ ڈاک خانہ کے اہلکار ہر چند سعی فرماتے ہیں۔ مگر کوئی پیش نہیں جاتی - اگر کوئی خیرخواہ ملک مجرم کی گرفتاری میں مدد دیگا تو نہ صرف مستحق شکریہ ہوگا بلکہ کمیٹی انتظامیہ نے اس کے لئے مبلغ پچیس روپے نقد منظور کئے ہیں۔ تاریخ اشاعت ہر ماہ کی تیس ہے اگر رسالہ نہ پہنچے تو دس دن کے اندر مفت دیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد قیمتاً - خط و کتابت میں چٹ کے نمبر کا حوالہ لازمی ہے

پروفیسر عبد القادر ایم۔ اے تاریخ ہند لکھ رہے ہیں - ہم یقین کرتے ہیں یہ قابل قدر ہوگی - سردست وہ اہل ہنود کے ذخائر سے اقتباس ہمیں عنایت کر رہے ہیں - اس نمبر میں مہاراجہ اشوک کے حالات درج ہیں - یہ مہاتما بدھ کا پیرو تھا جن کی تصویر اسدفعہ دی جاتی ہے - اس تصویر کے لئے شباب اردو جناب کیوریٹر صاحب عجائب خانہ اور وائس پرنسپل خانصاحب ماسٹر شیر محمد خاں کا ممنون منت ہے انشاء اللہ تعالیٰ آیندہ پرچے میں مہاتما موصوف کی سرگذشت ناظرین ملاحظہ فرمائینگے - جو نہایت دلچسپ اور معنی خیز ہے -

---

کتب خانہ شباب اردو مفصلہ ذیل کتب کیلئے ان کے مصنفین اور مولفین کا ممنون احسان ہے جو برائے ریویو دستیاب ہوئی ہیں -

(۱) حکایات شرلاک ہومز حصہ اول مرتبہ جناب شیخ فیروزالدین مراد صاحب یہ کتاب مسلم یونیورسٹی علیگڈھ سے مل سکتی ہے -

(۲) الماس یعنی ہیروں کا بادشاہ مولفہ و مترجمہ جناب خانصاحب حاجی محمد غلام حسن خانصاحب پشاوری ایم - آر - اے - ایس (لنڈن) آنریری مجسٹریٹ و ممبر حج کمیٹی کیمپ کراچی سے بہ قیمت ایک روپیہ چار آنہ دستیاب ہو سکتی ہے - نہایت دلکش اور قابل دید کتاب ہے -

(۳) فغان مسلم - از نتیجہ افکار جناب ابو نعیم عبد الحکیم خان نشتر جالندہری - جو ایس کے فیروز اینڈ سنز تاجران کتب شیرانوالہ گیٹ - لاہور سے ذیڑھ آنہ کو ملے گی

(۴) آوازۂ حق از جناب مصور جذبات شبیر حسن خان صاحب جوش ملیح آبادی مصنف روح معالات زریں - جذبات فطرت وغیرہ - نظم کیا ہے - قومی مرثیہ ہے - جس میں دبیر کی بلاغت اور انیس کی فصاحت موجود ہے - نہایت پاکیزہ کلام ہے - یہ دیدہ زیب کتاب صرف آٹھ آنہ کو رئیس احمد خاں رئیس ملیح آباد سے دستیاب ہوگی -

برکت علی ایم - اے

جائنٹ ایڈیٹر

اس نے ایک چیخ ماری اور پلنگ سے اُٹھ کر بھاگا مگر دروازے کے قریب جا کر منہ کے بل گرا اور سر دیوار سے ٹکرا گیا
اب یہ سنہری سر کبھی نہیں اٹھیگا - اب یہ سیاہ آنکھیں کبھی کسی کو دکھائی نہیں دینگی - اب یہ نازک کلیجہ
کبھی نہیں دھڑکیگا - اب یہ گلابی ہونٹ کبھی مسکراتے ہوئے نظر نہ آئینگے

(۵)

لوگوں کے گھروں میں عید تھی اور اس گھر سے دو جنازے اٹھائے جا رہے تھے - میاں دولت علی
کو اپنے نورِ بصر سے کمال محبت تھی - وہ اُسے دیکھ کر جیتے تھے - جب اُن کو معلوم ہوا کہ اُن کا غنچہ بن
کھلے مرجھا گیا - تو ان کو سخت صدمہ ہوا - صاحب فراش تو پہلے ہی تھے - اس زخم سے جانبر نہ ہو سکے
اُنہوں نے جعفر کی لاش اپنے کمرے میں منگائی اور اُسے اپنے ساتھ لٹا لیا - بڑی دیر تک اُسے پیار کرتے
رہے - جعفر اس وقت بیجان تھا - مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میٹھی نیند سو رہا ہے - بعد مردن بھی
اُسی طرح خوبصورت تھا - جس وقت مفلوج باپ بیجان پسر کی لاش کو کلیجے سے لگائے ہوئے تھا - اُسے
کوئی شے سخت سی مردہ فرزند کے کوٹ کی جیب میں معلوم ہوئی - اُسنے نکلوایا تو وہ جعفر کا گیند تھا
گیند کو دیکھ کر مصیبت زدہ پدر بچوں کی طرح رو دیا - اور روتے روتے بچے کو کلیجہ سے لگائے
ہوئے جان بحق تسلیم ہوا -

جس وقت دونوں جنازے قبرستان کی طرف روانہ ہو گئے - تو حمیدن آئی اور حسن جان
کو جو بظاہر نالہ و فغان کر رہی تھی - علیحدہ لے گئی اور کہنے لگی - اب تیرے کلیجہ میں ٹھنڈک پڑ گئی -
لیکن میں تجھے وہ بات بتاتی ہوں - جو سالہا سال سے میرے صندوقِ سینہ میں بند ہے - او خونخوار
عورت سن - تو نہ تو جعفر علی کی بہن ہے - نہ دولت علی کی بیٹی - خدا بخشے میری بہن کو جب اُسے حمل
کے آثار نمودار ہوئے - تو وہ بہت خوش ہوئی - اتفاق سے مرحوم میاں صاحب کو گھر سے باہر جانا پڑا
اُن کے جانے کے بعد معلوم ہوا - کہ میری بہن کا خیال غلط تھا - وہ بہت روئی - مجھے اس کے حال زار
پر رحم آیا - میں نے تجھے ہسپتال سے حاصل کیا - جہاں تیری ماں تجھے جن کر مر گئی تھی - کاش اس
گھڑی کو آگ لگ جاتی اور تجھے ہم گھر میں نہ لاتے - ہمیں کیا معلوم تھا - کہ تو یہ کانٹے بوئیگی ہائے افسوس
میں نے غریب دولت علی کو کیوں نہ بتا دیا - میں کیا کروں - اپنی قسم سے مجبور تھی بہن سے وعدہ
کر چکی تھی -

(۶)

کاغذ کی ناؤ پانی میں نہیں تیرتی - یہ سچ ہے - کہ دورِ قمر میں عجیب شور برپا ہے - تمام زمانہ
فتنہ اور شر سے آلودہ ہے - صاحب کمال آوارہ و سرگرداں ہیں - اسپ تازی بزیر پالان مجروح ہے

گردن خر میں طوقِ زرّیں موجود ہے۔ عیار اور اُٹھائی گیرے سرفراز اور سرسبز ہیں لیکن انسان کو مکافاتِ عمل سے غافل نہیں ہونا چاہئے۔ گیہوں سے گیہوں اور جو سے جو پیدا ہوتے ہیں۔ پولیس مدت سے ٹوہ میں تھی۔ بابو شہباز دریا دلی سے جعلی نوٹ استعمال کر رہا تھا۔ جس وقت غریب دولت علی اور بے کس جعفر علی کو موت آغوشِ لحد میں سُلا رہی تھی۔ بابو جی کے گھر کی در بندی ہو چکی تھی۔ تلاشی پر اُن کے مکان سے بہت سے جعلی نوٹ اور سکہ قلب بنانے کے آلات برآمد ہوئے۔ بابو جی بھانپ گئے کہ اب رہائی ناممکن ہے۔ اُن کی جیب میں زہر کی شیشی ہر وقت موجود رہتی تھی۔ اُسے کئی جگہ استعمال کر چکے تھے اب گرفتاری سے پہلے اُس کو اپنے کام میں لائے۔ اور جب پولیس انہیں گرفتار کرنے آئی۔ تو معلوم ہوا کہ ان کی لاش سوکھ کر لکڑی ہو چکی ہے۔ حسن جان ایک خونخوار سنگدل عورت تھی مگر باایں ہمہ سنگدلی اُسے خاوند سے انتہائی محبت تھی۔ وہ کسی خیال میں تھی۔ اور فلک کسی اور خیال میں۔ خاوند کی خودکشی سے اس کا خرمنِ اُمید جلکر سیاہ ہو گیا۔ ہر لحظہ اور ہر دم جعفر علی کی شکل اُس کے سامنے رہنے لگی۔ جو چھوٹی سی انگلی سے اس کی طرف اشارے کرتی رہتی تھی۔ وہ دیوانہ وار آنکھیں ملتی تھی۔ اُس شکل کو پکڑنے کی کوشش کرتی تھی۔ ہوا سے لڑتی تھی۔ زمین پر پاؤں مارتی تھی۔ مگر بے قراری اور اضطراب کسی طرح رفع نہ ہوتا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے جعفر علی اُس کے ساتھ تھا۔ اُس کی بھوک کافور ہو گئی۔ نیند اُڑ گئی۔ اُس نے افیون کا استعمال شروع کیا۔ مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ وہ سڑن اور سودائن بن گئی۔ اُس نے جسم کے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ اُس نے اپنے بال نوچ لئے۔ اور رکتی جھکتی بیاباں کی طرف نکل گئی۔ مگر جہاں ٹھہری وہیں جعفر علی کو موجود پایا۔ اور اُس کی آخری چیخ اُس کے کانوں میں گونجنے لگی۔ وہ جو جنگل میں آکر دوڑی اور دریا کا رخ کیا۔ رات کا وقت تھا۔ جب دوڑتے دوڑتے وہ ٹھہر جاتی تھی۔ تو جعفر علی کی شکل بھی ٹھہر جاتی تھی۔ جب وہ بھاگتی تھی تو وہ بھی ساتھ ساتھ بھاگتی تھی افتاں وخیزاں وہ دریائے راوی کے کنارے پر جا پہنچی۔ وہ آنکھیں بند کر کے دوڑ رہی تھی۔ جونہی اُس نے آنکھیں کھولیں جعفر علی کو موجود پایا۔ یہاں جعفر علی کی شکل بڑھنے لگی اور بڑھتے بڑھتے مینار بن گئی۔ حسن جان نے ایک چیخ ماری۔ یہ چیخ جعفر علی کی آخری چیخ سے مشابہ تھی اور دریا میں کود پڑی۔ دریا میں بھنور نمودار ہوا۔ اور پھر پانی اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔

ایڈیٹر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شباب اُردو

رُوح فروش

دسمبر کا مہینہ تھا۔ سردی چمکی ہوئی تھی اور ایک دلکشا کمرے میں بجلی کی روشنی سے دوپہر کا عالم نمودار تھا۔ اس کمرے کی دیواریں سبز رنگ زرنگار تھیں۔ اور بجلی کے قمقمے گلنار۔ اس کا فرش ایرانی قالین کا تھا۔ اور آرائشی سامان تمام قیمتی اور پُرتکلف۔ انگیٹھی میں آگ جل رہی تھی۔ اور دراز قامت۔ سُرخ رنگ چیچک رُو۔ زرد مو۔ سطبر لب۔ شہباز صوفے پر بیٹھا ہوا مصر کا مشکبو سگرٹ پی رہا تھا۔ شہباز کا بظاہر کوئی ذریعہ معاش نہ تھا۔ اس کی کوئی جائداد نہ تھی مگر دولتمندوں کی طرح زندگی بسر کرتا تھا۔ سواری کے لئے موٹر موجود تھی۔ جس مکان میں یہ اپنی بیوی کے ساتھ مقیم تھا۔ وہ دولہن کی طرح آراستہ تھا۔ اور اُس کا کرایہ سو روپے ماہوار تھا۔ اس کی رہایش اہل یورپ کی طرح تھی۔ اور اس کا لباس انگریزی۔ اس کے سوٹ ہمیشہ ولایتی دکان پر تیار ہوتے تھے۔ اور پچیس روپے سے کم قیمت کے بوٹ کا استعمال اس کے لئے کسر شان تھا۔ یہ شخص زمانہ شناس تھا۔ اس کو اپنے فہم و ادراک پر بڑا ناز تھا۔ شہر کے معززین اس سے دبتے تھے اور غنڈے اسے اپنا گورو گھنٹال جانتے تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ دغاباز۔ مکار۔ جلساز۔ عیار۔ شاہیں چور۔ اور کال جواری تھا۔ اور بعض کا خیال تھا کہ اس کو جعلی نوٹ بنانے میں کمال حاصل ہے۔

پردہ اٹھا۔ اور ایک خوبصورت جوان عورت اس کمرے میں داخل ہوئی اور آکر شہباز کے برابر بیٹھ گئی یہ شہباز کی بیوی حسن جان تھی۔ شوہر نے سگرٹ سے راکھ جھاڑی اور اپنے زرد زرد دانت دکھائے اور ہنس کر کہا۔ کہو بیری جان۔ "اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے"۔ حسن جان نے کہا۔ کہ ابّا بیمار ہیں فالج بے طرح گرا ہے۔ تم کو معلوم ہے۔ کہ انہیں مجھ سے بہت کم محبت ہے۔ وہ میرے سوتیلے بھائی جعفر کو آنکھ کا تارا سمجھتے ہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ اُن کے بعد وہی تمام جائداد کا وارث ہوگا۔ شہباز نے کچھ تامل کے بعد کہا۔ کہ اب موقع ہے۔ ایسی تجویز کی جائے۔ کہ اس لڑکے کا جس کی عمر بمشکل آٹھ سال کی ہوگی۔ اس بڑا خفش بڈھے کی زندگی میں کام تمام ہو جائے۔ سنکھیا میں لادونگا۔ ہاں بہتر تو یہ ہے کہ کوٹھے پر سے اس طرح دھکا دو۔ کہ تمام ہڈیاں سرمہ ہو جائیں۔ لوگ یہ سمجھیں گے۔ کہ کنکوا اڑاتا ہوا مُنڈیر پر سے گر گیا ہے۔ حسن جان نے ترش ہو کر جواب دیا۔ کہ خدا جانے تمہاری عقل کو کیا ہوگیا ہے۔ یہ دونوں باتیں خطرناک اور بھدّی ہیں۔ میں نے کچھ اور سوچا ہے۔ سانپ بھی مرجائیگا۔ اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے گی۔

۲

میاں دولت علی لاہور کا اسم با مسمیٰ تاجر تھا۔ یہ پانچ کوٹھیوں اور دس ہزار بیگہ زمین کا واحد مالک تھا۔ یہ باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اٹھاراں سال کی عمر میں شادی ہوئی۔ دس سال تک اولاد نہ ہوئی۔ بیوی اولاد کو ترستی تھی اور خاوند اُسے تسلی دیا کرتا تھا۔ دس سال کے بعد یکایک خوشگوار علامتیں ظاہر ہونے لگیں۔ اس اثنا میں میاں دولت علی کو سفر پیش آیا اور وہ مجبوراً ایک سال گھر سے باہر رہا۔ جب واپس آیا۔ تو حسن جان چھ ماہ کی تھی۔ اور انا کا دودھ پیتی تھی۔ دولت علی بہت خوش ہوا۔ مگر خدا کو کچھ اور منظور تھا۔ حسن جان ایک سال کی ہوئی تو بیوی جان بحق تسلیم ہوئی۔ دولت علی نے پھر اٹھاراں سال تک صرف حسن جان کی خاطر دوسری شادی نہ کی۔ اُسے پڑھایا لکھایا۔ ناز و نعمت سے پالا۔ مگر اٹھاراں سال کی عمر میں شیطان نے انگلی دکھائی۔ اور حسن جان نے باپ کی مرضی کے خلاف خود سر بنکر شہباز سے نکاح پڑھوالیا۔ دولت علی اس مہذب بدمعاش سے بخوبی واقف تھا۔ اس کی تمام امیدیں خاک میں مل گئیں۔ چھیالیس سال کی عمر میں دوبارہ نکاح کیا۔ پچاس سال کی عمر میں جعفر علی پیدا ہوا۔ جب یہ نونہال دو سال کا ہوا۔ تو ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس وقت جعفر کی عمر آٹھ سال کی تھی۔ وہ دولت علی کی آنکھوں کا نور اور اُس کے دل کا سرور تھا۔ دفعتاً دولت علی کے جسم پر بائیں طرف فالج گرا اور نصف جسم

جسم کا بیکار ہو گیا۔ البتہ طاقت گویائی قائم رہی۔ اس وقت تک وہ حسن جان سے سخت بیزار تھا۔ صرف ایک سو روپے ماہوار بھیجدیا کرتا تھا۔ ملاقات ترک کر چکا تھا۔ صاحب فراش ہو کر اس نے بچوڑا بیٹی کو بلا بھیجا۔ اور جعفر کا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں دیکر کہنے لگا۔ اب یہ تمہارے سپرد ہے۔

(۳)

جعفر علی کی عمر اس وقت آٹھ سال کی تھی۔ وہ نہایت حسین ہونہار بچہ تھا۔ اُسے دیکھ کر ہر ایک کو خواہ مخواہ پیار آتا تھا۔ اس کے بال سنہری تھے۔ آہ یہ وہی بال تھے جن کو سنگھارنے والے نازک ہاتھ چھ سال سے ہمیشہ کے لئے سرد ہو چکے تھے۔ اس کی آنکھیں سیاہ موٹی موٹی تھیں۔ مگر آہ وہ خوبصورت انگلیاں جو ان آنکھوں میں سرمہ لگایا کرتی تھیں۔ اب چھ سال سے معدوم تھیں۔ اس کے گال سیب سمرقند کو شرماتے تھے۔ مگر آہ وہ گلابی ہونٹ جو اُن کو بوسہ دیا کرتے تھے۔ اب چھ سال سے خواب و خیال ہو چکے تھے۔

جعفر علی اس وقت حسن جان کے پاس بیٹھا ہوا چائے پی رہا تھا۔ اُس وقت تک وہ اپنے باپ کے پاس سویا کرتا تھا۔ اب بہن نے آکر یہ انتظام کیا تھا۔ کہ وہ بالائی کمرے میں تنہا آرام کیا کرے بیمار کے کمرہ میں رہ کر بیمار ہو جائیگا۔ حمیدن نے جو میاں صاحب کی پہلی بیوی کی رشتہ میں بہن لگتی تھی۔ اور یہاں ابتدا سے کھانا پکاتی تھی۔ اعتراض کیا اور کہا کہ لڑکا کم عمر ہے۔ اس کو اکیلا نہ سلاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ رات کو ڈر جائے۔ مگر حسن جان نے نہ مانا اور کہا کہ میں اپنے بھائی کو بزدل بنانا نہیں چاہتی۔ میں اُسے جوانمردی اور مردانگی سکھاؤنگی۔ میں خود ساتھ والے کمرے میں رہا کرونگی۔ اور وقت ضرورت رات کو خبر گیری کروں گی۔ ہاں خالہ تم بیچ میں نہ بولو۔ میں اس کی بہن ہوں اور تم سے بڑھکر خیر خواہ ہوں۔ حمیدن نے ناک بھوں چڑھا کر کہا۔ کہ ہاں میں بھی جانتی ہوں تم اس کی بہن ہو۔ مگر خدا سے ڈرو۔ شاید یہ گفتگو طول پکڑتی اتفاق سے اسیوقت ایک خادمہ آئی اور کہنے لگی بابو جی آئے ہیں اور تمہیں بلاتے ہیں۔ بابو جی سے مراد شہباز تھی کیونکہ لوگ اُسے بابو شہباز کے نام سے یاد کرتے تھے۔

حسن جان نے خونخوار آنکھوں سے حمیدن کو گھورا اور اُٹھ کر چلی گئی۔ دوسرے کمرے میں شہباز اُس کا منتظر تھا۔ حسن جان اس وقت غصہ میں بھری ہوئی تھی۔ اُس نے جھپٹ کر خاوند کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور کہا بابو جی گناہ میرے خون میں ہے۔ اور میں یہ خوب جانتی ہوں۔ مجھے معصیت میں ایک خاص حلاوت معلوم ہوتی ہے۔ شاید مجھ میں کسی جلاد کی رُوح ہے۔ قسمت نے جوڑی خوب

ملادی ہے۔ اگر مجھ میں جلاد کی روح ہے۔ تو تم میں صیاد کی۔ یہ سچ ہے کہ خبیث عورتوں کے مقدر میں خبیث مرد ہیں۔ تم اور میں سات ہولناک گناہوں کے مالک ہیں۔ تم سازش میں فرد ہو۔ تو میں مکاری میں یکتا۔ یہ کمزور سد جو ہمارے راہ میں حائل ہے۔ عنقریب غارت ہو جائیگی اور پھر اس نخیلی کی جو پچھلے کمرے میں دم توڑ رہا ہے۔ اور اب کوئی دن کا مہمان ہے۔ بیشمار دولت مرے ہاتھ اور تمہارے قبضہ میں ہوگی

—:(۴):—

ظالم حسن جان سرگرمی سے اپنے کام میں مشغول تھی۔ ستونِ حیات کو بتدریج دیمک چاٹ رہی تھی۔ جعفر علی اب تنہا سوتا تھا۔ کسی کو اجازت نہ تھی کہ دس بجے کے بعد اس کے کمرے میں جاسکے۔ ہر روز دس بجے تک حسن جان اس کے کمرے میں رہ کر اُسے ڈراؤنی اور دہشت خیز کہانیاں سنایا کرتی تھی۔ وہ اس ننھی سی جان کو یقین دلا چکی تھی کہ چھوٹے بچوں کو رات کیوقت جن بھوت اور چڑیلیں اٹھا کر لیجاتی ہیں۔ اور جنگل میں لیجا کر مار ڈالتی ہیں۔ اب جعفر علی کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ڈائن کا لباس سیاہ رنگ کا اس کے بال بکھرے ہوئے اور اس کے گلے میں ہڈیوں کا ہار ہوتا ہے۔ وہ تیز چھری لیکر آتی ہے۔ اور وہ چھوٹے بچوں کا سینہ چاک کرکے کلیجہ کھا جاتی ہے۔

دس بجے یہ خوفناک عورت اس کمرے کا چراغ گل کر دیتی تھی اور ساتھ کے کمرے میں جہاں یہ خود سوتی تھی جاکر طرح طرح کی ہولناک آوازیں اس معصوم کو جس کی ماں مر چکی تھی سناتی تھی اور اُسے ڈراتی تھی۔ غریب جعفر دن بدن دبلا ہوتا جاتا تھا۔ اُس کا رنگ جو شنجرفی تھا۔ اب ہلدی کا کا سا تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے۔ ستم تو یہ تھا۔ کہ اُس کو باپ کے پاس تنہا نہ جانے دیتی تھی۔ وہ وقت اُس کے کمرے میں ملاقات کے لئے لیجاتی — اور سایہ کی طرح ہمراہ رہتی تھی۔

ماہ رمضان کی آخری رات تھی۔ عید کا چاند لوگ دیکھ چکے تھے۔ جعفر علی خوش تھا۔ کہ صبح کو کمخواب کا لباس پہنکر عیدگاہ جائیگا۔ اُس کے پلنگ کے سرہانے میز پر اُس کا لباس رکھا جا چکا تھا اُس کی پوشاک کے ساتھ اُس کے کھلونے اور با تصویر کتابیں بھی موجود تھیں۔ اس وقت دس بج چکے تھے۔ اس کمرے میں حسب معمول تاریکی تھی۔ دفعتہً معصوم جعفر علی کا پلنگ ہلنے لگا۔ اور اُس کے پلنگ کے پیچھے سے ایک سیاہ پوش خونخوار عورت جس کی آنکھیں مشعل کی طرح روشن تھیں اور جس کے گلے میں ہڈیوں کا ہار تھا۔ خنجر بکف نکل کر اُس کی طرف جھپٹی بیکس جعفر اُسے دیکھ کر

خون کے پیاسے

(گذشتہ سے پیوستہ)

ڈپٹی انسپکٹر نے بعد ازاں دیکھا کہ مقدمہ میں دو نقص باقی ہیں۔ ایک تو کوئی جوگی پیش کیا جائے جو یہ گواہی دے کہ اُس کے سامنے رام ناتھ کن پھٹے جوگی نے جو ایک رمتا ہوا فقیر تھا۔ سنتوک پورہ کے دہرم سالہ میں سنکھیا کی ایک ڈلی سردار کو دی تھی۔ اور دوسرے یہ کہ شیخ الٰہ بخش لائسنسدار یہ گواہی دے کہ پیر بخش منیم نے جو اب مرگیا ہے یہ بندوق سردار بساکھا سنگھ کے ہاتھ فروخت کی تھی۔ اور اُسوقت سردار نے منیم کو رشوت دیکر اپنا نام محمد جمال لکھوایا تھا۔ ایک جوگی بالناتھ آوارہ گرد شاہ عالمی دروازہ کے باہر ڈپٹی انسپکٹر کو مل گیا۔ اُس کو ڈپٹی انسپکٹر نے ٹھہرالیا۔ یہ شخص ایک تولہ سنکھیا ایک تولہ افیون اور ایک تولہ چرس یومیہ استعمال کیا کرتا تھا۔ ڈپٹی انسپکٹر نے یہ اشیاء اور دو سیر دودھ اُس کے لئے مہیا کردیا۔ شیخ الٰہ بخش نے شہادت دینے سے انکار کیا۔ لیکن جب ڈپٹی انسپکٹر نے چالان کرنے کی دھمکی دی۔ تو شیخ صاحب بھی راضی ہوگئے۔ الغرض مقدمہ مکمل ہو کر بساکھا سنگھ کا چالان زیر دفعہ ۳۰۲ تعزیرات ہند ہوگیا۔ مجسٹریٹ ماتحت نے چونکہ ظاہرا ثبوت کافی تھا۔ اور مسٹر گریوی اور مسٹر نورالدین بیرسٹروں نے جرح کرنے سے انکار کیا۔ جلدی جلدی کارروائی ختم کر کے مقدمہ سپرد سیشن کردیا۔ فاسٹ صاحب سیشن جج چھ ماہ کی فرلو پر گئے ہوئے تھے۔ اُن کی جگہ چیف کورٹ نے خانبہادر مرزا حاتم علی کو جو لاہور کے رہنے والے تھے اور چھ ماہ کی رخصت چاہتے تھے۔ یہ کہکر لاہور میں لگا دیا۔ کہ لاہور آپ کا وطن ہے۔ آپ درخواست رخصت کو واپس کریں خانبہادر اس سے پہلے تین چار دفعہ قائممقامی کر چکے تھے۔ اور ابھی زیر آزمائش تھے۔ ہر ایک قائممقامی کے بعد حکام چیف کورٹ گورنمنٹ میں رپورٹ کیا کرتے تھے۔ جوڈیشل حکام کا اقتدار قائم رکھنے کو وہ سابق میں یہ رائے مقدمات کی کارروائی سے وضع کرلیا کرتے تھے۔ لیکن جب سے کم بخت ہندوستانی اس عہدہ پر قائممقام ہونے لگے۔ تو ان کی نحوست نے یہ اثر دکھایا کہ ججانِ چیف کورٹ خفیہ طور سے حکام ضلع سے پوچھنے لگے۔ خانبہادر کو یہ راز معلوم ہوگیا تھا۔ اس لئے وہ جس جگہ قائممقامی کے لئے جاتے تھے حکام ضلع و پولیس کی خوشنودی حاصل کرنے کی ازحد کوشش کرتے تھے۔ یہ رجحان اور راز بدقسمتی سے پراسی کیوٹروں کو بھی معلوم ہوجاتا تھا۔ اس لئے وہ بعض مقدمات میں اپنے اس علم کا اور خانبہادر کی کمزوری کا فائدہ اُٹھانے لگے۔

خاں بہادر کی صحت بہت خراب تھی عمر میں گو ابھی ادھیڑ
تھے۔ لیکن اعضا اور دل بہت کمزور تھے ساگ پات
اور انڈوں پر گزارہ تھا۔ اگرچہ وہ خود نہایت محتاط
اور پرہیزگار تھے مگر اُن کے والد مرزا اکرام علی بیگ
جو کسی زمانہ میں شاہدرہ کے پٹواری بھی رہ چکے
تھے ایک مشہور شراب خوار تھے اس لئے خاں بہادر
کے اعصاب پیدائش ہی سے ضعیف اور ذکی الحس
واقع ہوئے تھے۔ جب تک چاروں طرف سے کواڑ
بند نہ کر لیتے فیصلہ نہیں لکھ سکتے تھے اور مشکل
سے تمام دن میں دو اپیل ختم کیا کرتے تھے دیانتاً
تو اوّل درجہ کے تھے یعنی رشوت لینا اور سفارش
سننا حرام سمجھتے تھے لیکن انتظامی حکام سے
اس قدر خایف رہتے تھے کہ بہت ہی کم فوجداری
اپیل ان کی عدالت میں منظور ہوتے تھے۔
اگر خدانخواستہ خوفِ خدا کبھی غالب بھی ہوجاتا
اور اُن کے کسی ریمارک سے پبلک پراسی کیوٹر
کو یہ معلوم ہوجاتا کہ جج صاحب اوکھڑے ہوئے
ہیں تو وہ اشارۃً یہ کہہ دیا کرتا کہ صاحب ڈپٹی کمشنر
کو اس مقدمہ کا خاص خیال ہے یہ سنتے ہی جج
صاحب کے اعصاب درہم برہم ہوجاتے تھے۔
لیکن سیشن کے مقدمات کو نسبتاً ذرا زیادہ احتیاط
سے کرتے تھے اور بہت پھونک پھونک کر قدم
دھرتے تھے۔ کیونکہ ان مقدمات میں ہائی کورٹ
کے ججوں کا بھی خوف رہتا تھا اسلئے اپیلوں کے
برخلاف سیشن کے مقدمات میں بریت بھی ہوجاتی
تھی۔ بعض وقت بڑی دقت کا سامنا ہوتا تھا۔
ایک طرف سے تو پبلک پراسی کیوٹر لفٹنٹ گورنمنٹ
کا وہ سرکلر پیش کرتا تھا جس میں مجسٹریٹوں کو
تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ زیادہ بریت نہ کریں اور دوسری
طرف انصاف کا خون ہوتا تھا۔ جب کوئی انگریز
وکیل اُس کی عدالت میں آجاتا تھا تو دب جاتے
تھے۔ جب دونوں طرف سے انگریز وکیل ہوتے
تھے تو عجب کش مکش کی حالت ہوتی تھی۔
کہتے ہیں کہ خاں بہادر ایک جگہ ضرور جرأت دکھاتے
تھے یعنی جب کوئی جگہ خالی ہوتی تھی تو اپنے کسی رشتہ دار
کو مستحقین کے حق مار کر مقرر کر دیتے تھے۔ لیکن اپیل
کے خوف سے اس کو مستقل سالہا سال تک نہ کرتے
تھے چنانچہ اکثر ایسا ہوا کہ اُن کی تبدیلی کے بعد وہ
کمبخت نکال دیا جاتا تھا۔ جب لوگوں نے یہ کہنا
شروع کیا کہ خاں بہادر اپیلوں میں ظلم کرتے ہیں
دیوانی اپیل نامنظور کرتے ہیں۔ فوجداری میں ڈپٹی
کمشنر سے ڈرتے ہیں اور سیشن میں ججوں کی نکتہ
چینی کے خوف سے بریت بھی کر دیتے ہیں۔ تو انہوں
نے بدگمان خلقت کی زبان بند کرنے کے لئے یہ
وطیرہ اختیار کیا کہ پانچ فیصدی اپیل کی سزائیں
گھٹا دیا۔ کرتے تھے۔ اور تین چار فیصدی دیوانی
اپیلوں میں ترمیم کر دیا کرتے تھے۔ جب خان بہادر
کی پنشن ہوگئی تو بہت افسوس کے ساتھ یہ کہا
کرتے تھے کہ ہم نے اس گورنمنٹ کی خاطر ہزاروں
بیگناہوں کی گلوتراشی کی۔ لیکن گورنمنٹ نے

ہماری یہ قدر ہی تھی کہ ایک سال کی توسیع دیدی تھی ملازمت کے اخیر پندرہ دنوں میں جب ہر طرف سے ناامیدی ہوگئی۔ تو پچاس فی صدی اپیل منظور کئے۔

بیساکھا سنگھ کی بدقسمتی سے فاسٹ صاحب چلے گئے اور اُس کا مقدمہ خان بہادر کے سامنے پیش ہوا۔ چوہدری بدھاوا سنگھ ذیلدار اور کرم علیخاں صوبیدار اسیسر مقرر ہوئے گریوی صاحب اور میاں نورالدین صاحب بیرسٹر ملزم کی طرف سے پیش ہوئے۔ دوسری طرف سے ڈاکٹر بٹیمن کو سو روپیہ یومیہ پر صاحب ڈپٹی کمشنر نے خاص طور پر سرکاری وکیل مقرر کیا۔ یہ صاحب بہادر کچھ بہت ہشیار یا کامیاب بیرسٹر نہ تھے۔ مشکل سے پانسو روپیہ ماہوار کی آمدنی تھی۔ لیکن اُن کے چچا کسی زمانہ میں چیف جج رہ چکے تھے اور کچھ قوم پروری کا بھی خیال کیا گیا۔

باب ۱۳

میاں نورالدین کو سیشن کی عدالت میں پیش ہونے کا اول ہی موقعہ ملا تھا۔ اس لئے دو وکلا جو باہر روم میں خالی بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ میاں نورالدین کیسی کارروائی کرتے ہیں عدالت سیشن میں آبیٹھے۔ گریوی صاحب نے میاں نورالدین سے کہا کہ یہ مقدمہ آپ کریں میں دیکھتا جاونگا اور ضرورت پڑیگی تو آپ کو ہدایت کرتا جاؤنگا۔ فرد قرارداد جرم سردار کو سنایا گیا۔ تو سردار نے صاف انکار کیا۔ اول بٹیمن صاحب نے مقدمہ کی کارروائی شروع کی اور مختصر حالات مقدمہ ظاہر کئے۔ سردار کو اس کا اقبال سنایا گیا۔ تو اُس نے اقبال کرنے سے انکار کیا۔ لیکن یہ کہا کہ یہ اقبال تعذیب اور تعزیر سے حاصل کیا گیا ہے۔ سارجنٹ نے اول تو ۲۶ گھنٹے تک اُس کو جگایا اور ایک لمحہ سونے نہیں دیا۔ جگہ جگہ سوئیاں چبھوئیں۔ جن کے نشان اب تک موجود ہیں۔ سردار تہ بند کھولکر دکھانے لگا۔ عدالت نے روکا اور کہا کہ ہم اور اسیسر آج کی کارروائی ختم ہونے پر دیکھ لینگے نوٹ کر لیا گیا ہے۔ پھر گواہان استغاثہ پیش ہونے لگے۔ مسماۃ بیگاں پیش ہوئی اس کی آواز سنتے ہی دونوں اسیسر جو مسٹر بٹیمن کی تقریر کے وقت سو گئے تھے بیدار ہو گئے۔ مسمات بیگاں نے وہ تمام بیان جو پولیس میں لکھوایا تھا لفظ بلفظ ادا کیا۔ جب میاں نورالدین جرح کے لئے کھڑے ہوئے اور اُس سے یہ سوال کئے کہ سنکھیا کی ڈلی کس قدر بڑی تھی اور اس کا رنگ کیا تھا۔ اور کس رنگ کے کپڑے میں وہ لپیٹی ہوئی تھی اور شیرات سے کتنے دن پہلے اُس کو سردار نے دی تھی۔ تو وہ بالکل خاموش ہو رہی سرکاری وکیل نے نہایت ملائمت سے کہا کہ جواب دے اور کچھ خوف نہ کر لیکن وہ پھر بھی خاموش رہی۔ آخر جج صاحب نے فرمایا۔ کہ بی بی کچھ تو بول اس پر اُس نے کہا کہ مجھے ذیلدار اور ڈپٹی انسپکٹر نے اسی قدر سکھایا تھا۔ جو میں نے کہہ دیا۔ اور کچھ

مجھے معلوم نہیں میں کس طرح جواب دوں۔ یہ سنکر جج صاحب کے کان کھڑے ہوئے اور اس قدر گھبرائے کہ تمام بدن کانپنے لگا۔ دوسری طرف سرکاری وکیل بھی سیٹی بھول گئے۔ پانچ منٹ کے بعد ممبیں صاحب نے کہا بی بی تجھے کس نے بہکا دیا ہے۔ مسمات بیگاں نے کہا مجھے ڈپٹی انسپکٹر کے سوا بہکانے والا اور کون ہو سکتا ہے۔ ایک ماہ ہوا کہ اُس نے مجھے کسی سے ملنے تک نہیں دیا۔ مجھے اپنے گھر کے اندر بند رکھا۔ ایک وقت وہ دو جلیبیاں کھانے کو دیتا تھا اور دوسرے وقت بھنی مرغی۔ اُس کی بیوی نے اپنا نیا جوڑا مجھے پہننے کے واسطے دیا ہے اور ایک چندن ہار بھی دیا تھا۔ لیکن اب عدالت میں آتے ہوئے یہ کہکر میرے گلے سے اُتار لیا کہ گاؤں کے لوگ یہ نہ کہیں کہ یہ ہار بیگاں کے پاس کہاں سے آیا۔ میاں نورالدین نے کہا کہ جو کچھ تجھکو سکھایا گیا تھا وہ تو تو کہہ چکی۔ لیکن اصل حال کیا ہے اپنے ایمان سے بیان کر۔ پھر پوچھا کہ کیا تیری آشنائی سردار سے تھی۔ اُس نے کہا ہرگز نہیں۔ پھر میاں نورالدین نے کہا سنکھیا کا رنگ کیسا ہوتا ہے۔ اُس نے کہا میں نے سنکھیا آجتک نہیں دیکھی نہ یہ گرہ مجھے دکھائی گئی نہ اس کو میرے سامنے کھولا گیا۔ جج صاحب نے حکم دیا کہ گرہ موجود کیجاوے۔ وہ عدالت کے سامنے پیش کی گئی پاکٹ کھولا گیا کیونکہ عدالت ماتحت پاکٹ کا کھولنا بھول گئی تھی اور میاں نورالدین وہاں دانستہ خاموش ہو رہے تھے۔ میاں نورالدین نے مسماۃ بیگاں کو گرہ دکھائی اور کہا کہ جس کپڑے میں یہ گرہ ہے اس کا کیا رنگ ہے اُس نے کہا مٹیا زرد رنگ۔ پھر میاں نورالدین نے پوچھا یہ کپڑا کیا ہے۔ اُس نے کہا چین۔ میاں نورالدین نے کہا کہ اس رنگ کے چین کا کوئی کپڑا تمہارے گھر میں ہے اُس نے کہا نہیں۔ پھر میاں نورالدین نے سوال کیا۔ تم نے کبھی کسی پولیس کے سپاہی کی وردی دیکھی ہے اُس نے کہا ہاں میاں نورالدین نے پوچھا۔ بھلا کیسی ہوتی ہے اُسنے کہا نیلے چین کا کرتہ ہوتا ہے۔ مٹیا چین کا پاجامہ جیسا کہ اس گرہ کا رنگ ہے اور نیلا دوپٹہ سرخ کنی والا۔ پھر میاں نورالدین نے پوچھا۔ تم نے کسی کنسٹیبل کی وردی دیکھی ہے بیگاں نے کہا جب میں بارہ تیرہ سال کی تھی تو کرمداد کنسٹیبل کی وردی دیکھا کرتی تھی۔ جو اُسوقت ہمارا ہمسایہ تھا اب وہ شرقپور میں رہتا ہے۔ مسمات بیگاں کے بعد دو نمبردار یکے بعد دیگرے پیش ہوئے۔ جو سارجنٹ کے ساتھ تلاشی کرنے گئے تھے انہوں نے بیان تو وہی دیا۔ جو پولیس نے سکھا دیا تھا۔ لیکن جرح میں مان لیا کہ وہ سارجنٹ کے ساتھ تلاشی کے وقت کوٹھے کے اندر نہیں گئے تھے اور باہر کھڑے رہے تھے یہ بھی کہا کہ مسماۃ بیگاں بھی اندر نہیں گئی

امریکہ میں نمائش

امریکہ والوں کو تمام بڑی اور حیرت میں ڈالنے والی چیزوں کا از حد شوق ہے۔ اس لئے اس ملک میں نمائشیں بھی جس اعلیٰ پیمانہ پر منعقد ہوتی ہیں اُس کی نظیر روئے زمین پر اور کہیں نہیں ملتی۔ ایک گزشتہ نمائش کے چشم دید مشاہدات ایک یورپین سیاح یوں بیان کرتا ہے۔

لڑائی سے ایک سال پہلے میں نے امریکہ جا کر جزیرہ کونی کی نمائش دیکھی۔ ہمارا جہاز آدھی رات کو بندر نیویارک میں پہنچا۔ جہاز پر سے نمائشگاہ کی عالیشان عمارات اور ہزارہا بجلی کی لالٹینیں روشن دکھلائی دیتی تھیں اور اُن کی روشنی میں باوجود اتنی رات گئے بیشمار آدمی نمائش گاہ کی سڑکوں پر سیر کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ دوسرے دن صبح کو جہاز سے اُتر کر بروکلن کے پل سے میں ایک موٹر کار میں سوار ہوا جس نے چند منٹ میں ہم کو نمائش گاہ میں پہنچا دیا۔ تماشائیوں کا اس قدر اژدحام میں نے کہیں نہ دیکھا تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ امریکہ کی آدھی آبادی اس نمائشگاہ کی سیر کر رہی ہے۔

سب سے پہلے ہم نے ایک ٹرین دیکھی اُس کے اسٹیشن کے پاس ایک نمائشگاہ کا ملازم کھڑا ہوا پکار رہا تھا کہ ایسی ریل دنیا میں اور کہیں نہیں ہے۔ جلد سوار ہو اور پرستان کی سیر کرو۔ میں اور میرا ساتھی تھوڑی دیر کھڑے ہو کر یہ تماشا دیکھتے رہے کہ ریل میں صدہا آدمی سوار ہوئے ہیں۔ اور پھر ریل ایک ٹنل یعنی زیر زمیں راستہ میں داخل ہوتی ہے اور پانچ منٹ کے بعد واپس آجاتی ہے۔

واپسی پر جو لوگ ریل سے اترتے تھے۔ اُن کے چہرے خوفزدہ اور اُن کی چال لڑکھڑاتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ باوجود اس کے ہم سے نہ رہا گیا۔ اور میں اور میرا ساتھی بسم اللہ کہہ کر ریل میں بیٹھ گئے آدھے منٹ تک ریل ٹھیک چلی۔ پھر یہ معلوم ہوا کہ کسی ڈھال پر ہماری گاڑی اوندھی لڑھک رہی ہے۔ اُس وقت صرف سنبھل کر بیٹھنا کافی نہ تھا۔ بلکہ ہر شخص کسی سلاخ یا دروازہ یا تختہ کو جو اُس کے ہاتھ میں آگیا مضبوط پکڑتا تھا۔ تب اپنی جگہ پر قائم رہ سکتا تھا۔ مزید برآں ٹنل میں داخل ہوتے ہی سب لالٹینیں گل ہو گئیں۔ اور ہماری گاڑی ایک موڑ پر پہنچ کر یکایک اس سرعت سے مڑی کہ جو لوگ سلاخیں مضبوط تھامے بیٹھے تھے وہ بھی نیچے گر پڑے۔ ہم سب بمشکل سنبھلنے پائے تھے۔ کہ لالٹینیں روشن ہو کر پھر فوراً گل ہو گئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ہماری ریل کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں حائل ہیں جن پر سے وہ کودتی ہوئی جا رہی ہے میں اُس بنچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ جو انجن کی طرف اور اُس کے قریب تھی اس لئے مجھے زیادہ تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔ مگر جو لوگ ہمارے پیچھے تھے وہ ہماری گاڑی کے ہر جست

کے ساتھ زور سے چیختے تھے اور میرا ساتھی تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ مجنون ہو گیا ہے۔ وہ مجھ سے پوچھتا تھا۔ کہ میں کسی سرکس کے گھوڑے پر سوار ہوں۔ یا خواب دیکھ رہا ہوں۔ اس اثنا میں گاڑی دوسری طرف کو اس قدر سرعت سے مڑی کہ مسافر پھر سب گڈمڈ ہو گئے۔ اور ہنوز سنبھلنے نہ پائے تھے کہ ایسا معلوم ہوا۔ کہ گاڑی نیچے کی طرف ایک ڈھلوان راستہ پر پاتال کو جا رہی ہے۔ گاڑی کے دونوں طرف کھڑکیوں میں سے بڑے بڑے سانپ اور اژدہے مونہہ کھولے ہوئے نظر آتے تھے۔ گویا کہیں ابھی ڈس جاوینگے۔ عورتیں اُن کو دیکھ کر چیخیں مارنے لگیں۔ مگر یہ سب ایک نظر فریب نظارہ تھا۔ در اصل سانپ اور اژدہوں کا وہاں کوئی وجود نہ تھا۔

آگے چل کر ریل ایک بلندی پر چڑھی اور پھر ایک نشیب میں اُتری۔ سامنے اُسی پٹری پر دوسری جانب سے ایک اور ریل آ رہی تھی۔ یہ دیکھ کر اُس ریل کے مسافر اور ہمارے ہمسفر سب یکزبان ہو کر چیخنے لگے۔ اور میں بھی اس خیال سے بہت خوفزدہ تھا۔ کہ یہ دونوں ریلیں اب ٹکرا جاتی ہیں۔ مگر قبل اس کے کہ کوئی تصادم واقع ہو۔ یہ معلوم ہوا کہ یہ تماشا صرف ایک بڑے آئینہ کی نظر فریبی کا نتیجہ تھا۔ جو ہماری گاڑی کے سامنے پٹری سے کچھ فاصلے پر لٹکا دیا گیا تھا۔ پھر یہ آئینہ ایک جانب کو ہٹا دیا گیا اور ہماری گاڑی اُس سے گزر کر اور پہاڑی سوراخ سے باہر نکل کر کھلے میدان میں پہنچی جہاں دھوپ کھلی ہوئی تھی۔ یہ سماں دیکھ کر ہم نے خدا کا شکر کیا کہ اُس نے اب تک ہم سب کو زندہ رکھا۔ ریل سے اُتر کر میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ اب پورے آدھ گھنٹہ تک ہم کو آرام کرنا چاہیے۔ تاکہ تکان رفع ہو جائے۔ میرے ساتھی نے اتفاق کیا اور ہم دونوں خراماں خراماں ایک سڑک پر سیدھے چلے۔ تھوڑی دور چلکر ایک مینار کے پاس پہنچے جس کا نام چکردار پھسلنا مینار تھا۔ ہم نے دیکھا کہ اس مینار پر مرد اور عورتیں ایلی ویٹر کے ذریعہ سے چڑھتے تھے اور لوٹتے وقت زمین سے تھوڑے سے فاصلہ پر مینار کی چکنی سطح پر پھسل کر زمین پر آ پڑتے تھے۔ ہم کھڑے ہو کر یہ تماشا دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر میں ایک فربہ عورت پھسلکر ہمارے سامنے چاروں شانے چت گری۔ ایک مرد نے جو وہیں قریب کھڑا تھا اور غالباً اُس کا شوہر تھا۔ آگے بڑھ کر عورت کو اوٹھایا۔ اور کہنے لگا کہ تم ایسی بری طرح گریں کہ اس مینار پر چڑھنے کی اجازت میں پھر تمکو نہیں دے سکتا۔ مگر اس شرط پر کہ تمہارا جسم گردن تک پہلے ایک تھیلے میں بند کر دیا جائے۔ ہم نے اپنے دل میں اس رائے سے اتفاق کیا۔

آگے چل کر ہم لوگ ایک عمارت کے نزدیک پہنچے جس کا نام برقی زون تھا وہاں بینڈ بج رہا تھا۔ جسے بہت سے آدمی سن رہے تھے اور ایک طرف پردہ پر سینما کی تصویریں کچھ لوگ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ سینما کے پردہ کے قریب دو آرام کرسیاں خالی تھیں۔ سینما کا ایک ملازم ہمارے پاس

آکر کہنے لگا وہ دونوں کرسیاں خالی ہیں اور ان کی کچھ فیس نہیں لی جاتی آپ وہاں آرام سے بیٹھ کر سینما کی تصویریں دیکھ سکتے ہیں۔ ہم وہاں جاکر بیٹھے مگر ایک چوتھائی سکنڈ بھی نہیں بیٹھنے پائے تھے کہ میں اچھلکر کرسی کے پیچھے جا پڑا اور میرا ساتھی ایک نٹ کی طرح قلابازی کھاتا ہوا دوسری جانب گرا۔ ہماری یہ حالت دیکھکر جو لوگ پیچھے کرسیوں پر بیٹھے تھے کھلکھلا کر ہنس پڑے اور ان میں سے ایک بولا کہ ان دونوں کرسیوں میں بجلی بھری ہوئی ہے۔ پھر وہ نمائش کا ملازم آیا جس نے ہمیں لاکر ان کرسیوں پر بٹھایا تھا اور ہنسکر کہنے لگا کہ تم میری باتوں میں آگئے مگر اس نمائش کی دلچسپیوں کا ایک اہم جزو یہ بھی ہے اور اگر تم اب یہاں الگ بیٹھکر انتظار کروگے تو تم دیکھوگے کہ اور کتنے آدمی تمہاری طرح ان کرسیوں کا شکار ہوتے ہیں۔

پھر ہم نے اس برقی بجلی کے زون کے چاروں طرف چکر لگایا۔ مگر یہ عہد کرلیا کہ وہاں کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائینگے۔ ہم نے دیکھا کہ وہاں جا بجا زمین پر اٹھنی اور چونی کے برابر چاندی کے سکے بکھرے ہوئے تھے ہم نے اپنے تلخ تجربے کے بعد اُن کو ہاتھ نہیں لگایا۔ مگر یہ تماشا دیکھا کہ اور لوگ جو لالچ میں آنکر اُنکو اٹھاتے تھے وہ ایک بجلی کا دھکا کھاکر گر پڑتے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد ہمارے قریب ایک آئینے کے سامنے ایک میم آنکر کھڑی ہوئی اور اپنی ٹوپی اور نقاب آئینے میں دیکھکر درست کرنے لگی۔ یکایک ایک چھوٹی کنگھی اُس کے بالوں میں سے زمین پر گر پڑی۔ میں اُس کو محض سوء اتفاق کرکے آگے بڑھا اور کنگھی کو اٹھانا چاہا تو اُس کو ہاتھ لگاتے ہی مجھے ایک سخت دھکا محسوس ہوا۔ جس سے میں اوچھل پڑا۔

یہ دیکھ کر تماشائیوں نے ایک قہقہہ لگایا۔ اور وہ عورت جس نے اپنی لوہے کی کنگھی دانستہ نیچے گرائی تھی۔ مسکراکر پوچھنے لگی۔ خیر تو ہے تمہارا ہاتھ جلا تو نہیں میں نے اُس کا شکریہ ادا کرکے پوچھا کہ آپ کو اسی بات کی تنخواہ ملتی ہے۔ کہ اپنی کنگھیاں دانستہ گراکر تماشائیوں کو صدمہ پہنچائیں۔ عورت نے اقرار کیا تو میں نے طنزاً کہا کہ ایسی عورت جو اپنی روزی اس طریقہ سے لوگوں کو صدمہ پہنچاکر کمائے کبھی اس قابل نہ ہوگی کہ کوئی بھلا آدمی اُس سے شادی کرے۔

ہم آگے بڑھے تو جا بجا نمائش کے ملازم میگافون (بھونپو) لئے ہوئے اپنے مختلف تماشوں کی صدائیں لگاتے اور تماشائیوں کو اُن کی طرف متوجہ کر رہے تھے۔ ایک جگہ ایک لڑکا میگافون میں یہ صدا لگاتا تھا۔ "آؤ اندر جاکر دوزخ کا معائنہ کرو۔ جس کے ہولناک نظارے تمہارے اخلاق کو درست کردینگے اور تمہاری بقیہ زندگی نیکی اور نیکنامی میں بسر ہوگی"

میرے ساتھی نے اُس مجمع کو دیکھ کر جو اندر جا رہا تھا کہا کہ یہ امر قابل تشکر ہے کہ دنیا میں ابھی تک اتنے آدمی نیک زندگی بسر کرنے کے شائق ہیں۔ آؤ ہم بھی ان کا ساتھ دیں۔ اس کے بعد ہم نے ٹکٹ خریدے اور دروازہ کے اندر داخل ہوئے۔ وہاں کچھ تصویریں اور موم کے مجسمے دروازہ کے قریب نظر پڑے جن کا مقصود اس سزا کا اظہار تھا جو بد افعال اور بدمعاملہ لوگوں کو موت کے بعد دیجاتی ہے۔ انہیں میں ایک تصویر ایک بدرویہ شوہر کی تھی جو سرخ دھکتی ہوئی سیخوں پر کباب ہو رہا تھا۔ اس کے مقابل میں ایک مجسمہ تھا جو بادی النظر میں ایک سپیرا معلوم ہوتا تھا۔ مگر اس کی نیچے کی عبارت کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ وہ مجسمہ ایک شرابی کا ہو جس کو سانپ لپیٹ اور ڈس رہے ہیں۔ یہ ہولناک منظر ہم ابھی دیکھ رہے تھے کہ نمائش کا ایک ملازم شیطانی لباس پہنے سامنے آیا اور تماشائیوں کو پکارنے لگا کہ میرے پیچھے آؤ۔ ہم لوگ آگے بڑھے اور کرسیوں پر جا بیٹھے۔ اس کمرہ کے اخیر میں ایک گڑھا دکھلائی دیا۔ جس میں آگ دھک رہی تھی اور اُس کے شعلے تھوڑی دیر میں بلند ہوتے تھے۔ شعلوں کے پاس پہنچکر ہمارا شیطانی رہبر تماشائیوں سے یوں مخاطب ہوا "یہ ہولناک گڑھا دوزخ کا ایک دروازہ ہے۔ اس سے بچنے کی تمہیں سخت کوشش کرنی چاہئے۔ اپنی کرسیوں پر جمے ہوئے بیٹھے رہنا ورنہ اس گڑھے میں جا پڑوگے۔" یہ الفاظ وہ کہہ ہی رہا تھا کہ وہ سطح زمین جس پر کرسیاں رکھی تھیں آگے کی طرف کو جھکنی اور پیچھے کی طرف سے اُٹھنی شروع ہوئی۔ اب یہ معلوم ہوتا تھا کہ عنقریب ہم سب کرسیوں سمیت اُس آگ کے گڑھے میں گرنے والے ہیں۔ یہ محسوس کرکے تماشائی بہت گھبرائے۔ مردوں نے اپنی کرسیاں مضبوطی سے تھام لیں اور عورتوں نے چیخیں مارنی شروع کیں۔ پھر وہ زمین کی حرکت بند ہوگئی اور رفتہ رفتہ سطح زمین اپنی اصلی حالت پر آگئی۔ ہم ابھی پورے طور پر مطمئن نہ ہونے پائے تھے کہ کسی نے پکارا کہ اس کمرہ کی چھت گرتی ہے۔ ہم نے نظر اٹھا کر دیکھا تو درحقیقت چھت ایک طرف سے لٹک پڑی تھی اور ہمارے سروں پر چلی آتی تھی نوبت یہاں تک پہنچی کہ لوگوں نے ڈر کر اپنے سر جھکا کر گھٹنوں کے بیچ میں کرلئے اور یہ اندیشہ تھا کہ اب تھوڑی دیر میں سب کے سب کچل کر مر جائینگے۔ ایک عورت نے زور سے چیخ ماری تو چھت سنبھلنی شروع ہوئی۔ اور رفتہ رفتہ اپنی اصلی حالت پر آگئی۔ ہم لوگ جب باہر نکلے تو ہمارے اخلاق میں کوئی نمایاں ترقی محسوس نہ ہوتی تھی۔ مگر میرے ساتھی نے کہا کہ بھوک زیادہ لگی ہے۔ اس لئے ہم نے ایک ریسٹورنٹ میں جاکر کھانا کھایا۔ فارغ ہوکر ہم باہر نکلے تو ایک بیضاوی شکل کی عمارت نظر آئی۔ جس کے اوپر یہ لکھا ہوا تھا۔ "آؤ اس غبارہ میں بیٹھ کر مسافر چاند کی سیر کرتے ہیں"۔ ہم اندر گئے۔ تو وہاں روشنی کم تھی اور تماشائی بینچوں پر بیٹھے ہوئے ایک سینما کی تصاویر دیکھ رہے تھے۔ مگر زمین جس پر بنچیں رکھی ہوئی تھیں بار بار

اس طرح ہلتی تھیں جیسے سمندر میں کسی قدر تلاطم کی حالت میں جہاز حرکت کرتا ہے اور سینما کی تصویریں نیچے کی طرف غائب ہو جاتی تھیں جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم ایک غبارہ میں بیٹھے ہوئے چاند کی طرف اوپر چڑھ رہے ہیں۔ بادلوں اور ستاروں اور دم دار ستاروں کو نیچے چھوڑ کر ہمارا غبارہ اوپر کو چڑھتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ جہاں سے چاند بہت بڑا اور بہت قریب نظر آتا تھا۔ چند منٹ کے بعد لالٹینیں سب گل ہو گئیں۔ انجن کی سیٹی سنائی پڑی اور ایسا معلوم ہوا کہ غبارہ جس میں ہم بیٹھے تھے سطح زمین سے ٹکرایا ساتھ ہی نمائش کے ایک ملازم نے پکار کر کہا کہ چاند کی سیر کر کے ہم لوگ جزیرہ کونی کو واپس آ گئے ہیں۔ باہر نکل کر ہم آگے بڑھے تو ایک جگہ جلی حرفوں میں یہ لکھا ہوا تھا۔ کہ "یہاں دھوبی کپڑوں کی طرح آدمیوں کو دھوتے ہیں" ہم اندر گئے تو پہلے اوپر سے پانی کا چھینٹا ایسا آیا کہ ہمارے کپڑے نم ہو گئے۔ آگے بڑھے تو ایک گرم ہوا کا جھونکا محسوس ہوا۔ پھر سطح زمین جس پر ہم کھڑے تھے۔ ڈھلوان ہو گئی اور ایک بڑی مشین کی طرف جھکی۔ جس میں دھوبی بھیگے کپڑوں کو یورپ میں دباتے ہیں۔ اس مشین میں دو بہت بڑے رولر ایک دوسرے سے متصل گھومتے ہیں۔ اور ان دونوں رولروں کے بیچ میں ایک طرف سے کپڑے ڈالے جاتے ہیں جو دونوں رولر کے درمیان دب کر دوسری طرف نکلتے ہیں۔ زمین میں ڈھال اس قدر بڑھ گیا کہ لوگ ایک دوسرے پر گر کر مشین کی طرف لڑھکنے لگے۔ اب شور و غل کی آواز بلند ہوئی اور ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ باوجود واویلا اور چیخ پکار کے لوگ دونوں رولر کے بیچ میں دب کر غائب ہو جاتے ہیں۔ یہ دیکھ کر میں پہلے تو بہت ڈرا اور یہ خیال کیا کہ ان دو بڑے رولروں کے بیچ میں کچل کر ضرور مر جاؤں گا۔ مگر پھر معلوم ہوا کہ یہ دونوں رولر ربڑ کے بنے ہوئے اور ہوا سے بھرے ہوئے ہیں۔ میں جب لڑھکتا ہوا ان کے بیچ میں پہنچا تو ان کا دباؤ بہت خفیف محسوس ہوا اور ایسا معلوم ہوا کہ دو ہوا سے بھرے ہوئے تکیوں کے درمیان مجھے دبا کر دوسری طرف اتار دیا ہے۔

اب رات زیادہ آ گئی تھی۔ اس لئے میں اپنے ساتھی کے ہمراہ گھر کو واپس آ گیا۔ اور پھر وہاں نہ گیا۔ ایسی نمائش کی سیر کے لئے ایک دن میرے نزدیک کافی ہے کیونکہ وہاں کے عجائبات انسان کو اس قدر حیرت اور ہول میں ڈالتے ہیں کہ اس کا اثر دل سے عرصہ تک زائل نہیں ہوتا۔

شیبانی

زلالِ سخن

ترک گفتن بہ خیالِ خام را | دامنِ آغازِ بے انجام را
نے سوادِ منزلے نے ساحلے | گردِ باد و موجِ بے آرام را

صنعتِ مشاطۂ فطرت دھد
جلوۂ نو حسنِ صبح و شام را

دخل نبود در شبستانِ عدم
فتنۂ بیدارِ صبح و شام را

دیدۂ نامحرمِ فردائے ما
خوش نکرد آغازِ نیک انجام را

کورتر خواہیم و خارے بشکنیم
دیدۂ نامحرمِ انجام را

نیست جائے در دلِ بے مدعا
خار خارِ کوششِ ناکام را

آنکہ جوید کعبۂ خلوت مثال
ترک گوید سجدہ گاہِ عام را

فتنۂ فردا بفریادم رسید
شکر گویم حشرِ بے ہنگام را

مژدۂ غم مے زند ناخن بدل
مبتلائے دردِ خوش انجام را

یاسؔ در دار الامانِ بے خودی
خاک بر سر کن غمِ ایام را

ابوالمعانی مرزا یاس لکھنوی

سالِ نو

سالِ نو آتے ہی محشر کھل گیا دربارِ حُسن
اللہ اللہ جنوری کی گرمئ بازارِ حُسن

عیدِ نوروزی کی عزت اور حسینانِ جہاں
جس طرف اُٹھی نظر دیکھا اُسی سرشارِ حُسن

گردش آنکھوں کی ہوئی دورِ زمانہ کیطرح
کوئی بھولے سے بھی کہہ سکتا نہیں بیمارِ حُسن

سال کیا بدلا کہ فیشن نے بھی بدلا اپنا رنگ
ہوگئے تقسیم کیا کیا خلعتِ سرکارِ حُسن

سالِ نو کی جلوہ آرائی ہوئی شکلِ عروس
بنکے نوشہ مہر بھی نکلا پئے دیدارِ حُسن

وصل کی سوجھیں نئی تدبیریں اہلِ عشق کو
ظلم کرنے کو مبدّل ہوگئی رفتارِ حُسن

کہنہ گلکاری دسمبر ساتھ اپنے لے گیا
اب نیا ہے موسمِ گل اور نیا گلزارِ حُسن

تہنیت نامے لکھے جانے لگے معشوق کو
جسکا ایک اک نکتہ ایک اک دفترِ اسرارِ حُسن

بڑھ رہا ہے عاشق و معشوق میں ربطِ جدید
کوئی ہے غمخوارِ عشق اور کوئی ہے غمخوارِ حُسن

وہ اشارات اب ہیں اسرارِ علومِ مغربی
جنمیں ہوتا ہی سوالِ وصل پر انکارِ حُسن

قتلِ عاشق کے لئے تیغ صفاہانی نہیں
ہوگئے تیر و کماں اس سال ننگ و عارِ حُسن

وہ رموزِ خاص ہیں تہذیبِ تعلیمِ جدید
جن میں یکہ اک جنبشِ مژگاں سے ہے اقرارِ حُسن

الغرض محسنِ تغیر کا جہاں میں دور ہے
ہیئتِ اصلی کہاں دیکھو جسے وہ اور ہے

محشر لکھنوی

حروفِ مفردہ

کرمفرما جناب سید عبداللہ صاحب رضوی نے رسالہ نومبر میں حروف مفردہ کے متعلق جو کچھ بیان کیا اور لکھا ہے میں اس کو دیکھکر بتہ دل آپ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ملتمس ہوں کہ جس طرح صاحب ممدوح کو ہندوستانی ٹائپ ایجاد کرنے اور لیٹر س (حروف) بنانے کا خیال پیدا ہوا ہے۔ اسی طرح راقم الحروف بھی کئی سال سے اس کی اختراع کے متعلق متجسّس۔ لیکن اہتمام میڈیکل ہال۔ خدمت رہنما وانتظام مدارس وانصرام امورات انجمن وغیرہ کے علاوہ بعض بعض ان خیالات وخصوصیات متفرقہ ومتنوعہ کی تحقیق وتدقیق نے بھی عدیم الفرصت بنائے رکھا ہے۔ جو کبھی کبھی باغ تخیل میں نسیم سائنس لے آتی ہے اور خواہ مخواہ اس کی آزمائش وکوشش پر طبیعت آمادہ ہوجاتی ہے۔ چنانچہ آج ہی نہیں ابتدائے بچپن سے کھیل بھی یہی تھا کہ ریل گاڑی بنانا۔ پانی سے بھاپ نکالکر اس کا تماشہ دیکھنا۔ نقشہ نویسی تصاویر سازی۔ مہرکنی۔ چھاپہ کنی۔ طغرہ لکھنا۔ تمغہ تیار کرنا غرض صنائع بدائع کی معلومات کے خیال نے ... تک جو حصہ عمر سے پورے تیس (۳۰) سال گزر چکے ہیں کسی ایک جانب ملتفت ہونے نہ دیا۔ کبھی ہارمونیم کی ... نہ ہوئی تو خود کے ... دوستوں کی خاطر دو ایک تیار کر ڈالے۔ کبھی گراموفون کو بالکل جدید طریق پر بنانے کی کوشش کی گئی۔ سوئیوں کو دوبارہ کام میں لانے کے ... قابل بنانے کا طریقہ ایجاد کیا گیا ہے ... فیان (پنکھا) کا نمونہ بنایا گیا۔ کپڑے کا پنکھا کھینچنے والی مشین تیار کی گئی۔ اسٹیم انجن۔ ہاٹ ائر انجن ... بوٹ کے سمپل (نمونہ) جو اب تک کام کرتے ہوئے موجود ہیں بنائے گئے۔ آئیل انجن کی نقل تیار ... جس کا سائز ایک فٹ ہو۔ امورات انجمن ومدارس کے کاغذات وغیرہ چھاپنے کے لئے ایک جدید ... بھی تیار کیا گیا جس کی طباعت بالکل لیتھوگراف پریس کے مشابہ ہو جو بلا پریس کے صرف ایک ... اور پتھر اور چمڑے سے سو دوسو کاغذ چھپ سکتے ہیں۔ نیز سب سے زیادہ وقت اور پیسہ الکٹرسٹی ... متعلق صرف کیا گیا جس کا نتیجہ ہر قسم کی سلس بیاٹریس بنانے۔ روشنی پیدا کرنیکا آلہ اور کالنگ بیل ٹیلیفون وغیرہ کے تیار کرنیکا راستہ ملا۔ بلکہ تیار کردہ آلات میڈیکل ہال میں ہر روز خدمت کر رہے ہیں ... کی نسبت بھی جستجو ہے کہ بہت ہی سہل طریقے پر اس کو حاصل کرکے روشنی کے کام پر لائیں ... سب خیالات کے کبھی شوق سے کبھی دوستوں کی فرمائش پر کچھ نظم ونثر لکھنے کا خیال بھی ... جاتا ہے ... تالیف وتصنیف کا بھی سلسلہ جاری رہتا ہے۔ غرض ان تمام خیالات منتشرہ کا ... ہے جو میں حروفِ مفردہ کی نسبت کامیابی حاصل نہ کرسکا۔ ورنہ طریقہ حروف مفردہ بھی

میرے خیالات کی فوج کا ایک سپاہی ہے... جو معسکر تخیل میں آٹھ سال سے تنخواہِ تمنا پر رکھا گیا ہے۔ افسوس کہ ہجوم سپاہ نے اس غریب سپاہی کو مدارج ترقی حاصل کرنے سے باز رکھدیا۔

تاہم نمونۃً ایک ٹائپ رائیٹر مشین بھی تیار کی گئی جس کی ساخت اس صورت پر ہوئی کہ ایک مشین کہنہ ولایتی لی لئی اور انگریزی حرفوں کے بجائے چاندی میں حروف جو میں نے اختیار کئے ہیں اور رشوی صاحب کے حروف کی مشابہت رکھتے ہیں بناکر سلائڈ کے سروں پر جوڑدے گئے جو بالکل معمولی طور پر ٹائپ ہوسکتا ہے۔ ولیکن ابھی چند نقائص باقی ہیں۔ اگرچندے کوشش کیجاتی ضرور کامیابی کے میدان میں حروف مفردہ کام کب قدم رکھتا۔ کچھ تو عدیم الفرصتی۔ اور طرہ براں دوست واحباکے اعتراضات وچناں وچنیں سے چراغ شوق بالکل گل ہوچکا تھا۔ اور وہ مشین ایک لخت کنج عافیت میں پناہ گزیں ہے۔

اس میں شک نہیں کہ آجکل ہندوستانی لیتھوگرافٹ پریس میں اعلیٰ سے اعلیٰ چھپائی ہوسکتی ہے۔ اور خط بھی خفی یا جلی جیسا چاہیئے لکھا جاتا ہے۔ جگہ کی کفایت شعاری بھی ہے۔ کاپی بھی دنوں تک رکھی جاسکتی ہے گو کہ مشق اور تجربے نے اس کو بھی سہل سے اسہل درجہ پہنچا دیا ہے۔ لیکن بجنسہٖ وجوہ ٹائپ کی چھپوائی میں جو عمدگی و نزاکت اور سہولت ہے وہ اہل ہنر پر پوشیدہ نہیں۔

لیتھو کی کاپی کے لئے خاص قسم کی سیاہی خاص قسم کا کاغذ اور اس کے لکھنے کے لئے خوشنویس بھی چاہیئے جسکو خاص پراکٹس ہو۔ بخلاف اس کے کہ ٹائپ کے لئے نہ کاپی چاہیئے۔ نہ خوشنویسوں کی چاپلوسی کی ضرورت۔ ایک ابجد خواں لڑکا بھی کمپوز کرسکتا ہے۔ پریس مین صاحب تو اکثر ان پڑھ ہی ہوا کرتے ہیں۔ ان کی خدمت یہی ہے کہ سیاہی کا بیلن پھیرا اور کاغذ دابکے نکالے یہی وجہ ہے کہ انگریزی اخبارات لاکھوں تعداد میں چھپتے ہیں۔ اور بہ نسبت لیتھو کے ٹائپ کی طباعت بہت ارزاں بھی ہے

اہل مغرب صدہا قسم کے چھاپے اور ٹائپ وغیرہ ایجاد کرچکے ہیں۔ لیکن ہماری حروف اور چھاپے کی نسبت ان کی صنعت گری وتنوع پذیر نہ ہوئی۔ اس کی کئی وجوہات ہیں ہمیں اس کے بیان کی ضرورت نہیں۔ آخر جلشانہ نے اہل ہند کو بھی دل ودماغ عطا کئے ہیں کیوں ! ان ہستیوں کے ذریعہ... کسی امر جدید کا اختراع وایجاد حرام سمجھا جاتا ہے !

ہاں اس میں شک نہیں کہ ہموطنوں کی سرشت میں اعتراضات۔ رشک و بغاوات نا اتفاقی

بے اتحادی کا مادہ نہ ہوتا اور ملکی اشیاء کو نظر حقارت سے نہ دیکھنے لگتے آج اہل ہند بھی صنعت بھرفت ایجاد و اختراع کی منزلوں میں وہی روز افزوں ترقی حاصل کرتے جو اہل یورپ کو نصیب ہے

عوام کا گمان ہے کہ یورپ کے عناصر وارکان ہی میں ذکاوت وفراست کا مادہ ودیعتہً ملوہے لہذا ہر صنعتگری انہیں کا حق ہے۔ یہ خیال غلط ہے اگر یورپ کی خاک ہی میں مادہ حکمت ملو ہوتا تو ہر فرد بشر وہاں کا فلاسفر ہوتا۔ جنہوں نے ایجاد واختراع کا علم نصب کیا ہے اور جنکی بدولت یورپ کا ستارہ آسمان فراست پر چمک رہا ہے۔ وہ معدودے چند متنفس ہی ہیں بقیہ افراد انسان مثل ہمارے زمین یورپ پر بوجھ ڈالے پڑے ہیں۔ قَلِیْلٌ مَا یَعْقِلُوْنَ وَ اَکْثَرُہُمْ اَبْنَا بِلُوْنَ۔ شاہد عدل ہے۔ پس خواہ اہل ہند ہو یا اہل یورپ کوشش اور جستجو حصول کمال کے لئے شرط ہے مَنْ جَدَّ وَجَدَ۔ اور انگریزی مثال وہیئر دیئر از ول دیئر از وے۔ اور ع اگر کوشش کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔ ان باتوں پر غور کرنے سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔

لیکن حق بات یہ ہے کہ آدمی کو جب تک ان دس باتوں میں کامیابی نہ ہو وہ کبھی صورت سے کسی چیز کا موجد بن سکتا ہے۔ اور نہ اس کو اس اپنی ایجاد سے کچھ فائدہ حاصل ہو سکتا ہے جن میں پانچ باتوں کا تعلق باطن سے ہے اور پانچ کا ظاہر سے فراغت فرصت۔ قدرت تائید۔ آزادی یہ اسباب ظاہری ہیں۔ اور باطنی علم حکمت۔ ہمت شوق۔ استقلال جس انسان کو یہ صفات حاصل ہوں البتہ وہ جس کام پر توجہ کرے ضرور کامیاب ہوگا۔

حاصل کلام فی الوقت حروف مفردات کا رواج ترتیب دینے کی جو تجویز کی گئی ہے وہ بہتر واحسن ہے مگر جو لوگ معترض ہیں شاید ان کا گمان اس تحریر کے ایجاد سے ابطال خط مروجہ متصور ہو۔ حالانکہ یہ بات تو نہیں ہے۔ کیونکہ مروجہ تحریر بھی رہیگی۔ اور یہ چھاپہ بھی رہیگا۔ اور کتب میں بھی بدستور مطبوع ہوتی رہینگی۔ لیکن چند صورتوں میں حروف مفردہ علے العموم ٹائپ پرنٹنگ اور علی الخصوص ٹائپ رائٹنگ میں مفید ثابت ہونگے جو آیندہ چلکر لوگ اس کی خوبی کا معائنہ کرینگے۔

ایک سے زیادہ کتابت کی صورتیں رائج ہوں تو البتہ توسیع علم وفن کے لئے مفید ہی ہے نہ کہ مضر۔ دیکھئے انگریزی میں کیاٹیلس رومن۔ اٹالک وغیرہ اقسام کے حروف جدا جدا شکلوں کے تیار کرکے۔ طباعت میں کس طرح گنجائش پیدا کردی گئی ہے۔

ہمارے یہاں عربی۔ فارسی۔ اردو۔ ہندی وغیرہ علوم میں صرف دو خط ایک نسخ ایک نستعلیق

بھی مروج ہیں۔ ان دو کے علاوہ اگر اور کوئی خط جدید بھی ایجاد کیا جائے۔ لا مضایقہ لہ ولا ممانعتہ۔ مگر بحث بحث حروف کی ایجاد تو کچھ جدید طور پر واقع نہ ہوئی ہے صور کی نسبت اگر کہا جاتا ہے تو حروف کی اصلیت میں تو نہیں البتہ جسمیت میں کچھ تصرف ہوا ہے جو وہ بھی ضابطہ قدیمہ کے خلاف نہیں۔

تاہم اگر برادران سے شکریۂ اعتراض اس ایجاد کے معاوضہ میں صادر بھی ہو موجب استعجاب نہیں چونکہ من صنف قد استہدف زبان معترضین وطاعنین سے خدا اور رسول بھی بری نہیں سہ

قیل ان الالہ ذو ولد؛ قیل ان الرسول قد کہنا ؛ ما نجی اللہ والرسول معاً ۔ من لسان الوری فکیف انا

پس کوئی مصنف یا مجدد کس طرح بری رہ سکتا ہے۔

چاہیئے کہ حروف مفردہ مجددہ کے پسند فرما ہوا لے اصحاب پہلے باہم مشورہ فرما کر بایکدیگر تائید و امداد کا قلعہ تیار کرلیں۔ پھر حروف مفردہ کے ٹائپس کی توپیں اور بندوقیں کارخانہ سے بنوا کر نصب کر دیں اور اشاعت کی گولہ باری سے پبلک کی افواج قلوب پر فتحیابی حاصل کریں۔

پس حروف مفردہ کی طباعت و اشاعت جب عام ہوگی پبلک اس کے فوائد اور اس کی سہولت سے ماہر اور چند روز کی پریکٹس سے اس کے پڑھنے لکھنے پر قادر ہو جائے گی۔ گو کہ تحریر کے لئے ترکیب قدیمہ سے زیادہ سودمند تو نہیں ہے ہاں جب ٹائپ کیا جائے البتہ اس کے پڑھنے میں ابتداءً نوعی دقت سی معلوم ہوگی۔ لیکن اتنی تو نہیں جتنی دقت انگریزی لفظوں کے نکالنے میں ہوا کرتی ہے۔ چونکہ باوجود ایک ایک لفظ انگریزی کا حسب القرع کی لڑی یا زنجیر کڑی کے مانند طول طویل ہونے کے پھر بھی آسانی سے پڑھ لیا جاتا ہے۔ مگر اندیشہ اس بات کا ہے کہ صفحوں میں جا ے کا صرفہ زیادہ ہوگا۔ البتہ غور و خوض کر کے اس نقص کو دور کرنا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔

امید ہے کہ جب تک حروف مذکورہ رائج نہ ہوں اور اس کے ٹرس تیار نہ کئے جائیں۔ علم دوست احباب وقتاً فوقتاً شباب میں بذریعہ جذبات تحریر اس امر کی نسبت تحریک فرماتے رہینگے۔ اور میں بھی میرے اس ٹائپ رائٹر کے صور حروف۔ جو چند سال پہلے میں نے اختراع کے اسٹیج پر لا پیش کئے تھے۔ ناظرین نے جن کی نمائش کو محض بازیچۂ اطفال سمجھکر چناں وچنیں کرکے میرے چراغ شوق کو گل کر ڈالا تھا۔ مگر اس کو آج مکرمی رضوی صاحب کے جوش نے دوبارہ بھڑکا دیا ہے آیندہ کسی رسالہ میں ضرور پیش کروں گا۔ انشاء اللہ المستعان وعلیہ التکلان

محمود گڑپاوی

غزل

پیدا ہوئی خلش وہ دلِ بیقرار میں　　　مر کر بھی چین آیا نہ کنجِ مزار میں
ہے دل میں درد آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے　　　بیٹھا ہوں رہگذر پہ ترے انتظار میں
آسودگانِ خاک کو سمجھو نہ مطمئن　　　آیا ہے کسکو چین بھلا انتظار میں
کہئے کہ زہر جسم میں چھڑکے گا یا نہیں　　　زلفیں سنگھار رہے ہیں مجھ انتظار میں
دیکھا ہے جب سے اسکی نگاہوں کو اے نظر
اک پھانس سی چبھی ہے دلِ بے قرار میں

سالِ نو

کل دسمبر کی ۳۱- تاریخ تھی)- جب آدھی رات گذری)- ٹھیک بارہ بجے ناظم ازل نے گھڑیال بجایا جو گوش شنوا نے سنا- گھڑیال کی آواز میں تسلی اور اضطراب- شادی اور غمی- رنج اور راحت کچھ اس طرح آمیختہ تھے- کہ ایک کو دوسرے سے تمیز کرنا دشوار تھا-

جہاں نغمہ ہائے شادی دلوں کو لبھاتے تھے وہاں بیقراری کے نالہ ہائے شبگیر طبیعت کو پریشان کر رہے تھے- یہ وہ عجیب سماں تھا جسے نہ تو آنکھ نے پہلے دیکھا نہ کان نے سنا- ایسی انجم ساعت میں گھڑیال کی صدا کے یہ معنی تھی کہ سال ۱۹۲۱ء معہ اپنے ہیبت ناک نظاروں- خونخوار واقعات- معصومیت کے خون- الفت کے تلاطم- ہمدردی و غمگساری کی متواج روح افزا رنگا موجوں کے رخصت ہوا- اور سال ۱۹۲۲ء جو امید و تمنا بیم و رجا کے زرّیں ماتم خیز لباس میں ملبوس ہے آ گیا- - - - - گھنٹہ بجا- بعض ناعاقبت اندیش ہستیاں چونک پڑیں- گھبرائیں- مگر پھر اسی خواب غفلت اور انسانیت کش بیہوشی کا شکار ہو گئیں- بد خو روحیں جو ارد گرد منڈلا رہی تھیں- خوب قہقہہ لگا کر ہنسیں- اور وہ بھی اپنی اپنی آرامگاہ میں چادر عیش و عشرت و خود فراموشی اوڑھ کر محو استراحت ہوئیں- مگر وہ لوگ جو چشم بصیرت سے کام لیتے ہیں- اٹھے- گھنٹے کی آواز پر لبیک کہا- اور سراپا اضطراب ہو گئے- انہوں نے بھی سالِ گزشتہ کے تین سو پینسٹھ دنوں کو بنظر عمیق ایک ایک منٹ تک دیکھا- جانچا- واقعاتِ ماضیہ سے دماغ کو تازہ کیا- حالاتِ حاضرہ پر نظر ڈالی اور اس نئے سال کے واسطے جو عین اسیوقت اور اسی لمحہ شروع ہوا تھا- اپنا ایک نصب العین

ایک طریقہ ایک دستور العمل اور قواعد کا ایک ضابطہ مرتب کیا۔ اور استقلال اور بردباری کا زادِ راہ باندھ کر نہایت ایمانداری سے اس پر عمل پیرا ہونے کا وعدہ اس سکون و خاموشی کے وقت کیا جبکہ دریاؤں کا پانی بھی چند لمحوں کے واسطے تھم جاتا ہے۔ یعنی اس وقت جبکہ دنیا کے حکمراں اپنی قلمرو کو وسعت دینے کی دھن میں تھے۔ جبکہ دنیا کے نامور قزاق اپنے دائرہ عمل کی رکاوٹیں دور کرنے کی فکر میں تھے جبکہ عابدِ شب زندہ وار سبحہ گردانی میں مصروف تھے۔ جبکہ علم دوست چراغ ہدایت روشن کئے پرانے محققوں اور فلسفیوں کے مسائل میں مستغرق تھے۔ جبکہ دنیادار اپنی روزی کی فکر میں تھے۔ جبکہ عاشق اپنے معشوق کا نقشہ آنکھوں کے سامنے جمائے اپنی جبینِ نیاز کے سجدوں کی تڑپ پر مفتوں تھے۔ عین اسی وقت جبکہ قوم پرست اور فدایانِ ملک اپنی قوم و ملک کی بہبودی اور بہتری کی راہ ڈھونڈ رہے تھے۔ خدا کا ایک بندہ ابنِ آدم کی غفلت شعاری۔ پست ہمتی اور کوتاہ اندیشی سے متاثر ہو کر رب العزت کی بارگاہ میں سربسجود تھا۔ اور امتِ آدم کی فلاح کیواسطے گڑگڑا کر دعا مانگ رہا تھا۔ یکایک رازدارانِ سرِ یزدانی یعنی عرشِ اعلیٰ کے دربان نوری مشعل ہاتھوں میں لئے دوڑے اور درگاہِ قبولیت کے دروازے چوپٹ کھول دیئے۔ رحمتِ ربانی جوش میں آئی۔ اجابت خود آگے بڑھی اور اس دعا کو چوم کر آنکھوں پر رکھ لیا

شیخ عبدالحق ریاض۔ بی اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

دو پرندے

دو پرندے اک جگہ بستی سے دور / شورشِ ہنگامۂ ہستی سے دور / خلوتِ فطرت میں تھے بیٹھے ہوئے / ایک پر اک گردنیں رکھے ہوئے
شام تھی اور چھپ چکا تھا آفتاب / ہو رہا تاریک تھا نیلی قباب / تھی ہوا جو بادہ مستِ شام تھی / سرد تھی گو لیکن آتش جام تھی
اسکی آتش سے پرندوں کا باغ / تھا چراغاں مثلِ شالامار باغ / جذبۂ پاکیزہ سے معمور تھے / عشق مے تاثیر سے مخمور تھے
لے رہے تھے وہ محبت کے مزے / یعنی اس بانی فطرت کے مزے / جس سے خود موصوف ہے پروردگار / جس پہ ہے اخلاص انساں کا مدار
ہائے کیا اسوقت یاد آیا مجھے / جسنے دل کیطرح تڑپایا مجھے / کیا کہوں کسنے مجھے تڑپا دیا / "آدمی سے آدمی نے کیا کیا"
اس جگہ ظاہر ہوئی فطرت کا خلوص / کاش یہ انسان میں بھی ہوتا خلوص / اسکو ہے ہیم جنگ ہر فطرت کیساتھ / بک چکی تہذیب اس شیطاں کے ہاتھ
قافلہ انسانیت کا لٹ گیا / ہائے یزدانی سفینہ چھٹ گیا / قوتِ حیواں پہ ہے انساں کا ناز / ننھی چڑیا ہے شکارِ شاہباز
ان خیالوں میں مگن بڑھتا گیا / رخنہ انداز ان کی خلوت میں ہوا / کان میں آہٹ پڑی جو اڑ گئے / جاکے پھر کچھ فاصلے پر جڑ گئے
دفعتاً آنکھوں سے پنہاں ہوگئے / بیج اپنی پیت کا وہ بو گئے

دخلِ بزمِ راز سے نادم ہوں میں آہ صد حسرت کا مجرم ہوں میں میں کوئی کچھ کہنے یا سننے کو تھا آہ اے پیارے پرندو! تم سے کیا
تم کو پہلے تھا بشر پر اعتبار میں نے بوڑھوں سے سنا ہے بارہا مجھ کو واللہ پاس ہے احساس کا تم پہ جو گزری اسے جانے خدا
تم کو بھی انسان سے نفرت نہ تھی حرص سے انسان کو الفت نہ تھی مہر و الفت تھی نہ تھا آپس میں جنگ رنگ دونوں کا تھا فطرت ہی کا رنگ
بدتریں غم ہے فضا دلدادہ کو ہائے یہ قیدِ قفس آزادہ کو تم کو مارا یا کہ دی قیدِ قفس رونما آخر ہوئی حرص و ہوس
تم نے اڑنے کے لیے پھیلائے پر دُور سے انسان اگر آیا نظر ٹوٹنے ٹوٹنے حبلِ فطرت ہو گئی تم کو آخر اس سے نفرت ہو گئی
باغِ دنیا میں سبھی کانٹے نہیں لیکن انساں ایک سے ہوتے نہیں حرف نامِ جنسِ انسان پر دھرو حق بجانب ہو کہ نفرت تم کو ہو
ہاں تمہارا چاہنے والا ہوں میں نفسِ خود بیں سے مگر بالا ہوں میں یعنی مستِ بادۂ عرفاں ہوں میں ناز ہے مجھ کو بھی یہ انساں ہوں میں
لگ رہے ہیں کس کے ڈیرے دیکھیے چیر کر پہلو کو میرے دیکھیے مجھ سا ہوگا چاہنے والا کہیں! مجھ سے یہ نفرت تمہیں اچھی نہیں
ورنہ کیا رکھا ہوا بسمل میں ہے کل جہاں کا درد میرے دل میں ہے جس پہ میں نازاں ہوں سایا عشق کا دین میرا عشق ہے ایماں ہے عشق

ذکاء اللہ بسمل ایم۔ اے

مہاراجہ اشوک

قدیم ہندوستان کے چکراورتی راجاؤں میں سے مہاراجہ اشوک سب سے بڑا راجہ ہو گزرا ہے۔ مہاراجہ اشوک بدھ مذہب کا پیرو اور خاندانِ موریا کا تیسرا راجہ تھا۔ پٹالی پترا (پٹنہ) اس کی راج دھانی تھی۔ یہ شہر دریائے سون کے کنارے پر آباد تھا اور بقول یونانی سفیر میگس تھینز نو میل لمبا تھا۔ دور و نزدیک کے راجہ۔ اشوک کے حلقہ بگوش تھے اور اس کی غلامی کے طوق کو طرۂ امتیاز سمجھتے تھے۔

اشوک کے ابتدائی حالات پر بالکل تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ کب پیدا ہوا اور اس کی طفولیت کے دن کس طرح گذرے۔ ہاں اس قدر روایتاً معلوم ہے۔ کہ جب وہ جوان ہوا تو اس کے باپ مہاراجہ بندوسار نے اسے پہلے تو ٹکسلا کا اور اس کے بعد اجین واقع مالوا کا وایسرائے بنا کر بھیج دیا۔

۲۷۳ء ق۔م۔ میں اشوک تخت نشیں ہوا۔ مگر تخت نشینی کی رسم ۲۶۹ء سے پہلے ادا نہ ہو سکی اس تاخیر کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے۔ کہ اشوک کا بڑا بھائی بھی تخت کا دعویدار تھا۔ دونوں میں جنگ ہوئی جو دو سال تک جاری رہی اور آخر کار بخت نے اشوک کی یاری کی اور وہ راجہ بن گیا۔

ابتدا میں وہ بھی پہلے راجاؤں کی طرح زندگی بسر کرتا تھا۔ شکار کھیلتا۔ گوشت کھاتا اور عیش و عشرت کی مجلسوں اور میلوں میں شامل ہوتا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جین مذہب کا پیرو

نہ تھا۔ اس کی عادات اور مذہبی اعتقادات میں دفعتہً تبدیلی کی وجہ کالنگا کی جنگ تھی۔ جس میں لاکھوں بندگانِ خدا خون پانی کی طرح بہ گیا۔

کالنگا یا اوڑیسہ کا ملک ابھی تک ممالک محروسہ میں شامل نہیں ہوا تھا۔ سنہ ۲۶۱ قبل مسیح میں اشوک نے اس ملک پر حملہ کر کے اُسے فتح کر لیا۔ کالنگا کے باشندے جان توڑ کر لڑے لاکھوں نے اپنے ملک کی آزادی پر اپنی جان قربان کر دی۔ ان جانبازوں کی قربانی رنگ لائی۔ مفتوحین کی مظلومیت دیکھکر مغرور فاتح کے دل پر ٹھیس لگی۔ وہ لڑائی سے بیزار ہو گیا۔ اور آیندہ تازیست کبھی کہیں فوج کشی نہ کی

کالنگا کی جنگ تاریخ عالم کے نہایت اہم اور فیصلہ کن واقعات میں شمار کی جاتی ہے مفتوحین اپنی تکالیف۔ سپاہیوں کی صعوبتیں۔ قیدیوں کے مصائب تو بھول گئے۔ لیکن جیسا کہ فاتح کے دل پر ان واقعات کا بہت گہرا اثر ہوا اور مدتوں کے لئے جنگ کی قبیح رسم ہندوستان سے اٹھ گئی۔ اس واقعہ کی یادگار میں اشوک نے خود ایک بہت طویل کتبہ ایک پتھر کے مینار پر کندہ کرایا۔ جس میں کالنگا کی جنگ کے واقعات کو یاد دلا کر اس نے لوگوں سے اپیل کی کہ آیندہ انہیں صلح و آشتی سے رہنا اور اپنا وقت گیان دھیان میں مصروف کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اس کتبہ میں لکھا ہے۔ کہ تقدس مآب اعلیٰحضرت نے سن جلوس کے آٹھویں سال میں کالنگا فتح کیا۔ ڈیڑھ لاکھ قیدی اُس کے ہاتھ آئے اور ایک لاکھ آدمی مارے گئے۔ اور اس سے کئی گنا زیادہ لوگ جنگ کی وجہ سے تباہ اور برباد ہو گئے

اس فتح کے بعد اعلیٰحضرت دھرم پر کاربند ہو گیا۔ اور اس کی حفاظت کرنے لگا۔ اور لوگوں کو بھی اس کی تلقین کرنے لگا۔ قتل غارت اور تباہی جنگ کا لازمی نتیجہ ہیں۔ اسی وجہ سے کالنگا کی جنگ کے بعد اعلیٰحضرت پشیمان اور نادم ہوا۔

اس کے بعد اشوک لکھتا ہے۔ کہ سچی فتح یہی ہے کہ دھرم اور نیکی سے لوگوں کے دلوں کو تسخیر کیا جائے اور اپنے بیٹوں اور پوتوں کو نصیحت کرتا ہے کہ انہیں دنیاوی فتوحات کو چھوڑ کر حقیقی فتوحات کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد جو دو کتبے کندہ کرائے گئے۔ ان میں بھی اشوک نے مفتوحہ اقوام کو اسی قسم کی تلقین کی ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ دھرم سے مہاراجہ اشوک کی کیا مراد تھی؟ اشوک کی رائے میں انسان کے تین فرائض ہیں۔ اول والدین۔ استاد اور بزرگوں کی تعظیم و تکریم اور چھوٹوں کی پاسداری۔ دوئم کسی جاندار کو ایذا نہ دینا۔ جسے سنسکرت میں آہمسا کہتے ہیں۔ سوئم صداقت اور سخاوت۔ رواداری

اور نفس کشی - اس کے علاوہ اشوک ہمیشہ اس بات کی تلقین کرتا تھا - کہ انسان کو چاہیئے سب کے ساتھ مہربانی سے پیش آئے - غلاموں اور ملازموں کے ساتھ نیک سلوک کرے - خیرات دے - اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ کسی قسم کا مذہبی عناد نہ رکھے -

موریا سلطنت میں تقریباً قریباً تمام ہندوستان شامل تھا - اس کی شمالی حد کوہ ہندوکش سے ٹکرائی تھی - افغانستان کا کچھ حصہ کشمیر اور نیپال بھی اس میں شامل تھے - مغربی جانب بلوچستان سندھ - کاٹھیاواڑ - مالوہ - اوجین اور گجرات اس کے صوبے تھے - شرق کی جانب بنگال اور کالنگا اس کے ساتھ لگتے تھے - کالنگا کے جنوب میں اندھرا دیش تھا - یہ سلطنت بھی اشوک کی باجگذار تھی - ہندوستان کے عین جنوب میں چیدا - چولہ اور پانڈیا - تین سلطنتیں بالکل خود مختار تھیں -

اتنی بڑی سلطنت براہ راست اشوک کے ماتحت نہیں تھی - اس میں بے شمار چھوٹی چھوٹی باجگذار ریاستیں تھیں - جو اشوک کو ہر سال کچھ نہ کچھ خراج ادا کرتی تھیں - بہت سا علاقہ بالکل ویران پڑا تھا - اشوک کے ماتحت چار نائب السلطنت تھے - جو عام طور پر شاہی خاندان کے شاہزادے ہوتے تھے - شمال مغربی ممالک کے وائسرائے کا دار الخلافہ ٹکسلا تھا اور سندھ - بلوچستان مکران اور افغانستان اس کے ماتحت تھے - شرقی صوبوں کا وائسرائے توسالی واقع کالنگا میں رہتا تھا مغربی صوبوں کا دار الخلافہ اوجین تھا - دکن کے صوبوں کا دار الخلافہ ستوزن گدی تھا - ممکن ہے - کہ ان کے علاوہ اور بھی وائسرائے ہوں - لیکن تاریخوں میں صرف انہی چاروں کا ذکر آتا ہے

جلوس کے سولھویں یا سترھویں سال اشوک نے بدھ مذہب اختیار کر لیا - اس مذہب کو پھیلانے کی غرض سے مہاراجہ نے بدھ مذہب کے احکام چٹانوں پتھروں - کنوؤں اور میناروں پر پالی زبان میں کندہ کرا دیئے - وہ خود بدھ مذہب کا پورا عامل تھا - اور چاہتا تھا کہ دوسرے لوگ بھی کامل طور پر اس کی تقلید کریں - وہ غریبوں کی بہت دستگیری کرتا تھا - اور اس نے مسافروں کے آرام کی خاطر سڑکوں پر دورویہ درخت لگوائے - کنوئیں کھدوائے - اور سرائیں بنوائیں - جابجا انسانوں اور حیوانوں کے لئے شفاخانے بنوائے - اس کے علاوہ اس نے حیوانی قربانی اور جانوروں اور پرندوں کا شکار قطعی بند کر دیا اشوک نے محتسب مقرر کر رکھے تھے - جن کا کام لوگوں کو دھرم کی خلاف ورزی کرنے سے روکنا تھا - اس نے بدھ مذہب کی اشاعت کے لئے اپنے بیٹے مہندا اور بیٹی سنگھ منا کو لنکا میں بھیجا - جہاں انہیں بہت کامیابی ہوئی - اور قریباً سب کے سب لوگ بدھ مذہب کے پیرو ہو گئے - اشوک کے دربار میں ہر شخص نہایت آزادی سے آجا سکتا اور جس وقت چاہتا اپنی درخواست گزار سکتا تھا -

فاہین اور ہیون سانگ نام دو چینی سیاحوں نے جنہوں نے پانچویں اور ساتویں صدی میں ہندوستان کا سفر کیا۔ اپنے سفرناموں میں ان میں سے بہت سی عمارتوں کا ذکر کیا ہے۔ سانچی کے قریب جو بہت سے گنبد پائے جاتے ہیں۔ وہ اسی زمانہ کے بنے ہوئے ہیں۔ اشوک نے اپنے افسروں کو بھی یہ حکم دے رکھا تھا۔ کہ وہ اس کی طرح ہمت اور چستی سے کام کریں اگر کوئی گورنر ان احکام کی تعمیل میں تساہل کرتا تو اس کو گوشمالی کی جاتی تھی۔

اشوک نے بدھ مذہب کے پرچار کے لئے نہ صرف ہندوستان کے مختلف صوبوں میں بلکہ شام مصر۔ مقدونیہ اور دوسرے ممالک میں اپنے اپدیشک (مبلغ) بھیجے۔ اُس کے بیٹے مہندا نے سیلون میں بُدھ مذہب کی اشاعت کی۔ سیلون۔ برما اور تبت کی روایتوں میں اشوک کو بدھ مذہب کا سب سے بڑا مہاراجہ کہا جاتا ہے کہتے ہیں۔ کہ اس راجہ نے تاک میں بے شمار مقدس عمارتیں بنوائیں

اسی راجہ کے عہد میں بعض اپدیشک بدھ مذہب کی اشاعت کے لئے کاشغر۔ ختن اور چین تک پہنچے۔ سٹرابو۔ مشہور یونانی جغرافیہ دان بیان کرتا ہے کہ جنوبی ہند کی پانڈیہ سلطنت نے ۲۹ سنہ قبل مسیح میں ایک شخص سرامنا چاریہ کو روم میں بدھ مذہب کی اشاعت کے لئے بھیجا۔ اور یہ کہ اس شخص کا ایتھنز۔ پایہ تخت یونان میں انتقال ہوا اور وہ وہیں مدفون ہوا۔

اشوک نے بدھ مذہب کی اشاعت کے لئے ایک مشن سیلون کو روانہ کیا جسے اپنے مقصد میں پوری کامیابی حاصل ہوئی۔ رفتہ رفتہ تمام جزیرے نے بدھ مذہب اختیار کر لیا۔ یہ مشن سیلون کے راجہ ٹِسا کے ایما سے وہاں پہنچا تھا۔ اشوک کا چھوٹا بھائی مہندا یا مہندرا اس مشن کا سردار تھا۔ مہندا کا ۲۰۴ سنہ قبل مسیح میں وہیں انتقال ہوگیا۔ اہل سیلون نے بہت سی عمارتیں اس اپدیشک کی یادگار میں قائم کرنے کے لئے تعمیر کیں۔ جن میں سے بعض اب تک موجود ہیں۔ سنگھا ترا بھی اپنے بھائی مہندا کے ہمراہ سیلون پہنچی۔ اور اس نے عورتوں میں وہی کام کیا۔ جو مہندا نے مردوں میں

اشوک گو بدھ مذہب کا پکا معتقد تھا۔ لیکن دوسرے مذاہب کے معتقدوں کو بالکل ایذا نہیں دیتا تھا۔ اس کے بعض احکام سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ برہمنوں۔ جینیوں اور سادھوؤں کی بہت عزت کرتا تھا۔ ایک فرمان میں صریح طور پر لکھا ہے۔ کہ راجہ تمام مذاہب کے لوگوں کو عزت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اور ان کو انعام و اکرام دینا پسند کرتا ہے۔ اسی فرمان میں یہ بھی ذکر ہے۔ کہ راجہ مذہبی تعصب کو ہرگز پسند نہیں کرتا اور اس کو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ کہ کوئی شخص کسی دوسرے مذہب کے معتقدوں کے ساتھ درشتی یا سختی سے پیش آئے

اشوک کے عہدِ حکومت کے واقعات کے مطالعہ سے معلوم ہوگا۔ کہ یہ راجہ شہنشاہ اکبر سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ اکبر ایک وسیع ملک کا مالک اور باحوصلہ بادشاہ تھا۔ کیا فاتح اور کیا مفتوح کیا مسلمان اور کیا ہندو سب کو ایک نظر سے دیکھتا۔ مذہبی رواداری اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ کیا مجال کہ کوئی کسی کے مذہبی معاملات میں دخل دے سکے۔ وہ عالموں فاضلوں۔ اور ماہرین فن کی قدر کرتا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ لوگ دُور دُور سے اس کے دربار کی طرف کھچے چلے آتے تھے۔ یہی حال اشوک کا تھا فرق صرف یہ تھا کہ اشوک اپنے دھرم کا پکا تھا۔ اکبر کی طبیعت ملک گیر تھی۔ وہ کشت وخون کا شایق تھا۔ اور جب تک جیا۔ کسی نہ کسی سے برسرِ پیکار رہا۔ لیکن اشوک کو جنگ سے نفرت تھی۔ اس نے ساری عمر میں صرف ایک لڑائی لڑی۔ اس کے بعد شمشیر کو غلاف سے کبھی نہ نکالا۔ اشوک کے عہد کے کتبے ملک کے مختلف حصوں میں ملتے ہیں۔ یہ کتبے یا تو چٹانوں پر پالی زبان میں جو اس زمانہ میں ملک کی عام زبان تھی۔ کندہ ہیں۔ یا پتھر کے بہت اونچے اونچے ستونوں پر۔ یہ حقیقت میں مہاراجہ اشوک کے افسروں اور اپنی رعایا کے نام احکام ہیں۔ ان کے ذریعہ وہ انہیں نیکی اور دھرم کی تلقین کرتا تھا۔ ان سب کتبوں میں وہ اپنے آپ کو پیاداسی یعنی رحمدل لکھتا ہے۔ دوسرے بادشاہ اپنی بڑائی کے لئے اس قسم کی یادگاریں قائم اور ان میں نہایت شدومد سے اپنی فتوحات کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن اشوک نہایت منکسر المزاج تھا۔ اس کی غرض لوگوں کی ہدایت تھی نہ کہ خودستائی۔ اس لئے اس نے کسی کتبے میں بھی اپنی شان وشوکت اور فتوحات کا ذکر نہیں کیا۔ صرف ایک کتبے میں کالنگا کی فتح کا ذکر ہے

یہ کتبے ملک کے مختلف حصوں اور دور دراز مقامات میں ملتے ہیں۔ مثلاً ایک نونیپال میں ملتا ہے، اور دوسرا یوسف زیوں کے ملک میں۔ ایک گیدنار واقع کاٹھیاواڑ۔ جس دوسرا سدھاپورہ واقع میسور میں اور تیسرا جنگا واقع مدراس میں۔ چونکہ ان کتبوں کا روئے سخن رعایا اور ارکین سلطنت کی طرف ہے۔ اس لئے مؤرخین کا خیال ہے۔ کہ جن علاقوں میں یہ ستون پائے جاتے ہیں وہ سب اشوک کی وسیع سلطنت میں شامل تھے۔ اور چونکہ وہ سب کے سب پالی زبان میں ہیں۔ اس لئے خیال کیا جاتا ہے کہ اُس وقت ملک کی عام زبان پالی تھی۔ جس کے سمجھنے والے بھی آج خال خال ملتے ہیں۔

فیروز تغلق اس قسم کے دو ستون کہیں سے اٹھا کر دہلی لے گیا تھا۔ چنانچہ ان میں سے ایک توغدر ۱۸۵۷ء میں ٹوٹ گیا۔ اور دوسرا اب تک فیروز تغلق کے کوٹلہ کے کھنڈرات کی پاسبانی کر رہا ہے۔ بے ثباتی عالم کی اس سے بہتر اور کیا دلیل ہوسکتی ہے؟

پردہ داری میکند برقصرِ قیصر عنکبوت — بوم نوبت مے زند بر گنبد افراسیاب

اشوک نے لمبنی (نیپال) کے باغ میں بدھ کی عین پیدائش کی جگہ پر بھی ایک ستون نصب کروایا تھا۔ اس ستون کا سنہ ۱۸۹۵ء میں پتہ چلا تھا۔ اس کا ایک ایک حرف اب تک بھی ویسی ہی اچھی حالت میں ہے۔ جیسا کہ اس سے بائیس سو سال قبل تھا۔

اس راجہ کی وفات کے واقعات پر بھی تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کا کہاں اور کس سن میں انتقال ہوا۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اشوک اپنی عمر کے آخری ایام میں تخت سے دست بردار ہوگیا تھا۔ لیکن کسی معتبر روایت کی بالکل تصدیق نہیں ہوتی۔ تبت کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کا ٹکسلا میں انتقال ہوا۔ لیکن تاریخ وفات کے متعلق تبت کے لوگ بھی خاموش ہیں۔

سید عبد القادر ایم۔ اے

میری آرزو

جسدم شعاعِ مہر سے — ہو شب کا سینہ چاک چاک — ہر ذرہ بن جائے دھنک — رنگینیاں ہوں تابناک
سیکھے شفق سے جب سما — عیاریٔ حُسنِ حنا — ہر غنچہ کے دل کی کلی — کھلکر ہنسے ایسی ہنسی
بیتاب ہو دیوانگی — شرمائے سحرِ سامری — قطرے ہوں شبنم کے عیاں — یوں پتیوں پر پھول کی
جیسے کسی اُستاد نے — مخمل میں ہوں موتی جڑے — یا عارضِ نازک پہ ہو — جس طرح اشکوں کی بہار
جب سن لے کوئی نازنیں — ٹوٹے ہوئے دل کی صدا

جب آبشارِ جانفزا — ہو شیشۂ گوہر نما — دریاؤں میں آبِ رواں کرنے لگے اٹھکھیلیاں
شفّاف پانی کی جھلک — آئینہ دارِ مہر ہو — گل ریز و راحت خیز ہو — یا سازِ رنگ آمیز ہو
یا خندۂ راحت فزا — جادو طراز و فتنہ زا — تو اے گلِ رعنائے من — اس جھٹپٹی ساعت میں آ
سرسبز ہو میرا چمن — بن جائے وہ خلدِ بریں — اپنے گیسو کھول دے — میرے دلِ صد چاک پر
چھڑک دے آبِ بقا — اُن حسرتوں کی خاک پر — جو فرقتِ جانکاہ کے — شعلوں سے خاکستر ہوئیں
یوں دیکھ شوخی سے مجھے — گڑ جائیں دل میں تیر سے — پھر نرگسی آنکھیں تری — دیں مجھ کو درسِ بیخودی
اتنی بڑھے وارفتگی — من تو شوم تو من شوی — سب کو گماں ہونے لگے — گویا ازل سے ایک تھے
اسوقت اے مرے خدا — میں کاش ہو جاؤں فنا — پھر شاخسارِ زندگی — خونِ خزاں سے ہو رہا
پھر کیف مستی کا رہے — پیماں ہمیشہ استوار — اور قصرِ راحت بھی رہے — روزِ ابد تک پائدار

عمر خیام نمبر اوّل

ابو الفتح غیاث الدین عمر ابن ابراہیم الخیام بعہدِ سلطان سنجر ۵۱۸ھ میں پیدا ہوئے امام موفق الدین سے جو سرزمین نیشاپور کے فاضل ترین علماء میں سے تھے تعلیم پائی۔ امام موصوف نے اپنی پوری عمر درس کلام مجید و حدیث شریف میں صرف کر دی۔ بڑے بڑے علما و فضلا آپ کی تعلیم و تربیت سے فیض حاصل کر کے اعلےٰ مراتب پر پہنچے۔ حسن ابن الصباح اور نظام الملک طوسی دونوں عمر خیام کے ہمعصر و ہم سبق تھے۔ نظام الملک اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ "جب درس سے فارغ ہو جاتے تھے تو بحث و مباحثہ کی مجلس گرم ہوتی تھی۔ ایک روز حسن بن صباح نے کہا کہ یہ بات زبان زدِ خاص و عام ہے کہ امام موفق الدین کے شاگردان رشید کی روشن و منور قسمتوں کے ستارے اقبال کے آسمان پر چمکا کرتے ہیں، اور جو اُن کی تربیت کا فیض حاصل کر لیتا ہے اعلےٰ رتبوں پر پہنچتا ہے۔

فرض کیجیئے اگر ہم میں سے کوئی برتری حاصل کرے تو اپنے دوسرے رفیقوں کے ساتھ وہ کیا برتاؤ کرے گا۔ دونوں نے ہمزباں ہو کر کہا کہ جو تم چاہو۔ حسن بن صباح نے کہا کہ ہم تینوں کو آج سے اس بات کا عہد کر لینا چاہیئے۔ کہ ہم میں سے جو کوئی بامراد و کامیاب ہو وہ دوسرے دوستوں کو اپنے فیض سے محروم نہ کرے۔ تاکہ زمانے کی بے التفاتی و بے اعتنائی سے فراغت حاصل ہو جائے۔ ہم کو چاہئے کہ آیندہ سال تک امام موفق الدین کی صحبت کا فیض اٹھائیں اور تحصیل علم کے بعد مختلف ملکوں کی سیاحت کریں۔ میں نیشاپور سے خراسان گیا۔ وہاں سے ماوراءالنہر غزنین اور کابل پہنچا۔ یہاں سے واپس جانے کے بعد میں الپ ارسلاں کے دربار میں وزارت پر مامور ہو گیا۔ سلطان نے نظام الملک کے خطاب سے میری عزت افزائی کی۔ زمانے نے میرا ساتھ دیا۔ اقبال نے دستگیری کی۔ قسمتیں کھلیں جس زمانے میں میری تقدیر نے اوج وزارت پر مجھ کو جلوہ فگن کیا۔ میرے پاس عمر خیام آیا۔ پرانی دوستی کا حق میں بجالایا۔ میں نے اُس کا دل خوش کیا۔ اور کہا کہ ہماری ذات کا گوہر گرامی اس قابل ہے کہ سلطان کی قدرداں نگاہیں اس کی قیمت و عظمت دوبالا کرے اور تمہارے ظاہری و معنوی کمالات کے فروغ سے بادشاہ کی طبیعت میں شادمانی کا دروازہ کھلے اور تم بارگاہِ خسروی میں باریاب ہو۔ وہ عہد جو میں نے تم سے امام موفق کی درسگاہ میں کیا تھا اس کا ایفا کرنا مجھ پر فرض ہے۔ اور تم کو کامیاب بنانے کی کوشش مجھ پر لازم۔ خیام نے اِس کو قبول نہ کیا۔ کہا کہ بس میرے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ آپ کی سرپرستی میں رہ کر تحصیلِ علوم کروں۔ جب میں نے خیام کی طبیعت تقرب بارگاہِ سلطانی کی طرف مائل نہ دیکھی۔

بارہ سو مثقال (زر احمر) کا سالانہ وظیفہ نیشاپور کے خزانے سے اُسکے نام پر جاری کرادیا۔

مترجم افرنجی نے رباعیات خیام کے دیباچے میں لکھا ہے کہ خیام نے نظام الملک سے ایک موضع کے محاصل کی درخواست کی تھی نظام الملک نے سلطان سے عرض کرکے اس درخواست کو منظور کروادیا۔ نظام الملک کے قتل کے واقعہ کے بعد خیام نیشاپور چلا گیا۔ اور ریاضی و ہیئت کی تعلیم حاصل کرکے خوب شہرت حاصل کی۔

سلطان ملک شاہ کے عہد حکومت میں ۴۷۰ھ سے ۴۸۰ھ تک اُس کا دماغ فلسفیانہ خیالات کا جولانگاہ بنا رہا۔ اور اُس کی عزت و شہرت کی پیشانی خورشید تاباں کی ہم پلّہ ہوگئی ابوالفدا نے نظام الملک سے یہ عبارت نقل کی ہے۔ کہ خیام نے مرو میں مہندس شاہی کے مرتبہ پر پہنچکر ملک شاہ کے نام سے نسخہ زیجی تحریر کیا۔ حاجی خلفا نے بھی اس واقعہ کی تصدیق کی ہے چند صاحب ادراک مہندسوں کی مدد سے فارس کی قدیم تقویم کی غلطیاں درست کیں اور حکمائے قدیم کی لغزشوں کو درست کرکے حساب بالکل ٹھیک کر دیا۔ اور جلالی تاریخ کو جلال الدین ملک شاہ سلجوقی کے نام نامی سے از سر نو تازہ کیا۔ اس کے شمار کی ابتدا دسویں رمضان ۴۷۱ھ ہے۔

موسیو تبورڈ نے یہ لکھا ہے کہ عمر خیام کا طریقۂ تقویم پوپ گریگورل سے بھی زیادہ مقبول ہوا اور عمدگی نفاست اور صحیح ہونے کے لحاظ سے تاریخ جولین قیصرلی پر فوقیت رکھتا ہے۔

موسیو ویکی[1] نے عمر خیام کے رسالۂ جبر و مقابلہ کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا ہے اور دیباچے میں قواعد کے استقرا اور اُس کے اصول کے استحکام کی تعریف کی ہے اور کمال کا اعتراف کیا ہے

خیام کی دوسری تالیفات میں نسخہ معلقات حدود اقلیدس ہے۔ جو کتب خانۂ لندن میں اسوقت تک محفوظ ہے اور اُس کی تحقیق کے نکات لآلی آبدار میں سے شمار کئے جاتے ہیں۔

موسیو ویکی اپنی تالیف کے دیباچے میں جو تذکرہ تاریخ الحکما کا خلاصہ ہے یوں نقل کرتا ہے:۔

”خیام فلسفہ دانی میں بینظیر روزگار بلکہ خراسان میں اپنے وقت کا امام تھا۔ اسرار حکمیہ کے عقدہائے لاینحل کو اپنے فکر رسا کے ناخنوں سے سلجھایا کرتا تھا۔ تزکیۂ نفوس اور مشاہدہ صنائع صانع حقیقی کی تعلیم دیا کرتا تھا۔ اور یونانیوں کے مشرب کے مطابق سیاست مدن کے بھید دریافت کرنے کی کوشش میں مصروف رہتا تھا۔

---

[1] موسیو ویکی ایک فرانسیسی محقق ہے جو ۱۸۲۶ھ میں پیدا ہوا۔ اسکی زندگی کا ایک کافی حصّہ نیشاپور میں بسر ہوا ہے اسلئے عمر خیام کی نسبت اس کی تحقیقات اور دیگر بیانات زیادہ مستند تسلیم کئے جاسکتے ہیں

مسعود

صوفیہ کے گروہ نے خیام کی نظموں کے بعض اجزا کو اپنی اصلاح کے پیرایہ میں جلوہ دیکر مجلسوں اور خانقاہوں کو زمزمہ سنجی ترنم ریزی اور خوش نوائی کے ہنگاموں سے سر پر اُٹھا لیا اور اہل حال کی انجمنیں گرم کیں۔ خیالات کی لعبت کا نقاب ظاہری و معنوی اشارات کے ہاتھوں اتروا ڈالا۔ لیکن خیام کے معاصرین کلام دہریت کی بو سونگھ کر تشنیع و ملامت کرتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور رندانہ گفتار کو شرع کے حکم کے مطابق زہد کے قبولیت کے کان سے گرا دیا۔

خیام نے اس کلام مستانہ کی بیقدری و بدالتفاتی سے یارانِ وطن کو خیرباد کہکر حجاز کا رُخ کیا۔ حرمین شریفین کی زیارت و آستان بوسی کا شرف حاصل کر کے بغداد کیطرف روانہ ہوا۔ بغدادیوں نے اُس کے کمال کا شہرہ و آوازہ پہلے ہی سن لیا تھا۔ حلقہ درس میں شامل ہونا چاہا۔ مگر خیام نے بہانہ کر دیا۔ کہ میں نے تحصیل و تدریس علوم کا قدیم مشغلہ بالکل ترک کر دیا ہے یہاں تک کہ مطالعہ سے بھی دل برداشتہ ہو گیا ہوں جب وطن واپس آیا۔ تو صبح و شام نماز با جماعت ادا کرتا تھا۔ زہد و اتقا بڑھ چلا تھا۔ بقیہ عمر بھی اسلامی اعتقادات میں بسر ہوئی۔ اور راستی کے مسلک سے اس کی طبیعت پھر کسی دوسری طرف مائل نہ ہوئی۔

خواجہ نظام الدین عروسی سمرقندی جو عمر خیام کی بزم فیض کا قدح خوار ہے۔ بیان کرتا ہے۔ کہ ایک روز مولانا عمر امام الحکما کے ساتھ تفریح کر رہے تھے۔ اثنائے گل فشانی میں ایک عجیب لہر وُسر میں اُن کے لبوں سے میں نے یہ سُنا "میری قبر ایک باغ میں ہو کہ بادشمال ہر موسم بہار میں اُس پر گل فشانی کرے اور میری خاک سے تازہ بہار پیدا ہو" یہ سُنکر مجھے بہت تعجب ہوا۔ لیکن مجھے اس بات کا علم تھا کہ بیہودہ بات وہ کبھی اپنے مونہہ سے نہیں نکالتے۔ ضرور اس کا کچھ نہ کچھ مطلب ہو گا۔ انکی طبیعت کسی ناممکن الحصول خواہش کا اظہار بھی نہیں کرتی تھی۔

تھوڑے دن بعد نیشاپور جانے کا اتفاق ہوا۔ اُسوقت مولانا عمر رحلت کر چکے تھے۔ میں نے اُن کی مرقد کو نظر بصیرت سے دیکھا۔ دیکھا کہ خیام کا گنبد ایک باغ میں گنجان درختوں کے جھرمٹ میں سر نکالے کھڑا ہے۔ اور میوہ دار درخت باغ کی دیوار سے دکھائی دے رہے ہیں۔ اور پھولدار پودے اپنی ٹہنیوں سے گل فشانی و نگس رانی کر رہے ہیں۔ بہت سے پھول اور کلیاں قبر پر بکھری پڑی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا قبہ ایک پھولوں کا گنبد ہے۔

ایک قصہ بہت مشہور ہے کہ خیام کی وفات کے بعد اُس کی ماں نے اُسے خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ حق تعالیٰ سے کیا معاملہ پیش آیا، جواب میں اُس نے یہ رباعی سنائی:-

اے سوختہ سوختہ سوختنۂ وے آتش دوزخ از تو افروختنۂ
تا کے گوئی کہ بر عمر رحمت کن حق را تو کہ برحمت آموختنۂ

ایک روز خیام نے محفلِ نشاط کے ایک گوشہ میں بحالتِ نشہ شراب کا پیالہ اپنے سر پر اونچا لیا پیالہ ٹوٹ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور شراب زمین پر گر پڑی۔ حالت مستی میں ادب کبریائی ہاتھ سے جاتا رہا۔ فوراً یہ رباعی رندانہ موزوں کی:۔

ابریق مۓ مرا شکستی ربی بر من در عیش بستی ربی
بر خاک فگندی مۓ گلگونِ مرا من مست نیم مگر تو مستی ربی

جب نشہ اترا تو اپنے کئے پر تائب ہوا اور فوراً معافی میں دوسری رباعی لکھی:۔

ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو آں کس کہ گناہ نہ کرد چوں زیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی پس فرق میانِ من و تو چیست بگو

عمر خیام کی زندگی اہلِ بصیرت و اربابِ نظر کے لئے ایک پند و نصیحت کی ضخیم کتاب ہے۔ اس کی حیات کا کوئی لمحہ عبرت و نصیحت سے خالی نہیں۔

مسعود علی بریلوی

مجھے نیند آتی ہے

آفتاب ابھی غروب ہوا ہی، جماعت کے پابند لوگ نماز پڑھ چکے ہیں، اور کچھ ابھی پڑھ رہے ہیں مکانوں میں چراغ روشن کئے جا رہے ہیں۔ تاریکیٔ شب نورِ شمع سے متبدل ہو چکی ہے اور میں بیخود ہوا جاتا ہوں کیونکہ مجھے نیند آتی ہے۔

جنوری کا شروع ہفتہ ہے، موسم سرما شباب پر ہے، فضائے کہر میں ہاتھ سے ہاتھ سوجھائی نہیں دیتا ہے۔ اعضا افسردہ ہوئے جاتے، لوگ اپنے مکانوں میں آگ کے گرد جمع ہو کر ہاتھ پاؤں سینک رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میں بھی آتشدان سے کچھ سردی کی تلافی کروں اور اس کی سرد کاکو انگیٹھی کی گرماگرمی سے محو کر دوں، لیکن کیا کروں، مجھے نیند آتی ہے۔

مجھکو بہت سے کام انجام دینا ہے۔ کچھ لکھنا ہے، کچھ پڑھنا ہے۔ اخبار میز پر پھیلے ہوئے ہیں کتاب کھلی رکھی ہے۔ قلم ہاتھ میں ہے۔ مگر مجبور ہوں کہ مجھے نیند آتی ہے۔

لوگ مجھ سے میری بے اعتنائی کا شکوہ کرتے ہیں۔ بعض میرے پس پشت میری بُرائی کیا کرتے ہیں۔ میرے متعارفوں کے ہر گروہ اور ہر جماعت میں اس کا عام چرچا ہے، اور اس کو میں خود بھی

محسوس کرتا ہوں مگر معذور ہوں کہ مجھے نیند آتی ہے۔

ہاں مجھ کو نیند آتی ہے۔ سر شام آتی ہے، بلکہ دن کو بھی اگر ہنگامۂ ہستی خلل انداز نہ ہو تو اپنے محدود لمحات حیات اسی عالم میں گزار دوں۔

میرے اس خواب کا فلسفہ کچھ میرے ہی قلب کے کیفیات سے متعلق ہے۔ مادی دنیا میں یہ نوعیت خواب اسباب گوناگوں پر مبنی ہو سکتی ہے۔ مریضان جسمانی جو ایک حد تک محروم خواب ہو چکے ہوں منت کش ادویہ ہو کر خواب سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ طفلان شیر خوار۔ ماد رضاعی کی راحت بخش لوریوں سے متاثر ہو کر مصروف خواب ہوتے ہیں۔ عالم شباب میں بھی بروئے طب۔ تولید خون اور حواس خمسہ وجملہ قوائے انسانی بحیثیت مجموعی صحیح طور سے فرائض کی انجام دہی ایک کیفیت پیدا کر دیتی ہے جو بجائے خود ایک ہلکی سی نیند ہے۔ ایک لطیف نیند ہے مگر مضطرب۔ ایک بیدار نیند ہے مگر بیتاب کن اسکے علاوہ بستر استراحت کے لوازمات خصوصی بھی ایک شبیہ خواب کے حامل ہوتے ہیں۔ دلپسند ہمخوابیوں کی تفسیر صاحبان کیف کیلئے نکہ بر جراحت ہے۔ اُن کے لئے نیند لانیوالی بہت سی دلکش باتیں ہیں، جس کا تصور ہم انہیں کی حس لطیف پر چھوڑتے ہیں

ہاں مجھ کو نیند آتی ہے! میری نیند، وہ دلخراش لفظ ہے جسکے معنی دکھے ہوئے دل کی تہ میں پنہاں ہیں۔ بالغ نظری سے مبالغہ کرنیوالے اس کو میری بیخودی و سرخوشی پر محمول کرتے ہیں۔ میری از خود رفتہ کاربائے خوداں اسرار لطیف کی منکشف ہیں۔ میری فراموشیاں خود ان پاکیزہ جذبات کی غماز ہیں۔ درد دل کا ایک لطیف اثر بیخودی ہے اور بیخودی میری دردمندیوں کی حریف ہو کر سوز ظنی کا باعث ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے جو میں بظاہر محو خواب ہوتا ہوں اور حقیقت میں "کسی" درد کا لذت کش!

میرے خواب کی تشکایت میں مزید اسرار چھپے ہیں۔ اس لئے میں تو ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ "مجھے نیند آتی ہے" فقط

ولی احمد خان ۔ جے پوری

جذبات

کیا سوز و ساز آج تری انجمن میں ہے
اک آگ سی لگی مرے ہر موئے تن میں ہے

اک تو کہ تیری قدر ہر اک انجمن میں ہے
اک میں کہ میرے واسطے غربت وطن میں ہے

نالے ہیں کس کے نغمۂ ساز طرب کے ساتھ
کیا کوئی "غم نصیب" تری انجمن میں ہے

اے ہمصفیر آج تو پہچانتا نہیں
کل ہم بھی اُس چمن میں تھے تو جس چمن میں ہے

جب یاد آگیا تو مرا دل تڑپ گیا　　اللہ کیا کشش مرے اُجڑے وطن میں ہے
ساحل پہ دیکھ کر تجھے لہریں تڑپ گئیں　　کیا حُسن بیقرار جبیں کی شکن میں ہے
تیری نگاہِ ناز کی اللہ رے شوخیاں　　جو شخص ہے خموش، تری انجمن میں ہے
ثاقب سے پہلے جس میں ہزاروں ہوئے تباہ
لو وہ فریب خوردہ اُسی انجمن میں ہے

[illegible]

غریب کسان

بیچارہ غریب کسان جو بقول سارے جگت کا ان داتا کہلاتا ہے۔ اپنی آرزوؤں میں سرگرداں اور قسم قسم کے خیالات و تفکرات میں غرقاب رہتا ہے۔ اِسے قلبہ رانی کے لئے اچھے اچھے بیل اور گائے بھینس کی تمنا رہتی ہے اور فصل کے بونے کے موقعہ پر بہترین غلہ اور بیج کی ضرورت۔ بیچارہ ہمیشہ شادی۔ بیاہ۔ موت کے حوادث و ہجوم رسوم میں خیالی پلاؤ پکاتا رہتا ہے۔ پھر مقدمات کی پریشانیاں تو اسے ایک منٹ کے لئے چین نہیں لینے دیتیں۔ بچوں کی تعلیم کی اسے چنداں فکر نہیں ہوتی۔ اس کی بیوی بھی انہیں جھمیلوں میں پھنسی رہتی ہو۔ اور غریب شوہر کو رائی بھر سہارا بھی نہیں دے سکتی۔ کیونکہ یہ دونوں جاہل مطلق ہیں +

شادی بیاہ موت اور غم اسے یکساں ستاتے ہیں۔ جہالت کی وجہ سے اکثر دیوانی کے پیادے تحصیل کے چپراسی اور تھانہ کے سپاہی بیطرح پیش آتے ہیں۔ اور پٹواری دیہہ سے تو اس کی رُوح فنا ہوتی ہے۔ جو گرداوری اور حد بندی کے جھگڑوں سے اسے فارغ نہیں ہونے دیتا۔ فصل کاٹنے کے بعد ساہوکاروں اور بنیوں کے ہاتھوں سے رہائی مشکل ہوتی ہے۔ پھر گاؤں میں خیرات دینے دلانے کا اندیشہ دامنگیر ہو جاتا ہے۔ غلہ جو تقدیر سے کسی سال زیادہ میسر ہو جائے۔ تو منڈیوں میں مارا مارا پھرتا ہے۔ اور جب قحط سالی ہو۔ امساکِ باراں نے ستایا ہو۔ تو ہر وقت اس کی منتظر نگاہیں آسمان کی طرف لگی رہتی ہیں۔ سردیوں میں اپنے لباس اور بال بچوں کے کپڑوں کی فکر ہے ساتھ ہی بیکاری بھی سر پر سوار۔ کیونکہ کاشت کے بعد اِسے کچھ کام زمینداری کا نہیں ہوتا۔ مجبوراً سرکار سے تقاوی لینے کے لئے ہر روز تحصیل میں جاکر محرر جوڈیشل یا قانون گو سے سر کھپاتا ہے۔ الغرض۔ "یک سر و ہزار سودا" کی مثل صادق آتی ہے کیوں نہ ہو۔ ساری دنیا کا رزق رساں جو ہوا۔ اسے فکر نہ ہو تو کس کو ہو۔ مگر اسے تعلیم کی طرف بھی ضرور متوجہ ہونا چاہیئے۔ تاکہ ایسے اچھے اچھے اناج بونے اور کاٹنے سے خاطر خواہ نفع حاصل ہو سکے۔ مقدمات کا غم [illegible]

اور تفکرات و سراسیمگی دور - اسے لازم ہے کہ سائینٹفک طریقہ سے جدید کاشت کاری کرے - کھیتوں میں آب رسانی کے لئے نئے وسائل نہروں اور بندوں کے بنانے سے مہیا کرے - اور حصول معاش کے ساتھ اسے کفایت شعاری خودداری اور خدا پرستی کی بھی تمیز ہوتی رہے - آجکل ساری دنیا اپنی آیندہ ترقی کیلئے میدان عمل میں گامزن ہو - مگر یہ انہیں پُرانے دقیانوسی خیالات کا دلدادہ اور پرانی لکیر کا فقیر ہے -

میر کریم الدین برق منشی فاضل -

خودکشی

کیا انسان بالعموم خودکشی کا حق رکھتا ہے ؟ یہ سوال ہی غلط ہو - اس مسئلہ میں حق کا تو کوئی سوال ہی نہیں - اگر وہ ایسا کرنے پر قادر ہے تو یقیناً اس کو اس کا حق بھی حاصل ہے " خودکشی کا امکان " خود معنی ہے - اس کے ہونے ہوئے آدمی کو یہ حق حاصل نہیں (حق کا یہ استعمال موزون ہے) کہ وہ اس زندگی کو ناقابل برداشت کہے - کیونکہ اگر زندگی کا بسر کرنا ناممکن ہے تو وہ آسانی کے ساتھ اس کو ختم کر سکتا ہے - لہذا کوئی شخص زندگی کو ناقابل برداشت نہیں کہ سکتا - کیونکہ اس کے لئے یہ ممکن قرار دیا گیا ہے - کہ وہ خودکشی کرے - حقیقت یہ ہے کہ انسان اس حق سے لڑائی عیاشی - شراب وتمباکو نوشی یا عادت افیونی کی صورت میں فائدہ اٹھاتا رہا ہے - سوال یہ ہو سکتا ہے آیا خودکشی کرنا معقول اور اخلاقی حیثیت سے مستحسن ہو کہ نہیں ؟ جواب مختصراً یہ ہے کہ ہرگز نہیں - بالکل غیر معقول - بلکہ یہ اتنا ہی غیر معقول ہے جتنا کہ ایک ایسے درخت کی ایک شاخ کی قطع و برید جسکو تباہ کرنا چاہتے ہیں شاخ کو کاٹنے سے درخت تباہ نہ ہوگا - بلکہ اس کی نشو و نما بے قاعدہ ہو جائیگی -

ہماری حیات بالکل غیر فانی ہے اور زمان و مکان کے اثر سے بالا ہے - لہذا موت صرف اس کی صورت و بدل سکتی ہے اور اس جہان میں اس کے مظہر کو کالعدم کر سکتی ہے - اول تو ہم کو اس کا علم ہی نہیں کہ اس جہان میں اس کے مظہر کو کالعدم کرنے سے حیات آیندہ میں اس کا مظہر اور بھی زیادہ لذت زا ہوگا - اور دوسرے اس طرح کرنے سے میں اپنے آپ کو ان تجارب و اکتساب سے محروم کر لوں گا - جو میں بذات خود اس جہان میں حاصل کر سکتا تھا - مزید برآں اس کے غیر معقول ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اپنی زندگی کے ظاہری آرام کی وجہ سے اس کے امتناع سے میں یہ ظاہر کرتا ہوں کہ اس زندگی کی غایت کی نسبت میرا خیال اصلیت کے بالکل برخلاف ہے کیونکہ اس طرح سے میں یہ فرض کرتا ہوں کہ زندگی کی غایت لذت ذاتی ہے - حالانکہ اس کی غایت ایک طرف تو تکمیل

ذاتی ہے اور دوسری طرف اس خاص مہم کی مدد کرنا جو کائنات کی مجموعی زندگی سرانجام دے رہی ہے۔ ان ہی وجوہ کی بنا پر خودکشی اخلاقی حیثیت سے مذموم ہے۔ زندگی من حیث الکل اور طبعی موت تک اس کے بسر کرنے کا امکان انسان کو صرف اس شرط پر عطا ہوئے ہیں کہ وہ کائنات کی حیات میں ممد ہے۔ جب تک زندگی لذت زا رہتی ہے۔ اس وقت تک تو انسان اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ جب یہ لذت سوز بنجاتی ہے۔ وہ فوراً کائنات کی مدد سے منہ موڑ لیتا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس مدد کی عین اس وقت ضرورت ہوتی ہے جب زندگی لذت سوز معلوم ہوتی ہے تمام کام شروع شروع میں زحمت ہی معلوم ہوتے ہیں ؛؛

جبتک آدمی میں زندگی ہے۔ وہ پہلے تکمیل ذات اور کائنات کی مدد کرسکتا ہے۔ مگر کائنات کی مدد اپنی تکمیل کی صورت اور اپنی تکمیل کائنات کی مدد کی حالت ہی میں کرسکتا ہے + (ٹالسٹائے)

جب کسی خوفناک و مدہش خواب کے دوران میں ہم انتہائے خوف و دہشت پر پہنچتے ہیں ۔ تو ہماری آنکھ کھل جاتی ہے۔ اور اس طرح وہ تمام مہیب شکلیں جو رات کی پروردہ ہوتی ہیں کالعدم ہوجاتی ہیں۔ ہماری زندگی بھی ایک خواب ہے۔ جب سب سے بڑی ہیبت کا لمحہ ہمکو اس کا جوا کندھے سے اتار پھینکنے پر مجبور کرتا ہے تب بعینہٖ یہی حالت ہوتی ہے + (شوپن ہوئر)

معتضد ولی الرحمٰن بی اے

ٹیگور کی خیال آرائیاں

تمہاری متجسس نگاہیں چاہتی ہیں کہ میرے جذبات مستور سے آشنا ہوجائیں ...... جس طرح چاند سمندر کی تہ تک پہنچنا چاہتا ہے ،

میں نے اپنے اسرار زندگی کو تمہاری آنکھوں کے سامنے عریاں کردیا ہے۔ اور کوئی بات چھپانے کی کوشش نہیں کی ...... یہی سبب ہے کہ تم مجھ سے انجان ہو۔

اگر وہ ایک موتی ہوتا تو میں اس کے ٹکڑوں کی مالا بنا کر تمہاری گردن میں ڈال دیتا۔ اگر وہ ایک

خوبصورت چھوٹا سا پھول ہوتا تو میں اسے شاخ سے توڑ کر تمہارے بالوں میں لگا دیتا... لیکن.... وہ تو "دل" ہے اسکا "ساحل" اور اس کی تہ کہاں ؟

تم اس سلطنت کے حدود سے ناواقف ہو مگر پھر بھی تم اس کی "ملکہ" ہو

(۲)

محبت پر اعتماد کرو خواہ وہ غم پیدا کرنے والی ہو کیوں نہ ہو، مگر اپنے دل کی وسعت محدود نہ کرو

آہ اے دوست نہیں تمہارے الفاظ تاریک ہیں اور میں انہیں سمجھ نہیں سکتا

مسرت ایک قطرۂ شبنم کی طرح نازک ہے کیونکہ
سورج کی کرنیں اُس کو فنا کر دیتی ہیں۔ لیکن غم
مضبوط اور دیرپا ہے.....
لیے ایک غمگین محبت کو اپنی آنکھوں میں بیدار ہونے دو
آہ اے دوست نہیں تمہارے الفاظ تاریک
ہیں اور میں اُنہیں نہیں سمجھ سکتا۔

نیلوفر ضیائے آفتاب میں کھلتا ہے اور جو کچھ اس
کے پاس ہے وہ کھو دیتا ہے۔ موسم سرما کے مستقل
کہرے میں اس کا غنچہ باقی نہیں رہتا۔
آہ اے دوست نہیں تمہارے الفاظ تاریک
ہیں اور میں اُنہیں نہیں سمجھ سکتا۔

سیّد ابو محمد ثاقب کانپوری

یورپ پر عربوں کے احسان

جن لوگوں کی قابلیت اور تحقیقات نے بنی نوع انسان کو عظیم الشان فائدے پہنچائے ہیں خدا کی شان اُن کی قسمت میں یہ بھی لکھا تھا کہ ان کے ہم عصر ان کی دیدہ ریزیوں کا استخفاف کریں یا ان کو غلط سمجھیں۔ مگر کئی مثالیں ایسی ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنے والی نسلوں نے انکی بیش بہا اور اہم خدمات کا اعتراف کر کے حق شکریہ ادا کیا۔ عرب بھی اس قسم کے سلوک سے نہ بچ نہ سکے۔ معدودے چند مشہور مستشرقین کے سوائے ازمنۂ حال نے ان کی اشاعت و ترویج علوم کے شوق و سرگرمی کا احسان مند ہونے کے بجائے انہیں نہ صرف دل سے ہی بھلا دیا۔ بلکہ عربوں پر اُلٹا یہ الزام دیا۔ کہ انہوں نے لٹریچر کو بگاڑا اور اس کے زوال کے باعث ہوئے۔ جب علم ادب از سر نو تازہ ہوا۔ تو ادبا نے جن میں پٹرارک بھی شامل ہے۔ اپنا شعار بنا لیا۔ کہ ان کو علوم و فنون کا بگاڑنے والا اور ایک سنگدل اور وحشی قوم اور علوم شائستہ کا دشمن سمجھیں۔ گذشتہ اوراق بتا دینگے کہ ازمنہ مابعد کے مورخین نے یہ سنگین الزام ان کے سر پر تھوپنے میں کس قدر ناانصافی برتی۔ کئی خلفا نے اہل قلم کو اپنی حمایت و سرپرستی میں لیا۔ علما اور فضلا کو اعزاز و عطایا سے سرفراز کیا۔ ان کی تصنیفات ان کے بیشمار مدارس اور اساتذہ۔ ان کی عالیشان عمارات۔ یہ سب باتیں شاہد ہیں۔ کہ اگر ہم انہیں یونانیوں اور رومنوں کا ہم پلہ کہیں۔ تو کچھ بیجا نہیں۔ یہ تو فوراً مان لیا جاتا ہے۔ کہ دونوں مؤخر الذکر قومیں عربوں پر سبقت لیگئی ہیں۔ گو دونوں قومیں اوج کمال میں رومنوں کا ہم پلہ ہونے کا دعوے کرتی ہیں۔ حالانکہ اہل روما تو صرف لٹریچر ہی میں شہرۂ آفاق تھے۔ اور اوّل الذکر نے طب۔ تاریخ۔ ہیئت اور ریاضی میں نہایت کامیابی کے ساتھ ترقی کی لیکن لٹریچر میں اہل روما کے اعلیٰ فوقیت کو یعنی ان کے لیوی۔ سائسرو۔ ہوریس۔ ورجل ٹرینس کو دیکھ کر ہم عربوں کے اکتساب علوم کی قابلیت کو بھول جاتے ہیں۔

ہم ابھی دیکھ چکے ہیں۔ کہ عربوں نے کس سرگرمی اور ذوق و شوق سے علوم و فنون حاصل کئے مگر ہم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا۔ کہ موجودہ زمانے پر ان کے لٹریچر کا کیا اثر ہوا۔ اس لئے اب یہ بتانا باقی ہے۔ کہ یورپ والے کہاں تک ان کے شرمندہ احسان ہیں۔ نہ صرف اس لحاظ سے کہ عربوں کے علم و ادب کا لٹریچر اور سائنس کے احیا و نشر پر کیا اثر ہوا۔ بلکہ ان ایجادات و انکشافات کے لحاظ سے بھی جن کی وجہ سے ہم عربوں کی دانشمندی اور جان کاہی کے خاص طور پر مرہون ہیں۔

جس وقت عرب لٹریچر فنون اور علوم کی اشاعت و ترقی میں مصروف تھے۔ اس وقت اور خصوصاً ساتویں صدی سے گیارہویں صدی تک یورپ سخت ترین جہالت میں ڈوبا ہوا تھا۔ صرف مذہبی علوم ہی پڑھائے جاتے تھے۔ یونان والے اقلیدس اور بطلیموس کو پڑھنا چھوڑ بیٹھے تھے۔ اور خود لاطینی اپنی قدیم زبان بھلا بیٹھے تھے۔ عیسائیوں کے مدارس صرف انہی سوالات سے گونج رہے تھے۔ جو گریگوری کے گیت یا ایسٹر منانے کے ٹھیک وقت کی بحث کے متعلق تھے۔ مگر افریقہ سپین اور سلطنت ہائے نیپلز و صقلیہ کے عرب تمام علوم و فنون کی تحصیل و نشر میں ہمہ تن مصروف ۔ اور یونان والوں کے باقیماندہ علم کو سینوں سے لگائے بیٹھے تھے۔ یہ افریقہ اور سپین کے مسلمان ہی تھے۔ جنہوں نے یورپ کو اس وحشیانہ جہالت سے نجات دلائی۔

تمام مؤرخ بالاتفاق شاہد ہیں۔ کہ نویں صدی میں سپین میں قریب قریب ہر علم و فن کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مسلمانوں نے اس ملک کو بزور بازو فتح کیا تھا۔ اس لئے سپین والوں کو اس کے سوائے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ کہ اپنے فاتحان کا لٹریچر اختیار کر کے اس کی تحصیل و اشاعت میں مصروف ہوں۔ تھوڑے ہی عرصہ میں وہ عربی کتابوں کے مطالعہ میں اس سرگرمی سے مصروف ہو گئے۔ اور مسلمانوں کے علم اور زبان حاصل کرنے کا شوق انہیں اس قدر دامنگیر ہو گیا۔ کہ اپنی لاطینی زبان کو گلدستہ طاق نسیان بنا دیا۔ بلکہ کئی ایک نے تو عیسائی مذہب کو بھی خیرباد کہہ دیا۔ الورو قرطبی جو نویں صدی میں گزرا۔ اپنے ہموطنوں کو عربیت کا اس قدر دلدادہ دیکھ کر شکوہ کرنے لگا۔ آخر کار عربی زبان اس قدر رائج ہو گئی۔ کہ جان سوائیلی نے جو اپنی تبحر علم سے بھی زیادہ اپنی پاکبازانہ زندگی کی وجہ سے مشہور تھا۔ ضروری سمجھا کہ اپنے اہل وطن کے استفادے کے لئے کتب مقدسہ اور ان کے کیتھولک شرح کو عربی زبان میں شائع کرے۔ چند سال بعد یہ حال ہو گیا۔ سپین کے گرجاؤں میں استعمال ہونے کے لئے مذہبی احکام کا مجموعہ عربی زبان میں تیار ہوا۔ یہ مجموعہ اسکوریل کے کتب خانہ کے قلمی نسخوں میں اب تک موجود ہے۔

[redacted]

مگر چہ عربوں اور سپین والوں کا یہ علمی تعلق بعض حالتوں میں ان کے مذہب کے لئے مہلک ثابت ہوا لیکن بحالت مجموعی ساری قوم کے لئے مفید اور کارآمد ثابت ہوا اسلئے اُسے موجودہ لٹریچر کا سنگ بنیاد سمجھنا چاہیئے دسویں صدی میں پہلے جسے خاص طور پر وحشت اور جہالت کا زمانہ ہونے کا طعن دیا جاتا ہے۔ سپین کو یہ فخر حاصل تھا کہ وہاں کئی ممتاز ریاضی داں موجود تھے مثلاً اوسونا کا بشپ آیمن۔ بارسلونہ کا لوپیو جو علم ہیئت کا بڑا ماہر تھا اور ایک شخص جوزف نامی جو علم ہندسہ میں مشہور تھا اور ان کی اس قدر شہرت تھی۔ کہ فرانسیسی اطالوی۔ انگریز۔ اور جرمن علوم صحیحہ سیکھنے کے لئے سپین میں ہی آتے تھے۔

پہلا فلاسفر جو اس غرض کے لئے اس جزیرہ نما میں آیا۔ وہ شہرہ آفاق جربرٹ تھا۔ اور سلوسٹر دوم کے نام سے مشہور تھا۔ اپنی تبحر علم اور قابلیت کی وجہ سے پوپ کے اعلےٰ رتبہ پر پہنچ گیا تھا۔ شوق علم نے اس عجیب غریب شخص سے تھوڑی عمر میں ہی وطن چھوڑا دیا۔ اور اسی شوق میں بڑی بڑی مصیبتیں جھیلکر یورپ کے بڑے حصہ کا سفر کیا۔ مگر صرف سپین ہی ایسا ملک تھا۔ جہاں اسے گوہر مقصود ہاتھ آیا۔ قرطبہ ہی میں ان کی ریاضی دانی کی خداداد قابلیت کی تکمیل اور تحصیل علوم کی آرزو برآئی۔ چونکہ تعلیم دینے کا بھی ایسا ہی شوق تھا۔ جیسا علم حاصل کرنے کا۔ اس لئے اس نے واپس آکر دو مدرسے جاری کئے۔ ایک تو اٹلی میں بمقام بوبیو اور دوسرا فرانس میں بمقام ریمز۔ اور جیسا کہ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں۔ یہی پہلا شخص تھا۔ جس نے مغربی یورپ کو عربوں کا صفر سکھایا۔ جربرٹ کے دونوں مدارس میں۔ لوگ جوق درجوق آتے اور علم فلسفہ کی ترقی میں حصہ لیتے تھے چرٹرس کا بشپ مشہور و معروف فلبرٹ بھی جربرٹ کا ہی شاگرد تھا۔ اور اُس نے تمام علوم ریاضی اسی سے حاصل کئے تھے۔ اپنے شاگرد شاہنشاہ آتھو سوم کے رسوخ سے پاپائیت کے اعلیٰ رتبہ پر پہنچ کر بھی اسے علم کا شوق دامنگیر رہا۔ اور قلمی نسخوں کی فراہمی اور عالموں کے ساتھ فیاضانہ سلوک کرنے میں بے حد روپیہ صرف کرتا رہا۔ اس کے معلومات اور بالخصوص صنائع قدرت کے معلومات اس قدر وسیع تھیں۔ اور زمانہ جاہلیت کی آنکھوں کو ایسی عجیب و غریب معلوم ہوتی تھیں۔ کہ لوگ اسے بنی نوع انسان سے بالاتر جانتے تھے۔ اور یہ سمجھتے تھے کہ اس کا فرشتوں کے ساتھ تعلق ہے۔ اسکے مکتوب جن میں سے ایک سو اکسٹھ اب تک موجود ہیں۔ طبعی فلسفہ کے کئی عجائبات سے پُر ہیں۔ اور اس میں کلام نہیں۔ کہ اس کی تصنیفات نے نویں اور دسویں صدی کی تاریکی دور کرنے میں بڑا حصہ لیا۔

جربرٹ کی مثال اور اس اعزاز سے جو اس کے علم اور خداداد قابلیت کی وجہ سے اسے حاصل ہوا کئی اور تشنگان علم ہمت پاکر اور اس کے نقش قدم پر چل کر ان ممالک میں گئے۔ جہاں بحر علم موجزن تھا۔ لکھ۔ جو لوگ علم حاصل کرنے کے آرزومند ہوتے اور علماء و فضلاء کو [illegible]

ان کے عربی زبان سیکھنا ضروری ہوتا تھا۔ تاکہ عربی کتابوں کو سمجھ سکیں۔ اور دوسری عام مروّجہ زبان میں ان کا ترجمہ کر سکیں۔ موں ٹکلا کہتا ہے۔ کہ کئی صدیوں تک یہ حال رہا۔ کہ جن لوگوں نے ریاضی میں اعلیٰ ترین شہرت حاصل کی تھی۔ انہوں نے بھی عربوں سے یہ علم سیکھا تھا۔ اٹلی والوں میں گیرارڈ ہوڈی کریمونہ نے فلسفہ اور ہیئت طلیطلہ میں سیکھا۔ اور اطالوی زبان میں بطلیموس کے المعسطی اور الرازی اور بوعلی سینا کی طبی کتب کا ترجمہ کیا۔ جو انگریز گیارھویں صدی میں سپین آئے ان میں باتھ کا بینی ڈکٹائن راہب ایڈیلرڈ نامی نہایت مشہور تھا۔ اس نے عربوں سے علم طبعی اور ریاضیات سیکھے۔ اور اقلیدس کے اصول اور دوسری یونانی کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس کے بعد کی صدی میں ڈینیل مورلے جو نورفاک کا باشندہ اور آکسفورڈ اور پیرس کے دارالعلوموں کا تعلیم یافتہ تھا۔ سپین میں آیا۔ اور طلیطلہ میں ریاضیات اور عربی سیکھی۔ جرمنی میں فرینکنین کا باشندہ آکتھو اور اٹلی کے شاہنشاہ فریڈرک دوم نے کئی عربی کتابوں کے خود ترجمے کئے اور دوسروں سے بھی کروائے

باقی باقی فقیر سید نجم الدین

عیّار جُلاہا

سلطنت جن لوگوں کے خیال میں تمام تمناؤں کا مدعا اور آرزوں کا منشا ہوسکتی ہے۔ وہ یہ سنکر حیران ہونگے کہ تاجور سر بسا اوقات عجیب و غریب حسرتوں کا مرکز ہوتا ہے۔ کامراں ایک عظیم الشان بادشاہ کو جامہ زیبی کا سودا تھا ہر قسم کے لباس۔ قیمتی سے قیمتی پوشاکوں اور اعلیٰ ترین خلعتوں سے بھرے ہوئے بقچے اُس کے سنگھار گھر کی زینت تھے۔ مگر اُس کی ہوس جامہ زیبی ہوس جہانگیری کی طرح بڑھی ہوئی تھی وہ اس ہوس کا پشمینہ پوش فقیر تھا۔ وہ ایک ہوشیار رفوگر کی جدت پسند مبالغہ آمیزی کا شہید تھا۔ ایک عیار خیاط کی دلربا طلسم کاریوں کا مفتون تھا

کونسل کے کمرہ میں جب وزراء سلطنت کے اندرونی نظام کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش میں مستعدی سے سرگرم مباحثہ ہوتے تھے۔ تو خسرو گیتی پناہ کے بلند پرواز تخیلات اُس وقت نئے نئے ملبوسات کے دامن و گریباں میں اُلجھے ہوتے تھے۔ فرائض سلطنت اور کاروبار مملکت کی سب دلچسپیاں نگارخانۂ لباس کے طلسمات کی رہن تھیں آپ کے وقت کا زیادہ حصہ ڈریسنگ روم میں گذرتا تھا۔ وزیر اعظم اور مختلف محکمہ جات کے سکرٹری اکثر یہ جواب پاکر شرف پائے بوس کو ترستے ہوئے مجلس سے رخصت ہوتے تھے۔ کہ سرکار عالی ناظم پوشیدنیات کو شرف باریابی عطا

[redacted]

زمانہ سے ہیں۔ یہ شوق جنون کی حد کو پہنچ گیا تھا۔ اور خیالات کی طرح آپ کی عقل بھی حریر اور اطلس کے زرتار پردوں کی تہوں میں رہنے لگی تھی۔

آہ کتنی شرمندگیاں ہیں جو افراط و تفریط کے لباس کی دھجیاں اڑانے کو پیدا کی گئی ہیں۔ اور کس قدر ناکامیاں ہیں جو ناعاقبت اندیش تمناؤں کو پامال کرنے کے لئے موجود ہیں۔

ناگہاں سلطنت کے ایک گوشہ سے ایک ہنرپرور زرباف کی آواز اٹھی اور حکومت کے ایوان ہزار ستون تک گونج گئی۔ کامراں کو اطلاع ہوئی کہ چرخ بافندگی کا ایک فلک نورد ستارہ افق مغرب سے نمودار ہوا ہے جو ہر بات میں دنیا سے نرالا ہے۔ ستارہ ہے مگر آفتاب کے رخ پر نہیں چلتا مرغ قبلہ نما ہے مگر مشرق کو سجدہ کرتا ہے سیاہی کو سفیدی پر ترجیح دیتا ہے۔ اور رات کو دن پر۔ نور کا قائل نہیں۔ تیرگی پہ مٹا ہے۔ غرضیکہ اُس کی بات بات دنیا سے انوکھی ہے۔ اُس کا دعویٰ ہے کہ وہ اس قدر محیر العقول لطافت سے کام لیکر نفیس اور باریک پارچات بُن سکتا ہے جو صرف فرض شناس آنکھ ہی دیکھ سکتی ہے۔ اور وہ لوگ جو اپنے عہدے کے لئے نہایت ناقابل ہیں یا انسانی حماقت کی ذلیل ترین مثال ہیں۔ اگر خردبین سے خردبینی اور سکاٹ لینڈ یارڈ کے جاسوس سے تجسس مستعار لیں تو بھی اُس کپڑے کو نہیں دیکھ سکتے۔

بافندہ نواز بادشاہ نے حیرتناک مسرت سے یہ باتیں سُنیں اور اُس رات وہ بہت مختلف خیالات لیکر پلنگ پر گیا۔ یہ بالکل سچ ہے کہ اُسے اپنے وزیر اعظم پر پورا بھروسہ تھا۔ وہ اُس کا قدیم خیر اندیش اور پرانا نمکحلال ملازم تھا۔ معاملہ فہمی اور مصلحت ملکی میں اُس کا پایہ سب سے بلند تھا۔ کوئی وجہ نہیں کہ وہ وزیر خارجہ اور وزیر جنگ ضرور وفادار سرکار اور خیر خواہ دولت تھے۔ اُن کی اہلیت میں بھی کون شک کر سکتا تھا۔ مگر نہیں کیا ضرورت تھی ابھی سے کسی شخص کے متعلق رائے قائم کر لینے کی۔ لباس شاہی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردیگا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کسی شخص کے نہاں خانۂ دل کے پوشیدہ ترین پردوں میں کیا کیا جذبات متمکن ہیں۔ ایوان کے وزراء دربار کے امیر۔ فوج کے افسران اور اعلیٰ و ادنیٰ طبقات کے خدمتگذار ایک ایک فرد کے متعلق بہر حال معلوم ہونا ضروری تھا۔ کہ کون کون اپنے عہدے کے ناقابل ہیں اور ناحق سلطنت کے آئے دن کی مالی مشکلات میں اضافے کا باعث ہو رہے ہیں۔

مقدس جلاہا حسب الطلب پانچ وہ شاگردوں سمیت اس شان سے قدردان کامراں کے
[illegible]

لاثانی پوشاک تیار کر سکتا ہوں کہ عالم مثال میں جس کی نظیر نہیں مل سکتی لیکن وہ لوگ جو اپنے عہدے کے قابل نہیں یا جو احمق ہیں اُسے نہیں دیکھ سکتے ۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

بادشاہ نے اُس کے فن کی تعریف کی اور ایک درباری نے اُسے رُوحانیت کا آفتاب کہا اُس کے ایک شاگرد کی حیرت میں ڈال دینے والی فصاحت نے وزیر اعظم جیسے زبردست مقرر سے خراج تحسین وصول کیا اور دوسرے شاگرد نے بڑھکر بادشاہ کی لمبی سفید ڈاڑھی کو ہاتھ میں لیکر قسم کھائی اور کہا لباس وہ بے نظیر تیار ہوگا کہ تاریخوں میں یادگار رہے گا۔

غرض ریشمیں شالیں۔ حریر اطلس۔ کمخواب۔ مخمل اور زربفت کے تھان۔ مرصع و مکلل زرتار طلا۔ چیدہ چیدہ جواہرات۔ بیش قیمت زمرد۔ انمول موتی اور لاثانی پکھراج شاہی خزانوں اور توشہ خانوں سے نکل کر بافندگانِ باکمال کی نذر ہوئے اور تینوں اُستادانِ فن اِس کاروبار لطافت میں انتہائی انہماک سے مصروف ہوگئے ۔

پارچہ باف کی لطیف کارگزاری کی خبریں دم بدم بڑی آب و تاب سے بادشاہ کو پہنچتی تھیں۔ محل کے ملازم کہتے تھے حضورِ عالی۔ اُستاد جب فرصت کے وقت کارگاہ سے باہر آتے ہیں۔ تو اپنے ہاتھوں کو چوما کرتے ہیں۔ کہتے ہیں ایسی لاجواب پوشاک طیار ہو رہی ہے۔ کہ قدسیانِ عالمِ بالا اگر دیکھ پائیں تو زہرۂ فلک کے لئے چھین لے جائیں اور بادشاہِ سلامت یہ باتیں سنکر دوچند کھانا کھاتے تھے

کامران کو اضطراب آمیز حسرت تھی کہ وہ جلد سے جلد اس فنِ لطیفہ کا قابل قدر کمال بچشم خود ملاحظہ کرے۔ اُسکے بڈھے دل میں اس خلعتِ جواہر نگار کے لئے ایسی مضطرب تڑپ موجود تھی جو کسی قسمت نصیب جوان کے ضبط میں پوشیدہ ہو سکتی ہے۔ مگر افسوس کتنی ہستیاں ہیں جو دنیا میں اپنی کمزوریوں سے آگاہ نہیں۔ اُسے ڈر تھا۔ کہ اتفاقاً بادشاہ کے گھر میں پیدا ہو جانے سے ضروری نہیں کہ عالمِ بالا کی بادشاہی میں بھی وہ مسندِ تاج کے لئے قابل اور مقبول تجویز کیا جاتا ہو۔ اُسے ہمسایہ سلطنت کے ایک گستاخ اخبار کے چند ناخوشگوار الفاظ بھی یاد تھے جو اتفاقاً چھوٹی شہزادی کی لائبریری میں نظر سے گذرا تھا۔ اور گو اُس نے نہایت قابل نفرت مبالغے سے کام لیا تھا۔ مگر وہ خوب جانتا تھا کہ درحقیقت وہ وزیر مال کی اقتصادی تقریروں میں چنداں دلچسپی نہیں لیتا۔ ہاں یہ فقرات زمین و آسمان کی ملامت کے قابل ہیں کہ کامران کو بین الاقوامی قوانین اور عہد ناموں سے بالکل واقفیت ہی نہیں یا یہ کہ وزارت عظمیٰ کی ناچیز خواہشات اور فضول مطالبات کو علانیہ تسلیم سے بغیر نکتہ چینی اور بلا حرف گیری کے منظور کر لیتا ہے۔ مگر اس کی یہ

نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ صدر اعظم کی تقریروں کو سمجھ نہیں سکتا تھا۔ یا کہ اُن کی تردید کی قابلیت نہیں رکھتا تھا۔ درحقیقت وہ اُس کی جادو بیان فصاحت اور شاندار و پُرشکوہ الفاظ کی دل سے قدر کرتا تھا

دنیا میں ایسے بہت سے خوش اعتقاد موجود ہیں جن سے آپ کہدیں کہ اگر آپ بیوقوف نہیں تو اس کھڑکی میں سے گذر جائیے تو وہ خواہ مخواہ احتراز کرینگے اور اگر گذر نا گزیر ہے تو کسی زیادہ بے باک لیڈر کی لبیک کا انتظار کرینگے۔ درحقیقت عقل کو ایسی خطرناک آزمائش میں ڈالنا ہی عقل کے خلاف ہے یہی باعث تھا کہ کامران نے وزیراعظم کو اپنی شہرہ آفاق قابلیت کے باعث کارگاہِ پارچہ بافی کے ملاحظہ کے لئے منتخب کیا۔

وزیراعظم بیخوف اُس کارخانہ میں پہنچ گیا جہاں عِلم باغندگی کا مشہور اُستاد اپنے لائق تلامذ کی معیت اپنی رُوح سے زیادہ پاکیزہ اور روحانیت سے زیادہ لطیف لباس کا کپڑا بن رہا تھا۔ انہیں اپنی قابلیت کا یقین تھا۔ اور دماغ میں یہ حقیقت بھی روز روشن سے زیادہ واضح تھی کہ قلمدانِ وزارت احمق کی تقدیر کا حصہ نہیں ہو سکتا لیکن اگر حضرت اکبر مرحوم کے خفیہ پولیس نے کمر کا سُراغ لگا لیا ہوتا۔ تو جناب صدر اعظم کی باریک بین حسرتیں بھی یہ نہ کہہ اُٹھتیں کہ

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں

دل میں کہہ رہا تھا۔ اوخدا کیا میں اپنے عہدے کے قابل نہیں ہوں کیوں یہاں تو کچھ نہیں۔ مجھے تو کپڑے کا ایک تار نظر نہیں آتا کمبخت جلاہے کے اوزار سب خالی دکھائی دیتے ہیں۔ آہ یہ بدمعاش کس قدر تیزی سے ہاتھ پاؤں چلا رہا ہے۔ افسوس کیا سرکار عالی سمجھینگے کہ نا قابل وزیراعظم ہوں؟ کیا لوگوں کی رائے کہ میری قول و فعل میں موافقت نہیں۔ میری زبان کو دل سے تعلق نہیں صحیح ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ میں نہایت شاندار تقریروں میں بارہا ایسے ذلیل اور مذموم الزامات کو غلط ثابت کرچکا ہوں۔ افسوس۔ کیا مخالف پارٹی زبردست ہو جائیگی دنیا کیا کہیگی۔ اس طلسم ہوش رُبا نے میرے حواس باختہ کر دیئے ہیں اور حیرت ..... مگر میں اپنے دشمنوں کو خوش ہونے کا موقعہ نہیں دونگا۔ میں جگ ہنسائی نہیں کرونگا میں اس پیش پا افتادہ حقیقت کا انکشاف نہیں کرنے کا۔

خدا جانے وزیراعظم دل ہی دل میں کیا کہہ گیا ہوگا۔ اور اُس کا پریشان تخیل جانے کہاں کہاں بھٹک گیا مگر آخر کار جلاہے کے شاگرد کی بے مثال فصاحت نے اُسے چونکا دیا جو حیرتناک جادو بیانی سے اس تمام وقت میں اُس لاہوتی لباس کے چند نا تمام ٹکڑوں کی موہوم لطافت پر شاندار بحث کر رہا تھا۔ وہ چمنستانِ بیان کا ایک شکر شکن طوطی تھا جس کی منقار رہا غت آب حیات سے مصری کی ڈلیاں استعار

لے رہی تھی۔ ستم ظریف کارگاہ کے اوزاروں کے درمیان خلا میں انگلیاں دوڑا کر لباس کی مختلف چادروں کی لطیف نفاست کی تعریفیں کر رہا تھا۔ اُس نے ہاتھ اٹھا کر کہا دیکھئے یہ دربار کی زریں قبا ہے۔ اس لاجوردی رنگ میں کیسی خوبصورت جھلک ہے۔ اس کے مطلا حاشیے کس اعلیٰ مُناسبت اور موزونیت سے بُنے گئے ہیں۔ یہ نیلم کی جھالر کیا ہی بہار دے رہی ہے۔ اور صدرِ اعظم نے جسکی محققانہ موشگافیاں ایک عالم سے خراجِ ستائش حاصل کر چکی تھیں۔ مجبوراً وقار کے ساتھ جواب دیا کہ واقعی شاندار ہے۔

بلیت
وزیرِ اعظم نے سرِ دربار لباس کی تعریف میں دادِ فصاحت دی۔ اور بادشاہ نے بطورِ اعتراف قابلیت اُسے چند معزز خطابات سے سرفراز فرمایا۔ دوسری روز دربار کے مختلف امراء و وزرا نے کارخانہ کا ملاحظہ کیا اور جلاہے کے کمال کی کثرت سے تعریفیں ہوئیں۔ اتفاقاً وزیرِ مال اور وزیرِ خارجہ میں دلی صفائی نہ تھی۔ اور ہر ایک کا عداوت نواز باطن دوسرے کے بغض و حسد کا امانتدار تھا۔ وزیرِ خارجہ نے جو بڑے مبالغے سے موہوم لباس کی تعریفیں کرتے ہوئے حاضرین پر اپنی اہلیت کا اثر ڈال رہا تھا اپنے مخالف کو سرنگوں خاموشی کی حالت میں کھڑا دیکھ کر پوچھا حضرت آپ کیوں خاموش ہیں؟ وزیرِ مال نے کہا جنابِ عالی۔ میں مسرت آمیز تعجب سے سوچ رہا تھا کہ ایسے خوبصورت فن کی ایجاد کے بعد اقتصادی پہلو سے ہمارے محکمے کی مشکلات کا ایک حد تک ازالہ ہو جائیگا۔ اُس نے دل میں کہا۔ بدمعاش یہ بھی پیری طرح نکما ہے۔ میں نے ایسا ذلیل جھوٹ بولنے والا دنیا میں نہیں دیکھا۔

اب بھلا بادشاہ میں کہاں تاب تھی کہ وہ اِس جواہر نگار حسن کے دیدار سے محروم رہتا۔ ایک مکمل جلوس کے ساتھ شاہِ ذیجاہ کارگاہ میں رونق افروز ہوئے۔ جلاہے کے شاگردوں نے عنقا صفت لباس کے مختلف جوڑے دکھائے۔ وزیروں مشیروں اور مصاحبوں کی قدر افزا ستائش سے کارخانہ گونج اُٹھا ادنیٰ طبقہ کے ملازمان نے تو واہ وا اور سُبحان اللہ کا وہ شور مچایا کہ الاماں۔ الحفیظ۔ عیار جولاہا تسلیم حمیت سے دوہرا ہوا جاتا تھا اور انہیں اپنی قابلیت اور لیاقت کے لئے مبارکباد دے رہا تھا۔ بادشاہ سلامت عجیب حیرت سے ایک ایک کا منہ تکتے تھے۔ اور مقابلے میں ہر ایک آدمی مودبانہ تسلیم بجالا کر لباس کی تعریف کر دیتا تھا۔

بادشاہ کو کافی رنج تھا کہ اس کی عقل و فراست کے دیدے بے نُم ہو گئے۔ اور نا اہلیت کے پردوں نے اُسے اس قدسی اساس لباس کی دیدہ نوازی سے محروم رکھا۔ مگر کیا بظاہر اُس نے اِس رنج کا اظہار کیا؟ نہیں پہلے تو وہ کافی دیر تک خاموش [illegible]

میں برمحل ثابت ہوئی۔ مگر اس کے بعد وہ یکایک چونکا چند موزوں اور مناسب الفاظ میں لباس کی عمدگی
اور نفاست کی تعریف کی جلاہے کے لطیف کمال کی داد دی اور اُسے تلطف آمیز کلمات سے مخاطب
کرتے ہوئے انعام و اکرام سے سرفراز فرمایا۔

دنیا کا کونسا مسخرہ ہے جو اس ستم ظرافت کی داد نہیں دیگا کہ جلاہے کی مودبانہ التجاؤں نے کامران
سے اس امر کی رضامندی حاصل کرلی کہ اس نورانی لباس میں ملبوس ہو کر شاہِ کجکلاہ ایک عظیم الشان
جلوس کے ساتھ شہر کے آباد ترین حصوں میں گلگشت فرمائیں تاکہ اُس کے فن کو زیادہ فروغ حاصل
ہو اور اُس کی شہرت عوام الناس سے بھی دادِ کمال کا خراج وصول کرے۔

وزیر مال کی مستعدی بزار آفریں کے قابل ہے کہ چند ہی روز میں جلوس کا اہتمام شاندار تکمیل کو
پہنچ گیا۔ راستوں اور سڑکوں پر سُرخ مخمل کا پا انداز فرش بچھ گیا۔ دورویہ ایستادہ ہونیوالی فوجوں اور
جلوس کے علمبردار، چوبدار، اور خدام کے لئے شاہی خزانے سے بیش قیمت زرندوزی وردیاں اور
زرنگار جوڑے تیار ہوئے۔ محکمہ تصریفات نے نہایت بیدردی سے لاکھوں روپے خرچ کئے اور
دنیا کے امرا وزرا اور صوبجات کے گورنروں نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر پرشان و شکوہ لباس اور
اسٹاف اور باڈی گارڈ فوجوں کے لئے بہترین وردیاں بنوائیں۔ شہر کی رعایا نے بھی جلوس کی رونق
کو بڑھانے میں کافی دلچسپی سے حصہ لیا۔ اور نادار مفلوک غریبوں کو جنونِ جامہ زیبی کے صدقے خزانہ
عامرہ سے حسب مدارج حیثیت عمدہ پوشاکیں عنایت ہوئیں۔

مبارک دن بھی آپہنچا۔ شاہی محل کے ایک پُرتکلف ڈریسنگ روم میں بادشاہ سلامت ایک
طلائی کرسی پر جلوہ گر ہیں۔ باہر دارالسلطنت اپنی شان میں شہر شداد کا مقابلہ کر رہا ہے۔ اور فوجوں
کی زرق برق وردیاں۔ شرفا کی بیش قیمت پوشاکیں امرا کے زرتار لباس اور ارکانِ سلطنت کے
چوبکار خلعت اپنی شاندار چکاچوند سے ایک ممتاز نظارہ مسرت پیدا کر رہے ہیں۔ روحانی جلاہے اور
اُس کے شاگردوں نے مسرور مستعدی کے ساتھ چند خوبصورت صندوق اور بقچے کھولے اور نورانی
لباس کے مختلف حصے نکال نکال کر طلائی کھونٹیوں پر لٹکائے۔ بادشاہ نے پہلا لباس اتار ڈالا جب
جس کے متعلق جلاہے کے روشن دماغ شاگردوں نے کہا کہ اب اُس کی قدر کاسۂ سر فغفور کی طرح ٹھیکری
کے برابر بھی نہیں۔ جلاہے نے اپنے شاگردوں کی مدد سے ایک قد آدم آئینے کے سامنے درجہ بدرجہ
بادشاہ کو لباس پہنانا شروع کیا۔ اُس کے ہاتھ متانت نواز آسائش کے ساتھ آہستہ آہستہ
بادشاہ کے جسم کے مختلف حصوں پر لباس کی سلوٹوں کو صفائی کے ساتھ درست کر رہے تھے لباس

مکمل ہوگیا۔ تاج شاہی سر پر رکھا گیا۔ اور کمر بند مرصع اور بازو بند مروارید کی مبالغہ آمیز تعریف ہوئی کامران کو آئینے کے سامنے آگے پیچھے دائیں بائیں پھرا کر جلاہے نے لباس کی برجستگی۔ مناسبت اور موزونیت کی لاجواب تعریف کی اور بادشاہ کی طرف سے بھی ایک خوشگوار تبسم میں اس کی حوصلہ افزا تائید ہوئی۔

پیرومرشد۔ آپ کا لباس بلا شائبہ تکلف بہترین ہے۔ کس کی مجال ہے کہ اس کے لاجواب ہونے میں عذر کرے۔ یا اس کی تعریف کرنے میں کامیاب ہو سکے۔

تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس　　یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں سیدھا الٹا

بادشاہ کا برآمد ہونا تھا کہ صل علیٰ اور سبحان اللہ کا شور مچ گیا۔ لباس کی تعریفوں میں غلغلہ انداز مبالغہ آمیز آمیزیاں ہو رہی تھیں۔ سلامی کی توپیں دنادن گرج رہی تھیں۔ نقار خانوں اور باجوں کی آوازیں شور محشر کی کیفیتیں پیدا کر رہی تھیں۔ فوجوں نے سلامی لی۔ درباریوں نے کورنشات کا صیغہ گردانا اور وزراء نے نذریں گذاریں۔ جلوس شروع ہوا۔ سب کے آگے خاقان کجکلاہ ولنواز مسرتوں میں مخمور جوانان رعنا کی طرح جھوم جھوم کر چل رہے ہیں۔ ع

آں ترک شوخ بیں کہ چہ مستانہ میرود

آپ کے سر پر زردوزی مخمل کا جواہر نگار چتر ہے۔ جس کی طلائی چوبیں چار خوش پوش نوخیز غلمان کے ہاتھوں میں ہیں۔ آپ کے پیچھے وزیروں امیروں کا گروہ ہے۔ سڑک پر دو رویہ قطار در قطار شہر کے شرفا اور عوام الناس اپنے جامہ زیب بادشاہ کی آمد کے لیے چشم براہ ہیں۔ جہاں جلوس پہنچا اور واہ وا کا غل مچ گیا۔ زبانیں لباس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ مگر خدا شرمائے آنکھوں کو یہ زمین پر کیا تک رہی ہیں؟ ان ناقدروں سے کوئی پوچھے کہ زمین میں دلچسپی کا باعث کیا رکھا ہے؟ بادشاہ کی طرف دیکھو۔ نیچے کیا دیکھ رہی ہو؟

معصوم بچوں کی اخلاقی جرأت ہمیشہ قابل تعریف رہی ہے۔ جلوس جا رہا تھا کہ ایک پنجسالہ طفل نے اپنے باپ سے کہا۔ باپ! تم بادشاہ کے لباس کی تعریف کر رہے ہو۔ بادشاہ تو ننگا جا رہا ہے۔ ایک شریف شہری اس غیر مہذب تماشے کو خاموش کھڑا دیکھ رہا تھا اُس نے کہا۔ لوگو معصوم کا فیصلہ سنو۔ دفعتہً ایک متفق غل ہوا اٹھا کہ بادشاہ ننگا ہے۔ بدمعاش جلاہے کو سزا دی جائے۔ اس آواز میں ہزاروں لب شریک ہو گئے اور بالآخر مجمع کا ہر فرد بشر یہی پکار اٹھا۔ مگر کیا اُس شخص سے جو شاہ وگدا کے عقل و ہوش کی آنکھیں ایک ہی پٹی سے کس کر باندھ سکتا ہو ایسی بیوقوفی کی امید کی جا سکتی

وہاں موجود رہتا وہ اور اُس کے شاگرد پہلے ہی سے کافور تھے۔

اب کامراں کی آنکھیں کھلیں اور اُس نے محسوس کیا کہ اپنی عُریانی کا مشاہدہ کرنے والا صرف وہی نہ تھا بلکہ ہزاروں اور بھی تھے اُسکے غیظ و غضب کی انتہا نہ تھی۔ وزیراعظم سے لیکر ادنے خدمتگاراں تک ایک سرے سے دوسرے سرے تک برقِ خشم کے شرارے چمک گئے۔ مگر جلا جلاد خود واجب القتل ہو وہاں تلوار کی کاٹ کون دیکھیگا۔ تن بہ تقدیر خاموش رہا۔

بہرحال کچھ مدت کے بعد خطاکار جلاہا دستیاب ہوگیا اور شاگردوں سمیت بامشقت قید میں ڈالدیا گیا۔ مگر زمانہ پلٹا۔ حالات بدلے۔ رسم و رواج اُلٹے۔ قوانین میں تغیر تبدل ہوا اور مجرم نوازی بھی آئین میں داخل ہوئی۔ جلاہے اور اس کے شاگردوں نے کامران کے حضور میں جرم بخشی چاہی۔ کامران بھی اب وہ کامران نہیں تھا اُس نے بلاکر عزت و احترام کے ساتھ تینوں کو معاف کردیا اور کہا۔

گر دستِ زلفِ مشکینت خطائے رفت رفت ۔ ور زہندوئے شما بر ما جفائے رفت رفت

جلاہے نے مودبانہ لہجے میں عرض کی۔

برق از خرمنِ پشمینہ پوشی سوخت سوخت ۔ جورِ شاہِ کامراں گر بر گدائے رفت رفت،

میرے خیال میں اگر اس قابلیت کا جلاہا موجودہ آزاد خیالی کے زمانہ میں ہوتا تو ضرور کسی جمہوریت کی کرسی صدارت کے لیئے ہاتھ پاؤں مارتا۔

محمد خدابخش ٹوانہ

غــزل

آتا ہے یاد آہ! میرا آشیاں مجھے ۔ صیاد لے چل آج سوئے گلستاں مجھے

وابستۂ چمن تھیں وہ آشفتہ سنجیاں ۔ آکر قفس میں بھول گئی ہے فغاں مجھے

بارانِ اشک ہی سے ہرا نخلِ غم ہوا ۔ لطفِ بہار دیگیا رنجِ خزاں مجھے

اے ہمنشیں قصۂ فرقت نہ چھیڑ۔ دیکھ ۔ دنیا سے لیکے جائے گی یہ داستاں مجھے

ہے اس قدر نوازشِ صیاد قید میں ۔ آتا ہے شکر باد بجائے فغاں مجھے

بے اختیار آنکھ سے آنسو نکل پڑے ۔ آیا وطن جو یاد کہیں ناگہاں مجھے

محوِ خیالِ یار رہوں چھیڑا نہ کر کلام

ہرگز نہیں دماغِ غمِ این و آں مجھے

نیاز محمد کلام

عالمِ تصوّر

آدھی رات کا خاموش منظر میرے سکوت وسکون کا دشمن ہے چمکنے والے ستاروں کو میری یکسوئی سے عداوت ہے دھیمی دھیمی ہوائیں میرے خیالات میں برہمی پیدا کر رہی ہیں اب مجھے چپ دیکھکے چھیڑتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ میں عالمِ تصوّر سے نکل کے اُن کی دل فریبیوں کا تماشہ دیکھوں۔ مگر آہ مجھے کیسے تصور ہی میں لطف آتا ہے۔ کیونکر کہوں کہ کس کے تصور نے مجھے اپنا بنالیا ہے۔ اب وہ دماغ کہاں سے لاؤں جو ان مناظر سے لطف اندوز ہوسکے۔ سچ ہے کہ فرقت نصیبوں کو نہ سنسان رات کے مناظر سے کوئی سروکار ہے۔ نہ ستاروں کی انجمن افروزی سے کچھ مطلب ہے۔ صرف میں ہوں اور اُن کا تصور ؎ بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

بھادوں کی اندھیری رات ہے ننھی ننھی بوندیں پڑرہی ہیں کبھی کبھی بجلی بھی چمک جاتی ہے حسن فطرت لیلائے شب کے آغوش میں ہے۔ لیکن میں آہ میں بدنصیب چپ چاپ کسی کی یاد میں محو ہوں۔ مجھے یہ پسند نہیں کہ بجلی چمکے اور میرے خیالات کے تسلسل میں فرق آئے۔ فطرت اپنی دلفریبیاں دوسروں پر صرف کرے مجھے اپنی محویت کافی ہے۔ بزمِ تصور ہو اور خیالِ یار ہو۔ بس مجھے دنیا کی کسی چیز سے سروکار نہیں

او ستم رسیدہ عورت اے اپنے ارمانوں کا ماتم کرنیوالی عورت تیرے نالے عالم خموشی میں فضائے آسمان سے ٹکرا کر ایک ہنگامہ برپا کررہے ہیں مگر اس عالم سکوت میں ہلچل پیدا کرنیوالے نالوں کا بھی میرے دل پر اسوقت کچھ اثر نہیں ہے دل ودماغ میں ان باتوں کی حس ہی باقی نہیں میں جانتا ہوں کہ تو بھی فرقت نصیب ہے تو بھی کسی کی یاد میں محو ہے تجھے بھی کسی کی یاد تڑپا رہی ہے اور تو بھی اسوقت عالم خیال میں مستغرق ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ تیری نظروں میں حقیر ہے۔ یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں یہ ہوا کے سرد جھونکے تجھے بادِ سموم سے بھی زیادہ ناگوار خاطر ہیں سیاہ بادلوں میں بجلیوں کا چمکنا تیرے دل کے لئے نشتر ہے عالم سکون سے کبھی کبھی پپیہے کی رٹ تیرے غم کو تازہ دلکو اور زیادہ مضطر بنا دیتی ہے۔ لیکن جس طرح سے تجھے دنیا اور دنیا کے دلچسپ مناظر سے کوئی نسبت نہیں۔ اسی طرح مجھے بھی ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ فرق یہ ہے کہ تو نالے کرتی ہے اور میں خاموش ہوں میرا دل شام ہی سے کسی کی یاد میں سرشار ہے۔ او کمسن بیوہ تیرے نالے میری محویت کو پسند نہیں کرتے۔ تیری فریاد میری خاموشی کو چھیڑا کرتی ہے۔ خیالِ دوست تو کتنا پیارا ہے۔ میرا غم نصیب دل تجھ سے آرام پاتا ہے۔ تیرے دامن میں وہ صورت پنہاں ہے جسکے لئے میری آنکھیں ترستی ہیں۔ نظام عالم میں برہمی پیدا ہو جاتا۔ [illegible]

[illegible]

جذبات فکری

جو کہا نہیں ہے کچھ بھی تجھے پاسِ دلنوازی
تو ستم ظریف بولا ترا عشق ہے مجازی

یہ ہے خوف کھل نہ جائے کہیں رازِ دلنوازی
مری سمت دیکھتا ہے بنگاہِ بے نیازی

ہیں حسین لاکھ لیکن کوئی لائے گا کہاں سے
تری آنِ خود نمائی تری شانِ امتیازی

ترے بال کھل پڑے ہیں جو کھلے رہینگے یونہی
نہ گھٹے گی تا قیامت شبِ ہجر کی درازی

اُسے لوگ کہہ رہے ہیں تری انتہائے نخوت
ترے ناز کہہ رہے ہیں جسے شانِ بے نیازی

مری آنکھیں ہوا جو دیکھیں پسِ مرگ تو وہ بولا
اسے دیکھنا ہے اب بھی ہوسِ نظارہ بازی

جو دکھائے اپنا جلوہ وہ صنم حرم میں جاکر
تو یقین ہے کہ نیت وہیں توڑ دے نمازی

ترے در پہ آ پڑا ہے ترا دردمند فکری
کبھی دیکھ لے تو آکر بنگاہِ چارہ سازی

شریف فکری

شاعر کا گیت

شاعر نے ایک گیت گایا۔ جو اُس کے ٹوٹے ہوئے دل کی صدا تھی + دولت پرست نے اُس پر کچھ توجہ نہ دی۔ کیونکہ اس میں زر نہ تھا + سپاہی کشت و خون میں مشغول تھا۔ اُسے حرص ملک گیری سے فرصت نہ تھی۔ تلواروں کی جھنکار اور توپوں کی گرج میں اُسے شکستہ دل کی مدھم آواز سنائی نہ دی + فلسفی بحث چنان و چنیں میں الجھا ہوا تھا۔ اس الٹ پھیر میں اُسے اور کسی طرف کا خیال نہ آیا + مکتبی مُلّا بولا۔ اشعار ناقص ہیں۔ وزن اور قافیہ درست نہیں ہے۔

معمولی آدمی نے شاعر کی صدا سُنی۔ مگر شکم کے دھندے دماغ کو معطل کر دیتے ہیں۔ آخر شاعر نے اپنا تحفہ کو حُسن کی خدمت میں پیش کیا۔ دل کی دھڑک رہا تھا۔ کہ یہی ایک بارگاہ ہے۔ جہاں قبولیت کا اعزاز حاصل ہوگا۔ مگر صد حیف۔

غرورِ حُسن اجازت مگر نداد ای گل
کہ پُرسشے بکنی عندلیبِ شیدا را

وہاں بھی کچھ شنوائی نہ ہوئی + آخر شاعر دنیا اور دنیا والوں سے مایوس ہوکر فطرت سے گویا ہوا۔ پھر کیا ہوا بادِ نسیم مستانہ وار چلنے لگی۔ اشجار جھومنے لگے۔ پرندے چہچہانے لگے۔ فطرت مست ہوگئی کیونکہ فطرت خود بھی شاعر ہے۔

(آزاد محمد ... [illegible])

آزادی کی تکلیف غلامی کے آرام سے بہتر ہوتی ہے

قمر کا ہوا جلوہ گر نور جب ہوئی دن کی گرمی بھی کافور سب
نکل کر چلا بھیڑیا غار سے کہ کھائے کوئی جانور مار کے

جب اک سمت جاتا تھا دوڑا ہوا سر راہ کتے کو دیکھا کھڑا
وہ چھٹکی ہوئی چاندنی کا سماں وہ مخمل سا اُسکا چمکتا رواں

سلام اور پیام اُنکے جب ہو چکے پُرانے گلے شکوے سب رو چکے
کہا بھیڑیے نے کہ کیا بات ہو تجھے مل گئی کونسی ایسی شے

کہ فوراً گئی تیری کایا پلٹ بدن پھیلا ڈھالا گیا سب پلٹ
کہا اُسنے تقلید میری کرو۔ کیا ہے جو میں نے وہ تم بھی کرو

دکھاؤں چلو اپنے آقا کا گھر میرے ساتھ تم جاگنا رات بھر
ہے آقا کی تاکید مجھکو یہی پھٹکنے نہ پائے کوئی اجنبی

دو وقتہ تمہیں غسل دینگے نفر ملیگا وہ راتب سدا وقت پر
کہ دو دن میں حالت سنبھل جائیگی رُواں گر کے صورت بدل جائیگی

تعلق نہ ہوگا کسی کام سے پڑے رہنا دن بھر تم آرام سے
کہا ہوں جو روزی سی مجبور ہیں شرائط یہ سب مجھکو منظور ہیں

کٹیگی جو آرام سے زندگی عنایت میں سمجھونگا سب آپکی
مگر یہ تو فرمائیے مہرباں پڑا ہے یہ گردن پہ کیسا نشاں

اُڑے ہیں یہ کیوں سب گردن کے بال کہا اسکا کیجیے نہ ہرگز خیال
رہوں جاگتا رات بھر اس لئے بندھا رہتا ہوں دنکو زنجیر سے

کہ آرام سے پڑکے سویا کروں نہ دن چلنے پھرنے میں کھویا کروں
رگڑ ہے فقط طوق و زنجیر کی خراش ایک گردن میں جو پڑ گئی

یہ سنکر کھسکنے لگا بھیڑیا اور اُلٹے قدم پیچھے ہٹنے لگا
کہا اُس سے کتے نے کرتے ہو کیا میاں ایسی باتوں سے ڈرتے ہو کیا

کہا ایسے راتب کو میرا سلام مبارک رہے آپ کو یہ طعام
مجھے بھوک سے مرنا منظور ہے شکم آگ سے بھرنا منظور ہے

نہیں مجھکو کھانے کا اتنا بھی شوق گوارا مجھے ہو جو زنجیر و طوق
غلاموں کی کیا خاک ہے زندگی اگر زندگی ہے تو آزادگی

نہیں حریت سی کوئی اور شئے نہ ہو یہ تو ہر چیز ناچیز ہے
نہیں حریت بے لگامی کا نام کہ یہ بے لگامی ہے غنڈوں کا کام

اگر ایسے آزاد ہو جائیں سب کرے ترک ہر ایک حفظ ادب
کسی کا نہ ہو کوئی پرسان کار ہر اک شخص ہو جائے با اختیار

کہ چاہے کرے کچھ کہے جو چاہے جو کسی روک کا وہ نہ پابند ہو
چلے خواہش نفس کی راہ پر نہ عقبےٰ کا خوف اور نہ دنیا کا ڈر

تو دنیا میں برپا وہ طوفان ہوں کہ بدتر درندوں سے انسان ہوں
تمدن ہو معدوم غالب ہو شر پھرے منہ چھپاتا بشر سے بشر

نہ پہنچائے جو دوسروں کو گزند غریبوں کا حامی اور درد مند
نہ ہمدرد ہو محض انسان کا ہی خواہ ہو بلکہ حیوان کا

نہ بانیٔ فتنہ نہ حامیٔ شر خدا سے ڈرے اور سب سے نڈر
محافظ حدودِ شریعت کا ہو حقوق و فرائض پہ عامل ہو جو

وہی سچ جو پوچھو تو آزاد ہے جہاں اُسکے دم سے ہی آباد ہے

محمد حسین عارف

بندگی

ہر اطاعت کے لئے ایک سرکشی، ہر وفاداری کے لئے ایک دشمنی، اور ہر عاجزی کے لئے ایک غرور و تمرد لازمی ہے۔ آپ ایک آقا کے نوکر ہو نہیں سکتے، جب تک کہ اور تمام آقاؤں سے انکار نہ کردیں۔ زید سے اگر آپ کو محبت ہے، تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اس کے تمام دشمنوں کے آپ دشمن ہو گئے۔ ایک چوکھٹ پر جبھی سر جھک سکتا ہے، جب اور تمام جھکانے والی چوکھٹوں پر سے مغرورانہ گذر جائے۔ جب آپ نے کہا کہ میں روشنی ہی کو پسند کرتا ہوں تو ضمناً اس کا بھی اقرار کرلیا کہ تاریکی سے متنفر ہوں آپ ایک ہی جانب اپنا منھ کر نہیں سکتے۔ جبتک اور ہر طرف سے منہ پھیر نہ لیں اور ایک ہی اپنا رشتہ جوڑ نہیں سکتے جبتک ہر طرف سے رشتہ کاٹ نہ لیں۔ پس خدا کی اطاعت کیلئے پہلی چیز یہ ہے کہ اس کے سوا اور جتنی قوتیں اپنی اطاعت کی طرف بلاتی ہیں ان سب سے باغی ہو جائے اور اس کے آگے جھکنے سے پہلے اور تمام جھکانیوالوں کے آگے مغرور ہو جائے۔ جو لوگ اس کی اطاعت کے مدعی ہیں، ان کو اطاعت سے پہلے سرکشی کا، وفاداری سے پہلے بغاوت کا، اور دوستی سے پہلے دشمنی کا ثبوت دینا چاہئے۔ ان کو آزمایش میں پڑھ کر ثابت کرنا چاہئے کہ خدا کی وفاداری کے لئے انہوں نے کن کن قوتوں سے بغاوت کی ہے۔ اور اس کی محبت کے پیچھے کس کس کو اپنا دشمن بنایا ہے؟ سب سے بڑا قوت ابلیسی کا مظہر نفس انسانی اور قوائے بہیمہ کی قوائے ملکوتیہ سے ایک دائمی جنگ ہے۔ پھر انسان سے باہر طرح طرح کی ضلالتوں اور باطل پرستیوں کے تخت بچھے ہوئے ہیں۔ اور خود انسان کے بیشمار غول ہیں۔ جنہوں نے شیطان کے ہاتھ پر بیعت کر کے اس طرح ان کی اطاعت میں اپنے تئیں فنا کر دیا ہے۔ کہ ان کا وجود از سرتاپا پیکر شیطانی اور مجسمۂ ابلیسی بن گیا ہے۔ ان میں سے ہر قوت شیطانی انسان کو اپنے آگے مرعوب دیکھنا چاہتی ہے کہیں دولت اور مال وجاہ دنیوی شیطان کا نشیمن ہے۔ کہیں غرور علم و فضل کے اندر سے شیطان جھانک رہا ہے۔ کہیں مذہبی پیشواؤں کی جماعتیں اس کا مرکب فساد بن گئی ہیں۔ اور کہیں جماعتی تسلط اور قوت نے اپنی دعوت ضلالت کی باگ اس کے ہاتھ میں دیدی ہے۔ ننگ و ناموس دنیوی اور محبت اہل و عیال کی زنجیروں کے اندر بھی اس کے تعبّد و انقیاد کی کشش مخفی ہے پس مقام مذہب کے رو سے اشرف المخلوقات کہلانے کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ انسان ان تمام طاقتوں کی اطاعت سے یکسر باغی و سرکش ہو جائے اور ان کی عظمت و جبروت کے اثر سے اپنے دل کو آزاد کر دے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جہانتک طلب صادق کی قوت اور توفیق الٰہی کی ہمت اس کا ساتھ دے ان تمام مظاہر شیطانیہ سے

مقابلے میں ایک مفرورانہ جہاد کا اعلان کردے۔ دولت دنیا میں ہمیشہ سے شیطان کی سیر و سیاحت کا سب سے بڑا مرکب رہی ہے۔ اور ضلالت کی تاریکی نے چاندی اور سونے کی دیواروں کے اندر ہمیشہ گھر بنا لیا ہے۔ پس ہر اس غرور اور ہر اداکو جو دولت اور عزّ و جاہ دنیوی سے پیدا ہو شیطان کا بت یقین کرلے اور خدا کی عزت کی خاطر جہاں تک ممکن ہو اسے ذلت سے ٹھکرا دے۔ خدا کی محبت کے لئے ان سب کا دشمن ہو جائے اور اس نام کی عزت کو بلند کرنے کے لئے ان سب کو ذلیل و رسوا کرے۔ اپنی زبان کو، اپنے دماغ کو، اور اپنی تمام قوتوں کو وقف کردے۔ تاکہ جو طاعت الٰہی سے سرکش انسان حق و صداقت کی عزت کو دنیا میں تاراج کر رہے ہیں۔ اُن کی عزت باطلہ کے تاراج و باطل کرنے کا وہ ذریعہ بنے۔ اس کی زبان حق کی زبان ہو اور قدم حق کے قدم ہوں۔ زبان سے ان کی تحقیر و تذلیل کرے اور پاؤں سے ان کے مغرور سروں کو کچلے۔ جب اس منزلِ امتحان سے گذر جائیگا۔ اس وقت خداوند عالم کا مطیع ہوگا۔ کیونکہ جو اللہ کا مطیع ہو۔ ضرور ہے کہ شیطان سے باغی ہو۔

محمد شفاعت علیخان ناشاد سہسرامی

لمعات عزیز

رگیں کھنچنے لگیں اب نزع کا ہنگام آتا ہے
وہ آجائیں ورنہ اُنکے سر پہ سب الزام آتا ہے

ہمیں تو اب کسی پہلو میں نہیں آرام آتا ہے
نہیں اس دل کو لے لو یہ تمہارے کام آتا ہے

دمِ آخر لکھے تھے جس میں اپنے تجربے تم کو
وہ خطِ شوق دیکھوں کسکے کسکے کام آتا ہے

نہ سمجھو بے حقیقت اس قدر تم زندگی دل کی
لہو کا ایک قطرہ بھی بہت کچھ کام آتا ہے

یہاں تک کی ہے میں نے احتیاطِ بادہ آشامی
لرز جاتا ہے دل چھلکا ہوا جب جام آتا ہے

جنابِ واعظِ عزلت گزیں سے عرض اتنی ہے
فقط یہ دیکھ لیں محفل میں کیونکر جام آتا ہے

دیا ہے کون سا اعجاز الٰہی عشق میں تو نے
دلِ مرحوم مرنے پر بھی اکثر کام آتا ہے

کہوں مقتل میں کس سے میں بھی مشتاقِ شہادت ہوں
یہاں سب خود غرض ہیں کون کسکے کام آتا ہے

کسی محفل میں اب جانے کے قابل ہی نہیں اے دل
وہ عالم ہے زباں پر اکثر اس کا نام آتا ہے

نہ پوچھو کس قدر ہوگا عذابِ آخرت اُس پر
شبِ غم جس مریضِ ہجر کو آرام آتا ہے

سکوں ہو کس جگہ میرے دلِ سیماب فطرت کو
جہاں بجلی تڑپتی ہے وہاں آرام آتا ہے

یہ سناٹا یہ تاریکی یہ گورستاں یہ ویرانی
تمہیں اے سونے والو کس طرح آرام آتا ہے

مرے چہرے کو اے چادر ہٹا کر دیکھنے والے
مریضِ ہجر کو دیکھ اس طرح آرام آتا ہے

الٰہی وہ شفق بنکر دیارِ حسن میں پھوٹے
برابر خونِ دل جو صبح سے تا شام آتا ہے

عزیزِ باوفا نے دیر میں کچھ چوٹ کھائی ہے
حرم میں آج باندھے جامۂ احرام آتا ہے

عزیز لکھنوی

دو ابرو کا صفایا

۱۔ اگست ۱۹۱۱ء میں ٹوکلش میں سوار ہو کر لنڈن کو چلے۔ بکثرت ہند و ہر گوشۂ ہند سے کچھ مسلمان کچھ انگریز اکثر طلباء علوم مسافر تھے۔ لنڈن میں آجکل کا رواج (فیشن) یہ ہے کہ ڈاڑھی مونچھ نوجوان جوان بڈھے قطعاً نہیں رکھتے۔ اس قاعدہ میں بہت ہی کم استثنا ملیگا۔ ایکدن سطح جہاز (ڈک) پر باہمدگر یہ بحث ہونے لگی۔ اور بے ڈاڑھی مونچھ والوں نے اوروں سے اصرار کیا کہ لنڈن میں پہنچنے سے قبل سب کو ڈاڑھی مونچھ کو خیرباد کہنا چاہئے۔ بعض مسلمانوں کو تردد ہوا اور اس حقیر سے رجوع کیا اور پوچھا کہ سب دوست مصر ہیں کیا کریں۔ آپ کی کیا رائے ہے

۲۔ میں نے دو کلمے عرض کئے کہ شرعاً ڈاڑھی منڈوانا حرام ہے اور مونچھیں رکھنے نہ رکھنے کا اختیار ہے مگر بڑی نہ ہوں کہ منہ میں جائیں۔ لیکن یہ جواب کچھ مسکت اور مسکن ثابت نہ ہوا۔ اور گرد گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ اور جیسی کہ اس عہد کے طلبا کے دماغوں کی تربیت ہوگئی ہے اس کے اقتضائے معاملہ کو بحث میں ڈالدیا اور جابجا گوشہ گوشہ میں عقل آرائیاں ہونے لگیں۔ اور چونکہ میں ریشو اور سبلدار ہی نہیں بلکہ سفید ریش تھا۔ میرے گرد ہجوم ہوگیا۔ اور ہر طرف سے سوالات اور جوابات ہونے لگے اور سب منتظر ہوئے کہ دیکھیں اب یہ کیا کہتا ہے۔

۳۔ آخراں کی بجسپی کے لئے میں نے یہ تقریر کی:۔ اے بھائیو ذرا ادھر متوجہ ہو اور میری ایک بات سن لو پھر گفتگو مزید فرمائیگا۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ مرد عورت سے خوبصورت ہوتا ہے۔ خدا نے خواہ نیچر نے مرد کو عورت سے خوبصورت بنایا ہے۔ اور ثبوت اس کا یہ ہے کہ فطرت نے انسان ہی نہیں بلکہ اور حیوانات میں بھی یہی قاعدہ مرعی رکھا ہے کہ نر مادہ سے حسین خوبرو رنگین ہوتا ہے۔ اپنے اپنے گھروں میں دیکھو چڑا اور چڑیا۔ چڑے کی گردن میں کیسا خوبصورت سیاہ رنگ کا کنٹھا ہوتا ہے اور اس کے پروں پر بھی کچھ رنگ ہوتا ہے۔ بیا اور بئی کو دیکھو نر زرد رنگ ہو کر اپنے حسن کو دوران زمان میں دکھلاتا ہے۔ لال اور بینا کو دیکھو۔ پدا اور پدی میں بھی تفاوت ہوتا ہے۔ مرغا اور مرغی دیکھو۔ بیس مرغیوں میں مرغ بلند کبس (تاج) اور دونوں طرف گلپھڑے سرخ چہرہ بلند دم توی ہیکل خوبصورت مرغی جیسی ہوتی ہے آپ کو معلوم ہے۔ اسیطرح بجار سانڈھ بیل اور گائے۔ گھوڑا گھوڑی شیر شیرنی غرض پرندہ چرندہ درندہ اگر غور سے تحقیق کرو تو ان میں نر مادہ سے خوبصورت ہوگا

۴۔ اس کلیہ کے تحت میں مرد بھی عورت سے حسین ہوتا ہے۔ خدا نے عورت سے مرد کو ڈاڑھی مونچھ والا پیدا کر کے یہ امتیاز بخشا ہے۔ یہ ڈاڑھی مونچھ اسکے حسن کا زیور ہیں اسلئے اسپر واجب ہے کہ انکو برقرار رکھے۔ ہاں انکی اصلاح کرسکتا ہے یعنی اعتدال سے زیادہ ہوں یا کم ہوں تو انہیں کچھ تغیر کرے ہر چند کہ اور بھی علامات ہیں جن سے مرد کی مردیت ظاہر ہوتی ہے یعنی اسکے جسم کی اور چہرہ کی ساخت وغیرہ اور انکے اعضا کا تناسب لیکن ذرا غور کرو تو یہ علامت ڈاڑھی مونچھ کی سب سے زیادہ ہے

- پھر میں کہتا ہوں کہ مرد عورت سے خوبصورت ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کوریوں کے لونڈے جن کی مسیں بھیگتی ہوتی ہیں عورتوں کا لباس پہنکر بیٹھ جاتے ہیں تو لڑکیوں سے حسین معلوم ہوتے ہیں

- پس جو کوئی ڈاڑھی مونچھ منڈاتا ہے۔ وہ خلاف فطرت کرتا ہے اور اپنے حسن کو خاک میں ملاتا ہے اور مادہ بد نظر آنے لگتا ہے اور وہ مردیت کا جلال اُس کے چہرہ سے زائل ہو جاتا ہے۔ اب تم خود انصاف کر لو۔

- اگر یہ کہو کہ ہمکو تو عورت ہی خوبصورت معلوم ہوتی ہے بہ نسبت مرد کے تو یہ کہنا انصاف سے خالی ہے عورت سے بھی پوچھو کہ وہ کیا کہتی ہے۔ ہم نے تو دنیا میں یہ دیکھا کہ مرد بیشمار تعلقات پیدا کر لیا کرتا ہے اور ہرجگہ ہر دیگ بنتا پھرتا ہے۔ اور عورت ایسی وفادار رہتی ہے کہ جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ ذرا انصاف کرو۔

۸۔ فرانس میں ڈاڑھی بکثرت نہیں رکھتے ہیں۔ مگر رکھتے ہیں۔ مگر مونچھیں بہت کم منڈاتے ہیں اور انگلستان میں ہر شخص مونچھیں ڈاڑھی سب صاف۔ صرف ایک تحریر سیاہ ڈاڑھی مونچھ کی موجود رہتی ہے۔ وہ نہ عورت مرد یکساں دکھائی دیتے ہیں۔ فرانسیسی کی صورت میں مردانگی نظر آتی اور انگریز مین زنانہ پن محض ڈاڑھی مونچھ کے منڈوانے سے

۹۔ چنانچہ چین اور جاپان کے آدمیوں میں مرد اور عورت میں کچھ تمیز نہیں ہوتی۔ اگر ہوتی ہے۔ تو وہی دو چار بال مرد کے چہرہ پر نظر آتے ہیں۔

۱۰۔ اس تقریر نے وہیں ایک سوال پیدا کر دیا۔ کہ حسن کسے کہتے ہیں اس کی تعریف یا تشریح کیجئے۔

۱۱۔ میں نے عرض کیا کہ حسن کے عناصر صباحت ملاحت اور تناسب اعضا کہے جا سکتے ہیں۔ صباحت یعنی سرخ سفید رنگ ملاحت جس کا ترجمہ نمکینی تناسب اعضا یعنی چہرہ بلکہ سارے بدن کے جوڑ بند باہمدگر مربوط اور متناسب ہوں۔ اصل تو یہ ہے کہ ان عناصر کی تعریف یا تشریح مشکل ہے یہ ذوقی بات ہے۔ لیکن مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ فرض کرو کہ یہ کہا جاتا ہے کہ آنکھیں بڑی بڑی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی بہ نسبت اچھی ہوتی ہیں۔ لیکن اگر چہرہ کے اور اعضا کے ساتھ متناسب نہ ہوں تو آنکھیں بڑی اچھی نہ معلوم ہونگی اونچی پیشانی اچھی سمجھی گئی ہے۔ مگر حد سے زائد اور چہرہ پر موزون اور مناسب نہ ہو تو کچھ نہیں۔ بعض لوگ ایسی شکل کے دیکھنے میں آئے ہیں کہ اگر انکے چہرہ کے ہر عضو ناک آنکھ پیشانی رخسار علیحدہ علیحدہ دیکھو تو حسین معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن باہم دگر متناسب نہیں ہوتے۔ تو مجموعی حسن حاصل نہیں ہوتا ہے۔

۱۲۔ اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ عالم میں کس ملک کے آدمی حسن کا نمونہ مانے جانے کے لائق ہیں۔ ہمارے تجربہ میں گرجستان یونان اور کشمیر۔ پیشانی کی بلندی اور حسن کیلئے بہت ضروری چیز معلوم ہوتی ہے دبی ہوئی پیشانی کا آدمی حسین نہیں ہو سکتا یعنی نسبتاً پیشانی کے داہنے بائیں سطح نارک کا چہرہ کی سطح کے ساتھ زاویہ قائمہ یا اُسکے قریب کا زاویہ بنیگا تو حسن زیادہ پایا جائیگا جس قدر اس سے انحراف ہوگا۔ اتنا ہی بندر سے شکل مطابق ہوگی ۱۳۔ سیاہ بال سرخ سفید رنگ اور ایسا سفید نہیں جیسا گورونکا ہوتا ہے بلکہ نمکین سفید اور تناسب الاعضا یعنے چہرہ اور جسم کے اجزا ہر ایک جدا جدا اور پھر متناسب ہوں تو میں کہونگا کہ یہ حسن کا نمونہ ہے۔

[redacted]

تناسب سے تمام انسان کے چہرہ پر بشرطیکہ رنگینی حسن پیدا کر دیتا ہے۔

۱۴- ڈاڑھی بڑھانے سے تو لوگ یوں گھبراتے ہیں کہ کوئی ہم کو ریشائیل نہ کہے۔ اگر کہے تو بُرائی کیا ہے۔ جبرائیل میکائیل فرشتوں کے ہموزن ہونا کیا کچھ بُری بات ہے۔ اچھی کوسے سے تو ریشوا اچھا۔ حکم تو یہ ہے کہ کوسہ بھی ہو تو نہ ترشواؤ اگرچہ تھوڑی پر تین ہی بال کیوں نہ ہوں۔ اس سے ہم متفق ہیں کہ لحیانی رہنا بھی بڑی آفت کا سامنا ہے۔ روز کنگھا کرو کہ جوئیں نہ پڑ جائیں لیکن سر کے ساتھ اگر ڈاڑھی مونچھ میں بھی پرسش کر لیا جایا کرے تو انسان محفوظ رہ سکتا ہے۔ آخر ہندوستان میں سکھ کیسی طول طویل ریش و بروت کے مالک ہوتے ہیں۔ بلکہ سارے سر کے بالوں کو بھی اپنی پوری قوت کے ساتھ بڑھنے کی آزادی دیئے ہوئے ہیں۔

۱۵- راجہ شنکر سنگھ رئیس اینٹہ ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کے دروازہ پر ایک پٹھان مسلمان دربان پہرہ پر رہا کرتا تھا اُسکی ڈاڑھی ڈاڑھیوں کی نمائشگاہ کے لائق تھی۔ وہ اس کو لپیٹ کر ڈھاٹے سے باندھے رہا کرتا تھا۔ میں چھوٹا سا تھا جب وہاں جانیکا اتفاق ہوتا تو اس سے ڈھاٹا کھولکر ڈاڑھی دکھانیکی فرمایش کرتا اور وہ مسکراتا جاتا اور بالوں کو سیدھا لٹکا کر دکھاتا۔ اُس کا قد تخمیناً ۵ فٹ ۹ انچہ کا ہوگا۔ ڈاڑھی کے بال جب سیدھے ہو جاتے تو زمین سے میری دو بالشت اونچے رہتے۔ میں بیٹھ کر ناپتا اور خوب ہنستا۔ وہ بھی ہنستا جاتا اور ڈاڑھی لپیٹتا جاتا اور مجھ سے کہتا تم بھی اپنی ڈاڑھی ایسی ہی رکھا کرنا۔ جب نکلے تو میں شرما جاتا اور کہتا مجھ سے چوزری نہیں نکلی جائیگی

۱۶- فوٹو اور دستی تصویروں میں سب سے بڑی ڈاڑھی فتح علیشاہ شہنشاہ کجکلاہ ایران کی سب نے دیکھی ہوگی ان کے سفرنامہ وغیرہ میں اب بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ ڈاڑھی بہت گنجان ہے بالوں کی بہتات اور کثرت اس سے زیادہ کہیں نہیں دیکھی۔ سارا چہرہ بھرا ہوا ہے۔ رخسار مگر کچھ کھلے ہیں۔ شہنشاہ نہایت حسین جوان تھے۔ ڈاڑھی بدزیب نہ تھی۔ میں نے شہر قم میں جو طہران کے پاس ہے مرحوم کی قبر پر سورۂ فاتحہ پڑھ کر بخشی ہے۔ قم میں حضرت فاطمہ خواہر حضرت امام رضا ع کا مقبرہ بڑی شان و شوکت کا بنا ہوا ہے اور بہت سی سعافیات اس کے متعلق ہیں۔ خاندان قاچاریہ کے چند بادشاہوں کی قبریں وہاں موجود ہیں فتح علی شاہ کی قبر پر سنگ مرمر کا تعویذ ہے۔ اور اس میں شاہ کی تصویر بطور مجسمہ ابھری ہوئی کندہ ہے

۱۷- یہ نئی بات دیکھی کہ ایک مسلمان کی قبر پر کمر تک مجسمہ کندہ ہو فتح علیشاہ کا مجسمہ جو قبر پر دراز ہے۔ فوجی لباس میں ہے اور ڈاڑھی مونچھ کا بال بال صنّاع نے اس خوبی سے دکھایا ہے۔ کہ ہو بہو فوٹو کے مطابق ہے۔ اگرچہ مجسمہ ناقص ہے۔ صرف کمر تک ہے سینہ اور شکم اور دونوں ہاتھ اور سر مع دیگر جوارح کندہ ہیں

کندہ نہیں ہو [illegible]

ہاں تمام طور ایسے مجسمے ایران میں مسلمانوں کے نہیں دیکھے جیسے ہندوستان میں ہندو اپنے مندروں میں رکھتے ہیں یا انگریز چار سوتی چوکوں پر اس امید نصب کرتے ہیں کہ ہندو اپنے دیوتاؤں کی طرح انکی پرستش کرنے لگیں گردش روزگار سے بعید بھی نہیں

۹۔ ایسا لکھا تھا کیا ملنے لگا۔ قدیم بادشاہانِ ایران کے متعدد مجسمے مقامات مشہور پر ہیں۔ اور تصویریں بھی کندہ ہیں کوہ بے ستون و بہی زبادہ والا پہاڑ اسپر تصاویر کندہ ہیں اور جگہ بھی جہاں دیکھا معلوم ہوا کہ قدیم ایرانی ڈاڑھی رکھتے تھے۔ مثلاً دارا وغیرہ کے زمانہ کی تصاویر ریشور ہیں۔ مگر وہی یکمشت دو انگشت۔ قدیم زمانہ میں یہود ڈاڑھی کے گوشے کتروانے سے ممنوع تھے۔ شہر قدیم بابل کے پرانے کھنڈروں کو کھودنے سے جو نکلے نکلے ہیں اور انپر جو تصاویر منقش ہیں۔ ریشدار ہیں مصر کے فرعون ڈاڑھی میں موتی پر دیے ہوئے رکھتے تھے۔

اور سنا جاتا ہے کہ ایرانی بادشاہانِ قدیم چاندی سونے کے تار ڈاڑھی کے بالوں کے ساتھ گوندھتے تھے۔ یونانی سکندر کے عہد تک ڈاڑھی کی حفاظت کرتے تھے۔ رومی بھی ۲۹۶ قبل مسیح تک ڈاڑھی کو خیرباد نہیں کہتے تھے۔ ترک بھی ڈاڑھی رکھنا عزت سمجھتے تھے۔ اور منڈوانا ذلت جانتے تھے۔ اور طریق اسلام کے خلاف۔ ہندوستان میں رواج تھا۔ کہ جب شباب کے آغاز میں ڈاڑھی مونچھ نمایاں ہوتیں مسیں بھیگتیں تو ماں باپ سیویاں پکوا کر اس کی خوشی میں احباب کو کھلواتے تھے۔ مونچھوں کی یہ قدر تھی کہ اُن کی قسم کھاتے تھے کہ ایسا نہ ہو تو مونچھ منڈوا دوں۔ یہ فعل بے عزتی کا سمجھا جاتا تھا۔ قدیم اہل برطانیہ مونچھیں رکھتے تھے۔ اور گلگچھے ریشچہ یعنی ریش بچہ کو بھی طول دیتے تھے۔ نارمن ڈاڑھی مونچھ منڈواتے اور اپنی رعایا کو بھی مجبور کرتے تھے۔

۲۰۔ انگلستان میں الزبتھ کے زمانہ تک ڈاڑھی کا بڑا اہتمام کیا جاتا تھا اور معززین کبھی دور نہیں کرتے تھے۔ بلکہ طرح طرح سے کٹواتے اور کترواتے تھے۔ حتیٰ کہ بعض خاص پیشہ ور لوگ خاص طور پر ڈاڑھی مونچھ رکھتے تھے جس سے ان کی شناخت ہو جایا کرتی تھی۔ چارلس دوم کے عہد کے قریب اس ڈاڑھی پر وبال آنا شروع ہوا۔ تمام یورپ نے اس کو رخصت کرنا شروع کیا۔ نپولین کے عہد میں پھر سپاہیوں نے ڈاڑھی بڑھائی اور علامت مردی و مردمی کو پھر جتایا۔ بلکہ فوج سے سول میں آنے پر بھی ڈاڑھی کی عزت رکھنے لگے۔ اس زمانہ میں ہر شخص اپنی ڈاڑھی کا بادشاہ ہے۔ کوئی رکھتا ہے۔ کوئی نہیں رکھتا ہے۔

[illegible]

مونچھیں شاید ہی کوئی منڈواتا ہو مگر ڈاڑہی بہی اکثر رکھتے ہیں یعلوم ہوتا ہے مرد ہیں۔
ہندوستان میں عام ہندو اور خاص ولایت زا ہندو اور مسلمان دونوں۔ ولایت زا سے میری مراد یہ ہے کہ جو انگلستان ہوآئے ہیں سب مادہ روئی پسند کرتے ہیں۔ شرفائے اسلام عہد شباب سے لیکر مرنے تک ڈاڑھی مونچھ رکھتے ہیں۔ نیم مسلمان کترواتے ہیں ایسی چھوٹی کہ جسکو ایرانی مورچہ یا کہتے ہیں اور ہندوستانی خشخاشی اور نا مسلمان صفاچٹ رکھتے ہیں۔
بہر نوع قص شارب کا مضایقہ نہیں۔

۲۲۔ ہندوؤں نے بھدرا یعنے چار ابرو کا صفایا جوگیوں سے سیکھ کر مسلمان فقیروں بینواؤں کو بھی سکھا دیا۔ یہ اللہ والے لوگ ہیں۔ حسن ظاہر پر حسن باطن کو ترجیح دیتے ہیں۔ ڈاڑھی مونچھ ابرو اور سر منڈوا کر اپنی آبرو کہوئیں تو کچھ بیجا نہیں۔ کیونکہ وہ تو تارک دنیا ہوتے ہیں۔ ان کا ذکر ہی کیا ہے۔ الا مسلمانوں میں جو مسلمانی کے دعویدار ہیں۔ یہ مرض بے طرح پھیلا ہے یعنی اگر ایسی ڈاڑہی رکھنے سے گھبراتے ہیں کہ "وراں بچہ دہد خر گوشے" تو کتری ہوئی تو رکھ کر اسلام کی آبرو رکھ لیں۔ طبًا بہی ڈاڑہی رکھنا مستحسن ہے مفید ہے چاہیئے جس طبیب کامل سے اور ڈاکٹر سے پوچھ کر اپنا اطمینان کر لو کہ ڈاڑہی رکھنے سے حلق اور گردن کے امراض سے انسان محفوظ رہتا ہے۔ بلکہ پھیپھڑے اور سینے کے امراض سے پاک رہتا ہے۔ کیا یہ فائدہ کم ہے۔ صدرکے امراض جلد مزمن ہو جاتے ہیں۔ ان سے بچتا ہے۔

سید عبد اللہ رضوی اکبرآبادی

کلام حنا

صبا اس کے کوچے میں کیا پا گئی — مرے درد دل کی دوا آ گئی
عنادل کو کنج قفس موت ہے — مری روح دنیا سے گھبرا گئی
تجھے کیا ہوا اے دل بے قرار — کہیں تجھ میں بجلی نہ ہو آ گئی
ہیں رسموں کی پابندیاں بیڑیاں — طبیعت مری ان سے گھبرا گئی
زمانہ میں کیسا بپا شور و شر ہے — الٰہی قیامت یہ کیا آ گئی
عبث تھی عدو سے شکایت مجھے — اُسے دیکھ کر آنکھ شرما گئی
تری آہ تھی اے حنا کالی بدلی — کہ وہ پاس ہی پاس برسا گئی

بنت کبری ڈاکٹر محمد عبد الکریم

ملیح آباد

میٹھی نیند

واپس - واپس - اُو وقت تیز گامی سے واپس چل - اور صرف آج کی رات کے لیے مجھے پھر بچہ بنا دے !-

امّاں! تو پھر آ - اُس بے پایاں سمندر کے ساحل سے واپس آ - اور مجھے اپنے کلیجے سے لگا لے رنج و افکار میری پیشانی سے چوم کر معدوم کر دے - محبت بھری نگاہوں سے رات بھر میری حفاظت کر - اور مجھے میٹھی نیند عنایت کر -

واپس یا - واپس! او اُو زمانہ کی رَو واپس!!! محنت کرتے کرتے اور آنسو بہاتے بہاتے تنگ آگیا ہوں محنت بے بدل اور آنسو بے سود - مجھ سے لیلے - دونوں لیلے - اور میرا بچپن واپس دیدے -

میں نے دولت روحانی ضائع کر دی - میں اوروں کے لئے محنت کرتا رہا! اب اُکتا گیا ہوں - بس امّاں آ - اور اب مجھے پھر میٹھی نیند سُلا !!

اماں میں جو فروش گندم نما دنیا سے بیزار ہو چکا ہوں - آ! آ! تیرے لئے میرا دل بیتاب ہے - کئی دفعہ بسنت کی رت آئی - کھیت اور درخت ہرے بھرے ہو گئے - پھول کھلے اور مرجھا بھی گئے یہ سب کچھ میں اور تو اکٹھے دیکھا کرتے تھے - برسوں تیرا دودھ پیا - پیاری پیاری لوریاں سنیں - لیکن آج میرے دل میں اضطراب ہے - میری دلی آرزو ہے کہ تو پھر یہاں آئے -

آ! امّاں آ! اُس بے پایاں بحر خاموشی سے پھر آ! اور مجھے راحت کی نیند سُلا!

زمانہ گذر گیا - ماتا جیسی کوئی روشنی پھر دکھائی نہیں دی - اماں تیری بے غرض محبت - دلجوئی اور ہمدردی کو آنکھیں ترستی ہیں -

آہ! کوئی بھی تیری طرح بیمار روح اور تھکے ہوئے دماغ کو راحت نہیں پہنچا سکتا!

آ! امّاں آ! نیند کا میری آنکھوں پر غلبہ ہو رہا ہے - اور مجھے میٹھی نیند سُلا!

آ! اماں آ! اور اپنے کالے اور چمکیلے بالوں کو میری آنکھوں پر جھکا دے - دنیا کی سیاہ روشنی کو میری آنکھوں سے دور کر دے تاکہ اس چمکیلے اندھیرے میں پُر مسرت پرانی یاد کو تازہ کر سکوں -

آ کہ اس زمانہ کے محبت خیز ولولے تازہ ہو جائیں! آ اور مجھے میٹھی نیند سُلا!

آ - اور مجھے اپنی محبت بھری گود میں اُٹھا لے - اپنی چمکیلی لٹوں کو میری تھکی ہوئی آنکھوں کے آگے پھیلا دے - اور اس طرح سُلا کہ پھر نہ کبھی جاگوں اور نہ روؤں!

گوپال کرشن - یاس

نالۂ نے

گزشتہ ستمبر کی آخری رات میں مدہوشی کے عالم میں دنیا و مافیہا سے غافل سو رہا ہوں۔ ایک وحشت انگیز خواب کسی بیدرد کی بے اعتنائی کی اذیت پہنچا رہا تھا۔ کہ یکایک آنکھ کھل گئی۔ حیران تھا کہ یہ غیبی امداد کیسے دستگیر ہوئی۔ دفعتاً ہوا کی موجوں میں ایک نہایت دلکش آواز کی موجودگی کا احساس ہوا۔ کانوں کے لطیف پردوں میں سے ہوتی ہوئی فوراً دل تک جا پہنچی اور اس عجیب الخلقت مضغہ کو مضطرب کر دیا۔ نگاہیں اس بیقراری کے عالم میں آسمان کی طرف اٹھیں۔ پہر بھر رات باقی تھی۔ ستارے جن کے سیمیں تیروں نے ابتدائے شب میں کئی دلوں کو گھائل کر رکھا تھا۔ اور جن کی چشمک نے ہزاروں مہ جبینوں کے دلوں کو امنگوں کی شیریں چشموں سے لبریز کر دیا تھا۔ ہمہ تن گوش ہو رہے تھے۔ باد نسیم مؤدبانہ طور پر اسی لطیف آواز کو فضا میں پریشان کر رہی تھی۔ چاند ان آسمان کی طرف اٹھتی ہوئی ہم آہنگی کے اشتیاق میں اپنی خوابگاہ کو الوداع کہہ چکا تھا۔ میرا دل اپنے استخوانی قفس کی سلاخوں میں نے کی ان دلفریب نغموں کے ساتھ رقص کر رہا تھا۔ ایک مشہور آگ بھڑکی اور آن کی آن میں اس مسرت کے حاصل کو فنا کر گئی۔ میں نے ایک آہ سرد کھینچی اور کہا۔

اے نے! تیری خلقت آگ۔ پانی اور ہوا سے ہوئی۔ میری ہستی بھی ان ہی کی برکت سے معرض ظہور میں آئی۔

انسان جس نے تجھے بنایا اور برتا تجھ پر کامل طور پر مختار ہے۔ میں بھی باوجود حیرت انگیز استعدادوں اور قویٰ کے اپنے خالق اور مالک کے قبضۂ قدرت میں ہوں!

تیری روح میں بیتابی ہے۔ مجھ میں سیماب کی صفت!

تو سوراخوں سے پُر ہے۔ میں چھیدوں سے چھلنی!

لیکن .... تجھ میں اور مجھ میں ایک نمایاں فرق ہے۔ تو نادانستگی کے عالم میں ہزاروں دلوں کو بیخود اور وارفتہ کر دیتی ہے۔ میں باوجود مسلسل سعی کے ایک اکیلے دل کو اثر پذیر کرنے میں ناکام رہا ...... جی چاہتا ہے تیرے نغموں میں مل جاؤں۔ اور اس کے اضطراب کے عالم کو دیکھوں!

غلام عباس تمیم۔ بی۔ اے

جنسِ لطیف اور پالٹیکس

تاریخ ہمیں خواتین عرب کے بھی کارنامے بتلاتی ہے۔ کہ ان عورتوں نے کس طرح مردوزن کے کارناموں اور لڑائیوں میں دوش بدوش شرکت کی۔ خطروں کا مقابلہ۔ شدائد و ہولناک مصائب کا سامنا کیا۔ باوجود اس کے وہ سب کی سب بی بیاں اور مائیں تھیں۔ اور مردوں نے ان کے امورِ زندگی میں ہاتھ بٹانے سے کتنی شاندار ترقی حاصل کی۔ اور ہماری زمانہ میں بھی یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بڑے مشہور شہر کی علم شہراہوں پر سے گزرے۔ تو شاپوں۔ بنکوں۔ تاروں کے دفاتر کو انگریز عورتوں سے بھرا ہوا پائیگا۔ جو تجارتی کاموں سے لین دین کرتی ہیں۔ حساب و کتاب رکھتی ہیں۔ صنعت و حرفت کے تمام امور جیسا کہ چاہیئے نہایت استحکام و استواری سے انجام دیتی ہیں (فاضلۂ زینب نے یہ مضمون آج سے اکتیس سال قبل لکھا ہے اس قلیل عرصہ میں یورپ کی عورتیں کہاں سے کہاں پہنچ گئیں) یورپ نے (کیونکہ کسی قوم کے مرد اس صورت میں تعلیمیافتہ کہے جا سکتے ہیں۔ جبکہ ان کی تمام عورتیں بھی علم و فضل میں انہی کی طرح ممتاز ہوں۔ ورنہ نصف جسم انسانی کی درماندگی و بیکاری سے قومی ترقی کا ڈھانچ کبھی مکمل نہیں ہو سکتا) حیرت انگیز ترقی کی ہے یعنی وہاں کوئی کام انسانی زندگی کا کوئی اہم شعبہ ملکی قومی صدالتی صنعتی خدمت ایسی نہیں جسے مرد انجام دے سکتے ہیں۔ اور عورتیں اس سے قاصر ہوں۔ مصنفہ ہیں، مولفہ ہیں۔ ماہر سائنس و فلسفہ ہیں۔ روزانہ اخبار اپنے اہتمام سے شائع کرتی ہیں۔ دورانِ جنگ عظیم میں اہل پولیس کے تمام امور عورتوں نے انجام دیے۔ تمام محکمہ جات کے فرائض ادا کئے۔ کوئی کام ایسا نہ تھا جسمیں عورتوں کی امداد و اعانت شامل نہ ہو۔ امریکہ میں تو اس سے بھی زیادہ حقوق و مراعات حاصل ہیں۔ حتی کہ وکیل ہیں بیرسٹر ہیں۔ اکثر عورتیں کالجوں، سکولوں کی پروفیسری پر ممتاز ہیں۔ حکومت کی رکنیت۔ جمہور کی نیابت۔ پارلیمنٹ کی ممبری یہاں تک کہ ملکی، تمدنی، معاشرتی۔ سیاسی، انسانی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جسمیں عورتیں برابر کی حصہ دار نہیں۔ سچ ہے (ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ) حالانکہ یہ سب کی سب بیویاں اور مائیں ہیں۔ جو اپنی خانہ داری کی تمام مصروفیتوں کو بوجوہ احسن ادا کرتی ہیں۔ اور اشغال خارجی کا بھی نہایت خوبی سے انتظام کرتی ہیں۔ پھر جب ہم ان غریب عورتوں پر نظر ڈالتے ہیں۔ جو اسکندریہ و مصر اور اسکے اطراف و جوانب میں رہتی ہیں۔ تو ان کا غالب حصہ وہ ہے۔ جو مردوں کیطرح تمام کاروبار کرتا ہے۔ اکثر عورتیں تاجر ہیں۔ بیشتر عورتیں ہر قسم کی صنعت و حرفت کا کام کرتی ہیں۔ اور کچھ بیچاری تعمیر و مستری گری کی محنت شاقہ برداشت کرتی ہیں اور اسکے علاوہ ایسے ہی دیگر پیشوں میں مصروف ہیں۔ اور بہت کم کام ایسے ہیں۔ جو مطلوبہ معاش حاصل کرنے کے لئے صرف مردوں ہی سے مختص ہیں۔ لیکن ہم ایک کنبہ وار گھر کو دیکھتے ہیں۔ جسمیں شوہر بی بی اور بچے شامل ہیں۔ تو ادھر مرد اپنی خدمت انجام دینے میں مشغول ہو جاتا ہے ادھر بی بی اپنی حرفت و صنعت میں مصروف

ہو جاتی ہے۔ اگر تاجرہ ہو تو دوکان چلاتی ہے۔ اور باوجود کسب معاش کے اشغال ادا کرنے کے لئے امور خانہ کی بھی صلاحیت و قابلیت سے نگرانی کرتی ہے۔ اور اولاد کی پرورش گھر کا دھندا چلانا، خانہ داری کے تمام کام۔ کھانا پکانا۔ دھونا۔ نانجھنا۔ سینا پرونا سب کچھ کرتی ہے۔ اسیطرح ہم مقامات خرید و فروخت کو بھی عورتوں سے معمور پاتے ہیں۔ جو تمام معاملات لین دین اور اسی قبیل کے بیسیوں کاموں میں مردوں کا مقابلہ کر رہی ہیں جب ہم دنیا کی جانب نگاہ ڈالتے ہیں۔ تو اراضی کاشت کھیتوں کو عورتوں سے آباد پاتے ہیں۔ جو شمار میں مردوں سے کم نہیں جنہیں سے اکثر بلکہ سب کی سب اپنے شوہروں بیٹوں کی مدد کرتی ہیں اور مردوں کی طرح زراعت۔ قلبہ رانی۔ کھیت کاٹنا۔ اور اسی طرح کے وہ صدہا کاروبار چلاتی ہیں۔ جو زراعتی امور کے ساتھ مختص ہیں۔ اور جن پر بقائے عالم کا انحصار ہے۔ حالانکہ یہ سب عورتیں بھی شوہردار صاحب اولاد ہیں، پس عقلمند شخص جب اس دنیا کے تمام کاموں پر نظر ڈالے گا۔ تو دونوں جنسوں کو زندگی کے ہر شعبہ میں مساوی پائیگا۔ وہ چیز جس نے عورتوں کو اس قدر پیچھے ڈالدیا ہے۔ صرف بیکاری اور سہل انگاری ہے۔

انگریز خواتین کے امور سیاسی میں داخل ہونے اور انکے حق انتخاب کے طلب کرنے پر میں انہیں ہرگز خطاوار نہیں سمجھتی۔ بلکہ ان کی موئد ہوں کہ انہیں بلاشبہ اپنے حصہ کے مطالبہ کا حق حاصل ہے جبکہ وہ اپنے فرائض مفوضہ مردوں کی طرح ادا کرنے پر قادر ہیں۔

محترمہ سیدہ زینب نے اکتیس سال قبل استقلال و ثبات عزم کی ترغیب اپنی صنفی بہنوں کو دیتے ہوئے جو مبارک توقع ظاہر کی تھی۔ وہ اسی عزم بالجزم۔ حزم و ہمت، ثابت قدمی۔ جفاکشی و محنت کی بدولت خواتین انگلستان کو آج جنگ یورپ میں مردوں کے دوش بدوش سرفروشانہ جان نثاری۔ صبر آزما جرأت حیرافزا بسالت۔ خلوص آگیں خدمات وطنی و ملکی بجالانے کے معاوضہ میں حاصل ہو چکی ہے جس نے مردوں کے اس غلط یقین اور مہمل عقیدہ کو جو صنف لطیف کی دماغی۔ ذہنی۔ جسمانی۔ ناقابلیت و کمزوری و ضعف عقلی پر صدیوں سے مشتمل چلا آتا تھا۔ آخرکار باطل و بے بنیاد ثابت کر چھوڑا۔ سچ ہے۔

(افحسبتم انما خلقناکم عبثا)

نوشابہ خاتون قریشی

جلوۂ خیال

جب ماہتاب کی نور پاشیوں سے ریگ کے ذرّے چمک دیتے تھے۔ اور درختوں کو چھونے والی ہری ہری کونپلیں سروں پر کلاہ زریں رکھے ہوئے جھیل کے صاف و نیلگوں پانی کی نازک لطیف لہروں میں ایک چاند کے سیکڑوں بنجانے والے چاندوں کا تماشا کر رہی تھیں میں بھی عالم خیال میں

یکبارگی تکتکی باندھے خاموش بیٹھی ہوئی قدرت کی سادہ مگر دلچسپ منظروں کی نظارہ بازی میں منہمک رہتی۔ میں نہیں جانتی اسوقت میرا جسم خاکی جو کیمیائی طور پر اجزائے اربعہ سے بنکر تیار ہوا ہے مجھ سے کتنی دور اور کہاں رہ گیا تھا۔ میری تماشا طلب نگاہیں متحرک سطح آب پر جمی ہوئی تھیں اور اُن سے جوش اشتیاق ٹپکیاں تھا۔ گویا میں اُن کنولوں کو بغور دیکھ رہی تھی جنہیں خنک ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے چادر آب پر ادہر سے اُدہر تیراتے پھرتے تھے، اُن کی دودھ سے دھوئی ہوئی سفید سفید پنکھڑیاں جوش شباب سے کھلی پڑتی تھیں۔ اور پانی کی ننھی ننھی لہریں فرط محبت سے بےچین ہو ہوکر آغوش شوق میں دبوچنے کو بڑھتی تھیں۔ مگر رعب حسن اُن کی گستاخانہ دست درازیوں کو ایک نگاہ خشمگیں سے روک دیتا تھا۔"

بھونرا سطح آب سے کسقدر بلند اُن سرستان شباب پر منڈلا منڈلا کر نغمۂ محبت الاپ رہا تھا اور رات کی خاموش فضا اُس کے ولولہ خیز ترانوں سے گونج رہی تھی۔ مگر پھولوں کا استغنائے حسن نظر اُٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہ کرتا تھا۔ اشجار سبز پوش کی زمردیں شاخیں ہوائے سرور کی اٹکھیلیوں سے مستانہ وار جھوم رہی تھیں۔ اور طیور کبھی کبھی چٹکی ہوئی چاندنی کی ضیا باری سے صبح صادق کا دھوکا کھا کر چہکار اُٹھتے تھے۔ اور میں اُن کی نوائے دلگداز کی مشتاق ہو کر گوش دل کو اُن کی طرف پھیر دیتی تھی۔ لیکن قدرت کی وہ چھوٹی مخلوق اپنے بےمحل زمزموں کا احساس کر کے اس طرح خاموش ہو جاتی تھی جیسے کبھی بولی ہی نہ تھی!"

میں پھر سابق کی طرح سیر شب ماہ و لطف آب میں محو ہو جاتی تھی۔ میرا دل رسمی رفتار کے ساتھ متحرک تھا۔ مگر اُس کی خفیف صدا شب کے سناٹے میں مخل نہ تھی۔"

رات بڑھ رہی تھی اور آسمانی مسافر (ماہ) مارا مار منزلیں طے کر رہا تھا۔ تاروں نے ایک ایک کر کے غائب ہونا شروع کیا۔ سونے والے بستروں پر کروٹیں بدلنے لگے، مگر میں مناظر قدرت سے دلچسپی رکھنے والی ہنوز وابستہ خیال تھی،

منظر آب خاموش تھا۔ اشجار ساکت تھے۔ خدا کی چھوٹی بڑی مخلوق چپ تھی آسمان و زمین پر سکوت طاری تھا اور اُس خاموشی کے عالم میں کوئی چیز ایسی نہ تھی۔ جو مجھے خیالات کے عمق سے نکالکر بیدار کر سکے۔

یکایک مشرق سے ایک نور ساطع ہوا۔ تارے غائب ہو گئے۔ ماہتاب کے زرد چہرے پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں۔ نسیم سحری نے شانہ جھنجھوڑا۔ مسجدوں سے بلند ہونیوالی صدائے اللہ اکبر نے کانوں میں گونجکر ہوشیار کر دیا اور میں پرندوں کا، جو خدا ! زمزمہ سبحان سنتے رہا، نماز فجر میں مشغول ہو گئی۔

[redacted]

عجیب واقعہ نمبر۲

مسمات ـــــ بیگم میری منہ بولی بہن تھی۔ خدا بخشے چندے آفتاب اور چندے ماہتاب تھی میں نے اس شکل و شمایل کی عورت نہیں دیکھی۔ اسکا خاوند سب جج تھا۔ اور میری سہیلی کیطرح وہ بھی دیدار و جوان تھا۔ ان دونوں میں گل و بلبل۔ سرو اور قمری کی محبت تھی۔ دفعتہً سب جج کو پیغام اجل آ گیا۔ میری سہیلی کے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا وہ بیوہ ہوگئی اُسنے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ آٹھوں پہر رویا کرتی تھی اور اپنے کمرے میں منہ ڈھانپ کر پڑی رہتی تھی۔ ہم سب اُس کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے انسان اناج کا کیڑا ہے کب تک فاقہ سے رہ سکتی تھی۔ ایکدن وہ خلاف معمول خوش تھی۔ خود بخود کھانا مانگا اور سیر ہو کر کھایا۔ ہم سب حیران تھے کہ اسکی کایہ کیونکر پلٹ گئی۔ سب نے پوچھا مگر اُسنے کانوں پر ہاتھ دھرے۔ اب اس کا یہ معمول ہو گیا تھا۔ کہ جمعہ کی رات کو پُر تکلف پوشاک پہنتی اور اس میں چنبیلی کا عطر لگاتی تھی۔ اُس کے خاوند کو زندگی میں چنبیلی کے عطر سے عشق تھا۔ پھر سر شام اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیتی تھی اور صبح آٹھ بجے ہنستی ہوئی خوش خوش باہر نکلتی تھی۔ گرمی ہو یا سردی اُس کے معمول میں فرق نہ آتا تھا۔ چار سال تھا یہ دستور جاری رہا۔ چار مہینے ہوئے وہ مجھے ملنے آئی۔ ان ایام میں میری طبیعت علیل تھی۔ میرا پلنگ مہتابی پر جب شام کو جانے لگی تو بولی بوا۔ یہ آخری ملاقات ہے۔ آؤ گلے مل لو۔ مجھے حیران دیکھ کر وہ مسکرانے لگی اور کہا کہ آج میں تم کو وہ بات بتاتی ہوں جو کسی کو نہیں بتائی۔ تم کو معلوم ہے۔ مجھے تمہارے بہنوئی کی وفات کا کس قدر قلق تھا۔ زندگی دوبھر تھی میں آٹھ دن کے فاقہ سے تھی کہ وہ میرے کمرے میں آئے اور کہنے لگے کہ تو پردہ دنیا میں پریشان ہے اور میں عدم آباد میں سرگرداں ہوں۔ تیری جدائی مجھے شاق تھی۔ میری وجہ سے اہل جنت بےچین تھے۔ ابھی تیری عمر باقی ہے۔ مجھے ازراہ رحم اجازت مل گئی ہے۔ کہ ہر ہفتہ میں ایکبار تجھے ملا کروں۔ اب تو غم کو ترک کر دے۔ محبت سب کچھ کر سکتی ہے۔ یہ ملاقات ہماری خالص محبت کا اثر ہے۔ مجھ سے مزید حالات نہ پوچھو۔ بہن یہ راز میں ظاہر نہیں کر سکتی۔ بس اتنا بتا سکتی ہوں کہ وہ تمام رات میرے پاس رہ کر صبحدم غائب ہو جاتے ہیں کل آئے تھے اور کہنے لگے کہ میری جان تیار ہو جاؤ تمہارا وقت آ گیا۔ اس چہار شنبہ کو تم میرے ہی پاس آ جاؤ گی تمہارے لئے مکان تیار ہو گیا۔ لو بوا۔ خدا حافظ۔ اب میں جاتی ہوں۔ خدا کرے چہار شنبہ جلد آئے۔ میں نے سمجھا کہ میری سہیلی دیوانی ہو گئی ہے۔ مگر تعجب تو یہ ہے کہ اسنے ٹھیک چہار شنبہ کو قلب کی حرکت بند ہو جانے سے رحلت کی۔ ماہران علم ارواح شائد اس عجیب واقعہ پر کوئی روشنی ڈال سکیں۔

خورشید سلطانہ

فاقہ کش منعم

انڈرسن محکمہ ریل کا ایک امیر کبیر ٹھیکہ دار تھا۔ ممالک متوسط کے ایک ضلع میں اس کی عالیشان کوٹھی اور لاکھوں کی جائداد تھی۔ جون کے مہینے میں ہندوستان میں بلا کی گرمی پڑتی ہے۔ صبح کے وقت انڈرسن اور اس کی میم برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک فقیر آیا۔ اور سوال کیا۔ صاحب کی طبیعت گرمی کی وجہ سے بدمزہ تھی۔ جھڑک کر بولا۔ جاؤ روٹی نہیں ہے۔ فقیر نے کہا بابا روٹی نہیں ہے۔ تو دام دیدے میں خرید لونگا۔ صاحب کو جواب سوال کا دماغ کہاں تھا۔ بگڑ کر غلام کو بلایا۔ جنہوں نے فقیر کو دھکے دیکر نکالدیا۔ جاتا ہوا فقیر بولا اچھا صاحب گھڑی بھر میں تمکو بھوک کی تکلیف معلوم ہو جائیگی۔ انڈرسن نے قہقہہ لگایا۔ اور کہا۔ ایسے دلی بہت دیکھے ہیں۔ دس بجے کھانے کا گھڑیال بجایا گیا۔ اور میاں بیوی میز کے روبرو بیٹھ گئے۔ جب پہلی پلیٹ صاحب کے روبرو آئی۔ تو اس میں دو جھینگر تیر رہے تھے۔ صاحب نے خادم کو دھمکایا اور کہا۔ کہ آنکھیں کھولکر کھانا لایا کرو۔ خادم کو حیرت سے سکتہ ہو گیا۔ اسنے کہا حضور کیا عرض کروں۔ جب میں پلیٹ لایا تھا۔ تو اس میں ہرگز ہرگز جھینگر نہ تھے۔ خیر جب دوسری پلیٹ کا رکاب پوش اٹھایا گیا۔ تو اس میں تمام سفید سفید کیڑے رینگ رہے تھے۔ صاحب نے خانساماں اور خانساماں نے صاحب کی طرف دیکھا۔ مگر دونوں خاموش ہو گئے جب تیسری پلیٹ آئی۔ تو اسمیں اصطبل کا کوڑا کرکٹ تھا۔ اب تو حد ہو گئی۔ صاحب بھوکے میز سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور بھوکے دفتر چلے گئے۔ صاحب کا ٹیفن ٹھیک دو بجے آیا کرتا تھا۔ صاحب کو امید تھی کہ آج قبل از وقت آجائیگا۔ مگر تین بج گئے اور نہ آیا۔ صاحب کی آنتیں قل ہو اللہ پڑھنے لگیں۔ جس کا غصہ پنکھا قلی پر نکلا۔ اور چپراسی کو مکان پر بھیجا گیا۔ کہ جاکر خانساماں کو ہمراہ لائے۔ ابھی چپراسی چند قدم ہی گیا تھا کہ صاحب ڈپٹی کمشنر مسٹر ہاکنس آگئے اور کہنے لگے کہ انڈرسن کیا بتاؤں تمہارا خادم ٹیفن لئے آرہا تھا۔ اتفاق سے اُسے میری موٹر کی ٹھوکر لگی اور وہ گر پڑا۔ اب وہ ہسپتال میں ہے۔ مگر بچ گیا ہے۔ فکر کا مقام نہیں ہے۔ انڈرسن خوش مزاج آدمی تھا۔ مگر گرسنگی کی وجہ سے اُسے غصہ آگیا۔ اور اُسنے ڈپٹی کمشنر کو وہ الفاظ کہے جو نہ کہنے چاہیئے تھے۔ ڈپٹی کمشنر یہ سمجھکر کہ اس کا مغز چلگیا ہے۔ وہاں سے چلدیا۔ چار بجے صاحب دفتر سے گھر آیا۔ اور چائے مانگی۔ خدمتگار روتا ہوا آیا۔ اور بولا کہ حضور کیا عرض کروں۔ خانساماں تو ہسپتال میں ہے۔ میں نے چائے تیار کرکے جونہیں برتن میں ڈالی۔ ایسی آواز آئی کہ جیسے بم چھوٹا۔ اور چائے دانی چکنا چور ہو گئی۔ ساتھ ہی چائے بہ گئی۔ ایک گھنٹہ تک انتظار کیجئے۔ صاحب نے کچھ جواب نہ دیا۔ اور موٹر پر سوار ہو کر سیدھے ریلوے اسٹیشن کے ریفرشمنٹ روم میں پہنچے۔ وہاں جاکر

[redacted]

معلوم ہوا کہ کھانا غائب ہے۔ اس کمرے کا تمام سامان باہر پڑا ہے۔ اتفاقاً کوئی چوہا نکل آیا تھا۔ طاعون کے خوف سے تمام کمرے کی صفائی ہو رہی تھی۔ آٹھ بجے میاں بیوی کپتان فریسر کی کوٹھی پر گئے۔ ان سے بڑی ملاقات تھی۔ نو بجے کے بعد کپتان صاحب اور ان کی بیوی کلب سے آئے اور کہنے لگے۔ راہ میں گاڑی اُلٹ کر چکنا چور ہو گئی۔ کرایہ کی گاڑی میں آئے تھے۔ انتظار کی تکلیف کی معافی چاہتے ہیں۔ خیر سوا نو بجے کھانا کھانے بیٹھے۔ کپتان صاحب کا خادم تھا تو سمجھدار۔ خدا جانے کیوں اُسوقت گھبرا گیا۔ اور شوربے کی پلیٹ انڈرسن کے کان پر گر گئی جس سے تمام کان جل گیا۔ پلیٹ نے گرتے گرتے برف آب کا گلاس کپتان کی میم پر جو ساتھ ہی بیٹھی تھی ــ اُلٹ دیا۔ اور بیچاری تر بتر ہو گئی وہ اُٹھ کر کپڑے بدلنے گئی۔ اور انڈرسن کی میم نے اپنے خاوند کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور کہا کہ بس یہاں سے چلو ورنہ ہندوستانی فقیر کی بددعا سے ان بیچاروں پر بھی کوئی آفت آ جائیگی۔ غرض دونوں بھوکے چل کھڑے ہوئے۔ اور کپتان کے اصرار سے بھی نہ ٹھہرے۔ راہ میں دیسی حلوائی کی دوکان تھی وہاں سے مٹھائی خریدی۔ حلوائی صاحب کا ممنون تھا۔ صاحب کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ اور مودّب ہو کر جو اُٹھا مٹی کا تیل گر گیا۔ صاحب نے دونا تو لیلیا۔ مگر چھوئے بغیر آگے چلکر سڑک پر پھینک دیا۔ تیل کی بو سے میم صاحب کا دماغ پریشاں ہو گیا تھا۔ دس بجے بیچارے گھر واپس آئے۔ خدمتگار نے اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے۔ دونوں خوش ہوئے۔ مگر بیٹھے بیٹھے اُکتا گئے کھانا نہ آیا۔ جب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ چونکہ صاحب وقت معینہ پر نہیں آئے۔ خدمتگار نے باورچی خانہ میں کھانا گرم ہونے کے لئے رکھدیا تھا۔ بھولے سے دروازہ کھلا رہگیا اور تمام کھانا کتے نوش کر گئے۔ اب کیا ہو سکتا تھا۔ دونوں بھوکے سو رہے۔ دوسرے دن بھی ایسا ہی ہوا۔ تیسرے دن دونوں فقیر کی جھونپڑی میں گئے۔ اُس نے اُنہیں روکھے سوکھے ٹکڑے کھلائے مٹی کے برتن میں پانی پلایا۔ اور سمجھایا کہ دنیا میں فقط دولت ہی طاقت نہیں ہے خدا کو سب اختیار ہے وہ چاہے تو سونے کو مٹی کر دے۔ اب خدا کی مرضی یہ ہے۔ کہ سیدھی نیت سے ولایت چلے جاؤ۔ ورنہ فقیر کی دعا سے بھوکے مر جاؤ گے۔

صاحب نے فقیر کے فرمان کے بموجب دوسرے دن ہی بمبی کی طرف کوچ کیا۔

(الیس کرچی)

سبزہ بیگم

مہملات غالب

شاید بہ مدعائے تو گویم حکایتے　　　یکبار عرضِ حال ہمرائے تواں شنید

شباب اردو کے ایک پرچے میں حضرت علامہ حاجی عبد المالک صاحب مشیرال بہاولپور نے غالب کے بعض اشعار غرقاب کرنے کی رائے دی۔ حضرت علامہ نے تو سرسری طور پر فرما دیا تھا۔ لیکن حضرت یاس نے اس موقع کو غنیمت سمجھا۔ اور جلے دل کے پھپھولے خوب پھوڑے۔ مولانا عامل نے محاکمہ لکھکر زخموں پر نمک پاشی کی اور اسلح غالب کی یہ پیشگوئی پوری ہوگئی ؎ ہئے چہ میگویم اگر انیست وضع روزگار۔ دفتر اشعار باب سوختن خواہد شدن

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ بعض اوقات جزئیات کے نظر انداز کردینے سے شعر میں گنجلک پیدا ہو جاتی ہے اور یہ نقص غالب کے کلام میں کسی حد تک موجود ہے۔ مگر اتنا نہیں کہ مہملیت کی حد تک پہنچ گیا ہو۔ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ اشعار زیر بحث بمعنی ہیں۔ پھر بھی اُنکے اخراج کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ ہمارے خیال میں یہ اشعار بجائے اس کے کہ ہمارے نوجوان شعرا پر بُرا اثر ڈالیں تازیانہ عبرت کا کام دینگے۔

تعجب ہے کہ اساتذہ ماسبق کے کلام میں سینکڑوں جگہ اس قسم کے نقائص پائے جاتے ہیں لیکن اُنپر کسی صاحب نے قلم نہ اُٹھایا نزلہ اگر گرا تو بیچارے غالب پر ؎ کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوک بیداد کہ ہم۔ خود اٹھالاتے ہیں جو تیر خطا جاتا ہے آخر اس بارے میں غالب کی تخصیص کیا ہے سوا اسکے کہ وہ ہندوستان میں پیدا ہوا اُسنے فارسی شاعری میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اور بگڑے ہوئے مذاق کی اصلاح کردی ؎

تو اے کہ محو سخن گسترانِ پیشینی　　　مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست

اسی پر بس نہیں کی۔ بلکہ جناب یاس نے اکتوبر کے شباب میں غالب کو سارق ٹھہرا کر اپنے دعوٰی کے ثبوت میں صائب کا یہ شعر ؎ ز کفرِ سبحہ شماراں خدا نگہدارد + کہ صد سر ست بہ یک حلقۂ کمند اینجا پیش کر دیا۔ اور غالب کے شعر ؎ شمارِ سبحہ مرغوبِ بُتِ مشکل پسند آیا۔ تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا کو اس کا سرقہ قرار دیا۔ ارباب فن انصاف فرماویں۔ غالب اور صائب کے شعر میں زمین و آسمان کا فرق ہے اس موقعہ پر ہم یہ جتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ خواہ مخواہ سرقہ کی تہمت لگا دینے کو جناب یاس نے اپنا نصب العین بنا رکھا ہے۔ دو تین سال ہوئے۔ آپنے نظارہ میرٹھ کے ایک پرچہ میں لسان الہند حضرت عزیز لکھنوی کے کلام پر تنقید کرتے ہوئے ؎ یا مصرع ہے نہ اس اقلیم میں بادِ نسیم۔ ہاں مگر جھونکے صبا کے آرہے ہیں بے حساب کو اس مشہور شعر ؎

نسیم غفلت کی چھا رہی ہے اُمنڈ رہی ہیں بلا کی نیندیں + کچھ ایسے سوئے ہیں سونیوالے کہ جاگنا حشر تک قسم ہے

سے ماخوذ تبلایا تھا۔ ناظرین اس ذوقِ سلیم کی داد دینگے۔ اگر سرقہ اسی کا نام ہے تو اس سے کوئی بھی بچ نہیں سکتا۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ایسا سرقہ کم و بیش ہر شاعر کے کلام میں موجود ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ظہوری ؎ برآں صیدِ مسکیں چہ بیداد رفت — کہ در دام از یادِ صیاد رفت

حزیں ؎ اے وائے بر اسیرے کز یاد رفتہ باشد — در دام ماندہ باشد صیاد رفتہ باشد

نظیری ؎ فسانہ مرثِ نظیری مکن کہ خواب کند — شکستہ کہ بیہدہ، و تیلا خفتہ است

میر تقی ؎ سرہانے میر کے آہستہ بولو — ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

؎ چو نفی نفی اثبات است از مردن نمے ترسم — بقائے من چو شمع کشتہ باشد در فنائے من

میر انیس ؎ خود پیام زندگی لائی قضا میرے لئے — شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لئے

متنبی ؎ اذا رأیت نیوب اللیث بارزۃ — فلا تظنن ان اللیث متبسم

سیف الدولہ کی مشہور تشبیہ کی نسبت جملہ ماہرین فن کا اتفاق ہے کہ شاہانہ تشبیہ ہے میر معزی نے سرقہ کرکے اس کا خون کر دیا۔ معزی ؎

نمائد خو بشتن قوسِ قزح چوں چنبرِ رنگیں — کہ باشد در زمیں پنہاں شدہ یک نیمہ زاں چنبر

چو پوشیدہ سہ پیراہن کہ ہر یک را او پیدا — بن و دامن یکے احمر یکے اصفر یکے اخضر

فاضل نقاد جناب یاس ؎ کا فرد دیندار ہیں ہے رشتہ واحد وہی — سب کے سب جکڑے ہوئے ہیں ایک ہی زنجیر میں

اگر یہ شعر غالب کا ہوتا۔ تو ہمیں آپکے مذاق سلیم سے توقع ہے کہ آپ ضرور فرما دیتے کہ یہ تو اس شعر کا سرقہ ہے

؎ کفر و اسلام در رہش پویاں — وحدہٗ لا شریک لہ گویاں۔

ستمبر کے شباب میں حضرت گھر جائسی نے سرقہ اور توارد پر ایک مفصل بحث کی تھی۔ لیکن ہمارے نقاد پھر بھی نہ سمجھے۔ مولانا غالب بھی یہ کہہ کے چپ ہو گئے۔ کہ کیا "زید ملزم کو اس لئے بری کیا جائے کہ بشل اسکے عمر نے بھی چوری کی تھی"

لیکن حضور انصاف کیجئے۔ جرم کی نوعیت میں تو کوئی فرق نہیں۔ پھر کس لئے زید کو قصور وار ٹھہرایا جائے۔ اور عمر کو پوچھا تک نہ جائے۔ علاوہ ازیں یہ تو ایسا جرم ہے جس سے اقلیم سخن کے تاجدار بھی نہیں بچ سکے غالب بیچارے کی کیا حقیقت ہے۔ آگے چلکر مولانا نے ایک جگہ پھر فرمایا ہے۔ اساتذہ ماسبق کے کلام میں تو ایک آدھ جگہ توارد ہوا ہوگا اگر آپ نے شعراء فارسی کے کلام کا مطالعہ بخوبی کیا ہوتا۔ تو کبھی ایسا نہ فرماتے۔ خمسہ نظامیؒ کے مقابلے میں خسروؒ اور جامی کے خمسے رکھکر دیکھئے ایسا سرقہ سینکڑوں جگہ نظر آئیگا۔ ملاحظہ فرمائیے۔

نظامی ؎ دو کار است باقرِ خسندگی — خداوندی از تو زما بندگی

خسرو ۔ اے صفت بندہ نوازندگی + از تو خدائی و ز ما بندگی ۔ نظامی ۔ مرا اے کاشکے مادر نزادے

وگر زادے بخورد سگ بدادے + جامی ۔ مرا اے کاشکے مادر نمیزاد ۔ بجائے شیر مادر زہر میداد +

نظامی ۔ زن از پہلوئے چپ گویند برخاست ۔ نیاید ہرگز از چپ راستی راست

جامی ۔ زن از پہلوئے چپ شد آفریدہ کس از چپ راستی ہرگز ندیدہ

حاشا اس سے یہ مقصود نہیں کہ یہ بزرگوار سارق تھے ۔ الحق کہ ان کا دامن کمال سرقہ کے دھبے سے بالکل پاک ہے ۔ ہمارا مقصد صرف تفہیم ہے کاش کہ آپ سرقہ و توارد میں افتراق کر سکیں ۔ آپ جس چیز کو سرقہ سمجھتے ہیں ۔ ہمارے نزدیک وہی چیز غالب کی علو طبیعت کی دلیل ہے ۔ ایسے شعرائے فارسی ہی نہیں بلکہ مغرب و مشرق کے شعراء سے یکساں توارد ہوا ہے ۔ چنانچہ کبھی کبھی انکا طائر فکر مغربی شاعر کے شہباز خیال کے ساتھ گرم پرواز نظر آتا ہے ۔ پوپ انگریزی کا مشہور شاعر ہے ۔ اُس نے اوڈ آن سالیچیوڈ کے عنوان سے ایک نظم لکھی اس نظم کے اخیر میں وہ لکھتا ہے [۵۱]

یہی مضمون غالب کے ہاں موجود ہے + رہیے اب ایسی جگہ چلکر جہاں کوئی نہ ہو ۔ ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے ۔ کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو + پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

دونوں نظموں کا موازنہ کرنیکا یہ محل نہیں لیکن ہم اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ غالب کے اشعار میں سوز و گداز ہے ۔ پوپ کی نظم اس سے خالی ہے ۔ پوپ ایک جاہ طلب آدمی تھا ۔ روپیہ پیسہ کی کوئی کمی نہیں تھی کیونکہ اُسکا باپ ایک سوداگر تھا ۔ جو کافی جائداد چھوڑ گیا تھا ۔ اُس نے عمر بھر امراء کی صحبتوں میں بار پانے کو فخر سمجھا اور وہ لندن کی فیشن ایبل سوسائٹی میں خاص قدر کی نظر سے دیکھا جاتا رہا ۔ برخلاف اسکے غالب نے تمام عمر مصائب میں کاٹی ۔ چچا کی جائداد ضبط ہوتے دیکھی ۔ بھائی دیوانہ ہو کر مر گیا ۔ غدر ۱۸۵۷ء کا ہولناک واقعہ اس کے سامنے گزرا ۔ ان واقعات نے اُسکی زندگی تلخ کر دی تھی ۔ وہ ہمیشہ موت کی آرزو کرتا رہا ۔ اور وفات کی تاریخیں نکالتا رہا ۔ یہ اشعار اُس کے درد دل کا سچا آئینہ ہیں ۔ دوست و احباب کی بے مہریاں ابنائے روزگار کی کج ادائیاں اور گمنامی کی زندگی بسر کرنے کی آرزو کے پر اثر طریقہ سے بیان کی ہے ۔ پوپ کے اشعار خالی خولی باتیں ہیں ۔ ع خوب اند خوش اند و لے بوئے ندارند ۔

علاوہ ازیں پوپ کی نظم کے ابتدائی اشعار پڑھنے سے یہ لطف بھی اُڑ جاتا ہے اور مضمون غیر مربوط نظر آتا ہے اس مضمون پر ہم انشاء اللہ پھر کبھی قلم اٹھائینگے ۔ اب ہمارے نقاد صاحبان انصاف فرمائیں ۔ کیا حضرت یاس صاحب اسے بھی سرقہ قرار دینگے غالب پر سرقہ کا الزام دھرنے کو سینکڑوں موجود ہیں ۔ لیکن اُس کے ٹوٹے ہوئے مزار کی مرمت کرنیوالا کوئی نہیں غالب کو جانے دو ۔ میر تقی جو اردو شاعری کے آسمان کمال کے ماہتاب ہیں کس بیکسی کی حالت میں فوت ہوگئے ۔ اور کسی شیدائی ملک ادب سے یہ نہ ہو سکا کہ اُن کے مقبرہ کو دست حوادث روزگار سے بچائے رکھے ۔ آج لکھنو میں کوئی بھی نہیں جانتا ۔ کہ ان کا مقبرہ کہاں ہے ۔

۵۱ بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک ہم کہینگے حال دل اور آپ فرمائینگے کیا

زہرِ عشق

شہنشاہِ ہند نورالدین جہانگیر کے عہد میں ایک چشمہ دیکھا گیا۔ جس کا پانی اپنے اندر ایک خصوصیت رکھتا تھا۔ یہ چھ ماہ تو معمولی حالت میں بہتا تھا جس سے مویشی اور انسان اپنی پیاس بجھاتے تھے۔ لیکن اس کے بعد چھ ماہ کے لئے زہرِ قاتل بنجاتا تھا۔ شہنشاہ نے اس راز کی موشگافی کے لئے حکما کی ایک جماعت کو مامور کیا انھوں نے کچھ عرصہ کے بعد رپورٹ کی کہ یہ کوہِ ہمالہ کی بعض جڑی بوٹیوں کی تاثیر ہے جب بارش ہوتی ہے برف پگھلتا ہے اور پانی کا سیلاب آتا ہے تب یہ چشمہ لبریز ہوتا ہے اور اُس کا پانی زہرِ قاتل بنجاتا ہے

شہنشاہ نے کوہِ ہمالہ کی چوٹیوں سے یہ بوٹیاں منگائیں اور اُن کا جوہر نکلوایا جو عرق کی شکل میں نکالا گیا۔ اور اسکا تجربہ جب حیوانات پر کیا گیا تو ثابت ہوا کہ اس زہر کا سونگھ لینا ہی حیوانات کی زندگی کا خاتمہ کر سکتا ہے۔

شہنشاہ کا خیال تھا۔ کہ سولی پھانسی وغیرہ سزائے موت میں مجرم کو شدید تکالیف کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے پس اس زہرِ قاتل کے تیار ہو جانے پر اس نے یہ قرار دیا۔ کہ اب ایسے مجرم کو صرف یہ شیشی سنگھا دی جایا کریگی

شہنشاہ نے زہر کی شیشی اسکے خواص بتا کر اپنے ایک خاص نوجوان مصاحب کے سپرد کر دی اور اُسے تاکید کر دی کہ اُسے نہایت احتیاط سے مقفل کر کے رکھے تاکہ کسی انسان کا ہاتھ اس تک نہ پہنچے۔ اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد یہ نوجوان محل شاہی کی ایک کنیز پر فریفتہ ہو گیا مگر عجیب طرح سے یعنی صرف ساعدِ سیمیں کے نظارہ سے محبت کا تیر اسکے دل میں ترازو ہو گیا۔ اسنے اپنی محبوبۂ مطلوبہ کو ہر چند تلاش کیا۔ لیکن وہ گوگردِ سرخ اور لعلِ سپید بنگئی تھی یا لم۔ یاس میں اُسنے اس زہر کی تمام شیشی جس کا ایک قطرہ فیل مست کی ہلاکت کے لئے کافی تھا پی لی۔

(۲)

ایک ڈاکو کا مقدمہ ابھی ابھی فیصل ہوا شہنشاہ ہند نے اسکے لئے سزائے موت تجویز کی اور حکم دیا کہ شیشی منگائی جائے مگر شیشی کہاں سے آتی۔ شہنشاہ کا رنگ غصہ سے سرخ ہو گیا۔ اہل دربار گھبرا گئے۔ اسوقت نوجوان مصاحب نے قدموں پر سر رکھکر قصور کا اعتراف کیا۔ اور عرض کی کہ جہاں پناہ وہ شیشی تمام و کمال میں نے پی لیکن مجھ پر اثر نہیں ہوا غالباً زہر کی تاثیر کافور ہو گئی شہنشاہ کو یقین آیا لیکن حکما نے یقین دلایا کہ یہ زہرِ عشق کا کرشمہ ہے۔ زہر کا دفعیہ زہر ہے۔ اس نوجوان کا خیال دوسری طرف لگا ہوا ہے ورنہ خوفناک زہر مہلک اور قاتل تھا (۳) اب شہنشاہ کو یہ فکر ہوئی کہ نوجوان مصاحب کی اُمید بر آئے۔ اگلے وقتوں کے بادشاہ بھی عجیب دل رکھتے تھے۔ اسکو ایسے مقام پر بٹھا دیا گیا۔ جہاں سے وہ سب کچھ دیکھے اور اُسے کوئی نہ دیکھے۔ پھر محل کی کنیزوں کو حکم ملا کہ برقعہ پوش ہو کر وہاں سے گذریں صرف اپنی کلائی نہ چھپائیں۔ تمام کنیزیں وہاں سے گذریں صرف ایک باقی رہگئی لیکن طالب کی آنکھیں منور نہ ہوئیں جب آخری مہ پارہ اپنا ہاتھ برہنہ کئے ہوئے سامنے سے گذری تو نوجوان مصاحب کے بدن میں سنسنی سی پیدا ہو گئی وہ چلا اٹھا کہ خدا کی قسم میری آرزوئے دل یہی حور شمایل ہے شہریار کو اپنے مصاحب کی خاطر بہت عزیز تھی

شہنشاہ دولہا کا باپ اور ملکہ نور جہاں دولہن کی ماں بنی تھی اللہ اکبر عجیب زمانہ تھا اب ان باتوں کا یقین آنا دشوار ہے۔ شبلی مرحوم نے کیا اچھا کہا ہے ؎ کبھی ہمنے بھی کی تھی حکمرانی ان ممالک پر   مگر وہ حکمرانی جس کا سکہ جان و دل پر تھا۔ شادی بڑے تزک و احتشام۔ نہایت دھوم دھام سے ہوئی لیکن دنیا کی بے ثباتی اور فلک سفلہ پرور کی کج ادائی دیکھئے جب گل و بلبل کا عقد ہوا تو اس کے بعد شاہد ایک دن بھی زندہ نہ رہی۔ انکے جسم پانی ہوکر بہ گئے اور اس قسم کی عفونت پھیلی کہ وہ جس محلہ میں رہتے تھے وہاں کے بیشمار باشندے سوتے کے سوتے رہ گئے۔ اور حکما کی کوشش سے بڑی مشکل سے یہ وبا ٹلی۔

محمد ممتاز علی چشتی ممتاز

سوزِ جگر

جب تک متاعِ درد نہ پیدا کرے کوئی ۔۔۔ مشکل کہ سوزِ عشق سے سودا کرے کوئی
اے دُرِّ اشک نمکو ترازوئے درد میں ۔۔۔ شبنم کے ساتھ ڈال کے تولا کرے کوئی
اے چارہ سازِ زخمِ اذیّت پسند کو ۔۔۔ نشتر نہ ہو تو تنکے سے چھیڑا کرے کوئی
پہلے تو بِنکے یوسفِ مصرِ وفا بکے ۔۔۔ پھر آرزوئے خوابِ زلیخا کرے کوئی
لگ جائیگا کہیں کسی بُلبل کا کوسنا ۔۔۔ گُل اس چمن سرا کے نہ توڑا کرے کوئی
آ درد اُٹھکے سورۂ اخلاص دم کریں ۔۔۔ پہلو میں آکے تیر جو اٹکا کرے کوئی
اے شمع دیکھ موت ہے ٹھنڈی ہوا ہیں ۔۔۔ پروانے کے پروں سے نہ پنکھا کرے کوئی
کھلتے ہیں جان قبر میں بھی منکر و نکیر ۔۔۔ مطلب ہے یہ یہاں بھی نہ پٹکا کرے کوئی
طوفاں ہے اشک جنبشِ مژگاں حباب ہے ۔۔۔ تا چند سائیانیٔ دریا کرے کوئی
وہ نازِ نازکی ہے تو یہ ضعف کا غُرور ۔۔۔ تھامے اُسے کہ مجھکو سنبھالا کرے کوئی
سُنکر قفس میں مرغِ خوش الحاں کی داستاں ۔۔۔ اب بولنا یہ ہے کہ نہ بولا کرے کوئی
میں مر گیا امید میں اس انقلاب کی ۔۔۔ رُوٹھوں جو میں تو مجھ کو منایا کرے کوئی
اے تیر تیرا ساتھ نہ چھوڑینگے لختِ دل ۔۔۔ پھوسے تجھ کو سوچ کے کھینچا کرے کوئی
دل کو ہے سرد مہریٔ دُنیا کا عارضہ ۔۔۔ بہتر ہے اس کو آگ سے دھویا کرے کوئی
احمد کو بیخودی نے نگاہوں سے گم کیا ۔۔۔ اب اس شکستہ دل کو نہ ڈھونڈا کرے کوئی

ایڈیٹر



Austerities of BUDHA.

جلد ۴ نمبر ۵ بابت ماہ جمادی الثانی ۱۳۴۱ھ مطابق فروری ۱۹۲۳ء

شذرات

پروف ریڈر کے ایام علالت میں جنوری کے رسالے کے پروف ہیڈ کلرک نے پڑھے۔ اور بے پرواہی سے پڑھے۔ ہمیں افسوس ہے کہ محترمہ بنت مکرمی ڈاکٹر محمد عبد الکریم المتخلص بہ حنا کی غزل کے پانچویں اور ساتویں شعروں کے پہلے مصرعے غیر موزون چھپ گئے۔ جس کے لئے ہم محترمہ موصوف سے معافی کے خواستگار ہیں۔ ہر دو اشعار یوں ہونے چاہئیں ؎

زمانے میں کیسا ہے۔ یہ شور و شر　　الٰہی قیامت یہ کیا آگئی

تری آہ نے کیا کمالی ہے حنا　　کہ وہ یاس ہی یاس برسا گئی

اس ماہ میں کتب خانہ شباب چراغ سخن کیلئے جناب مشفقی ابو المعانی مرزا واجد حسین یاس عظیم آبادی ایڈیٹر کار امروز اور جانورستان کے لئے عزیز مکرم آغا محمد طاہر نبیرہ حضرت آزاد مرحوم کا رہون منت ہے۔ چراغ سخن رسالہ عروض و قوافی ہے جس میں علم عروض و قوافی کے نازک مسائل نہایت صاف زبان میں سلجھا کر بیان کئے گئے ہیں۔ اہل زبان و زباں دانی کا فرق اور صحیح مفہوم بتایا گیا ہے۔ اور ماہیت شاعری پر فلسفیانہ بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب مصنف یعنے جناب یاس موصوف سے بقیمت ایک روپیہ چار آنہ ملسکتی ہے۔

جانورستان شمس العلماء مولانا مولوی محمد حسین آزاد مرحوم کے ایام بیخودی کی دوسری تصنیف ہے۔ اس میں درندوں پرندوں اور چرندوں کے ظاہر و باطن پر نہایت پیاری زبان میں روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب مینجر آزاد بک ڈپو اکبری منڈی سے بقیمت دس آنہ دستیاب ہوسکتی ہے۔

روح سیاست مصنفہ جناب محمد عمر صاحب مترجم ہائی کورٹ جموں پر کسی سرسری طور پر اپنی رائے کا اظہار کیا تھا کئی ماہ کے بعد اس کا جواب مصنف صاحب موصوف نے لکھا۔ شباب میں مضامین بقید تاریخ آمد سلسلہ وار شائع کئے جاتے ہیں۔ تاکہ کسی کو شکوے کا موقعہ نہ ملے۔ یہ جواب اپنے نوٹ کے ساتھ ہم نے کاتب کو دیدیا تھا۔ تاکہ وہ فروری کے پرچے میں شائع ہو جائے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں۔ کہ وہ جواب اب ایک دوسرے رسالہ میں درج ہوگیا ہے۔ اس لئے ہم جناب مترجم صاحب سے دریافت کرتے ہیں۔ کہ کیا اب بھی اُسے شباب میں درج کرنے کی ضرورت ہے؟

شباب اردو جلد دوم کے نمبر اول کی ایک صاحب کو ضرورت ہے۔ یہ اکتوبر ۱۹۲۱ء کا پرچہ ہے۔ جس میں علامہ خانصاحب حاجی محمد عبد المالک مشیر مال بہاولپور کی تصویر ہے۔ اگر کوئی صاحب فروخت کرنا چاہے۔ تو مطلع فرمائیں۔ قیمت معقول دی جائیگی۔ جلد اول و دوم و سوم سالم یا ان کے متفرق پرچوں کی بھی بہت ضرورت ہے۔

ذکاء اللہ ایم۔ اے
جائنٹ ایڈیٹر

اللہ اکبر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شباب اردو

آگ اور دھواں

صفدر پنجاب یونیورسٹی کا ایم اے۔ اور ایک روشن دماغ نوجوان تھا۔ یہ کتاب کا کیڑا نہ تھا۔ اس نے طوطے کی طرح مضامین یاد کر کے امتحان پاس نہ کیا تھا۔ یہ اُن طالب علموں میں سے نہ تھا۔ جو صرف قوت حافظہ کی بدولت ہمیشہ تعلیمی نتائج میں اول یا دوم نکلتے ہیں اپنی ڈگری پر پھولے نہیں سماتے۔ لیکن جنہیں اتنی بھی قابلیت نہیں ہوتی کہ دو سطریں درست لکھ سکیں املا اور انشا کا تو کیا ذکر۔ اُس نے علم تجربے مشاہدے اور قدرت کے مطالعہ سے حاصل کیا تھا۔ وہ نظم اور نثر دونوں پر حاوی تھا۔ اور جس وقت تقریر کرتا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ اور ایک دریائے فصاحت امڈا چلا آتا ہے۔ وہ ایک دبلا پتلا میانہ قد انسان تھا۔ پچیس سال کی عمر تھی۔ شکل صورت بھی دلکش نہ تھی۔ مزاج تیز تھا۔ مگر قدرت نے اپنے جوہر اس میں کوٹ کوٹ کر بھر دیے تھے۔ بیس سال کی عمر میں اُس کی شادی ایک شریف زادی کے ساتھ ہو چکی تھی جس کا نام ناطقہ تھا۔ وہ ایک اخبار نویس کی ماہ لقا زہرہ ادا دختر تھی۔ اس کی تعلیم بی۔ اے تک تھی۔ سب کو یقین تھا۔ کہ وہ بی۔ اے کی ڈگری عزت کے ساتھ حاصل کرے گی۔ مگر والد کی ناگہانی موت سے دل کی دل ہی میں رہی۔ اور تمام منصوبے خاک میں مل گئے۔ اگر ہماری امیدیں ہمیشہ بر آئیں تو یہ دنیا پرستان بن جائے

ناطقہ کو اپنے روشن ضمیر شوہر سے عشق تھا۔ مرد اکثر عورتوں کا دل لبھانے کے لئے چھیلے منڈے رہتے ہیں۔ انگریزی لباس۔ خوشبو اور سینٹ کا استعمال کرتے ہیں۔ چیخنے والے بوٹ کو سمندِ حُسن کے لئے تازیانہ اور سرخ نکٹائی کو صیقل زنگار بدرونی سمجھتے ہیں اور واقعی بعض کوتہ اندیش عورتیں اس دامِ تزویر میں گرفتار ہو جاتی ہیں۔ لیکن ناطقہ کا عشق ظاہرداری کا دست نگر نہ تھا۔ وہ صفدر کی صرف اس لئے دلدادہ تھی کہ وہ اس کا خاوند تھا صفدر خوبصورت نہ تھا۔ وہ تندخو تھا۔ زود رنج تھا مگر ناطقہ کی آنکھوں میں یوسف ثانی تھا۔ ماہ کنعان تھا۔ صفدر کی مالی حالت بھی اچھی نہ تھی آجکل ایم۔اے تک تعلیم پانا طلسم کشائی سے کم نہیں وہ دن گئے کہ جب مسجدوں کے درویش اور پاٹ شالوں کے طالبعلم چنے چبا کر گذارہ کرتے تھے فیس معاف تھی۔ کتابیں سستی مل جاتی تھیں۔ صرف محبت اور استقلال سے حاکم عدالت بن جانا ایک یقینی بات تھی۔ اب اعلیٰ تعلیم صحت اور دولت کی قربانی کے بغیر عنقا ہے۔ ناطقہ کو جواہرنگار زیور اور مخمل اور کمخواب کے فوق البھڑک لباس جو صنفِ نازک کے دل کے لئے دامِ صیّاد ہیں میسر نہ تھے۔ اُس کے سنگھار کا سامان صرف ایک جڑاؤ گلوبند۔ ایک طلائی جوڑی کڑوں کی اور کانوں کے دُر تھے۔ مگر وہ سرشارِ محبت تھی۔ کمبل کو شال اور زربفت سمجھتی تھی۔ کوئی وقت ایسا نہ تھا۔ کہ ہنسی اُس کے چہرے کی بلائیں نہ لیتی ہو۔

(۲)

صفدر عالم تھا۔ فاضل تھا۔ شاعر تھا۔ مقرر تھا۔ مؤلف تھا۔ مصنف تھا۔ مگر نازک مزاج تھا۔ اُس کی غیرت اُسے اجازت نہ دیتی تھی۔ کہ وہ خودداری یا حُریّت کو ہاتھ سے دے۔ اُسے حفظِ مراتب کا بہت پاس تھا۔ اُسے خوشامد سے نفرت تھی۔ اور صاف گوئی اس کی عادت۔ ذرا سی بات پر بگڑ جاتا تھا۔ فارغ التعلیم ہوکر اُس نے سررشتہ تعلیم میں ملازمت ڈھونڈی۔ سب کو یقین تھا کہ اُس کو پروفیسری مل جائیگی۔ مگر تقدیر کو کچھ اور منظور تھا۔ یہ ڈائرکٹر کی ملاقات کو گیا۔ صاحب بہادر مصروف تھے۔ یا انہوں نے پرواہ نہ کی اسے دو گھنٹے دفتر کے باہر انتظار کرنا پڑا۔ جب صاحب نے بلایا تو اُس نے اُن کی کج اخلاقی کا شکوہ کیا۔ یہ صاحب کو بُرا معلوم ہوا۔ سچی بات سب کو کڑوی لگتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس محکمہ کا دروازہ اس کے حق میں ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

محکمہ تعلیم سے جس کے لئے وہ نہایت موزون تھا۔ محروم ہوکر اُس نے مصنفی اور

اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کیلئے سعی کی یہاں خاندانی خدمات اور سفارش اور رسوخ کا مطالبہ ہوا صفدر کو اپنے ذاتی جوہر پر ناز تھا اُسنے سر دفتر سے ملنا یا حسرار سے مدد مانگنا کسرشان سمجھا - اسنے اپنی عرضی کو وارنٹ تقرر خیال کیا - مگر یہاں بھی مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ نصیب نہ ہوا - ایک بڑے دفتر میں تلاش روزگار مل جانے پر اُسے معلوم ہوا کہ وہاں کا مہتمم بندہ درم ہے اور زر کو قاضی الحاجات جانتا ہے - بھلا صفدر کا اخلاق کب گوارا کر سکتا تھا کہ وہ رشوت دیکر ملازم ہو - پولیس کے حاکم اعلےٰ کو درخواست دینے پر جواب آیا کہ اگر آپ انسپکٹری چاہتے ہو تو بطور تربیت کیلئے جا سکتے ہو - صفدر تو نیم راضی ہوگیا - مگر ناطقہ نے زور سے مخالفت کی اور کہا کہ تم پولیس کے لائق نہیں - وہاں بڑے عیار کا کام ہے تم پرستار درد اور شیدائے سوز و گداز ہو تم ایک چیونٹی کو ستاتے ہوئے گھبراتے ہو - آخر یہ قرار پایا کہ صفدر قانونی کالج میں داخل ہو کر وکالت کی سند اور ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کرے - ناطقہ بڑی سمجھدار تھی اور خاوند کی عاشق زار لیکن اسمیں شک نہیں کہ وہ مایوس سی ہو گئی بتقاضائے بشریت اس ملک کی عورتوں کیطرح اُس کی تمنا یہ تھی کہ اُسکا خاوند ڈپٹی مجسٹریٹ ہو وہ عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر حکمرانی کرے - لوگ اُسے حضور اور سرکار کہیں - افسوس اُسے خبر نہ تھی کہ ہر شے جو چمکتی ہے سونا نہیں - پھولوں میں تیز کانٹے نہاں ہیں -

(۳)

دو سال گزر گئے - ایل - ایل - بی کے امتحان کا نتیجہ نکل آیا - کامیاب طلبا کی فہرست میں سب سے اوّل نمبر پر جس کا نام تھا وہ صفدر تھا - صفدر کو اپنی اس زریں کامیابی پر ناز تھا اور اسکی بیوی فخریہ اپنی سہیلیوں سے کہنے لگی کہ اب وکیل صاحب بہت روپے کمائینگے دوسرے راسٹگن کہلائینگے - اور دس سال کی پریکٹس کے بعد خدا نے چاہا تو ہائی کورٹ کے آنریبل جج منتخب ہونگے - اس موہوم امید نے میاں بیوی کو اس قسم کے سبز باغ دکھائے کہ انہوں نے رہنے کا گھر رہن رکھکر ایک عالیشان مکان کرایہ پر لیا - اسے سامان آرایش سے سجایا اور دفتر کے کمرے کو ہر قسم کی قانونی کتابوں سے مالا مال کر دیا - عورتوں کو زیور بہت پیارا ہوتا ہے یہاں تک کہ خاوند کو وہ ٹیکے اور جھومر سے تشبیہ دیا کرتی ہیں - ناطقہ نے اپنے کڑے بیچ ڈالے اور جناب صفدر کے لئے عمدہ تانگا اور سبک رفتار گھوڑا مہیا کر دیا - یہ سب کچھ ہوا - مگر دوکان نہ چلی - ناطقہ کا شوہر اخلاق و آداب کا بہت پابند تھا - کیا مجال کہ وہ کسی دلال کو پاس بھٹکنے دے - جس شہر میں بدقسمتی سے اُس کی رہایش تھی - وہاں دلالی کا بہت زور تھا - ایک دن رحیم دلال نے جو نہایت منہ پھٹ تھا - اور کسی زمانہ میں پہلوان اور مشہور گرہ کٹ رہ چکا تھا صاف صاف کہدیا کہ اگر چاہتے ہو کہ کچھ کماؤ اور مقدمات آئیں تو ستر فیصدی دلالی دو - اگر

دس روپے موکل سے دلوائینگے تو اسمیں سے نصف ہم لینگے یہ ہمارا دستور ہے اور اپنی غرض سے ہمارے طالب ہیں یہ دیتے ہیں یہ سنکر صفدر کا چہرہ غصہ سے لال چقندر ہوگیا۔ اگر منشی دلال کو رخصت نہ کرتا۔ تو خون خرابہ ہوجاتا۔ ادھر صفدر چلا رہا تھا۔ ادھر دلال خم ٹھونکے کھڑا تھا۔ بارے خیریت گذری کہ دلال ٹل گیا۔ مگر یہ خبر بجلی کیطرح دلالوں کے جرگہ میں پھیل گئی۔ استاد رحیم اور اسکے چیلے چانٹے موکلوں کو ورغلانے لگے ہندوستان میں بھیڑ چال مشہور ہے لوگ نام پر مرتے ہیں ذاتی جوہر دیکھنے والے بہت کم ہیں۔ صفدر ایک خوش رنگ بے نظیر پھول تھا۔ مگر اُسے سونگھنے یا دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ ایک آبدار دُرِ شہوار تھا۔ مگر اُسے پرکھنے والا کوئی نہ تھا۔ دوکان پہلے سرد ہوگئی۔ پھر بند ہوگئی۔ صفدر نے حالت غم اور غصہ میں اپنی قانونی کتابیں بیچ ڈالیں اور وکالت ترک کردی

(۴)

جب ہر طرف سے مایوسی ہوگئی جب مرہونہ مکان بک گیا اور اُس کے حق انفکاک کی قیمت ضروریات روزمرہ پر قربان ہوچکی۔ تو صفدر اور ناطقہ ضروریات کے لئے پریشان رہنے لگے۔ محتاجی بری بلا ہے۔ ناطقہ اپنے پیارے شوہر کو پراگندہ خاطر دیکھ کر بیتاب تھی۔ مگر معذور اور مجبور تھی کوئی صورت بہتری کی دکھائی نہ دیتی تھی۔ ایک دن اُس نے خاوند سے کہا کہ اگر تم اجازت دو تو میں معلمہ بن جاؤں۔ مگر صفدر نے نہ مانا اور کہا کہ جب تک میں زندہ ہوں یہ نہیں ہوسکتا۔ کہ تم نوکری کرو۔ ناطقہ نے اصرار نہ کیا وہ صفدر کی عادت سے واقف تھی آخر سوچ سوچ کر اُس نے کہا کہ تم خدا کے فضل سے شاعر ہو مصنف ہو۔ ایک علمی رسالہ نکالو۔ اُمید ہے فائدہ ہوگا۔ شائد اُس سے ہمارے دن پھریں۔ صفدر نے یہ مشورہ پسند کیا اور کہا تمہیں گویا الہام ہوا۔

گھر کا رہا سہا سامان کوڑیوں کے مول دیا گیا۔ اور رسالہ نکلا۔ رسالہ نہایت شان و شوکت سے نکلا۔ یہ ایک لاجواب علمی فلسفی۔ تاریخی۔ ادبی رسالہ تھا۔ جس نے دیکھا اُسنے پسند کیا۔ مگر چھ ماہ کے عرصہ میں بمشکل دو سو خریدار بنے۔ اُس کا خرچ آمدن سے بہت بڑھ گیا۔ صفدر نے اپنے دوستوں اور ناطقہ نے اپنی سہیلیوں کو لکھا۔ مگر کسی نے پروا نہ کی۔ صفدر اپنے ایک ہم جماعت کے پاس گیا اور اس سے مالی امداد کے لئے کہا۔ مگر اُس نے کچھ عرصہ تو بہت لیت و لعل میں رکھا آخر ٹال دیا۔ یہ شخص ایک دولتمند زمیندار تھا۔ لاکھوں روپے کی جائداد تھی۔ شاعری کا بھی دعوٰی تھا۔ ہزاروں روپے عیش و عشرت میں اڑاتا تھا۔ ہر روز تھیٹر میں جاتا تھا۔ رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوتی تھیں شراب پانی کی طرح بہائی جاتی تھی۔ مگر اتنی توفیق نہ تھی کہ مولفوں یا مصنفوں کی دستگیری کرے صفدر کو اس کم ظرف مگر مالدار دوست کی وعدہ خلافی پر بہت غصہ آیا۔

خون جگر پی کر خاموش ہو رہا۔ اب ناطقہ اور صفدر کی آنکھ کھلی اور اُن کو معلوم ہوا کہ اس ملک میں مٹی بکتی ہے۔ گوبر بکتا ہے۔ لیکن وہ شئے جس کا کوئی خریدار نہیں مصنف کی تصنیف ہے۔ یہاں سعدی یا شیکسپیئر پیدا کرنا گناہ ہے اور شعر کہنا دیوانگی ہے۔ یہاں ایجاد اور اختراع تضیع اوقات ہے یہاں اصلاح اخلاق کا خیال حماقت ہے۔ یہاں دولتمند ریفارمروں کو بڑھانا جرم سمجھتے ہیں یہاں عوام الناس بھائی بندوں کی دستگیری کسر شان تصوّر کرتے ہیں۔ اگر کسی شے سے انس ہے۔ تو ہُو حق لام کاف شور وغل دغل فصل ریاکاری اور دام تزویر سے۔ اب ناطقہ اور صفدر نے بھانپ لیا کہ اُن کے رسالے کی بنیاد ریت کے ٹیلوں پر ہے۔ یہاں ایسے لوگوں کی گنجائش نہیں ہے جن کی نظم نے جزائر یونان کو آباد کر دیا۔ یہاں ایسے جوانمردوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ جن کی قوت ایجاد نے آگ دھوا سمندر اور بجلی کو لونڈی غلام بنا لیا۔ آہ رسالہ کوئی چھ مہینے زندہ رہا۔ اور پھر نقش زنگار طاق نسیاں بن گیا۔

(۵)

تنگی اور عسرت کا منہ کالا ہو یہ انسانی زندگی کے درخت کے لئے دیمک ہے۔ صفدر پہلے ہی دُبلا پتلا تھا۔ اب اور بھی ظہیر ہو گیا۔ اُس کا دماغ جو فہم و فراست کا آئینہ تھا۔ اب تفکرات کے غبار سے دھندلا پڑ گیا۔ اُس کا قلم جو شمشیر دو پیکر سے کم نہ تھا۔ اب پریشانیوں کے زنگار سے بیکار ہو گیا۔ اُس کو ابنائے جنس سے نفرت ہو گئی۔ اُس کو یقین ہو گیا کہ انسان سے بڑھ کر خود مطلب کوئی نہیں جس کو دیکھو گوں کا یار ہے۔ اُس نے لوگوں سے ملنا جُلنا چھوڑ دیا۔ مطالعہ سے اُس کو رغبت نہ رہی۔ اُس کے دل میں خوفناک شکوک پیدا ہو گئے ایسے نازک وقت میں ناطقہ کی محبت اُس کے لئے ابر رحمت ثابت ہوئی۔ اگر وُہ نہ ہوتی۔ تو وہ خدا کی ہستی سے معاذ اللہ منکر ہو جاتا۔ ناطقہ کو خدا نے نعمت حسن و جمال کے ساتھ ملا ایک فریب آواز بھی عطا کی تھی۔ وہ زندگی کے تاریک لمحوں میں غالب اور حافظ کی غزلیں گاتی تھی جس سے صفدر کو فوراً نیند آجاتی تھی۔ صفدر کی غیر حاضری میں وہ گوٹا بنتی تھی۔ ریشمی رومال کاڑھتی تھی۔ اور اُس کی موجودگی میں اُسے ناول۔ ڈرامے اور اخبار سُنا کر اُس کا غم غلط کرتی تھی وہ خاوند کو ہمیشہ یہی کہا کرتی تھی کہ مجھ سے بڑھکر کوئی خوش نصیب نہیں۔ کیونکہ تم مجھکو دیکھتے ہو۔ اور میں تم کو دیکھتی ہوں۔ میں تمہاری ہوں اور تم میرے ہو۔ اور تمام مرے ہو۔ دنیا میں لاکھوں میری بہنیں ایسی ہیں کہ جن کی ظاہری آسائش کے پردے میں ببول کے کانٹے۔

سانپ اور بچھو پوشیدہ ہیں۔

(۶)

انسان کی حقیقت ہی کیا ہے۔ وہ فولاد بدن یا روئیں تن نہیں ہے۔ انسانی دل برگ گل سے زیادہ نازک ہے۔ زمانہ کی کج ادائی۔ لوگوں کی سرد مہری۔ ابنائے جنس کی ناقدردانی سے صفدر کی صحت میں فرق آگیا۔ دل ٹوٹ گیا۔ جسم ناتواں ہوگیا۔ کلیجہ چھلنی بنگیا اور یہ تمام پیچیدگیاں مالی خولیا کی صورت میں ظہور پذیر ہوئیں۔ صفدر وہ صفدر جس کی اگر قدر کی جاتی تو وہ اپنے بارآور اور دلکش دماغ سے پھول برساتا۔ جلوۂ طور دکھاتا۔ لیکن اس کے ملک کی گلیم بخت ازل سے سیاہ ہے۔ اُسے آب زمزم یا کوثر سفید نہیں کرسکتا۔ اب ناطقہ کا شوہر ایک مٹی کی زندہ تصویر تھا۔ زندہ تھا۔ مگر مردوں سے بدتر۔ اب اُسے اپنے جسم کا ہوش نہ تھا۔ وہ سبکو دیکھتا تھا۔ مگر کسیکو نہ پہچان سکتا تھا۔ آہ ناطقہ کو بھی شناخت نہ کرسکتا تھا۔ یہ مصیبت ناطقہ کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ قانون قدرت رنگ لایا۔ انقلاب آیا۔ اور خونخوار وبا کی طرح آیا ناطقہ کے چہرے کی مسکراہٹ کافور ہوگئی۔ اُس کے لمبے لمبے سیاہ بال سفید ہوگئے۔ اُس کا رنگ روغن اڑگیا۔ اور وہ قبل از وقت ضعیف ہوگئی۔ اب مسرت کا باغ ویران ہوچکا تھا۔ خوشی کا چراغ گل ہوگیا تھا۔ چاروں طرف تاریکی تھی۔ اور شکستہ دل ناطقہ صرف شوہر کی خبرگیری کے لئے زندہ تھی۔ اور دیکھ رہی تھی کہ سرد مہری سنگدلی۔ بیوفائی اور ریاکاری کے انتقام کے لئے زلزلے بیقرار ہیں۔ بجلیاں بیتاب ہیں۔ لڑائیاں خنجر تیز کررہی ہیں۔ قحط آگ برسا رہا ہے۔ وبائیں زہر اُگل رہی ہیں۔ اور بربادی پس و پیش اس ملک کے منڈلا رہی ہے۔

ایڈیٹر

لمعات اکبر

یہ دنیا رنج و راحت کا غلط اندازہ کرتی ہے
خدا ہی خوب واقف ہے کہ کسپر کیا گذرتی ہے

نئے عنصر نہیں آتے چمن میں گل کھلانے کو
یہی ذرّے ابھرتے ہیں یہی مٹی سنورتی ہے

وہ دو ذرّے بلا اذن خدا مل ہی نہیں سکتے
کہ جن کے میل سے سائنس کی قوت ابھرتی ہے

جو ہیں اہل بصیرت اکثر آنکھیں بند رکھتے ہیں
نظر اچھے دلوں کو بھی کبھی بدنام کرتی ہے

زبانیں مختلف بھی ہوں اگر دو حق پرستوں کی
سمجھ بجھ جاتی ہے نیت کی خوبی کام کرتی ہے

آوارہ و مجنونے رسوا سر بازارے

خون کے پیاسے

(گذشتہ سے پیوستہ)

ہم سے بھی دس قدم پیچھے مردوں سے دور کھڑی تھی۔ یہ بھی مان لیا کہ انہوں نے کوٹھ میں جانے سے پہلے سارجنٹ کی تلاشی نہیں لی تھی۔ سمات بیگاں کے باپ اور جیٹھ نے شروع ہی سے کہدیا کہ یہ بیانات اُن سے زبردستی لے گئے ہیں۔ اور بالکل غلط ہیں۔ سمات بیگان کا کوئی تعلق سردار کے ساتھ کبھی بھی نہیں رہا۔ یہ فقط پولیس کی بناوٹ ہے۔ شیخ اللہ بخش چہرہ والہ پر جب جرح ہوئی اُس نے تسلیم کر لیا کہ یہ بندوق اُسکے فہیم نصیرالدین نے فروخت کی ہے جو دس روز سے مفرور ہو گیا ہے اور یہ بھی بیان کیا کہ پیر بخش فہیم کو مرے ہوئے بارہ سال ہو گئے۔ استغاثہ کے دو گواہ اور باقی رہے تھے۔ کمّا شاہدرہ کا ماچھی اور فقیرا نواب کوٹ کا مصلی ان دونوں کا بیان تھا کہ وہ بیلہ میں نرسل کاٹ رہے تھے کچھ فاصلہ سے انہوں نے بندوق کے فائر کی آواز سنی اور بیساکھا سنگھ کو بھاگتے دیکھا۔ ابھی یہ دو گواہ پیش ہونے پائے تھے کہ سرکاری وکیل نے کہا کہ ہمارے تمام گواہ سرداروں کے خاندانی رسوخ کے سبب سے بدراہ ہو گئے ہیں۔ ہم ان گواہوں کو چھوڑتے ہیں۔ پیش کرنا نہیں چاہتے۔ میاں نورالدین نے کہا کہ میں ان دونوں پر جرح کرنا چاہتا ہوں۔ جرح میں اُن دونوں نے مان لیا کہ انکے بیانات جو تحریر کئے گئے ہیں وہ انہوں نے پولیس کے بہکانے سے کئے تھے۔ میاں نورالدین نے اقبال جو ذرا غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اُس پر مجسٹریٹ کی تصدیق نہیں ہے۔ میاں نورالدین نے فقط اس فروگذاشت کی جانب مبذول کیا اور نوٹ لکھوا دیا۔ ملزم کی جانب سے فقط ایک گواہ پیش کیا گیا اور وہ پولیس کے ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ تھے انہوں نے تسلیم کیا کہ ڈپٹی انسپکٹر نے اُن کے سامنے بیساکھا سنگھ کی شکایت کی تھی لیکن اُس سے پہلے بیساکھا سنگھ ڈپٹی انسپکٹر کی شکایت کر چکا تھا۔ اس کے علاوہ ڈپٹی انسپکٹر خفیہ رپورٹوں میں سرداران ستوکوہ کی عام شکایتیں کرتا رہا ہے۔ جس کا علم سرداروں کو نہیں ہوا۔

جب شہادت ختم ہو چکی تو مسٹر گریوی نے کھڑے ہو کر ڈیڑھ گھنٹہ تک تقریر کی لالہ گیا چند اور نیاز محمد سارجنٹ کی وہ خاک اڑائی اور قلعی کھولی کہ جج صاحب کے تمام بدن میں مارے خوف کے پسینہ آگیا۔ جسقدر گریوی صاحب پولیس پر جھاڑ ڈالتے تھے جج صاحب کو خوف پیدا ہوتا تھا کہ کہیں کورٹ انسپکٹر صاحب ڈپٹی کمشنر سے جا کر نہ کہدے کہ جج صاحب نے گریوی صاحب کو نہیں روکا۔ دوسری

طرف گریوی صاحب کو روکنے کی جرأت نہ تھی جب
گریوی صاحب بیرسٹر اپنی تقریر ختم کر چکے تو سرکاری
وکیل سوا اس کے اور کیا کہہ سکتے تھے کہ استغاثہ
کے گواہوں کو رشوت دیکر اور رعب دکھا کر سرداروں نے
توڑ لیا ہے۔ مگر کورٹ انسپکٹر صاحب نے جو
گن گئے تھے۔ یہ فرمایا کہ حضور یہ تمام شرارت ذیلدار
کی ہے۔ جو سرداروں کا ہمسایہ اور دوست ہے
(یعنی یہ تمام شرارت ذیلدار کی ہے جو سرداروں کا
ہمسایہ اور دوست ہے۔ یہ کورٹ انسپکٹر رشوت
خوار نہ تھے اور ایماندار افسر تھے لیکن پولیس کی
تائید کرنا ان کا فرض تھا۔ اگر اتفاقاً کوئی بری ہو جاتا
تھا۔ تو ظاہر میں تو ناراض ہوتے تھے۔ لیکن دل
میں خوش ہوتے تھے۔

جج صاحب جب اسیسروں کی جانب متوجہ ہوئے
تو یہ دونوں خوب خراٹین بھر رہے تھے۔ اتفاق
سے دونوں افیون کے عادی تھے۔ جج صاحب نے
انہیں جگایا اور مختصر طور سے کیفیت مقدمہ سنائی
اور قانون کی وضاحت کی۔ لیکن چونکہ حکام انتظامی
کا خوف دل میں بیٹھا ہوا تھا۔ اپنی رائے صراحت
کے ساتھ ظاہر نہ کر سکے۔ اسیسروں سے جب رائے
دریافت کیگئی تو چوہدری بدھاوا سنگھ نے تو جو مقدمہ
کی اصلیت سے خوب واقف تھے فوراً کہدیا۔ کہ
ملزم بالکل بے گناہ ہے۔ لیکن صوبیدار کورٹ انسپکٹر
کا منہ تکنے لگے۔ وہاں سے کچھ اشارہ نہ ہو سکا۔
کیونکہ جج صاحب دیکھ رہے تھے۔ اس لئے یہ کہا
کہ مقدمہ تو سچا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مثل پر کوئی شہادت
نہیں۔ صوبہ دار کے لیت ولعل کی یہ وجہ بھی تھی
کہ اس کا لڑکا ابھی دو ماہ ہوئے پولیس میں پروبیشنر
مقرر ہوا تھا۔ اور ڈپٹی انسپکٹری کا امیدوار تھا
اور کوئی جج ہوتا تو اسوقت ایک گھنٹہ میں فیصلہ
لکھ کر حکم سنا دیتا۔ لیکن خان بہادر نے تین
دن کے لئے فیصلہ سنانے کے واسطے مقدمہ کو
ملتوی کر دیا۔ دوسرے دن ریڈر سے مسل سننے بیٹھے
کئی دفعہ اسپر ناراض ہوئے۔ کیونکہ جس قدر سنتے
جاتے تھے۔ مقدمہ بیجان ظاہر ہوتا تھا۔ طبعی
رجحان عادت کے سبب سے مجرم قرار دینے کا
ہو گیا تھا۔ ایک طرف تو ڈپٹی کمشنر کا خیال تھا دوسری
طرف جموں کا خوف طاری تھا۔ گھبرا اٹھے اور تقدمہ
کے ضعف کا نزلہ عضو ضعیف یعنی ریڈر پر گرا گویا اس
نے مقدمہ کو خراب کر دیا اور جھلا کر اُس کو سخت سست
کہا اور مقدمہ کو اس روز بھی ملتوی کر دیا۔ تیسرے
دن ذرا اعصاب درست ہوئے۔ تو دس بجے سے چار
بجے تک دروازہ بند کر کے فیصلہ لکھا۔ نہایت
ترشروئی کے ساتھ تیسری دن بریت کا حکم سنایا
لیکن دکھانے کے لئے سردار کو بہت دھمکایا۔ کہ
مجھے یقین تھا کہ تم نے یہ فعل کیا ہے۔ لیکن کیا
کروں مسل پر کوئی ثبوت نہیں۔ آیندہ تم بہت
محتاط رہو۔ یہ جج صاحب کی عادت تھی کہ اگر ملزم
کو سزا دیتے تھے تو فیصلہ نہایت خندہ پیشانی سے
سناتے تھے۔ اور اگر بریت کا حکم دیتے تو منہ بنا کر

اپنی مجبوری ظاہر کیا کرتے تھے تاکہ پولیس والے خوش ہوں جج صاحب کا منیر تو یہ کہتا تھا کہ فیصلہ میں پولیس کی خوب خبر لیں۔ لیکن انتظامی حکام کے خوف سے لکھتے لکھتے رک گئے صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس کی راست گوئی کی بدرجہ غایت تعریف کی کہ انہوں نے عدالت کے سامنے سچ بولا اگرچہ ان کا بیان پولیس کے مفاد کے برخلاف تھا۔ لیکن بدقسمتی سے جب ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ نے وہ فیصلہ سنا تو بجائے خوش ہونے کے بظاہر ناراض ہوا اور اپنے ریڈر سے کہا کہ کیا جج صاحب یہ سمجھتے تھے کہ میں جھوٹ بولونگا۔ لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ خوشامد نے کرا کر دی خوش آمد جب اس کے بعد جج صاحب سے ملاقات ہوئی تو بڑے تپاک سے ملے اور بہت خوشی سے اوسکا ہاتھ دبایا۔

لالہ گیا چند ڈپٹی انسپکٹر مقدمہ کے اختتام کے بعد ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کے سلام کو حاضر ہوئے اور اپنی مدد کے لئے کورٹ انسپکٹر کو بھی ساتھ لیتے گئے۔ اور ذیلدار اور سرداروں کے خلاف دونوں حاکموں کے کان اس قدر بھرے کہ وہ اپیل کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ بلٹن صاحب کو بھی تقاضائے موقعہ ان کی تائید کرتی ہوئی۔ اور چونکہ جج صاحب نے فیصلہ میں پولیس کے خلاف کوئی ریمارک نہ کیا تھا۔ اور یہ دونو صاحب اس قدر لیاقت نہ رکھتے تھے کہ خود مسل کو سنکر اپنی رائے قائم کر لیتے۔ اس لئے وہ پولیس کی کارروائی سے بیخبر رہے مسل کو بغیر ملاحظہ کئے کمشنر صاحب کے پاس بھیجدیا۔ کمشنر صاحب معمولی سمجھ کے آدمی تھے۔ اُن کے خیال کے مطابق یہ عظیم الشان عہدہ محض آرام کے لئے وضع کیا گیا ہے نہ کہ کام کیواسطے۔ انکا عقیدہ تھا کہ تحت حکام کی تائید ان کا فرض ہے خواہ وہ غلط کریں یا صحیح۔ اُس زمانہ میں کانگرس کی بنیاد پڑ چکی تھی اس مسئلہ کو زیر نظر رکھتے ہوئے کہ حکام ضلع کے رعب اور رسوخ کا قائم رکھنا حکام بالا کا فرض ہے۔ اور کمشنر صاحبان کسی بات میں دست اندازی نہ کرتے تھے۔ کمشنر صاحب نے ایک ڈیڑھ سطر کا ریمارک لکھ کر مسل کو گورنمنٹ میں بھیجدیا وہاں سے وہ مسل گورنمنٹ ایڈوکیٹ کے پاس بھیجی گئی۔ اس نے مسل کو غور سے سنا اور اپنی رپورٹ میں پولیس کے وہ پرخچے اڑائے جیسکے وہ مستحق تھے گورنمنٹ کو لکھا کہ یہ پولیس اور سارجنٹ ہیں تو اس قابل کہ ان کو فوجداری سپرد کیا جاوے۔ لیکن اگر حالات موجودہ میں یہ مصلحت نہ ہو تو موقوف ضرور کئے جاویں۔ صاحب ڈپٹی انسپکٹر جنرل اور انسپکٹر جنرل سے گورنمنٹ نے رائے طلب کی ان دونوں نے مسل سننے کے بعد گورنمنٹ ایڈوکیٹ کی رائے سے اتفاق کیا اور سارجنٹ کا تنزل کر دیا اور ڈپٹی انسپکٹر کو بالکل موقوف۔ گورنمنٹ ایڈوکیٹ کی رپورٹ جب ڈپٹی کمشنر صاحب اور سپرنٹنڈنٹ پولیس نے

ملاحظہ کی تو وہ دونوں جو ہمیشہ ڈپٹی انسپکٹر کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے۔ فوراً اس کے سخت مخالف بنگئے۔ خوشامد اور دروغگوئی نے جو جادو کا پردہ اُن کی آنکھوں پر ڈال رکھا تھا دفعتہً اُٹھ گیا۔ اب اُن کو ڈپٹی انسپکٹر کے تمام عیب نظر آنے لگے اور بالکل یقین ہوگیا کہ جسقدر شکائتیں مظلوم اور رؤسا ڈپٹی انسپکٹر کے خلاف کرتے تھے وہ بالکل درست تھیں۔ اتفاق سے جلو کے اسسٹنٹ کمشنر بھی صاحب ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی سے نکلتے ہوئے سپرنٹنڈنٹ پولیس سے دوچار ہوگئے۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس بڑے تپاک سے انکی طرف بڑھے۔ لیکن انہوں نے ایسی سردمہری اور بے پرواہی سے انہیں جواب دیئے کہ صاحب بہادر بہت نادم اور ذلیل ہوئے۔

ایسے اُلٹے وقت میں ڈپٹی انسپکٹر پولیس کو تمام میں اپنا کوئی دوست نظر نہ آتا تھا اس نے ہر طرف اپنے گرد مردار خوار گدھوں کا ہجوم دیکھا کیونکہ اس محکمہ کا قاعدہ ہے کہ انمیں سے جب کبھی کوئی مرجاتا ہے تو دوسرے اس کا گوشت کھانے کو طیار ہوجاتے ہیں اس کا ایک جگری دوست جو فوراً اس کے بعد لاہور کے تھانہ میں بھیجا گیا۔ اس نے ایسی سخت اور پوست کندہ رپورٹ ڈف صاحب کی خدمت میں بھیجی کہ صاحب بہادر کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ خود حیران تھے کہ میں اس قدر دھوکہ میں کیوں رہا

موقوفی کے بعد لالہ گیا چند جو ڈپٹی کمشنروں اور سپرنٹنڈنٹوں کو انگلیوں پر نچاتے تھے اوکاڑہ میں تین کارخانوں کے مالک ہوگئے۔ جن میں انہوں نے کم سے کم تین لاکھ روپیہ کا سرمایہ لگایا تھا۔ اس کے علاوہ لائل پور میں بیس مربعے بھی انہوں نے ڈیڑھ لاکھ روپیہ کی عوض خرید کر لئے تھے۔ اور وہاں اپنے موضع گیان پورہ میں بڑے آرام اور مزہ سے زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر بخوائے دیرگیر و سخت گیر مظلوم غریبوں کی آہوں کا آخر اثر ہوا تینوں کارخانوں میں یک بیک پے در پے آگ لگ گئی تمام کلیں اور مال خاکستر ہوگیا۔ اور دونوں جوان بیٹے اور تینوں پوتے مرگئے۔ اب ایک داماد ان کی وراثت کا امیدوار ہے اور اُن کے مرنے کا انتظار کر رہا ہے۔

سردار بساکھا سنگھ کی بریت کے بعد ملاجمال اور مہر عبداللہ اور گوبند شاہ نے یکجا بیٹھ کر حساب کیا تو معلوم ہوا کہ اس مقدمہ میں کل ایک ہزار روپیہ خرچ ہوا ہے۔ سردار نے بہت زور دیا کہ کل روپیہ میں خود ادا کرونگا لیکن ملاجمال اور مہر عبداللہ نے نہ مانا اور جب وہ برا ماننے لگے تو سردار راضی ہوگیا کہ نصف بار وہ اٹھائیں کیونکہ زمینداروں میں بوتہ کی رسم جاری ہے۔ ایکدوسرے سے ایسے موقعوں پر مدد لینا عیب میں داخل نہیں ہے جب ایک پر مصیبت پڑتی ہے دوسرا مدد کے لئے تیار ہوجاتا ہے

ادب عالیہ

دھواں سا جب نظر آیا سوادِ منزل کا — نگاہِ شوق سے آگے تھا کارواں دل کا
چراغ لے کے کسے ڈھونڈتے ہیں دیوانے — نشاں تو دور رہا یاں نام تک نہیں دل کا
ازل سے اپنا سفینہ رواں ہے دھارے پر — ہوا ہنوز نہ گرداب کا نہ ساحل کا
نہ جانے جھوٹ ہے یا سچ ہے وعدۂ فردا — اجل پہ فیصلہ ٹھہرا ہے حق و باطل کا
پرائی موت کا احساں بھی ہے ہمیں منظور — کہیں طلسم تو ٹوٹے عدم کی منزل کا
نہ سر میں نشہ ہے باقی نہ دل میں کیفیت — زباں پہ رہ گیا اک ذکرِ خیر محفل کا
کبھی تو موج میں آئیگا تیرا دیوانہ — اشارہ چاہیئے ہے جنبشِ سلاسل کا
ہوا نہ پھر بھی افسردہ دلوں کی رت بدلی — ادل پڑا ہے پھر رنگ نقشِ باطل کا
خود اپنی آگ میں جلنا تو کیمیا ہوتا — مزاجداں نہ تھا پروانہ شمعِ محفل کا
وہ دستِ شل جو دعا کیلئے کبھی اٹھ نہ سکے — ارادہ کون سے بل پر کرے گا ساحل کا
امید و بیم نے وہ راستا ہی چھوڑ دیا — چراغ گل ہوا جب آستانۂ دل کا
جوابِ حسنِ طلب بیدلوں سے بن نہ پڑا — حیا سے گڑ گئے جب نام آگیا دل کا
فلک ہے دونوں طرف کا نگاہباں جبتک — نہ اپنی آنکھ اٹھیگی نہ پردہ محمل کا

جنابِ یاسؔ تھے تعبیر سے خود آگاہ
زبان گنگ تک آیا نہ ماجرا دل کا

علم النفس

صاحبانِ علم کے سامنے اگر یہ مسئلہ پیش کیا جائے کہ کون سا علم انسان کیواسطے زیادہ مفید اور کارآمد ہے تو سپنسر اور ہکسلے کے معتقدین سائنس کو زیادہ کارآمد بتائینگے اور ارسطو رول کے مقلدین تمامی علوم پر منطق کو ترجیح دینگے اور اسکی فضیلت میں صدہا دلائل پیش کردینگے مگر ایک منصف مزاج شخص بلا کسی تعصب و طرفداری کے یہی فیصلہ کریگا کہ وہ علم سب سے زیادہ مفید اور ضروری ہے جس سے انسان اپنی زندگی کے منازل طے کرنے اور فرائض معیشت کے ادا کرنے میں بخوبی امداد لے سکے۔ ناظرین رسالہ ہذا اس مضمون کو دیکھکر خود اس بات کا فیصلہ کردینگے کہ آیا علم النفس میں یہ خوبیاں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں یا نہیں انسان کیواسطے

ہر کام اور ہر پیشے میں جذبات نفس انسانی کا جاننا نہایت ضروری ہے۔ فطرت نے زندگی قائم رکھنے کے واسطے دو قسم کی قوتیں انسانی جسم میں خلق فرمائی ہیں ایک ایسی ہے جو بلا کسی ارادے کے اپنا فعل کیا کرتی ہیں اور دوسری ایسی ہے جس میں ارادے کو دخل ہے اول الذکر قوت کے افعال میں دوران خون عمل تنفس حرکت قلب معدہ کا غذا کو ہضم کرنا اور مثل اسی طرح کے افعال کے ہیں جس میں انسان کے ارادے کو دخل نہیں ہے اور ایک صحیح جسم میں یہ عمل بلا کسی قسم کی سعی کے خود بخود ہوا کرتا ہے جس کی تعلیم فطرت خود بغیر ہمارے علم و اطلاع کے ہمارے جسم کو دیا کرتی ہے۔ موخر الذکر قوت کے استعمال کے واسطے انسان کو اپنے ارادے سے کام لینا پڑتا ہے اور اس قوت سے انسان اپنی زندگی قائم رکھنے اور آرام دہ بنانے کے واسطے دو طریق سے کام لیتا ہے طریق اول میں زندگی کے ضروریات فراہم کرنے کے واسطے کسب معیشت کرنی پڑتی ہے جس کا ذریعہ تجارت صنعت و حرفت و زراعت و ملازمت ہے اور ان صیغوں میں جذبات نفس سے واقف ہونے کی سخت ضرورت ہے مثلاً ایک تاجر کو یا ایک صناع کو زمانہ کی نبض کی پہچان بازار کے جزر و مد کا سمجھنا انسان کے مذاق پسند سے واقف ہونا مروجہ فیشن کی چیزوں کو جاننا گاہکوں کو طرح طرح ترغیب سے گرویدہ کرنا ضروری ہے جس کی وجہ سے تجارت میں فروغ ہو۔ اسی طرح ایک کاشتکار کو سیاسی حالت کا سمجھنا زمیندار سے اپنے تعلقات کو خوشگوار رکھنا۔ کاشتکاری میں امداد دینے والے لوگوں کو راضی رکھنا ایک ملازم کو اپنے آقا کی مزاجدانی اور مذاق طبیعت کا جاننا ایک وکیل یا ڈاکٹر کا طبائع انسانی کے گوناگوں جذبات سے واقفیت حاصل کرنا نہایت ضروری ہے۔ جو شخص جذبات نفس سے واقف نہیں ہوتا وہ اپنے پیشے میں کبھی کامیابی نہیں حاصل کر سکتا۔ طریق دوم میں انسان کو اپنی زندگی کی غرض و غایت کیلئے یعنی مقصد زندگی حاصل کرنے کے واسطے اس قوت سے عمل تزویج و پرورش اولاد اور مشاغل سیاسی و نظام مذہب وغیرہ سے کام لینا پڑتا ہے عمل تزویج میں مرد کا عورت اور عورت کا مرد کی عادات و خصائل اوضاع و اطوار و مذاق طبیعت کا جاننا نہایت ضروری ہے۔ اگر کوئی مرد اپنی عورت کے خصائص امتیازی سے واقف نہیں ہے اور یہ نہیں جانتا کہ اس کی احساسات کی کیا کیا چیزیں محرک ہوتی ہیں اور وہ کن اشیاء عالم سے دلچسپی لیتی ہے تو وہ کبھی اپنی زوجہ کو خوش نہیں رکھ سکتا اور اس کے ناخوش رہنے سے وہ خود بھی کبھی آرام کی زندگی نہیں بسر کر سکتا۔ اس طرح پرورش اولاد میں بھی یہ جاننا نہایت ضروری ہے کہ اس لڑکے کا ذہن تادیب و تعزیر کن کن صورتوں سے متاثر ہوتا ہے کن چیزوں کی طرف اس کی طبیعت کو خاص مناسبت ہے۔ قوائے مخفیہ کا ظہور کس خاص ترتیب سے ہوتا ہے۔ بالخصوص مشاغل سیاسی میں تو بہت زیادہ

ضرورت نفس انسانی کے جاننے کی ہے تاکہ عوام اور خاص خاص طبقہ کے افراد انسانی کے جذبات کے رفتار سے سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو سکے۔ چنانچہ اسپنسر کا قول ہے کہ زحواس نفسی کے تابع ہر حیات ہوا کرتی ہے) غرضکہ دنیا میں جس قدر کاروبار پیشے و مشاغل ہیں۔ اُن سب میں حصول کامیابی کے واسطے جذبات نفس کے جاننے کی بہت زیادہ ضرورت ہے جس کو علم النفس کہتے ہیں۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو بھی ایک ایسا علم ہے جو سب سے زیادہ انسان کیواسطے مفید اور کارآمد ہو ہندوستان میں ہر قسم کے علم و فن کے سیکھنے کا لوگوں کو شوق ہو مگر ایک ایسے علم کی طرف سے بے توجہی برتی جاتی ہے۔ جو ہر شعبہ زندگی میں ہر وقت مدد کر سکتا ہو۔ یورپ میں عالمان علم النفس نے فلسفہ جذبات پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں مگر ابھی تک ہندوستان میں ایک کتاب بھی اس علم کے کل شعبوں کی کامل طور پر نہیں لکھی گئی تعلیمیافتہ حضرات کا فرض ہو کہ یورپ کی ہر زبان سے علم النفس کی کتابوں کا ہماری مادری زبان میں ترجمہ کریں تاکہ کثیر حصہ ہندوستان کی آبادی کا اس ضروری اور مفید علم سے مستفیض ہو سکے علم النفس کا اگر کوئی شعبہ اگر مشرح لکھا جائے تو اتنا بڑا مضمون ہو جائیگا جس کی گنجائش ایک ماہواری ادبی رسالہ میں ہونا غیر ممکن ہے اسوجہ سے جذبات نفس کی ماہیت اور اس کے معین شعبوں کے اصول اور آخر میں چند واقعات ہدیہ ناظرین کئے جاتے ہیں

خلاق عالم نے انسانی ہستی اس قدر پر اسرار خلق فرمائی ہے اور اسمیں ایسی قوتیں ودیعت فرمائی ہیں کہ باوجود دنیا میں اس قدر علوم کی ترقی کے اب تک اُسکے تمام رازوں کا انکشاف نہ ہو سکا۔ مگر جس حد تک بھی جن قوتوں کی واقفیت انسان نے حاصل کی ہو ان سے اگر صحیح طریقے سے کام لیا جائے تو ہر شخص ہر شعبہ زندگی میں نہ معلوم کس قدر ترقی کر سکتا ہے۔ یورپ میں محض قوت آزادی کے ذریعے صدہا قسم کے امراض دفع کئے جاتے ہیں اور عمل مسمریزم اور ہپناٹزم نے ایسی حیرت انگیز باتیں دنیا کے سامنے پیش کی ہیں جس کو دیکھکر انسان محو حیرت ہو جاتا ہے۔ ایشیا میں بھی بعض ولیوں درویشوں مہاتماؤں نے اشراق اور کشف کے ذریعے ایسے ایسے ماحول الفطرت باتیں دکھائی ہیں جن کے سمجھنے سے عقل انسانی اب تک قاصر ہے۔

فطرت نے نفس انسان میں ہر قسم کے جذبات خلق کئے ہیں۔ اور ایک صحیح الجسم انسان میں ہر قسم کے جذبہ کا ہونا لازمی ہے اور جسکو ایک وجدانی کیفیت بھی کہنا بیجا نہ ہوگا۔ ہر قسم کے جذبات نفس کی محرک تین چیزیں ہوتی ہیں۔ واقفیت۔ احساس۔ تغیرات جسمانی۔ ہر چیز کا ہمکو پہلے علم ہوتا ہے۔ اسکے بعد احساس ہوتا ہے۔ یا ادراک ہوتا ہے اور اسکے ساتھ جسم میں تغیر ہوتا ہے

یہ غیر ممکن ہے کہ بغیر علم حاصل ہوئے احساس ہو مثلاً محروم السماعت شخص گانے کی آواز یا کسی مسرت خیز کلمہ کو سن نہیں سکتا اس لئے اس کے جذبات مسرت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

علم حاصل کر لے کے بعد اگر نفس مطمئن ہو اور کسی دوسرے جذبہ کا اثر اسوقت اسپر نہیں ہے تو ہر قسم کے جذبات کا اثر اُس حد تک پڑنا لازمی ہے جس حد تک موثر تحریک ہوگی اگر اُس کا نفس کسی جذبۂ اذیت سے مغلوب ہے تو اُس حالت میں احساس نفس کسی دوسرے جذبہ کو محرک نہیں کر سکتا۔ مثلاً ایک شخص نے اپنے لڑکے کے مرنے کی خبر سنی اُسی وقت اگر اعلیٰ سے اعلیٰ موسیقی کا نغمہ اسکو سنایا جائے تو بھی اُس کے جذبات انبساط محرک نہ ہونگے۔ بلکہ نغمہ کی آواز کرخت و اذیت دہ معلوم ہوگی۔ کیونکہ جذبۂ غم سے اُسوقت وہ شخص مغلوب ہو رہا ہے بعض حالتوں میں واقفیت شئے بھی بعض جذبہ سے مغلوب ہو کر بے اثر ہو جاتی ہے جیسا کہ انتہائے غم و غصہ کی حالت میں انسان ہر چیز پر جو اس کے سامنے ہو غصہ اتارنے لگتا ہے اور عزیز سے عزیز شئے کو برباد کرنے لگتا ہے یا منہ پر طمانچے مارنے لگتا ہے اُس خاص حالت یا یوسی میں اُس کو ہر چیز افسردہ کن نظر آتی ہے اور ہر شخص مخالف معلوم ہونے لگتا ہے گو بعد میں سکون حاصل ہونے کے اُسے اپنی غلطی کا اعتراف بھی کرنا پڑتا ہے۔ مگر اسوقت وہ قہری طور پر افعال مذکور الصدر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

احساس کے ساتھ جسمانی تغیرات کا بھی ہونا لازمی ہے غیر ممکن ہے کہ کسی شخص کو غصہ آوے اور اُسکی پیشانی پر بل نہ پڑجائے یا چہرہ سرخ نہ ہو جائے یا کسی شخص پر خوف طاری ہو اور اُس کے بدن رعشہ پیدا نہ ہو یا تنفس تیز نہ ہو جائے۔ بعض صورتوں میں جسمانی تغیرات کے ساتھ احساس نفس بھی ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص اپنی صورت ایک عرصہ تک غمگین بنائے رہے تو اس کا افسردہ خاطر ہونا لازمی ہے۔

یہاں پر یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق اکثر محققین علم النفس میں اختلاف ہے بعض یہ کہتے ہیں کہ احساس نفس کے بعد تغیرات جسمانی ہوتے ہیں۔ مگر پروفیسر جیمس اور اس کی تبعین کا قول ہے کہ پہلے اعضاء جسم متاثر ہوتے ہیں۔ اس کے بعد نفس میں احساس کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن پروفیسر ربنو نے اس قصہ کا تصفیہ اس طرح سے کیا ہے کہ احساس نفس کے ساتھ تغیر جسمانی بھی بلا ایک سکنڈ کی تاخیر کے ہوتا ہے مگر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ بعض احساس نفس اور تغیر جسمانی ایک ہی وقت میں ہوتے ہیں کم و بیش اثر احساس نفس و تغیر جسمانی پر پڑنے کے متعلق تمام محققین کی یہ رائے ہے کہ نفس کے اندر جس قسم اور جس درجہ کی صلاحیت ہوگی اُسی قدر جذبات متاثر ہونگے۔

تمامی جذبات نفس کے مظاہر اعضا جسم انسانی میں مگر سب سے زیادہ اثر انسان کے چہرے پر پڑتا ہے جسکو حکما نے آئینہ جذبات کہا ہے +

جذبات امتثالی میں مشابہت کا پایا جانا ضروری ہے مثلاً جو مسرت ایک لذیذ غذا کے کھانے سے ہمکو حاصل ہوتی ہے اُسی قسم کی مسرت ایک موسیقی کے نغمہ کے سننے سے حاصل ہوتی ہے ۔

جذبات متقابل میں تغیر جسمانی کا اثر بالکل ضد ہوتا ہے مثلاً غرور کی حالت میں جسم تن کر سیدھا اور بلند ہو جاتا ہے اور انکسار کی حالت میں جسم پست اور سکڑا ہوا نظر آنے لگتا ہے ۔

جذبات کی صحیح ترتیب ابتک نہیں ہو سکی ہے مگر مفصلہ ذیل جذبات کا انسان کے جسم میں پایا جانا ثابت ہو چکا ہے جسکی ترتیب اگر اس طرح کی جائے تو غالباً بیجا نہ ہوگی ۔ (۱) جذبات متعلق بہ قیام حیات انسانی محبت انبساط ۔ غصہ ۔ حمیت ۔ جرأت ۔ ہمت ۔ یقین ۔ شک ۔ شجاعت ۔ وغیرہ (۲) جذبات اعلیٰ قویٰ ذہنیہ ۔ رحم ۔ ہمدردی فیاضی ۔ ایثار ۔ حب وطن ۔ قوم پرستی ۔ مذہب ۔ اعتقاد وغیرہ ۔ (۳) جذبات اسفل ۔ بغض ۔ حسد ۔ خوف ۔ تکبر ۔ ظلم عداوت وغیرہ +

فطرت ہمیشہ اپنے قوانین کا صحیح استعمال کیا کرتی ہے لیکن انسان اکثر اپنی جہالت یا بدنفسی سے اسکی مخالفت کرتا ہے اور اُسکا خمیازہ اُسے بھگتنا پڑتا ہے مثلاً معدہ میں جس وقت صحیح طور پر غذا ہضم ہو جاتی ہے اس وقت اشتہا پیدا ہوتی ہے اسکے برعکس صحیح اشتہا نہ ہونے کی حالت میں اگر غذا کھائی جائے یا قدرت نے جو غذا انسان کیواسطے خلق فرمائی ہے اُسکو خراب کرکے یا اپنی خاص جدت اور ترکیب سے زبان کے ذائقہ کو خوش کرنے کے واسطے ثقیل بنا کر کھائی جائے تو اُس سے مادۂ فاسد کا پیدا ہو جانا ضروری ہے اور مادۂ فاسد کی موجودگی سے جسم کا مریض ہونا لازمی ہے مرض پیدا ہونے سے قوائے نفسی میں خلل پیدا ہو جاتا ہے اگر دماغ میں دوران خون اعتدال کے ساتھ جاری ہے تو قوائے نفسی بھی صحیح حالت میں ہونگے اور اگر اسمیں کمی یا زیادتی ہوگی تو انسان کے قوائے نفسی میں بھی خلل واقع ہو جائیگا اور اس کا یہ اثر ہوگا کہ جذبات نفس صحیح افعال نہ کر سکینگے +

انسان اپنی زندگی کو خوش رکھنا چاہتا ہے اور اُسکو ہر وقت مسرت کی تلاش رہتی ہے جو لفظ اُس کی زبان سے نکلتا ہے یا جو قدم اُس کا اٹھتا ہے اس کی غرض و غائت مسرت کا حاصل کرنا ہوتا ہے اور یہ ایک ایسی خواہش ہے جو فطرتی ہے اور ہر انسان میں پائی جاتی ہے +

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسرت کس شے سے پیدا ہوتی ہے اُسکا جواب یہ ہے کہ مسرت اور اُسکے اسباب کا دارومدار ہر شخص کے مذاق پسند پر منحصر ہوا کرتا ہے مثلاً کوئی شخص اپنے نام و نمود سے مسرت حاصل کرتا ہے اور اس کے حاصل ہو جانے میں جو مسرت اُسکو ہوتی ہے ۔ اُسکے مقابلہ میں کوئی دوسری چیز دنیا کی اس کو مسرت نہیں دے سکتی کسی شخص کو دوسروں کے نفع پہنچانے میں مسرت حاصل ہوتی ہے

کوئی تصنیف و تالیف سے مسرت حاصل کرتا ہے کوئی موسیقی کے نغموں کو تمام مسرتوں پر ترجیح دیتا ہے مگر یہاں پر یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ قانون ارتقا کی سب سے اہم ترین دفعہ تزاحم فی الحیات ہے۔ کائنات عالم میں ہر وقت ایک طرح کی کشمکش ہوا کرتی ہے اور بقاو فنا کے دو متضاد و الخواص پتلے ہر وقت دنیا کے اسٹیج پر ایکٹ کیا کرتے ہیں چونکہ انسان کو تنازعہ للبقا کیواسطے میدان عمل میں آنیکی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اسی لئے فطرت نے نفس انسانی میں ایک ایسی قوت ودیعت فرمائی ہے جسکے ذریعے سے وہ دنیا کے ضرر رساں چیزوں سے بچ سکتا ہے۔ جو اشیاء ہمیں خوش ذائقہ معلوم ہوتی ہیں۔ جتنی چیزیں خوشبودار ہوتی ہیں جن آوازوں کا سننا خوشگوار معلوم ہوتا ہے۔ جن نظاروں کا دیکھنا خوش کن ہوتا ہے جن چیزوں کے مس کرنے میں لذت حاصل ہوتی ہے وہ بالعموم ہماری حیات کے قائم رہنے میں امداد دیتی ہے اور یہی ایک ایسا احساس ہے جس کے ذریعے سے ہم بخوف و خطر منازل حیات طے کر سکتے ہیں گو بعض حالتیں ہم پر ایسی قہری طاری ہو جاتی ہیں۔ جس سے ہماری زندگی کو درد آمیز مسرت کے میدان سے بھی گذرنا پڑتا ہے۔ پروفیسر جیمس نے اپنی کتاب (پرنسپلز آف سائیکالوجی میں) ایک خطیبانہ انداز سے لکھا ہے (کون شخص ہنسی کی لذت کیلئے ہنستا ہے اور کون شخص چھینکنے کی تکلیف رفع کرنے کے لئے چھینکتا ہے +

دنیا کی اکثر لذت درد و اذیت کی آمیزش سے پاک نہیں ہوتی ہر انبساط کے اندر انقباض کا کچھ شائبہ ضرور پایا جاتا ہے اور انسان کی حیات آرام و تکلیف کے متضاد لذتوں سے بہرہ اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ انسان اگر اپنے جذبات نفس سے کام لیا کرے تو اس کو دنیا میں مسرت زیادہ حاصل ہو سکتی ہے اور یہ ایسی دولت ہے جسکے حاصل کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے اور نہ اس کے صرف میں کمی کا اندیشہ ہے +

آخر میں چند واقعات جو مستند ہیں اس علم کی تائید میں لکھے جاتے ہیں۔ ایک یونیورسٹی کا پروفیسر جو دولتمند بھی تھا اپنے کمرہ میں تنہا سو رہا تھا۔ کسی ذریعہ سے ایک ڈاکو اس کے کمرہ میں گھس آیا اور بھری ہوئی پستول پروفیسر کی پیشانی سے لگا کر دولت کا پتہ دریافت کرتے ہوئے کہنے لگا کہ اگر تمہارے جسم نے اسوقت ذراسی بھی حرکت کی تو اس پستول کی گولی تمہارے سر سے پار ہو جائیگی۔ پروفیسر چونکہ علم النفس کا ماہر تھا اُس نے اپنے چہرہ پر خوف و اضطراب کے کچھ بھی آثار پیدا نہ ہونے دیے اور نہایت اطمینان و بےخوفی سے اُس نے جواب دیا کہ یہ بھی کوئی جوانمردی ہے کہ سوئے ہوئے غیر مسلح شخص پر تم تین مسلح آدمی حملہ آور ہوتے ہو۔ ڈاکو جو تنہا تھا گھبرا کر پیچھے دیکھنے لگا۔ کہ یہ میرے دوسرے ساتھی کہاں سے پیدا ہو گئے اس موقعہ سے پروفیسر موصوف نے فوراً فائدہ اُٹھایا اور ڈاکو کے ہاتھ سے پستول چھین کر اس کو بآسانی مغلوب کر سکا۔ چونکہ پروفیسر علم النفس کا ماہر تھا اُس کے ذہن میں آنکھ کھولنے کے بعد فوراً یہ

خیال آیا کہ ایسے وقت میں اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں ہے کہ اپنے حواس کو مجتمع کیا جائے اور حریف کو بدحواس کیا جاوے۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ نپولین اعظم جب پہلی دفعہ گرفتار ہوکر جزیرہ البیا میں نظر بند کیا گیا اور کچھ عرصہ کے بعد وہ موقعہ پاکر مفرور ہوا تو اسکے ہمراہ اسکے قدیم سپاہیوں کی ایک مختصر سی جماعت بھی تھی جسکے پاس نہ تو کافی آلات حرب تھے اور نہ سامان رسد تھا۔ مگر اس باہمت شخص نے اس جماعت کی مدد سے فرانس اور تمام یورپ پر قبضہ کرنیکا ارادہ کر لیا تھا۔ اتفاق سے پہلے ہی معرکہ میں تیس ہزار تازہ دم جوانوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ سخت ایسا پیش آیا کہ اسوقت ذاتی شجاعت و بہادری کا اظہار قطعاً بے سود تھا۔ مگر چونکہ وہ علم النفس کا عملاً ماہر تھا اُس نے دوسرے طریقے سے کامیابی حاصل کرنے کی فوراً رائے قائم کرلی۔ جسوقت دونوں طرف کی فوجیں صف آرا ہوئیں تو وہ تن تنہا غیر مسلح اپنی جماعت سے نکلا اور کمال اطمینان سے فریق مخالف کے لشکر کے سامنے جاکر کھڑا ہوگیا اور اپنے کوٹ کے بٹن کھولکر اپنے سینے کو برہنہ کردیا اور ایک خاص اور پر اثر لہجہ میں اپنے مخالف سپاہیوں سے جنمیں سے اکثر ایک زمانے میں اُس کے ماتحت بھی رہ چکے تھے۔ خطاب کرکے کہنے لگا کہ تم میں سے وہ کون سپاہی ہے جو اپنے باپ کے عُریاں سینے پر فیر کرنے کو تیار ہے۔ اس آواز کا یہ معجز نما اثر تھا کہ یکبارگی کوئی نہیں۔ کوئی نہیں کی آواز تمام لشکر سے بلند ہوگئی اور تھوڑی دیر میں تمام سپاہی نپولین کی حمایت میں دکھلائی دیئے۔

نپولین کی اسوقت کی کامیابی محض موثر لہجہ اور ذاتی وجاہت کیوجہ سے تھی۔ تمام محققین علم النفس کا یہ متفقہ قول ہے کہ انسان کے چہرہ پر تیز اور شدید جذبات کا اثر فوراً ظاہر ہوجاتا ہے۔ اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہر ماہر جذبات اسکے دل کے راز کو چہرہ سے دیکھ کر بخوبی سمجھ جاتا ہے۔ اور بعض حالتوں میں نفسی اثر ایسا تیز و سریع التاثیر ہوتا ہے جس سے جسم پر مافوق الفطرت تبدیلی پیدا ہوجاتی ہے اکثر لوگوں نے مشاہدہ کیا ہے کہ انتہائے خوف یا انتہائے رنج کی حالت میں انسان کے سر کے سیاہ بال تھوڑی دیر میں سفید ہوجاتے ہیں۔

مسٹر ڈارون ایک ہندوستانی مجرم کے واقعہ کو لکھتے ہیں کہ ایک قتل کے ملزم کو جج نے سزائے موت کا حکم سنایا۔ سپاہی اس مجرم کو پھانسی کی جگہ لے جانے لگے راستہ میں لوگوں نے دیکھا کہ اس مجرم کے چہرے کے سیاہ بال سرعت کے ساتھ سفید ہونا شروع ہوگئے اور پھانسی گھر تک جاتے جاتے تمام بال سفید ہوگئے۔

محمود علی خان عرف آغا علیخاں تعلقدار

رشحاتِ ثاقب

آہِ شرر افشاں کا ہم نے یہ اثر دیکھا
پرسوز جگر دیکھا جلتا ہوا گھر دیکھا
جانبازِ محبت کا ہمنے یہ جگر دیکھا
اک ہاتھ پہ دل دیکھا اک ہاتھ پہ سر دیکھا
اے جلوۂ جانانہ تیرا یہ اثر دیکھا
اک جوت سی پھیلی ہے عالم میں جدھر دیکھا
لے اے دلِ پر حسرت کچھ اور تمنا کر
دیکھا کہ گری بجلی جب اُس نے ادھر دیکھا
اللہ ری محویت خوش تھا ترا دیوانہ
دیکھا جو بگولوں کو سمجھا ترا گھر دیکھا
کس کام کی ہشیاری اچھی تھی وہ بیہوشی
جب آنکھ کھلی اُنکی آغوش میں سر دیکھا
کیا جانے کسے ڈھونڈھا بیمار نے مرتےدم
اک بار ادھر دیکھا اک بار اُدھر دیکھا
ہم سمجھتے تھے اے ثاقب ارمان کھٹکتے ہیں
پیوستہ مگر دل میں اک تیر نظر دیکھا

وعدۂ ملاقات

سنیاسی اُپگپت ایک رات کو متھرا کی شہر پناہ کے باہر فرش خاک پر پڑا سورہا تھا۔ باد تند کے تیز جھونکوں نے غریبوں کے ٹمٹماتے ہوئے چراغوں کو بجھا دیا تھا۔ مکانوں کے دروازے بند تھے۔ ابر سیہ روشن ستاروں کو اپنے دامن میں چھپائے تھا۔

کسی کے پائے نازک کی ٹھوکر سنیاسی کے سینے میں لگتے ہی چھاگل کی سامعہ نواز آواز نے قیامت برپا کردی۔ اُسنے چونک کر آنکھیں کھولدیں وہ عالمِ خواب میں فردوس بریں کے سدا بہار باغ کی سیر کر رہا تھا۔ چشمۂ آبحیات۔ امرت ساگر کے نظارے میں مصروف تھا۔ فرشتوں کے نورانی چہروں کے دیدار میں محو۔ وہ دلچسپ منظر آنکھوں سے اوجھل ہوگئے۔ اُس کی آنکھیں جو نور معرفت سو روشن تھیں ایک چراغ کی دھیمی روشنی پر پڑیں جسکو ایک نازنیں اپنے دستِ نازک میں بصد ناز لئے ہوئے تھی ایک عورت سور کی طرح مست۔ جوانی کے سبب دیوانی۔ اپنے چاہنے والے سے ملنے جارہی تھی وعدۂ ملاقات کا ایفا منظور تھا۔

نانشو دتّا کا پاؤں جوں ہی سنیاسی پر پڑا اوہ "ارے" کہہ کر فوراً ٹھٹھک گئی۔ دولہن کی طرح آراستہ تھی اور انداز و اطوار سے عنفوانِ شباب کی امنگوں کا اظہار ہوتا تھا۔ عہد ماضی

کے رنج وغم سے قطعی ناآشنا۔ آیندہ کے لئے سینکڑوں امیدوں کو دل میں جگہ دیئے ہوئے۔

گہرے نیلے رنگ کا دوپٹہ اس کے سر پر تھا۔ روشن چہرہ گھونگٹ میں یوں نمایاں تھا جیسے طرح ستارہ نیلے آسمان میں۔ اُس کا جسم گویا خاک کے بجائے رنگ و بو سے ہوا تھا۔

بجلی چمکی۔ اور اُس نے خاک پر ایک روشن چاند دیکھا۔ چہرے پر تبسم تھا۔ اور جسم پر بھبوت ملا تھا۔ مگر کہیں چاند پر خاک پڑ سکتی ہے۔ اسکا حسن چاند سورج دونوں کو شرماتا تھا۔ وہ چندے آفتاب تھا چندے ماہتاب ــ ایک آواز جسکے سامنے تمام دنیا کے ساز ہیچ ہیں۔ یہ کہتے ہوئے سنائی دی "میرے سوامی۔ راج کنور۔ مجھے معاف کرو۔ میں واپس جاتی ہوں۔ آؤ میرے ساتھ میرے کنج کو چلو۔ سر راہ یوں خاک پر پڑے رہنا تمہارے لئے نازیبا ہے۔

میں تمہارے لئے پھولوں کی سیج بچھاؤنگی۔ میں خود پنکھا جھلوں گی۔ نسیم خوشبو سے بسی ہوئی آئیگی اور تمہیں میٹھے سروں میں لوریاں سنائیگی تاکہ تمہیں نیند آجائے۔ چاند تمہیں شوق بھری نظروں سے برگ گل کی آڑ سے جھانکیگا۔ چاندنی تمہاری بلائیں لیگی۔ اور پیار کریگی۔ میں آنکھیں ملکر تمہارے پاؤں کی خاک چھڑاؤنگی۔ اور اشوک کی پتیوں سے انہیں رنگین بناؤنگی۔

اس طرح ہماری ایک سلطنت ہوگی جسمیں دو دھڑکتے ہوئے دل حکمراں ہونگے۔ قلم دل میں ہم کو وہ لطف آئیگا کہ اس دنیا سے بیخبر ہو جائینگے۔ ہم اس طرح ہم آغوش ہونگے کہ پھر قیامت تک ایک دوسرے سے جدا نہ ہونگے۔

ایک چھوٹے سے کمرے میں یک جان دو قالب ہوکر ہم ایک نئی بہشت اپنے لئے بنائینگے وہ تھوڑا سا حصہ جسکو ایک دھیمی روشنی نمایاں کرسکتی ہے۔ ہماری دنیا ہوگی۔ اُس کے اُس پار کی دنیا سے ہمیں کچھ کام نہوگا اُس کا عدم و وجود برابر ہے۔

تم راجہ ہوگے میں رانی۔ ہمارا تخت مختصر سا بستر ہوگا اور وہ بستر بھی اپنے دوپٹے کے آدھے حصہ سے بناؤنگی۔ آہ۔ کیسا پر کیف عالم ہوگا۔ مجھے نوشادی مرگ ہوئی جاتی ہے! میں تو بیخود ہوئی جاتی ہوں! کیسا لطف آئیگا! اٹھو! اٹھو! اور میرے ساتھ چلو"

سنیاسی نے ذرا سا اپنا سر اٹھایا۔ کہنی زمین پر ٹیک کر مسکراتے ہوئے کہا۔ اے پیاری نازنین۔ اپنے رستے جا۔ ابھی اس بات کا وقت نہیں ہے۔ جب وقت آئیگا۔ میں تیرے کنج میں آؤنگا۔

یکایک بجلی نے اپنی آتشیں زبان باہر نکالی۔ بادل کی گرج نے آسمان کو ہلادیا۔ زمین و آسمان کانپ اُٹھے انسان اور فطرت دونوں نے لرزہ محسوس کیا۔ ابر نے اپنا بھیانک منہ اسطرح پھیلایا

کہ انسان اور حیوان دونوں کو نگل جانے پر آمادہ معلوم ہوا۔ آندھی زور و شور سے چلنے لگی۔ اولے پڑنے شروع ہوئے۔ تمام دنیا پر چشم زدن میں طوفان کا تسلط ہوگیا۔ گویا آسمان نے اُس کی بیہودہ و ناپاک گفتگو پر اظہار ناراضگی کیا۔ لعنت ملامت کی بوچھار کی۔ اس ہنگامۂ طوفان خیز میں اس کی آواز پھر نہ سُن پڑی۔ اُس کے کان بھرے ہوگئے۔ نہ اس کو کچھ سنائی دیتا تھا۔ نہ دکھائی دیتا تھا۔ وہ ناکامی کی تصویر تھی۔ نامرادی کا مرقع۔ جہاں کھڑی تھی وہیں بت کی طرح کھڑی رہ گئی۔

ابھی وہ سال ختم نہیں ہوا تھا۔ چیت کے مہینہ کی سُہانی شام تھی۔ نسیم بے تابانہ مستانہ وار چل رہی تھی۔ شاہی باغ میں آموں کے درخت موروں سے لدے ہوئے تھے۔ پارُل۔ بکل۔ راجنی گندھا کے دلربا پھول دنیا کو اپنا معطر پیغام مسرت پہنچا رہے تھے۔ دور سے گانے بجانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ شہر سنسان معلوم ہوتا تھا۔ عورت مرد سب شاہی باغ کو بسنت کا جشن منانے کے لئے گئے تھے۔ وہاں تمام اقسام کے ساز موجود تھے۔

گویّے تانیں لگا رہے تھے۔ نوجوانوں کے گلوں میں پھولوں کے گجرے پڑے تھے۔ انواع و اقسام کے کھانے پک رہے تھے۔ دعوتوں کا ہر طرف سامان تھا۔ جدھر نظر جاتی تھی۔ جشن ہی جشن تھا۔

سنسان شہر میں۔ چاندنی رات میں سنیاسی اکیلا ٹہل رہا تھا۔ کوئل کی آواز درختوں سے جب تک سنائی دیتی تھی پپیہا۔ پی پی کی رٹ لگائے تھا۔ پھولوں کی مہک چاروں طرف سے آرہی تھی۔ عجیب دلچسپ دپرکیف منظر تھا۔ کیا وہ اتنی رات گئے کسی سے ملنے جارہا ہے۔ کیا کسی سے وعدہ ملاقات ہے؟

سنیاسی شہر پناہ کے پھاٹک سے باہر نکلا۔ شہر پناہ کے گرد جو خندق تھی۔ اس کے کنارے کھڑا ہوا۔ ارے اُسکے پاؤں کے پاس یہ کیا چیز ڈھیر ہے۔ اسمیں تو حرکت معلوم ہوتی ہے۔ کیا کوئی جانور ہے؟ اس سے تو رونے کی آواز آتی ہے۔ یہ تو کوئی انسانی ہستی ہے افسوس یہ تو کوئی عورت ہے عورت بنی انسان کی ماں۔ مادر مشفق۔ ایک سنسار کی ماتا

وہ ایک بہت ہی خراب عارضے میں مبتلا ہے۔ اس کے جسم سے سخت عفونت آرہی ہے چہرے پر جھریاں پڑی ہیں۔ رخساروں پر آنسوؤں کے نشان معلوم ہوتے ہیں۔ اُس کے چہرے پر تبسم کا اثر اس روشنی کی طرح خوف زدہ کرنیوالا تھا۔ جو کسی قبر پر پھیل کر اس کے اندر کے پوشیدہ جسم کو ظاہر کردیتی ہے۔ تمام جسم پر داغ تھے۔ بیماری کو متعدی بنانیوالے زہریلے کپڑے پڑ گئے تھے۔ وہاں وہ پڑی ہوئی تھی۔ بستر عیاشی کی نفرت انگیز مردہ ہستی۔ ہر شخص کی نشانہ ملامت

وتحیر۔ باشندگان شہر اُسے گاڑی پر لاد کر یہاں خندق کے کنارے ڈال گئے تھے ۔
سنیاسی نے جھک کر اُسے دیکھا۔ اسکے بعد سیدھا بیٹھ گیا۔ اُس کو اپنی گود میں لے لیا کمنڈل سے ٹھنڈا پانی اُس کے ہونٹوں پر ٹپکایا۔ منتر پڑھ پڑھ کر اسپر پھونکے۔ اور اپنے ہاتھ سے اُس کے تمام جسم پر صندل لگایا۔
اُسوقت زمین مسکرا رہی تھی۔ کوئل خوشی سے کوک رہی تھی۔ رات بادۂ مسرت سے مست تھی
اُس نے پوچھا۔ اے فرشتۂ رحمت۔ تو کون ہے ؟
سنیاسی نے جواب دیا " ماتا۔ میں ہوں تیرا پتر۔ اب اُس بات کا وقت آگیا تھا۔ میں تجھ سے ملنے کے لئے آیا ہوں ۔ عورت نے نحیف و کمزور آواز میں ایک بار حیرت سے کہا " گیا ؟ میرا بیٹا" اور پھر خدا جانے کس عالم میں پہنچ گئی۔

(رابندر ناتھ ٹیگور) یاسط بسوانی

خواتین مغلیہ

خاندانِ مغلیہ کی بعض خواتین آسمانِ شہرت پر آفتاب بنکے چمکی ہیں اور کوئی علم دوست ایسا نہیں جو اُن کے مناقب علم و ادب کا مداح نہ ہو، اگر ایک طرف انہوں نے میدان جنگ میں بہادر سپاہیوں کے دوش بدوش داد شجاعت دی ہے تو دوسری طرف میدان علم میں وہ اس جوش کیساتھ بڑھی ہیں کہ اپنی شہرت سے بھی آگے نکل گئی ہیں ۔
چنانچہ نورجہاں کے علم و عمل عقل و فراست شعر و سخن اور انتظام سلطنت کے کارنامے اور زیب النسا بنت عالمگیر کا تبحر علمی اور مذاق شاعری محتاج تعریف نہیں۔ کون ایسا ہے جو ان جامع صفات خواتین کا مداح نہ ہو
لیکن تاریخ ہند کے صفحات پر (ان دو خواتین کے علاوہ) دوسری معزز بیگمات کے بھی مٹے مٹے نقش نمایاں ہیں۔ جنکے شہرۂ کمالات سے ایک دن دنیا گونج چکی ہے اور جنکا تذکرہ آج بھی رونق بزم علم و ادب بن سکتا ہے۔ لیکن بد قسمتی سے عام لوگ اُنکے نام کی طرح اُنکے علمی کارناموں سے بھی بہت کم واقف ہیں۔ اگرچہ ان کی شہرت کا آفتاب یورپ میں بھی ضیا پاش ہو اور اسکی کرنیں ہندوستان میں بھی آ آ کے آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر رہی ہیں۔ شہنشاہ بابر کو ہندوستان کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ یہاں کا ذرہ ذرہ ایک دن اس کی عظمت و جلال کا کلمہ پڑھ چکا ہے۔ لیکن آج اُس کی عالمہ و فاضلہ لڑکی گلبدن کے جاننے والے بہت کم ہیں ۔
یہ عصمت مآب خاتون عربی و فارسی کی بہت بڑی عالم اور اپنے وقت کی جادو نگار ادیب گزری ہے۔ اس کی ایک زبردست تصنیف "ہمایوں نامہ" اب تک موجود ہے۔ جسمیں بابر اور ہمایوں کے زمانے کے واقعات کا

نہایت قابلیت سے نقشہ کھینچا ہے۔ یہ نایاب تاریخ چند سال ہوئے لندن میں بڑے اہتمام کے ساتھ مع انگریزی ترجمے کے شائع ہوئی ہے۔

یہ بیگم اکبر کے عہد تک زندہ تھیں ۹۸۲ھ میں سلیمہ بیگم کے ہمراہ بیگم حج کو گئیں اور متواتر چار حج کئے۔ ۹۹۰ھ میں واپس ہندوستان آئیں۔ انہوں نے بابر اور ہمایوں کی سلطنت کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ اور خود بھی نظام حکومت و امور سلطنت سے واقف تھیں۔ ان کے حسن قابلیت کی یادداشت اکبر کے زمانے میں مرتب کی گئی ہے۔ جو اسکے تخت نشینی سے تین برس پہلے کی کتاب ہے۔ اگرچہ انکو اپنے بھتیجے اکبر کی حکومت پورے طور پر دیکھنا نصیب نہ ہوئی تاہم انہوں نے اپنی تاریخ میں مغلوں کے خانگی حالات نہایت وضاحت سے قلمبند کر دیے ہیں۔ جن سے نہ صرف مغلوں کے جذبات و اطوار کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ شاہی خاندان کی محترم خواتین کے تمام حالات روشنی میں آجاتے ہیں۔ عموماً خاندانِ شاہی کی بزرگ عورتوں کی بہت عزت کیجاتی تھی۔ اور خاندان شاہی کا ہر فرد امور سلطنت میں اُن کے مشوروں کی قدر کرتا تھا۔ وہ لڑائیوں اور سلطنت کے اہم معاملات میں مردوں کے دوش بدوش رہتی تھیں۔ بابر کی اکثر معرکہ آرائیوں میں عورتیں بھی شریک تھیں۔

خود بابر کا بیان ہے کہ میری نانی بہت سی لڑائیوں میں میرے ساتھ تھیں۔ وہ ان کی اصابت رائے اور دور اندیشی کا بڑی گرم جوشی سے اظہار کرتا ہے وہ کہا کرتا تھا کہ "میری نانی کی عقل و فراست کے مقابلہ میں شاید ہی کوئی عورت نکلے تو نکلے"

بابر نے ہندوستان فتح کرنے کے بعد ان بیگمات کی خدمت میں کابل تحائف بھیجے جنہیں وہ کابل میں انصرام سلطنت کیواسطے چھوڑ آیا تھا اور ایک فہرست بنائی تھی جسمیں حفظ مراتب کا بہت بڑا لحاظ رکھا گیا تھا۔

گلبدن بیگم لکھتی ہیں کہ "بدست خواجہ کلاں بعموی عسیس یک اشرفی کلاں بوزن سہ سیر بادشاہی کہ پانزدہ سیر ہند باشد فرستادہ و بخواجہ گفتہ بودند کہ اگر عسیس (چھوٹا ناش کا) از شما پرسد کہ حضرۃ بادشاہ بمن چہ فرستادہ است خواہید گفت کہ یک اشرفی و چوں فی الحقیقت یکے بودہ تعجب کردہ تا سہ روز کاہید۔ حکم بود کہ اشرفی را سوراخ کردہ و چشمش را بستہ و در گردنش انداختہ درونِ حرم فرستید۔ بہر دیگہ اشرفی سوراخ کردہ در گردنش انداختہ از گرانی طرفہ یکافتی و اضطراب و خوشحالی میکرد و بدو دست اشرفی را گرفتہ طرفگیہا میکرد کہ کسے اشرفی مرا نگیرد"

سلطان بیگم۔ یہ بھی خاندان مغلیہ میں ایک واجب التعظیم خاتون گزری ہیں (انکو خدیجۃ الزمانی بھی کہتے ہیں) یہ بیگم ہمایوں کی بہن اور گلرخ کی لڑکی تھیں۔ علم الکلام کی ماہر اور زبردست فصیحہ تھیں۔ بڑے بڑے فصحاء و مقرر انکی سحر بیانی اور فصاحت کے قائل تھے۔ شاعری میں ان کا پایہ بہت بلند ہے۔ مخفی تخلص کرتی تھیں۔ دیوان امتداد زمانہ کے ہاتھوں ضائع ہوگیا۔ البتہ ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے جس سے

ان کی شاعرانہ بلند پروازی کا اندازہ ہو سکتا ہے ؎

کاکلت را گر ز مستی رشتۂ جاں گفتہ ام — مست بودم زیں سبب حرف پریشاں گفتہ ام

ہمایوں نے پانچ برس کی عمر میں ان کی شادی بیرم خاں سے کر دی تھی بیرم خاں کے انتقال کے بعد خود اکبر نے ان کے علم و فضل، تقریر و تحریر دیکھکر اپنے ساتھ کر لی تھی ان کی معجز بیانی و سحر آفرینی کا اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب جہانگیر بغاوت کر کے الہ آباد میں مقیم ہوا اور عوام میں اپنے نام کا سکہ و خطبہ جاری کر دیا تو اکبر کی پریشانی کی کوئی انتہا نہ رہی اس نے اپنی والدہ مریم مکانی اور ابو الفضل جیسے یگانہ روزگار کو سمجھانے کے لئے بھیجا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ابو الفضل نور راستہ ہی میں قتل کرا دیا گیا اور مریم مکانی ناکام واپس آئیں۔ اب تشویش تھی کہ کون بھیجا جائے آخر کار سلیمہ سلطان کا انتخاب ہوا انجام کار انہوں نے اس خم خوردہ شیر کو اپنی سحر بیانی کے جال میں پھانس ہی لیا اور اُسے اپنے ساتھ لیکر آگرہ روانہ ہو گئیں جب قریب پہنچیں تو جہانگیر نے درخواست کی کہ پیری لینے کیلئے مریم مکانی بھیجی جائیں۔ چنانچہ وہ آئیں اور جہانگیر کو اس طرح اکبر کے سامنے لے گئیں کہ اُس کا ایک ہاتھ مریم مکانی پکڑے ہوئے تھیں اور دوسرا سلطان سلیمہ بیگم۔

حمیدہ بانو بیگم "شہنشاہ اکبر کی والدہ حمیدہ بانو بیگم (جنہیں حاجی بیگم اور مریم مکانی بھی کہتے ہیں) بڑی عاقلہ اور نکتہ رس عورت تھیں۔ جب ہمایوں نے ان سے شادی کرنی چاہی تو یہ راضی نہ ہوئی تھیں عورتوں نے سمجھانا اور ہموار کرنا چاہا تو جواب میں کہتی ہیں ــ "آرے بکس خواہم رسید کہ دست من بگریبان او برسد نہ آنکہ بکسے برسم کہ دست من مے دانم بدامن او نرسد" غور کیجئے کہ اس مختصر سے جملے میں فلسفہ حیات کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔ اکبر انہیں کے بطن سے تھے جب ان کے شوہر ہمایوں نے انتقال کیا تو پندرہ لاکھ روپیہ صرف کر کے مقبرہ بنوایا۔ اس مقبرے میں دارا شکوہ فرخ سیر اور عالمگیر ثانی بھی مدفون ہیں، حج سے واپس آ کر مقبرے کے متصل ایک عمارت عرب سرائے تعمیر کرائی جو اب تک موجود ہے اور ایک محلے کی طرح آباد ہے اس عمارت کی تعریف ایک شاعر ان الفاظ میں کرتا ہے

ہر کہ میخواہد کہ بیند شکل فردوس بریں — گو بیا ایں قصر و ایں باغ ہمایوں را بہ بیں

اکبر کو اپنی ماں سے بہت محبت تھی وہ انہیں مریم مکانی کے لقب سے پکارا کرتا تھا اور بہت احترام کرتا تھا امور سلطنت کے متعلق جو کچھ وہ کہتیں کبھی اُس سے انحراف نہ کرتا۔ اکبر نے جب کشمیر کا سفر کیا تو مریم مکانی ساتھ نہ تھیں۔ سری نگر پہنچکر یاد آئیں۔ بیچین ہو گیا۔ اور ابو الفضل کو حکم دیا کہ انکی طلبی کے لئے فوراً ایک خط لکھا جائے۔ جس کی پیشانی پر یہ شعر ہو ؎

حاجی بسوئے کعبہ رود از برائے حج — یارب بود کہ کعبہ بیاید بسوئے ما

جب انکا انتقال ہوا۔ تو اکبر نے ہندوانہ رسم کے مطابق اپنی ڈاڑھی اور مونچھیں منڈوا ڈالی تھیں۔

جہاں آرا بیگم یہ شاہجہان کی لڑکی تھیں۔ مزاج فقیرانہ تھا اور نہایت علم دوست اور قابل خاتون تھیں۔ اپنے باپ کی سلطنت میں انہیں بڑا اقتدار اور اختیارات حاصل تھے،

ساٹھ لاکھ روپیہ کی جاگیردار تھیں اور بہت سے علما، مشائخ اور شعرا ان کے دربار سے وظیفہ پاتے تھے۔ یہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح سے بہت عقیدت رکھتی تھیں آپ کے متعلق ایک کتاب "مونس الارواح" نہایت عمدہ عبارت میں لکھی تھی جسے دربار کے مشہور خوشنویس عاقل خان سے وصلیوں پر لکھا کر طلائی نقش و نگار سے مزین کرایا تھا،

شاعری میں بہت اچھا ذوق رکھتی تھیں اور کبھی کبھی خود بھی شعر کہہ لیتی تھیں ان کا یہ شعر دنیا کی بے ثباتی اور عبرت کا دردناک مرقع ہے جو آجتک اُن کی لوح مزار پر کندہ ہے ؎

بغیر سبزہ نہ پوشد کسے مزار مرا کہ قبر پوشِ غریباں ہمیں گیاہ بس است

مرزا احسن بیگ رفیع نے شاہجہاں آباد کی تعریف میں ایک مثنوی لکھی تھی جس میں باغ "حیات بخش" کی تعریف میں یہ شعر کہا تھا ؎

انارِ وگلشن این تازہ بستاں بود بیدانہ ہمچو نار ....

جب یہ شعر جہاں آرا بیگم نے سنا تو پانچ سو روپیہ بطور انعام دیئے +

اسیطرح ایک مرتبہ باغ کی سیر کو نکلیں۔ شہر میں منادی کر دی گئی کہ کوئی باہر نہ نکلے۔ چاروں طرف پردے کا انتظام تھا۔ لیکن میر صیدی طہرانی جو ایک مشہور شاعر تھا۔ سواری کا تماشا دیکھنے کے لئے کسی حجرے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ جب بیگم کا ہاتھی قریب سے گذرا تو اس نے بیساختہ یہ شعر پڑھا ؎

برقع برخ افگندہ برد ناز بہ باغش تانکہتِ گل بیختہ آید بدماغش

جب یہ شعر اس نے سنا فوراً حکم دیا کہ شاعر حاضر کیا جائے حکم ہوتے ہی صیدی حاضر کیا گیا۔ بیگم نے اُس کے شعر کو بار بار پڑھوا کر سُنا اور پانچہزار روپے انعام دیئے، لیکن ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا کہ اس گستاخی کی پاداش میں اسے ہمیشہ کے لئے شہر بدر کر دیا جائے۔

آگرے کی جامع مسجد ان کی یادگار ہے۔ اس کے علاوہ دہلی میں ایک عالی شان کاروانسرائے بھی بنوائی تھی جس کے متعلق برنیر لکھتا ہے کہ کاش پیرس میں بھی ایسی ہی عمارتیں ہوتیں جن میں وہاں جانے والے سیاح اور پردیسی رہ سکتے اور دربدر کی ٹھوکروں سے محفوظ ہو جاتے "

زینت النسا بیگم یہ عالمگیر کی لڑکی اور زیب النسا کی چھوٹی بہن تھیں۔ طبیعت اور

طور و طریقہ صوفیانہ تھا۔ علم تصوف کے عالم تھیں۔ شعر و شاعری کا بھی ذوق تھا۔
انہوں نے شاہجہان آباد واقع دریا گنج میں ایک مسجد بنوائی تھی جو "زینت المساجد" کے نام سے مشہور ہے اور اسی کے صحن میں ان کا مزار ہے جس کی لوح پر یہ دردناک شعر کندہ ہے جو اہل دنیا کو ہمیشہ سبق عبرت دیتا رہیگا۔ واللہ اعلم بالصواب

سید ابو محمد ثاقب کانپوری

جذبات ندرت

کچھ بھی نہ تھا نکلتے ہی پیکانِ آرزو — تھی دل کی جان کاوشِ پنہانِ آرزو
پہلے تو دل کو پھونک لیا ضبطِ آہ سے — اب دم بخود ہیں سوختہ سامانِ آرزو
میں اُن کی آرزو کو سمجھتا ہوں جانِ دل — وہ میرے دل کو جانتے ہیں جانِ آرزو
اے آسمان کچھ تجھے خوفِ خدا بھی ہے — یہ دل ہے بحرِ عشق یہ طوفانِ آرزو
دنیا میں کیا پڑھیگا کوئی میری سرگذشت — لکھا ہے دل کے خون سے عنوانِ آرزو
آئی دمِ اخیر صدائے شکستِ دل — ٹوٹا ہے آج کیا درِ زندانِ آرزو
ہے دل میں خارِ غم تو نکلنے کی کیا امید — الجھا رہیگا گوشۂ دامانِ آرزو
الزام سرِ حسن کی رسوائیوں کا ہے — ہے ابتدائے عشق پشیمانِ آرزو
ہم سے رُکے گا گریۂ بے اختیار کیا — پوشیدہ ہے مرے اشک میں طوفانِ آرزو
رگ رگ میں دل کی حال ہے امید و بیم کا — اب کشمکش سے چھوٹ چکی جانِ آرزو
قاتل سے ہو رہی ہے قیامت میں بازپرس — ہم کہہ رہے ہیں ہم ہیں شہیدانِ آرزو
آئی ہو مجکو نیند تو آنکھیں ہی چھوٹ جائیں — دیکھا ہے جب سے خواب پریشانِ آرزو
ندرت سے کہہ رہی ہیں امنگیں شباب کی — کیا اب کچھ اور چاہئے سامانِ آرزو

شعیب احمد ندرت میرٹھی

یونیورسٹی کی تعلیم

اس زمانہ میں جب کہ ہندوستان کے ہر صوبہ میں کئی کئی یونیورسٹیاں قائم ہوگئیں اور ہو رہی ہیں سر آسوتوش مکرجی جیسے ماہر فن تعلیم کے خیالات یونیورسٹیوں کے معیار کے متعلق غالباً خالی از دلچسپی نہ ہونگے

یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر ملک اور ہر صوبہ کی یونیورسٹیاں کسی خاص نمونہ کی تقلید کریں کیونکہ ہر یونیورسٹی کو اپنے صوبہ یا اپنے رقبہ کے باشندگان کی حاجات پورا کرنے کا خیال مقدم ہے۔ پھر مختلف فیہ مسائل کو ہر یونیورسٹی مختلف طور پر طے کر سکتی ہے مثلاً ایک قدیم مسئلہ یہ ہے کہ پرانی زبانوں کا پڑھنا طالبعلموں کیواسطے زیادہ مفید ہے یا زندہ زبانوں کا جو اس زمانہ میں بھی بولی جاتی ہیں یا یہ مسئلہ کہ محض سائنس کا پڑھنا زیادہ مفید ہے یا اپلائیڈ سائنس کا یعنی سائنس کا استعمال سیکھنا یا یہ سوال کہ عام تعلیم زیادہ مفید ہے یا ٹیکنیکل تعلیم۔ ان مسائل کو مختلف یونیورسٹیوں نے مختلف طریقہ پر حل کیا ہے۔

لفظ یونیورسٹی اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ جملہ اقسام کی تعلیم کا انتظام یونیورسٹی کو کرنا لازمی ہے تاکہ ہر قسم کے علوم و فنون اُس کے رقبہ اثر میں کثرت سے پھیلیں۔ یونیورسٹی سے مراد اوستادوں اور طالبعلموں کی وہ جماعت ہے جو علم سیکھنے اور سکھانے کے لئے وقف ہے یونیورسٹی ایسی ہونی چاہیئے کہ اس میں ہر جنس ہر مذہب ہر فرقہ اور ہر درجہ زندگی کے آدمی بلا روک ٹوک داخل ہو سکیں۔ البتہ اتنی قید ضروری ہے کہ وہ لوگ ابتدائی تعلیم اتنی حاصل کر چکے ہوں کہ یونیورسٹی کا نصاب سمجھنے کی قابلیت کافی رکھتے ہوں یہ معیار تعلیم ابتدائی اتنا اونچا یا ایسا سخت نہیں ہونا چاہیئے کہ اکثر طالب علموں کو وہ یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم سے باز رکھے بعض اہل الرائے کا یہ خیال ضرور ہے کہ یونیورسٹی کی تعلیم محض ان لوگوں کو ملنی چاہیئے جو اعلیٰ ذہنی قابلیت اور کافی مالی سرمایہ رکھتے ہوں۔ مگر یہ خیال صحیح نہیں ہر یونیورسٹی کا نصاب ایسا ہونا چاہیئے کہ اوسط درجہ کی ذہنی قابلیت کے طلباء اُس سے مستفیض ہو سکیں اور جس قدر طلبا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا شوق رکھتے ہیں ان کا بیشتر حصہ یونیورسٹی میں داخل ہو کر اس کے امتحانات میں کامیاب ہو سکے +

نصاب تعلیم ایسا ہونا چاہیئے جو صرف اعلیٰ مدارج ملازمت یا عالمانہ پیشوں مثلاً وکالت ڈاکٹری و انجینیری وغیرہ کے ہی مناسب حال نہ ہو بلکہ دیگر پیشوں اور ہر قسم کی صنعت اور حرفت کے حاصل کرنے والوں کے واسطے موزوں ہو۔ بعض طالب علم کسی ملازمت یا کسی پیشہ میں داخل ہونے کی غرض سے یونیورسٹی میں داخل نہیں ہوتے بلکہ محض اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے واسطے شرکت چاہتے ہیں بعض ایسے ہوتے ہیں جو محض علم کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اور کچھ خوش نصیب ایسے ہوتے ہیں جو یونیورسٹی کی تعلیم سے مستفیض ہو کر علوم میں نئے اکتشافات اور ایجادات کر کے اپنی تمام قوم اور ملک کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ ان سب طبقوں طبیعتوں کے طالب علموں کی تعلیم کا سرانجام یونیورسٹی کو لازم ہے

تعلیم وہ ذریعہ ہے جس سے انسان کی پوشیدہ دماغی طاقتیں اور مفید خصائل نشو و نما پاتے ہیں۔ جن کے باعث ایک تعلیم یافتہ شخص اپنی جماعت کا ایک فائدہ رساں ممبر بن جاتا ہے۔ ایسی تعلیم

حاصل کرکے وہ نہ صرف اپنی روزی کما سکتا ہے بلکہ اوروں کے لئے بھی شمع ہدایت کا کام دیتا ہے۔

اعلیٰ تعلیم نہ صرف تعلیم یافتگاں کیلئے مفید ہے بلکہ حکومت اپنی تعلیم یافتہ رعایا سے بہترین خدمات لے سکتی ہے۔

افلاطون کا مقولہ ہے کہ تعلیم روح کو روشنی کی طرف متوجہ کر دیتی ہے۔ نپولین کا قول ہے کہ قابل و باغوں کے لئے تعلیم ترقی کا دروازہ کھولدیتی ہے۔ تعلیم سے نہ صرف دماغی نشوونما ہوتا ہے۔ بلکہ چال چلن پر بھی تعلیم کا بہت اچھا اثر ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ مناسب طور پر تعلیم دی جائے۔

طالب جو علم یا فن سیکھیں اسپر پورا عبور ان کا نصب العین ہونا چاہئے۔ اس علم یا فن کے متعلق کسی مسئلہ پر اسوقت تک یقین نہ کرنا چاہیئے جب تک کہ پوری تحقیق اور کاوش کے بعد اُس کی صداقت ثابت نہ ہو مشکلیں جو طالب علم کو پیش آدیں اُن کو مردانہ ہمت اور کوشش سے حل کرنا اور سمجھنا ضروری ہے۔ حق کی تلاش طالب علم کا مقصود ہونا چاہیئے۔ ایسے مسائل سے جو محض خیال خوش کن یا ضرورت زمانہ کے موافق ہوں مگر صداقت سے معرّا ہوں نہایت احتیاط اور سختی کے ساتھ اجتناب لازم ہے۔

یونیورسٹی کی تعلیم کو میں اس لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کے فوائد محض فوری ہی نہیں ہیں بلکہ ان کا لازوال اثر مدت العمر تک طالب علم کے چال چلن اور عادات پر پڑتا ہے۔ تفتیش اور تحقیقات کا شوق ایک دفعہ قائم ہوکر ما دام الحیات کام دیتا ہے۔ ایسی تعلیم جس سے تجسس اور تحقیقات کا ذوق نہ بڑھے بے کار ہے۔

تعلیم محض نقالی یا غلامانہ تقلید نہ ہونی چاہئے۔ بلکہ معلم اور متعلم کے درمیان آزادانہ تبادلہ خیالات ضروری ہے اور طالب علم کو اس امر کا پورا اختیار دینا چاہیے کہ ملکی اور قومی مسائل پر اپنے معتقدات اپنی سمجھ اور عقل کے موافق رکھے۔ یہ نتیجہ محض عمدہ قواعد یا بیش بہا مالی عطیات سے کسی یونیورسٹی کو حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ طریقۂ تعلیم کو اس میں بڑا دخل ہے۔ ایک عمدہ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل طلبہ میں وہ حمیدہ اوصاف موجود ہونے چاہئیں جو کامیاب زندگی کے لئے ضروری ہیں۔ مثلاً اپنے قویٰ پر بھروسہ رکھنا اپنے مخالف اشخاص یا مخالف خیالات رکھنے والوں سے خوش خلقی کا برتاؤ کرنا چال چلن عمدہ رکھنا اور ہر مسئلہ کا فیصلہ بلا رو رعایت کرنا۔ جو یونیورسٹی اپنے فارغ التحصیل طلاب میں یہ اوصاف پیدا نہیں کر سکتی اس کی تعلیم یوں سمجھنا چاہیے کہ ادھوری ہے اور اُس کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہئے۔ کہ اس کے مستخرجہ اشخاص اُسے ہمیشہ عزت اور محبت کی نگاہ سے دیکھینگے۔

تعلیم دینے کے واسطے اعلیٰ درجہ کے اساتذہ بہم پہونچانا یونیورسٹی کا فرض ہے۔ تاکہ وہ ہر قسم کے

علوم و فنون کی اعلے سے اعلے تعلیم دے سکیں - اساتذہ ایسے ہونے چاہئیں جنہیں اس بات کا شوق ہو کہ وہ جو کچھ جانتے ہیں اُسے بلا کم و کاست لائق طلبا کو سکھانے کو تیار رہوں - علم ہی ایک ایسی دولت ہے - کہ وہ جس قدر تقسیم کیجائے وہ مطلق کم نہیں ہوتی - اس لئے اساتذہ کو چاہئے کہ لائق اور ہونہار طالب علموں کی تعلیم میں کبھی بخل نہ کریں اور یاد رکھیں کہ طالب علم کی عقل اور اسکی قوت متخیلہ کی تحریک تعلیم کا نہایت ضروری جزو ہے -

تعلیم دینے کے علاوہ اساتذہ کا یہ بھی فرض ہے کہ ترقی معلومات اور اکتشافات جدیدہ میں منہمک رہیں - قدیم علوم سکھانا چنداں مشکل نہیں - علم ایک زندہ مخلوق ہے جو زمانہ کے امتداد کے ساتھ بڑہتا اور ترقی کرتا رہتا ہو اگر یونیورسٹی کے اساتذہ ایسی قابلیت نہ رکھتے ہوں کہ اپنی شاخ علم میں جدید اکتشافات کر سکیں تو ان کی تعلیم چنداں مفید نہ ہوگی - طالب علموں کو زیادہ ترفیض اُن اساتذہ سے پہنچتا ہے جو اپنے طلبہ کو یہ دکھلا سکیں کہ زندہ علوم و فنوں میں ترقی کیونکر ہوتی ہے ان کی تعلیم سے ان کے شاگرد تحقیق اور اجتہاد کے اعلےٰ مدارج تک پہنچ جاتے ہیں +

مگر یہ ضرور نہیں کہ یونیورسٹی کا ہر استاد اپنے فن کا محقق اور مجتہد ہو - علوم میں اجتہاد کے علاوہ اساتذہ کے دیگر فرائض بھی نہایت ضروری ہیں - مثلاً بعض اساتذہ ایسے ہونے چاہئیں جو ایک بڑی یونیورسٹی کے انتظام کی اعلے قابلیت رکھتے ہوں - بعض ایسے ہونے چاہئیں جو طالب علموں کے سوشل مذاق کی اصلاح اور رہبری کر سکیں + یونیورسٹی کو ہمیشہ ایسے اساتذہ کی جستجو میں رہنا چاہئے جو اعلیٰ قابلیت کے ساتھ تعلیم کے لئے اپنی زندگی وقف کرنے کے لئے تیار رہوں - ایسے اشخاص کی تعداد نہایت قلیل ہے ہر کالج کو ایسے استاد میسر نہیں آسکتے - اس لئے یونیورسٹی ایسی جگہ قائم ہونی چاہئے - جہاں متعدد کالج موجود ہوں تاکہ اُن کے اساتذہ کے چند کامل افراد سے یونیورسٹی مستفیض ہوسکے اور یونیورسٹی کے طالب علم اپنا منتخب کردہ فن ایسے اشخاص سے سیکھ سکیں جنہوں نے اپنی تمام عمر اُس فن کے سیکھنے اور سکھلانے میں صرف کی ہو - ایسے علما غیر عالم اشخاص کی ماتحتی میں رہنا پسند نہیں کرتے اس لئے یونیورسٹی کے لئے جس طرح علما کا انتخاب اور تقرر ضروری ہے اسیطرح یہ اہتمام بھی ضروری ہے کہ بعد تقرر تعلیم اور تعلم کے جملہ انتظامات علما کو تفویض کردے تاکہ ان کا فیصلہ تا متر اُن کی کثرت آرار کے مطابق ہوا کرے - ان کے فرائض خاطر خواہ ادا ہونے کے لئے یہ بھی ضرور ہے کہ ہر قسم کے بیرونی اثرات سے یونیورسٹی محفوظ رکھی جاسکے - مثلاً حکومت کا حد سے زیادہ دخل یا رعایا کی مختلف سیاسی جماعات کا اثر مذہبی یا سوشیل فرقوں کا اثر یا اُن علمار کا اثر جو تعلیم کا معیار اس قدر اونچا کرنا چاہتے ہیں - کہ

طالب علموں میں بجز چند نفوس کالج کے اور کوئی یونیورسٹی کے اعلےٰ امتحان میں کامیاب نہ ہو۔ ان سب اثرات سے یونیورسٹی مبرّا اور مامون ہونی چاہیئے اور تعلیم اور نصاب تعلیم کے متعلق اسکو پوری آزادی حاصل ہونی چاہیے ۔یونیورسٹی کی عالیشان عمارتیں اوس کے وسیع کتبخانے اور لیبوریٹریاں اُس کا کثیر سرمایہ اور اس کے بےنظیر اساتذہ اور محققین فنون سب بیکار رہیں۔ اگر یونیورسٹی کو علم کے شوقین طالب علم کثرت سے نہ ملیں ۔طالب علموں کو علم کا اتنا شوق ہونا چاہیئے کہ اُس کے سوا اور کسی چیز کی انکو پرواہ نہ رہے۔

ہندوستان کی قدیم تاریخ شاہد ہے کہ یہاں ہندو طالب علم کس محویت سے طلب علم میں مصروف رہتے تھے ۔کس طرح وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر برسوں تک اپنے گرو کے ساتھ بن باش کرتے تھے ۔ اگرچہ موجودہ یونیورسٹی کے قیام سے اس قدر زہد اور رہبانیت کی زندگی طالب علموں کے لئے غیر ضروری ہوگئی ہے مگر اس کی اب بھی ضرورت ہے ۔کہ سوا اپنی جسمانی اور اخلاقی اور روحانی ترقی کے طالب علم کو دوسرے مشاغل مثلاً سیاسیات وغیرہ سے کوئی تعلق نہ رہے۔ طالب علم کو یہ سمجھنا چاہیئے ۔کہ ابھی اس کی عمر اور تجربہ اور واقفیت میں اتنی ترقی نہیں ہوئی ہے ۔کہ وہ سیاسیات میں مشغول ہوکر اپنا وقت ضائع کرے ۔سیاسیات میں آیندہ حصہ لینے کے لئے اس کو سیاست مُدن فلسفۂ سیاسیات ۔اصول قانون ۔اصول حکومت ۔فلسفۂ اجتماعی تاریخ مذاہب اور عام تاریخ کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیئے مگر یہ نہیں خیال کرنا چاہیئے ۔کہ ان علوم سے کافی واقفیت پیدا کئے بغیر وہ ملک کے طرز حکومت پر کوئی مفید اعتراض کر سکتا ہے ۔ یا اُن خفیہ طاقتوں سے واقف ہوگیا ہے ۔جن میں قوموں کی ترقی اور تنزل کا راز سربستہ ہے ۔ زمانۂ تعلیم میں سب سے بہتر مسئلہ یہ ہے کہ صداقت کی تلاش کیجائے ۔ ہر مسئلہ کو بنظر امعان اور امتحان دیکھا جاوے ۔اور اسی مسئلہ پر اسوقت تک یقین نہ کیا جاوے ۔جب تک کہ وہ صحیح ثابت نہ ہو۔ جو طالب علم کسی سیاسی فرقہ میں داخل ہوکر اس کے اصول کی پیروی کرنے لگتے ہیں وہ اپنی اصلی مسلک چھوڑ کر غلامی اختیار کر لیتے ہیں ۔اُن کو چاہیئے ۔کہ ہر مسئلہ کے متعلق آزادانہ خیال رکھے ۔اور جب تک اُن کا زمانہ تعلیم ختم نہ ہو۔ اور سیاسی مسائل کا صحیح اور حتمی رائے قائم کرنے کی قابلیت اُن میں نہ آجائے ۔ اسوقت تک سب سیاسی فرقوں سے الگ تھلگ رہیں۔ یونیورسٹی کے امتحانات پاس کرنے کے بعد البتہ سیاسیات میں حصہ لینے کا وقت آتا ہے ۔میں اس رائے کا حامی نہیں ہوں کہ انسان جتنی اعلیٰ تعلیم حاصل کرے اسی قدر اس کو ملک کی محبت کم ہونی چاہیئے ۔ایسی تعلیم جو حب وطن سے انسان کو خالی رکھے بالکل ناقص ہے ۔ اس سے صرف ایک درجہ زیادہ ناقص وہ تعلیم ہے ۔جو انسان کو اپنے خالق اور پروردگار سے بے تعلق رکھے ۔ مگر حب وطن کے یہ معنی سمجھنا کہ حکومت کے طرز عمل پر محض قدح کیجائے صحیح نہیں ہے ۔ جرح کرنے سے پہلے یہ بتلانا چاہیئے ۔کہ موجودہ نظام سے

بہتر کونسا نظام ہے۔ اور وہ کہاں موجود ہے۔ معترض کو یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ جہلا اعتراضات کو سنکر بہت جلد آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور سنجیدگی اور متانت کے فقدان کی وجہ سے ان کے ہاتھوں امن عامہ میں سخت خلل واقع ہوتا ہے۔ تعلیم یافتہ اشخاص کا یہ فرض ہو کہ سیاسی مسائل کے حسن و قبح ظاہر کریں اور سیاسی خیالات میں سنجیدگی اور متانت پیدا کریں اور جب متضاد سیاسی فرقوں کے اختلافات اس قدر بڑھ جائیں کہ جنگ کا وقوع عنقریب متوقع ہو۔ تو بآواز بلند جنگ کے خوفناک نتائج سے لڑنے والوں اور امن پسند اہل ملک دونو کو پوری طرح واقف کر دیں۔ تعلیم یافتہ اشخاص کو اُس ترقی کی مخالفت نہیں کرنی چاہیئے۔ جو تہذیب اور شائستگی کی اب تک نصب العین رہی ہے۔ سوسائٹی کا نظام قائم رکھنا اور سیاسی انقلاب کی سلگتی ہوئی چنگاری کو مشتعل ہونے سے روکنا اُن کا پہلا فرض ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ جو ترقی ملک نے اسوقت تک کی ہے۔ وہ ہی ہاتھ سے جاتی رہے۔ اور امن عام اور شائستگی کے قیام میں جو قرنوں اور صدیوں سے جو کوشش ہمارے بزرگوں اور معاصرین نے کی ہے وہ آپس کے نفاق اور غصہ کے ہاتھوں رائگاں جائے۔ اور شائستگی بہیمیت سے بدل جائے۔ امن کا قائم رکھنا۔ قانون کا احترام او۔ حکومت کے ساتھ وفادارانہ برتاؤ تمام تعلیمیافتہ اشخاص کے لئے نہایت ضروری ہے اور انہیں چاہیئے کہ غیر تعلیم یافتہ اہل ملک پر انکی ضرورت اور فوائد کو اپنے افعال اور اقوال سے ہمیشہ مُبرہن کرتے رہیں اور ان کی عدم موجودگی سے جس سخت مصیبت میں تمام اہل ملک رعایا اور برایا امیر اور غریب کے یکساں اور دفعتہً مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہے اسکو سب پر واضح اور روشن کرتے رہیں تعلیم یافتہ اشخاص کا یہ بھی فرض ہے کہ سیاسی مسائل اور مباحث کو تعصب اور غصہ اور نفسانیت سے خالی رکھیں اور ٹھنڈے دل سے عقل سلیم کے مطابق تمام مختلف فیہ مسائل کو فیصل کریں۔ ایسی زندگی اُس یورپین شاعر کے مقولہ کی مصداق ہوگی۔ جس نے کہا ہے:۔ (۱) تو سچا خیال رکھ تاکہ تیری خیالات سے ملک میں فتنہ کی آگ بجھ جائے۔

(۲) تو سچی بات کہہ تاکہ تیرا ہر لفظ اس دانہ کا کام دے جو رفتہ رفتہ ایک تناور درخت بن جاتا ہے۔

(۳) تو سچی زندگی بسر کر تاکہ تیرے افعال عالم آشوب تاریکی میں شمع ہدایت کا کام دیں +

محمد احمد شیبانی۔ ایم۔ اے

پوسٹ ماسٹر

پوسٹ ماسٹر نے اپنا کام موضع اولاپور میں شروع کیا۔ یہ موضع اگرچہ چھوٹا تھا۔ لیکن اس وجہ سے پوسٹ آفس (پٹہ خانہ) کھولنے کے لئے اس کو اہمیت دی گئی کہ اس کے قریب ہی ایک نیل کا کارخانہ تھا۔ اور اس کا انگریز نژاد مالک اپنے کاروباری سہولت کیلئے چاہتا تھا کہ وہاں پٹہ خانہ (پوسٹ آفس) کھولا جائے۔

ہمارا پوسٹماسٹر کلکتہ کا رہنے والا تھا۔ شہر سے دور اس موضع میں اس کے لئے سکونت بالکل ایسی تھی جیسا کہ مچھلی کے لئے پانی سے باہر رہنا۔ اس کے دفتر اور رہنے کے کمرے ایک گھاس سے چھائے ہوئے چھپر میں تھے۔ یہ مقام ایک کنٹہ کے قریب تھا۔ جسکے اطراف سبز گھاس اُگی ہوئی تھی۔

نیل کے کارخانہ کے مزدور بہت زیادہ مصروفِ کاروبار رہا کرتے تھے۔ اس قدر کہ اُنہیں بہت کم فرصت کا وقت مل سکتا تھا۔ علاوہ بریں ان کی صحبت شایستہ اشخاص کے لئے دلبستگی کا سامان نہیں فراہم کرسکتی تھی۔ کلکتہ کے نوجوانوں میں ایک نقص یہ بھی ہے کہ وہ جلد کسی سے میل جول پیدا کرلینے کی صفت نہیں رکھتے۔ اجنبیوں میں یا تو وہ مغرور بنے رہتے ہیں۔ یا ان کے اوضاع سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ ان کی صحبت میں خوش نہیں۔ بہرکیف پوسٹماسٹر کیلئے نہ کام ہی کافی تھا۔ اور نہ اس کے اچھے ہمصحبت ہی موجود تھے۔

بعض مرتبہ وہ نظم لکھنے کی سعی کرتا۔ جن جذبات کے ظاہر کرنے کی وہ کوشش کیا کرتا وہ اسطرح کے ہوتے۔ پتوں کی جنبش اور آسمان پر ابر کا اجتماع زندگی کو خوشی سے بھر دینے کے لئے کافی ہیں غریب پوسٹماسٹر اس کو منجانب اللہ تصور کرتا اگر ایسا ہوتا کہ کسی رات الف لیلہ کا کوئی روایتی جن درختوں۔ پتوں اور دوسرے اسی قسم کے مناظر کی عوض پختہ سڑکیں لا بچھاتا اور اونچی اونچی شہری عمارتوں کو لاکھڑا کرتا۔ جن کی وجہ سے بادل نظروں سے غائب ہوجاتے۔

پوسٹماسٹر کی تنخواہ کم تھی اس کو اپنا کھانا آپ پکانا ہوتا تھا۔ اس کام میں رتن نامی ایک نیم دیہاتی لڑکی اس کا ہاتھ بٹاتی تھی صرف یہی نہیں بلکہ وہ اس کے اور بھی کام کاج کردیا کرتی تھی۔

جب شام کیوقت دھواں گاؤں کے مکانوں سے مرغولہ وار بلند ہوتا اور پرند جھاڑیوں میں چہچہاتے ٹھیک اسوقت پوسٹماسٹر اپنا چراغ روشن کرکے رتن کو بلاتا۔

رتن دروازہ کے باہر بلانے کی منتظر بیٹھتی اور بجائے اسکے کہ فوراً اندر داخل ہو پوچھتی۔ کہ "کیا آپ نے مجھے بلایا ہے"؟ پوسٹماسٹر جواب میں دریافت کرتا کہ "تم کیا کررہی ہو"؟

وہ جواب دیتی کہ "میں اب باورچی خانہ میں جاکر چولھا سلگانا چاہتی ہوں" اس کے جواب میں پوسٹماسٹر کہتا کہ "کچھ دیر بعد چولھا روشن کرو۔ اب تو میری چلم پر آگ دہر دو"

رتن کوئلہ لئے داخل ہوتی جس کو پھونکنے کی محنت سے اُس کے رخسار پھولے ہوتے۔ اس کا اندر آنا پوسٹماسٹر کیلئے بات چیت شروع کرنیکا موقع پیدا کردیتا۔ اور وہ دریافت کرتا "اچھا رتن بتاؤ کیا تم کو اپنے ماں باپ یاد ہیں؟" یہ سوال بڑا ہی بحث خیز ہوتا۔ رتن کو کچھ یاد تھا۔ اور کچھ وہ بھلا چکی تھی اس کو بہ نسبت ماں کے اپنا باپ بہت اچھی طرح یاد تھا۔ وہ اپنے کام کے بعد شام کیوقت گھر لوٹا کرتا تھا۔ یہ اور اسی قسم کی بعض باتیں دھندلی تصویروں کی طرح اس کے حافظہ میں موجود تھیں۔ رتن زمین پر پوسٹماسٹر کے پیروں کے قریب بیٹھ جایا کرتی اور گزشتہ باتوں کا اس کے حافظہ میں ہجوم ہو جایا کرتا۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی کو یاد کرتی کہ کس طرح گزشتہ زمانہ میں اس کے ساتھ کنڈ کے کنارے مچھلی پکڑنے کی چھڑی (بنسی) لیکر وہ کھیلا کرتی تھی۔ ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات کی یاد اس کے دل سے بڑے بڑے حادثوں کو بھلا دیا کرتی۔ یوں باتیں کرتے کرتے اس قدر زیادہ وقت گزر جاتا کہ پوسٹماسٹر کو اب کھانا پکانا نامعلوم ہوتا۔ اسوقت رتن جلدی سے آگ روشن کرتی کچھ روٹی پکاتی جسکو دن کے ٹھنڈے کھانے کے ساتھ دونوں کھالیا کرتے۔

کبھی شام کیوقت پوسٹماسٹر اپنے گھاس کے عریض وطویل مگر تنہا چھپر میں بیٹھا ہوا گھر کی یاد میں منہمک ہوجایا کرتا۔ ماں باپ۔ بھائی بہن اور ان لوگوں کی یاد اس کو خود فراموش بنادیتی۔ جن کے لئے اس کا دل اس آوارہ وطن میں بیچین وغمگین رہا کرتا۔ اکثر و بیشتر ایسے ہی خیالات اُس کے دل و دماغ پر چھائے رہتے جنہیں وہ کارخانہ کے کسی آدمی پر ظاہر نہیں کرسکتا تھا۔ وہ رتن کی موجودگی میں محسوس کرتا تھا کہ ان خیالات کی اسپر سختی سے یورش ہوا کرتی ہے۔ رتن اس کے ماں باپ۔ بھائی بہن کو پوچھا کرتی گویا کہ وہ ان سب سے واقف ہو۔ حقیقتاً ان میں سے ہر ایک کی تصویر اسمیں موجود تھی

ایک روز شام میں جبکہ بارش تھم گئی تھی اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چل رہے تھے۔ بھیگے ہوئے پتوں اور گھاس کی بو تیز دھوپ میں اس طرح آرہی تھی جس طرح تھکے ماندے انسان کی سانس چلا کرتی ہے۔ ایک ضدی پرند نیچر کے دربار میں شکوہ وشکایت کا دفتر کھول بیٹھا تھا۔

پوسٹماسٹر کو کوئی کام نہ تھا۔ ابھی ابھی دھلے ہوئے پتوں کی تازگی اور چمک اور برس کر کھل جانے والے ابر کے بقیہ ٹکڑوں سے افق کو گھرا ہوا دیکھنا عجیب لطف دے رہا تھا۔ پوسٹماسٹر اس نظارے اور اپنے خیالات میں محو تھا۔ دفعتاً اس نے اس عالم استغراق میں کہا۔ کاش میرا کوئی ہم مذاق یہاں ہوتا۔

یا وہ جس سے مجھے محبت ہے۔ یہ بالکل وہی بات تھی جو وہ شاکی پرند کہہ رہا تھا۔ اور یہ وہی احساس تھا۔ جو ہوا سے ہلنے والی پتیاں ظاہر کر رہی تھیں۔ لیکن کوئی نہیں جانتا۔ یا کم از کم یاد نہیں کر سکتا کہ ایک کم مواجب پوسٹماسٹر کے دل میں بھی ایسے خیالات پیدا ہو سکتے ہیں۔

پوسٹماسٹر نے ٹھنڈی سانس بھر کر پکارا "رتن"۔ رتن جو جامن کے درخت کے نیچے پکے جامن کھانے میں مصروف تھی۔ اس آواز سے چونک پڑی۔ اور یہ کہتی ہوئی دوڑی کہ "دادا کیا تم نے مجھے پکارا؟" پوسٹماسٹر نے کہا "میں تمکو پڑھنا سکھانے کا خیال کر رہا تھا۔" اس نے سہ پہر کا باقی حصہ رتن کو۔ الف بے۔ پڑھاتے صرف کر دیا۔

تھوڑے ہی عرصہ میں رتن دور تک پہنچ گئی۔

ایسا معلوم ہونے لگا کہ بارش ختم ہی نہ ہوگی۔ بارش نے جل تھل بھر دیئے۔ رات دن کے چوبیس گھنٹوں میں اگر کوئی آواز سنائی دیتی تھی تو وہ شدت بارش کے مسلسل گرنے والے قطروں یا مینڈک کے ٹرانے کی تھی۔ کثرت باراں نے راستوں کو ناقابل عبور بنا دیا۔ حتیٰ کہ خرید و فروخت تک کشتیوں کے بغیر ناممکن ہو گئی۔

ایک روز جبکہ ابر چھایا ہوا تھا۔ پوسٹماسٹر کا یہ کم سن شاگرد طلبی کا منتظر تھا۔ لیکن حسب معمول استاد نے اسکو طلب نہیں کیا۔ سخت انتظار کے بعد رتن اپنی مڑی تڑی کتاب لیکر آہستہ سے کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس نے دیکھا کہ پوسٹماسٹر بستر پر لیٹا ہوا ہے۔ وہ پلٹنے ہی کو تھی کہ اُس نے اپنے نام "رتن" کی آواز سنی۔ اُس نے فوراً پلٹکر پوچھا۔ کہ "دادا کیا تم سو گئے تھے"؟ پوسٹماسٹر نے کمزور آواز میں جواب دیا کہ "میرا مزاج اچھا نہیں ہے۔ میری پیشانی پر ہاتھ رکھو۔ کیا وہ نہیں جل رہی ہے؟"

آوارہ وطن کی اس دلشکن تنہائی اور بارش کے ان تاریک ایام میں اس کو ایک نازک ہاتھ کی تیمارداری چاہیئے تھی۔ وہ کس قدر منتظر تھا کہ اس کی پیشانی کسی چوڑیوں والے نرم ہاتھ کو محسوس کرے۔ جس سے صنف نازک کی محبت بھری موجودگی کا احساس ہو۔ اور وہ یہ خیال کر سکے کہ اس کی ماں یا بہن قریب ہے۔ آوارہ وطن پوسٹماسٹر کی یہ امید ٹوٹی نہیں۔ کیونکہ رتن نے اپنے آپ کو ایک کمسن دیہاتی لڑکی سے دفعتہً ماں کی حیثیت میں تبدیل کر لیا۔ وہ فوراً ایک دیہاتی حکیم کو بلا لائی۔ مناسب وقفہ سے بیمار کو دوا پلاتی رہی۔ رات رات بھر مریض کے سرہانے بیٹھی تیمارداری کیا کرتی۔ وقتاً فوقتاً اس کے لیے اوگرا پکاتی اور ہر وقت پوچھتی رہتی کہ "دادا کہو اب طبیعت کیسی ہے"؟

کچھ دنوں بعد پوسٹماسٹر کی صحت نسبتہً بہتر ہو گئی۔ ایک روز اُسنے فیصلہ کن لہجہ میں کہا کہ

یہ مصیبت اب زیادہ دنوں نہیں برداشت کی جاسکتی۔ مجھے اس جگہ سے فوراً تبادلہ کی درخواست کرنا چاہیئے۔" اس نے اسیوقت کلکتہ کو لکھا کہ اس مقام کی آب وہوا نے اس کی صحت پر مضر اثر ڈالا فوراً اس کا تبادلہ کہیں اور کر دیا جائے۔

جب رتن کو تیمارداری سے فرصت ملی تو وہ حسب عادۃ مستمرہ دروازہ سے باہر بیٹھا کرنے لگی لیکن اب اس کی طلبی پہلے کی طرح نہیں ہوا کرتی تھی۔ وہ کبھی چپکے سے کمرے میں جھانک کر دیکھتی۔ کہ پوسٹماسٹر یا تو کرسی پر خاموش بیٹھا ہے۔ یا بستر پر لیٹا ہوا دیواروں کو خالی تک رہا ہے۔ اگر رتن ایک طرف اپنی طلبی کی منتظر تھی تو دوسری طرف پوسٹماسٹر کو اپنی درخواست کے جواب کا انتظار تھا لڑکی بار بار اس خیال سے اپنے سبق دہرایا کرتی کہ ایسا نہ ہو کہ جب اس کو پڑھنے کے لئے بلایا جائے تو وہ کچھ بھی نہ بتا سکے۔ آخر ایک ہفتہ کے انتظار کے بعد پوسٹماسٹر نے اس کو اندر بلایا۔ رتن خوشی سے کمرے میں حسب معمول یہ کہتی ہوئی داخل ہوئی کہ " دادا کیا تم نے مجھے بلایا ہے۔"؟

پوسٹ ماسٹر نے کہا۔ کہ " رتن میں کل صبح جا رہا ہوں۔"

" دادا تم کہاں جا رہے ہو۔"؟

" میں اپنے گھر جا رہا ہوں۔"

" تم کب واپس آؤ گے "؟

" میں واپس نہیں آؤنگا "

رتن نے مزید گفتگو نہیں کی۔ لیکن پوسٹماسٹر نے اپنی ہی مرضی سے یہ کہا کہ اُس نے تبادلہ کی درخواست کی تھی جو نامنظور ہوئی۔ اس لئے اس نے استعفا دیدیا۔ اور اب گھر جا رہا ہے۔

کچھ دیر تک دونوں نے گفتگو نہیں کی۔ چراغ دھیما جل رہا تھا۔ اور اس گھاس کے چھپر میں ایک گوشہ کے خراب ہو کر شگاف دار ہو جانے کی وجہ سے پانی ٹپک ٹپک کر نیچے مٹی کے اس برتن میں جمع ہو رہا تھا جو اسی غرض سے وہاں رکھدیا گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد رتن اُٹھ کر باورچی خانہ میں کھانا پکانے کے لئے گئی۔ لیکن اب اس میں وہ پہلی سی تیزی نہ تھی۔ بہت سے نئے خیالات اس کے چھوٹے دماغ کو غور و فکر کی دعوت دے رہے تھے۔ جب پوسٹماسٹر نے شب کا کھانا ختم کیا تو رتن نے اُس سے کہا۔" دادا مجھے بھی اپنے ہمراہ گھر لے چلو۔"

پوسٹماسٹر نے ہنسکر کہا۔" یہ بھی کیسا خیال ہے"! اُس نے لڑکی سے یہ کہنا غیر ضروری تصور کیا کہ اگر ایسا کیا جائے۔ تو اسمیں کتنی رُکاوٹیں ہیں۔"

رتن رات بھر نیم بیداری کی حالت میں کروٹیں بدلتی رہی اور اس کے کانوں میں پوسٹماسٹر کی

یہ آواز گونجتی رہی کہ "یہ بھی کیسا خیال ہے"

صبح اُٹھکر پوسٹماسٹر نے اپنا حمام تیار پایا۔ اس نے یہاں بھی کلکتہ کے نہانے کا طریقہ جاری رکھا تھا۔ جہاں پانی دوسرے ظروف میں نکالا جاتا ہے اور جو دیہات کے اس سادہ طریقہ کے مغائر ہے کہ ندی میں غوطہ لگا کر نہا لیا جائے۔

لڑکی نے کسی نہ کسی وجہ سے نامناسب تصور کیا۔ کہ اس سے وقت وداع دریافت کرے۔ اُسکے اُٹھنے سے بہت پہلے ندی سے جاکر پانی لے آئی۔ تاکہ وہ اُٹھ کر غسل کر سکے۔ نہانے کے بعد اُس کی طلبی ہوئی۔ بغیر کچھ کہے سُنے وہ اندر گئی۔ پوسٹماسٹر کی طرف خاموشی سے دیکھتی اور اُس کے حکم کی منتظر رہی۔ پوسٹماسٹر نے کہا "رتن میرے چلے جانے کی وجہ سے تم کو متفکر نہ ہونا چاہئے۔ میں اپنے جانشین سے تمہاری نسبت کہتا جاؤنگا" اس میں کوئی شک نہیں کہ ان الفاظ کے کہنے سے مہربانی کا اظہار مقصود تھا۔ لیکن عورتوں کے دل ناقابل تفحص راز کے گنجینے ہیں!

رتن نے اکثر و بیشتر پوسٹ ماسٹر کے سخت سست الفاظ سُنے تھے اور ان کو آسانی سے پی گئی تھی لیکن اُس کے لئے یہ کرم آمیز جملے ناقابل برداشت تھے۔ اس نے روتے ہوئے کہا "نہیں۔ نہیں میری نسبت کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں اب اس جگہ رہنا نہیں چاہتی"

پوسٹماسٹر وقف تحیر ہو گیا۔ اس نے کبھی بھی رتن کو اس حالت میں نہیں دیکھا تھا۔

نیا شخص مقررہ وقت پر وہاں آپہنچا۔ اور پوسٹماسٹر نے چارج دیکر چلنے کی تیاری کر لی۔ چلتے ہوئے اُس نے رتن کو بلا کر کہا "یہ لو۔ میں امید کرتا ہوں کہ کچھ دنوں تم کو فکر معاش کی طرف سے فراغت حاصل رہے گی" اس نے جیب سے پورے مہینے کی تنخواہ نکال کر اُسکو دینا چاہا۔ اور اپنے مصارف سفر کے لئے بہت کم روپیہ رکھ چھوڑا۔ رتن اُس کے قدموں پر گر پڑی اور کہنے لگی کہ "دادا مجھے کچھ نہ دو۔ اور نہ میری فکر کرو" یہ کہتے ہوئے اُٹھی اور وہاں سے چلی گئی۔

پوسٹماسٹر نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اپنا تھیلا اٹھایا۔ اپنی چھتری کاندھے پر رکھی اور اپنے مختلف الالوان صندوق کو مزدور کے سر پر دے کر کشتی کی طرف لے چلا۔

جب وہ کشتی میں سوار ہو چکا تو کشتی چلی اور بارش کے پانی سے چڑھی ہوئی ندی کا پانی زور و شور سے کشتی کے تختوں کے نیچے بہنے لگا۔ پوسٹماسٹر نے اپنے دل کو مغموم پایا۔ ایک کمسن غمزدہ دیہاتی لڑکی کا چہرہ اُس کی نظر کے سامنے آموجود ہوا۔ جو نہ صرف اپنی بلکہ "مادر عالم" کی بھی شرح تکلیف وغم کر رہا تھا۔ ایکبار اضطراری طور پر اُس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ جاکر اُس کو لے آئے

اور اپنے ہمراہ لے جائے ۔لیکن ٹھیک اسیوقت ہوا بادلوں کو پھیلانے لگی اور کشتی دھار میں پہنچ گئی ۔اور وہ موضع نظر سے دور ہوگیا۔

اب اُس مسافر کے لئے جو تیز بہنے والی ندی پر سفر کر رہا تھا ۔بجز اس کے اور کیا باقی رہ گیا کہ وہ دنیا کی ان بیشمار ملاقاتوں اور جدائیوں پر فلسفیانہ انداز میں غور کرے جو روزانہ وقوع میں آیا کرتی تھیں ۔اور موت کی اس آخری ناگوار جدائی پر بھی کہ جس کے بعد پھر واپسی نہیں ہے۔

لیکن رتن نے فلسفیانہ دماغ نہیں پایا تھا ۔وہ پوسٹ آفس کے اطراف میں گھومتی رہی ۔اس کے رخساروں پہ آنسو بہا کرتے تھے ۔شاید اس کے دل کے کسی گوشہ میں یہ خیال چھپایا ہوا ہو کہ پوسٹماسٹر واپس آئیگا ۔اور اسیوجہ سے وہ اس جگہ سے الگ ہونا پسند نہ کرتی ہو ۔افسوس یہی تقاضائے بشریت ہے ۔انسان اپنی خواہشوں اور آرزومندیوں کے جوش وہجوم میں غلطیاں کر بیٹھتا ہے ۔ دلائل کے کے لئے یہ ایک وقت صبر آزما امر ہوتا ہے۔کہ اپنی قوت سے انسان کو اپنے زیر اثر لے آئیں ۔وہ بدیہات سے بالعموم اغماض کرتا ہے اور انہیں باور کرنا نہیں چاہتا ۔انسان ایک والہانہ جوش کے ساتھ امیدوں کو اپنے دل میں جگہ دیتا ہے ۔لیکن ایکدن آتا ہے کہ وہ اس سے بےرحمانہ طور پر جدا ہوتی ہیں ۔ اس کے بعد ہی بیداری واحساس کی تکلیف آتی ہے جس کی سختی سے وہ کس قدر اس بات کا آرزومند ہوجاتا ہے ۔کہ پھر ایکبار اپنے کو انہیں غلطیوں کی پر فریب بھول بھلیاں میں پھنسا دے۔

(ٹیگور) مرزا احمد اللہ بیگ ۔تحصیلدار

عظمتِ توبہ

فنا کردیتی ہیں جب لغزشیں راحت میری دل کی — مرے اشکوں میں کھنچ آتی ہے صورت قلب بسمل کی
میرا ہی نفس اعلیٰ مجھ سے خود منہ پھیر لیتا ہے — میرا دامانِ عصیاں بڑھ کے مجھ کو گھیر لیتا ہے
نماز و سجدہ میں لگتی ہے محسوس ایک دشواری — جبینِ بندگی پر ہنستی ہے میری ریاکاری
پنہا دیتا ہے حدادِ تخیل بیڑیاں مجھ کو — خود اپنے آپ پر ہوتا ہے زنداں کا گماں مجھ کو
نظر کرتا ہوں جب مونہہ ڈال کر اپنے گریباں میں — گھرا پاتا ہوں اپنے دل کو ظلمتہائے عصیاں میں
سناتا ہے مجھے حکمِ سزا میرا ضمیر اکثر — خجل ہوتا ہے روحِ پاک سے خاکی خمیر اکثر

۲

جب اس اندازِ بے تابی سے دل مایوس ہوتا ہے — بس اک ہلکا تموج قلب میں محسوس ہوتا ہے

عناصر ہنستے ہیں - دنیا کی وسعت مسکراتی ہے
بدن کے ہر بُن مُو سے یہی آواز آتی ہے
خود اپنے ہاتھ اپنا ہی دل پامال کر لے تو!
یہی بہتر ہے اپنے جرم سے اقبال کر لے تو!

۳

اسی عالم میں کرتا ہوں بلند آواز اس دل سے
پہنچتی ہے جو آگے عرش کے ساتوں منازل سے
یہ کہتا ہوں کہ اے حلّالِ مشکل سخت مشکل ہے
میں اک بیکار ہستی - اور تیری ذات تیرا دل ہے
ابھی تک آدمیت جوہرِ اعلےٰ پہ غالب ہے
بس اب دستِ تمنا دامنِ رحمت کا طالب ہے

۴

یہ کہنے بھی میرے دل کو سکوں معلوم ہوتا ہے
سنبھلنا کچھ مرا حالِ زبوں معلوم ہوتا ہے
جب استغراق تو بہ سے فراغت ہوتی ہے دل کو
بظاہر دیکھتا ہوں حل ہوتے اپنی مشکل کو
دوبارہ قلبِ مضطر پھر نشاط انگیز ہوتا ہے
مرا پیمانۂ دل نور سے لبریز ہوتا ہے
تمام آلائشوں سے اپنے دل کو پاک پاتا ہوں
میں اپنے دل میں نورِ قوتِ ادراک پاتا ہوں

۵

یہی ہے باعثِ حیرت یہی بنیادِ مشکل ہے
ابھی تائب تھا اب عاصی ہے دشمن ہو یا دل ہے

جگت موہن لال رواں - ایم - اے

شب ماہتاب

ادہر مہرِ عالم افروز کنجِ خلوت میں نہاں ہوا - اُدھر شام نے منہ نکالا - لیکن دم بھر میں سایہ کی طرح گریزاں ہو دی - شبِ ماہتاب کہکشاں کی مانگ نکالے ہوئے - مہِ انور کا تاج زیبِ سر کئے ہوئے - اور نور کی اوڑھنی اوڑھے ہوئے فضائے عالم میں جلوہ فگن ہوئی - حسن و دلبری اور ناز و ادا کا یہ عالم تھا کہ ؎

از فرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامنِ دل مے کشد کہ جا اینجا است

رنگیں ادا حسین و ماہ جبین تو ہزاروں ہوتے ہیں - لیکن اس شاہدِ رعنا کی ادا ہی اور ہے - ؎

شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد
بندۂ طلعتِ آں باش کہ آنے دارد

ستارے آنکھوں ہی آنکھوں میں چہ میگوئیاں کرنے لگے - لیکن ترکِ فلک نے خنجر کھینچ کر ان سے یوں خطاب کیا - دیکھنا اگر اس حسینہ کو آسیبِ چشم زخم پہنچا - تو تمہارے پرخچے اڑا کر شیطان کے انگاروں کی طرح اڑا دے جائینگے - لو لوئے فلک اس ماہ جبینہ کے حسن سے مسحور ہو کر رقص میں آئی - اور

اپنے رقصِ جانگداز سے شبِ زندہ داروں پر ایسا سحر کیا۔ کہ زاہدوں کا زہد اور صوفیوں کا تصوّف ایک پل میں ہوا ہوئے اور آسمان کے دبیر نے انہیں عشاق کے زمرہ میں درج کیا۔ اللہ رے حسن! کہ زمین و آسمان میں کسیکو گفتار و کلام کی مجال نہیں۔ سب دم بخود ہیں۔ ہر سو ہُو کا عالم ہے۔ جدھر دیکھو سکّانِ زمیں نشۂ سرور میں چور اور رنج و محن سے دور پڑے سو رہے ہیں۔ ہاں اگر نیند نہیں۔ تو عاشقِ زار کو جو فراقِ یار میں گھلا جاتا ہے۔ لیکن شبِ ماہتاب کے حسن کی مرہم جاں نواز سے اُس کے زخمہائے دلگداز بھی اندمال پذیر ہوکر باعثِ تسکین ہو رہے ہیں بلبل و قمری اپنے اپنے آشیانوں میں مئے نشاط سے مخمور ہیں۔ اگر کچھ ہوش میں ہیں تو سرو صنوبر یا لالہ و گل۔ مگر سرو بھی پا پیادہ ہوکر نشۂ عیش میں اونگھ رہا ہے۔ لالہ کا دل شبِ ماہتاب کے رشکِ حُسن سے داغدار ہو گیا ہے۔ اور چار و ناچار عجز و انکسار کی صورت میں کاسۂ گدائی بلند کئے ہوئے ہے۔ زبانِ حال سے یوں عرض پرداز ہے ؎

نصابِ حُسن در حدِّ کمال ست زکاتم دہ کہ مسکین و فقیرم

اگر جرأت استقامت ہو۔ تو سمن سیمتن میں کہ متبسّم ہوکر حُسنِ ماہ کی ہمسری کا دعویٰ کرتی ہے لیکن لوامع نور کی تاب نہ لاکر وہ بھی اپنی بے بضاعتی پر دل ہی دل میں خندہ زن۔ اور کانوں کان کسی کو خبر نہیں ہونے دیتی نرگسِ شہلا مجسمۂ حسن کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہے۔ اور سرور کا وہ عالم طاری ہے کہ آنکھ تک نہیں جھپکتی۔ مبادا یہ شاہدِ رعنا آنکھ کے جھپکنے تک نظر سے اوجھل ہو جائے۔ غنچہ تنگ دہن یہ عالم دیکھ کر آگے بڑھا۔ اور جب نرگسِ مست پر ماہِ حُسن کی یہ نوازشات مشاہدہ کیں۔ تو منہ پھاڑ کر کہنے لگا "حضور میں بھی حاضر ہوں۔ ایک نظر ادھر بھی"۔ ابھی یہ الفاظ دہنِ تنگ کی قید سے آزاد بھی نہ ہوئے تھے۔ کہ جنونِ عشق کی زنجیروں میں جکڑ کر رہ گیا۔ اور اسی جوشِ جنوں میں اپنے پیرہن کو پھاڑ کر آغوشِ خار میں پناہ لی۔ لیکن حُسنِ ماہ یہاں تک اس کی رگ رگ میں دوڑ گیا۔ کہ وہ ہر محفل میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ اور ہر حسین و ماہ جبین کے سینہ پر اُسے جگہ ملی۔ اور یہی وجہ تھی۔ کہ شیخ و برہمن اسے دستارِ مبارک میں رکھنے لگے۔ اور یہی باعث تھا۔ کہ راجاؤں اور بادشاہوں کا زیبِ محفل بنا۔ سوسن تیز زبان جواب تک ایک گوشہ میں دبک کر بیٹھی تھی نہایت شوخی سے آگے بڑھی۔ اور اپنی زبانِ طرار کو حرکت دیکر شبِ ماہتاب پر یوں زباں درازی کرنے لگی۔ دیکھ تو اپنے حسنِ یک شبی پر اتنی نہ اترا۔ اور اپنے مسحورین پر کھلکھلا کر نہ ہنس۔ کیونکہ تیرا یہ حُسن وہ حُسن نہیں جسے بقا ہو۔ اور تیرا یہ سحر وہ سحر نہیں جس کا اثر دیرپا ہو۔ تو بھی اپنی بے بسی کا خیال کر۔ کہ جب تیرا یہ غرور دور اور سرور کافور ہو جائیگا تو یہی گل و سمن جو اس وقت تیرے حسن کے متوالے ہیں کل یہی تجھ پر ہنس کر تیرے لئے بھالے بنینگے۔ بات

توسوسنِ تلخ گو نے خوب کہی۔ لیکن جوشِ شباب میں ایسی باتوں کی کون پروا کرتا ہے۔ ابھی بات بھی ختم نہ ہونے پائی تھی۔ کہ اس حسینۂ مستِ مئے ناز نے نگاہِ افسوں خیز و مشک بیز سبزہ زار پر ڈالی۔ وہ بیچارہ گو دن بھر کی توز آفتاب سے پژمردہ ہو کر زمین پر لیٹا ہوا تھا۔ لیکن نظرِ التفات ہوتے ہی فوراً اُٹھا۔ اور شبنمِ آبدار سے وضو کر کے نمازیِ شب زندہ دار کی طرح رکوع و سجود میں جھومنے لگا۔ اور طرب و نشاط کے عالم میں زبانِ حال سے یوں گویا ہوا: ؎

چو دیدم روئے خوبت سجدہ کردم — بحمد للہ نکو کردارم امشب

آبِ رواں لہرا لہرا کر ہم آغوش ہوا۔ اور بحرِ ناپیدا کنار نے آگے بڑھ بڑھ کر اس ماہ لقا کو رونمائی کے لئے لولوئے شاہوار اور گوہرِ آبدار پیش کئے۔ لیکن یہ شوخیِ حُسن یہ جوشِ شباب کب تک۔ یہ ناز و ادا یہ لطف نشاط کہاں تک۔ ہر کمالے را زوالے۔ آخر مرغِ صبح نے کوسِ رحلت بجایا۔ گل و بلبل نے قہقہہ لگایا۔ اور صبح نے ستمگر شبِ ماہتاب کی پژمردگی پر اظہارِ شماتت کیا۔ لیکن ع بدی را بدی سہل باشد جزا۔ ابھی دل کھول کر ہنسنے بھی نہ پائی تھی۔ کہ شہنشاہِ مشرق (سورج) نے آ لیا۔ اور شعاعوں کی تیغوں سے اُس کا کام تمام [illegible] نسیم جو پروردۂ آغوشِ شبِ ماہتاب تھی۔ اور ہم جلیسِ صبحِ عالمتاب تھی۔ ان ہر دو کی جدائی پر آٹھ آٹھ آنسو روئی۔ اور یہاں تک کہ خود بھی کھل کر چل بسی

ناظرینِ با تمکین! شبِ ماہتاب کی یک شبی زندگی ہمیں پُر لطف پیرایہ میں آگاہ کرتی ہے۔ کہ یہ دنیا جائے قرار نہیں۔ گلِ رعنا و بلبلِ زار سے اسے سروکار نہیں۔ ہزاراں حسین اور ماہ جبیں کبک رفتار و نغز گفتار اس سرائے سپنجی میں رونق افروز ہوئے۔ بیشمار فدایانِ حُسن کو گھائل بھی کیا لیکن آخر برقِ ناپائیداری کی طرح آنکھوں سے اوجھل ہو کر تا ابد صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ جب یہ حُسن و شباب ہیچوں شبِ ماہتاب گذشتنی ہے تو پھر یہ نمود و سرور کیسا۔ اُٹھ اے انسانِ غافل فردا کی فکر کر۔ ابد سے قیوم سے لو لگا۔ اور اپنے ہم مسلکوں (انسانوں) کو نہ ستا ورنہ تیرا بھی یہی حال ہوگا۔ جو صبح کے نونہال کا ہوا۔ تجھے بھی ریشخند کی پاداش میں آماجگاہِ تیغ و تفنگِ دیگراں بننا پڑیگا۔

عمر الدین احمد۔ بی۔ اے



جنونِ محبت

سین اوّل

چیرنگ کراس لنڈن کا ریلوے سٹیشن
پلیٹ فارم نمبر ۲ پر ڈوور ایکسپریس تیار
کھڑی ہے

"ناممکن!"

"ناممکن؟ مگر کیوں اور کس طرح؟"

"پیاری کیا کہوں۔ کس طرح تمہاری تسلی کیجائے ناممکن ہاں واقعی ناممکن ہے۔ کہ تم میرے ہمراہ ہندوستان چلو"

"تو کیا تم کو مجھ سے محبت نہیں۔ یا تمہیں میری محبت کا یقین نہیں"

"میری پیاری خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کرو۔ میرے زخمی دل پر تمہارے الفاظ نمک کا کام کرتے ہیں مجھے یقین ہے کہ تم میری محبت کو اچھی طرح جانتی ہو۔ تم کو معلوم ہے کہ میں جان و دل سے تم پر فدا ہوں تم جانتی ہو کہ تمہارے بغیر میرے لئے دنیا تاریک ہوگی۔ اور زندگی دوبھر۔ تم جانتی ہو کہ ہزاروں کوسوں کے فاصلہ پر بھی میری روح ہر وقت تمہارے پاس رہیگی۔ اور میں جہاں رہوں گا۔ ماہی بے آب کی طرح تڑپتا رہونگا۔ تم یہ جانتی ہو۔ اور میں بھی یہ جانتا ہوں کہ تمہاری محبت میری محبت سے کم نہیں۔ مجھے تمہاری محبت کی ہستی کا اسی قدر یقین ہے کہ جسقدر اپنے وجود کا مگر......"

"ہاں۔ ہاں۔ کیا مگر؟ یہی نگوڑا "مگر" تو میری سمجھ میں نہیں آیا"

"مگر یہ کہ میری کم عقل والدین (پھر اپنے تئیں روک کر اور دل میں) نہیں نہیں۔ یہ میں نے کیا کہہ دیا۔ اے خدا مجھے معاف کر کہ میں غصہ کے جوش میں اپنے پیارے والدین کو ایسے الفاظ کے ساتھ یاد کر رہا ہوں۔ مگر کیا کروں اے خدا اُن کے دل میں رحم ڈال کہ وہ میری مصیبت زدہ حالت پر رحم کھائیں۔ اے خدا اُنکو طاقت دے کہ وہ میری محبت کے جوش کو سمجھ سکیں۔ اے خدا اُن کے دل و دماغ سے تعصب کا پردہ اٹھا دے۔ تاکہ وہ مجھے اس نازنین سے شادی کرنے کی اجازت دیدیں۔ وہ بیشک ایک غیر مذہب کی عورت ہے مگر مجھے اپنی جان بلکہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ (پھر چونک کر اور اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر) میری پیاری۔ میرے والدین پرانے خیالات کے آدمی ہیں۔ اُن کے خیالات کو سمجھنا تمہارے واسطے مشکل ہے۔ جیسا کہ تمہارے خیالات کو سمجھنا ان کے لئے دشوار۔ وہ مجھے کبھی اجازت نہ دینگے۔ کہ میں تم سے شادی کروں۔ پھر کس طرح میں تم کو اپنے ساتھ لے جاؤں۔ اور کس طرح اپنا وطن چھوڑ کر پردیس میں جا بٹھاؤں"

"پردیس میں جانے سے تو میں ذرا نہیں گھبراتی۔ میرے لئے دنیا کا دور ترین گوشہ بھی پردیس نہیں ہوگا بشرطیکہ تم میرے ساتھ ہو۔ مگر یہ تو بتاؤ۔ کہ تمہارے

والدین کو اعتراض کس بات کا ہے۔ اگر میری پوشاک پر تو میں ہندوستانی پوشاک اختیار کر لوں گی۔ اگر میری خوراک پر۔ تو میں اپنے ملک کی خوراک ترک کر دونگی جو کچھ بھی وہ کہینگے میں کرنے کو تیار ہونگی۔ مگر میں تم سے جدا ہرگز نہیں رہ سکتی۔"

"اس جدائی کے خیال پر تو میرا دل بھی ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا ہے۔ مگر ہمارے ملک کی رسم و رواج کے مطابق کوئی شخص بھی کہیں دیگر مذاہب کی عورت سے شادی نہیں کر سکتا۔ اگر کرے تو برادری سے خارج کر دیا جاتا ہے کہ عزیز رشتہ دار اس کے ساتھ میل جول بند کر دیتے ہیں یہاں تک کہ اس کے اپنے ماں باپ بھی اس سے ملنا جلنا تو در کنار بولنا بھی ترک کر دیتے ہیں"

"مگر کیا تم ان باتوں سے ڈرتے ہو۔ میرا تو خیال تھا کہ تم ایک اصول پر چلنے والے آدمی ہو۔ کہ جو دھمکیوں کے ڈر کر اپنے اصول کو کبھی ہاتھ سے نہ دے گا۔"

"سچ ہے پیاری ہلڈا بالکل سچ۔ اصول کے لئے تو میں مرنے کو تیار ہوں۔ میں اس بات سے ہرگز نہیں ڈرتا کہ اور لوگ میری بابت کیا کہینگے۔ مگر ہاں مجھے ڈر ہے تو اپنے بوڑھے والدین کا خیال ہے تو ان کے جذبات کا۔ فکر ہے تو انکے صدمہ کا میں انکے دل کو نہیں دکھا سکتا۔ ان کی نافرمانبرداری ہرگز نہیں کر سکتا۔ انہوں نے مجھے پالا پوسا۔ انہوں نے مجھے پڑھایا لکھایا۔ انہوں نے مجھے زندگی بخشی۔ میں جو کچھ بھی ہوں۔ انہیں کی بدولت۔ میرے پاس جو کچھ بھی ہے انہیں کا ہے۔ کروں تو کیا کروں۔ ادھر تمہاری محبت کھینچتی ہے ادھر ان کی محبت۔ تمہیں چھوڑوں تو کس طرح۔ اور ان کو چھوڑوں تو کیونکر۔ خدا جانے کس گناہ عظیم کی سزا میں خدا مجھے عذاب دے رہا ہے۔"

"پیارے رام۔ واقعی اب میں تمہاری مشکل سمجھ گئی ہوں۔ مگر کیا تمہارے والدین کسی طرح پر بھی رضامند نہیں ہو سکتے۔"

"پیاری ہلڈا میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ ایں خیال است و محال است و جنوں۔ یہ ان کا قصور نہیں۔ مگر ان کے خیالات کا کہ جو انہوں نے ورثہ میں پائے ہیں۔ اور جن کو ابھی نئی روشنی کی کرنوں نے منتشر نہیں کیا۔"

اتنے میں ڈوور ایکسپرس کے انجن نے سیٹی دی اور تمام مسافر اپنی اپنی جگہ ٹرین میں سوار ہو گئے۔ رام بھی گاڑی کے ایک کونہ میں کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔

"میری جان۔ میں تمہیں جھوٹی امیدیں دلانے سے گریز کرتا ہوں۔ مگر اس بات کی تسلی رکھو کہ اپنی طرف سے والدین کو اپنا ہمخیال بنانے کی از حد کوشش کرونگا۔ شاید خدا کرے مان ہی جائیں۔ مایوس ہونا بھی اچھا نہیں۔ اچھا پیاری تو اب گاڑی چل پڑی خدا حافظ۔ مجھے بھول نہ جانا۔"

ہلڈا۔ رومال کو آنسوؤں سے تر کئے ہوئے۔ "خدا حافظ میرے پیارے خدا حافظ"

سین دوم

ہندوستان۔ مسٹر رام کا مکان ۔
مسٹر رام کے والد بزرگوار خط وکتابت میں مصروف ہیں

"رام!"

"اباجان"

"بیٹا تمہاری شادی کے خطوط لکھ رہا ہوں ۔ اگر کسی دوست یا برادر ہم مکتب کو اپنی شادی کی تقریب پر بلانا چاہو تو اس کا نام لکھا دو۔"

"آپ کی مہربانی مگر میں کسی کو بلانا نہیں چاہتا۔"

"کیوں کیا ہوا خیریت تو ہے"

"جی ہاں ۔کچھ بھی نہیں ۔صرف ...."

"صرف کیا؟"

"صرف یہ کہ میں شادی کرنا نہیں چاہتا"

"شادی نہیں کرنا چاہتے ۔کیوں کیا ہوا ۔پھر وہی انگریزی مس یاد آگئی ۔ میں تمہیں ہزار بار سمجھا چکا ہوں کہ اُس کا خیال دل سے دور کر دو۔ میں ایک غیرمذہب کی عورت سے شادی کرنے کی اجازت تمہیں نہیں دے سکتا۔ اور نہ کبھی دونگا"

"اباجان ۔ مذہب تو صرف خدا کی پرستش کے لئے ہوتا ہے۔ اُس خدا کو سب مانتے ہیں ۔اُس خدا کی پرستش سب کرتے ہیں ۔جس طرح آپ کا یقین پرمیشر پر ہے میری ہلڈا کا اعتقاد گاڈ پر ہے ۔ گاڈ کے معنی خدا ہیں ۔ اور خدا کے معنی گاڈ ۔صرف لفظوں کا ہیر پھیر ہے"

"بس بس ای نافرمان لڑکے ۔اپنی منطق نہ چھانٹ آیا ہے اپنے سے بڑوں کو پڑھانے"

"اباجان ۔ خفا نہ ہو ۔میرا مطلب ہرگز گستاخی کرنے کا نہیں ہے ۔ صرف اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں ۔سُن تو لیجئے ۔ ذرا سمجھنے کی کوشش تو کیجئے آپ چاہتے ہیں ۔کہ میں ایک ایسی عورت سے شادی کروں جسے میں نے آج تک آنکھوں سے نہیں دیکھا شکل وصورت کا مجھے اس قدر خیال نہیں ۔ مگر سیرت کا ضرور ہے مجھے معلوم نہیں کہ وہ لڑکی کیسی ہے ۔کس طبیعت کی ہے۔ اُس کے خیالات کیا ہیں ۔مزاج کیسا ہے"

"خاموش دور ہو جا ۔میری نظروں سے ۔یہ ہے نئی روشنی کا اثر کہ بچے والدین کے منہ پر بے شرمی سے باتیں کرنے لگے ۔کبھی پہلے بھی کسی نے اپنے والدین کے فیصلہ پر اس طرح بچوں کو نکتہ چینی کرتے سنا تھا میں تو تم کو یورپ بھیج کر پچھتایا ۔ نہ تم یورپ جاتے اور نہ ایسے خیالات تمہارے دماغ کے اندر گھستے مجھ سے اب صبر نہیں ہو سکتا ۔ آخر ہر بات کی حد ہوتی ہے ۔مجھے یہ ضد نہیں بھاتی ۔ جاؤ میرے گھر سے نکل جاؤ ۔ اور پھر میرے سامنے نہ آؤ"

× × × × × × × ×

پردہ بدلتا ہے ۔ دریائے راوی نظر پڑتا ہے صبح کا وقت ہے لوگ دریا پر نہا رہے ہیں ۔کہ یکایک اُن میں سے ایک چلا اُٹھا

"دیکھنا دیکھنا ۔کوئی آدمی ڈوب چلا" لوگوں نے نظر اُٹھا کر دیکھا ۔ تو پانی میں ایک بھنور دکھلائی دیا اور تھوڑی دیر میں ایک نعش سطح آب پر نمودار ہوئی

چند آدمی اُس کی طرف لپکے ۔ اور کھینچ کر باہر لے آئے دیکھا تو طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر چکا تھا آہ یہ نعش مسٹر رام کی تھی ؎

یہ نعش بیکفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

سین سوم

انگلستان ۔ مس ہلڈا کا مکان

"مس صاحب ۔ یہ خط آپ کا ابھی ڈاکیہ دے کر گیا ہے"

"لاؤ تو دیکھوں ۔ مریم"

مریم نے لفافہ ہلڈا کو دیا ۔ اور پھر چلی گئی ۔

ہلڈا نے یہ دیکھکر کہ لفافہ پر ہندوستانی ڈاکخانہ کی مہر لگی ہوئی ہے کہ اُسے چوما اور پھر کھول کر اشتیاق سے پڑھنے لگی ۔

"میری جان ہلڈا

یہ خط میرا آخری خط ہو ۔ جب یہ خط تمہارے ہاتھ میں ہوگا ۔ تو میرا ہاتھ جو یہ عبارت لکھ رہا ہے کہیں بحِس و حرکت پڑا ہوگا ۔ میں نے اپنے والدین کو اپنا ہمخیال بنانے کی سرتوڑ کوشش کی مگر وہ اپنی ضد پر تُلے ہوئے ہیں ۔ اب مجھے نہ صرف تمہارے ساتھ شادی کرنے کی اجازت نہیں دیتے ۔ بلکہ ایک ایسی لڑکی سے نکاح کرنے پر مجبور کر رہے ہیں ۔ کہ جو مجھے نہیں جانتی ۔ اور جس کو میں نہیں جانتا ۔ میرا دل تمہاری نذر ہو چکا ہے اور اب میں کہیں اور طرف نظر کرنا بھی گناہ سمجھتا ہوں ۔ مگر تقدیر تمہارے اور میرے برخلاف کام کر رہی ہے ۔ میرے لیے ادھر والدین کی ناراضگی ۔ ادھر وہاں کی کشش ۔ پیچ و تاب میں ہوں کہ کیا کروں ۔ جان عذاب میں ہے ۔ رات کو نیند نہیں آتی ۔ مجھے یقین ہو گیا اگر زندہ رہا تو ضرور دیوانہ ہو جاؤنگا اب دامنِ مرگ میں ہی رنج و غم سے عافیت ہو ۔ لوگ کہتے ہیں کہ موت بھیانک ہو ۔ مگر مجھے تو اس وقت سب سے زیادہ خوشگوار معلوم ہوتی ہے ۔ لوگ کہتے ہیں کہ خودکشی بزدلی کا کام ہے ۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ جب انسان زندگی سے اس قدر بیزار ہو تو موت کو خود گلے لگانا ایک دلیری و دانائی کا کام ہے ۔

یہ خط لکھ کر میں دریائے راوی پر جاؤنگا اور اپنے اس فانی جسم کو اُس کے سپرد کر دونگا ۔ میں مرتے ہوئے راوی کی لہروں سے کہدونگا کہ اگر سمندر میں کبھی دریائے ٹیمز کی لہروں سے ملاقات ہو ۔ تو اُن کو میری طرف سے چومنا ۔ اس خیال سے کہ وہ میری محبوب کی سرزمین سے آئی ہیں ۔ اور شاید کبھی وہاں واپس جائیں ۔ تو میرا پیغام ساتھ لیجائیں ۔

ہلڈا خدا حافظ میرے لیے نہ رونا ۔ میں تمہیں یقین دلانا چاہتا ہوں ۔ کہ میری محبت کی آگ کو آب راوی بھی نہیں بجھا سکیگا ۔ اگر یہ سچ ہے ۔ کہ پس مرگ انسانی روحیں کسی اور دنیا میں جاتی ہیں ۔ تو میری رُوح تیری محبت کو وہاں ساتھ لیجائیگی ۔ اور مجھے یقین ہے کہ ہم دونوں پھر ملینگے ۔ اور ملکر اس دنیا فانی کے رنج و غم کو بھول جائینگے "

ہلڈا نے یہ خط پڑھا ۔ پڑھتے ہی غش کھا کر

زمین پر گر پڑی۔ جب اُسے ہوش آیا۔ تو تڑکا ہو چکا تھا۔ اُس نے کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھا تو آسمان پر گھنگور گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ تاریکی کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ہلڈا نے آہستہ سے اپنے کمرہ کا دروازہ کھولا اور پھر گھر سے باہر نکل نظروں سے غائب ہو گئی۔ × × × × × ×

"اے دریائے ٹیمز کی لہرو۔ مجھے وہاں لے چلو۔ کہ جہاں دریائے راوی کی لہریں میرے پیارے رام کا پیغام لئے ہوئے تمہاری منتظر ہیں۔ وہ پیغام میں چل کر خود اُن سے لینا چاہتی ہوں۔ جلدی کرنا۔ کہیں راستہ میں دیر نہ ہو جائے لو میں آئی۔ مجھے اپنی آغوش میں لیلو۔"

ڈراپ سین

گورنکھ سنگھ مونگیا۔ بی او کیمبرج

غزل

غضب آتا قیامت ٹوٹتی محشر بپا ہوتا
اگر کچھ بھی میں بول اٹھتا ستم کا سامنا ہوتا

بلا سے جھوٹ ہی کہتا کہ جلد جاؤں گا واپس
برائے زندگی اے نامہ بر کچھ آسرا ہوتا

کوئی تسکین کی صورت تو ہوتی قلب مضطر کی
نہ آتا تھا اگر ظالم جواب خط لکھا ہوتا

بلا سے وہ بُتِ سفاک مجھ کو قتل کر جاتا
یونہیں پورا مری تقدیر کا لکھا ہوا ہوتا

سمجھ میں کچھ تو آجاتا کلام ناصح مشفق
جو اُن کی بے تکی باتوں کا کوئی سلسلہ ہوتا

کہاں تھی قوتِ دیدِ جمال یار اے نشتر
میں اُن کی بزم میں ہوتا بھی تو غش میں پڑا ہوتا

مرزا جعفر علی نشتر لکھنوی

"یادِ رفتہ کا ایک لمحۂ فکریہ!"

آہ! وہ زمانہ جبکہ بحر میں جزر و سکون اُس کی خموشی لہروں میں طوفان خیزی پوشیدہ کشتی امید کا مستول اور ساحل تمنا کا خوش کن منظر کہیں نظر نہ آتا تھا۔ گلزار دبستان میں بہار نے جنم نہ لیا تھا۔ قدرت کے لگائے پودے کی کونپلیں بھی نہ پھوٹی تھیں۔ کلی کا منہ بند تھا۔ امید و ارماں یہ شکل رنگ و بو اس میں مقفل تھے۔ اور اسیر نزار جان سے نثار ہونیوالا بلبل خاموش تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے رفتہ رفتہ بحر سکون میں مد اور تلاطم، خموشی لہروں میں شور اور تموج میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ سطح آب پر کشتی امید مستانہ وار رواں تھی۔ اس کے بلند مستول سے محبت آگیں نگاہ دور بیں۔ ساحل تمنا کا دلکش سماں دیکھنے لگی۔ لطفِ بہار سے بیخبر باغ میں بہار آئی اور اس شان سے آئی

کلیوں نے چٹک چٹک کر خوشیاں منائیں۔ غنچہ شگفتہ ہو ہو کر اپنی بھینی بھینی خوشبو سے ساکنانِ باغ کے مشامِ جاں کو معطر کرنے اور جوانانِ چمن انگڑائیاں لینے لگے۔ لالہ ساغر بکف ہوا۔ نرگس مخمور ہوگئی نسیمِ سحر مستانہ وار چلنے لگی۔ کونپلیں پھوٹیں۔ اور پھوٹ کر نکلیں اور اپنے نکھرے ہوئے سرسبز حسن کی دلکشی و رعنائی سے دلوں کو لبھانے لگیں۔ نوعروسانِ چمن عنفوانِ شباب کے پورے نشہ میں مستانہ وار جھوم جھوم کر اپنی سرکشی سے حسرتوں کو پامال کرنے لگے۔ بادِ صبا آمدِ بہار کا مژدۂ جانفزا اور نویدِ فتح پیر دیکر اقصائے عالم میں۔ پکار آئی "بہار آئی" "بہار آئی"۔ بلبلِ خموش نے مہرِ سکوت توڑ دی فرطِ خوشی سے چہچہا اٹھا لیکن آہ! اب نہ وہ بحر میں سکون ہے اور نہ اُس کے تموج میں وہ مسرت خیز لہریں بلکہ ایک نہ ساکت ہونے والا شور ایک نہ تھمنے والا طوفان کشتیِ امید گرداب میں اور اس کی ہستی معرضِ خطر میں ڈانواڈول نظر آ رہی ہے جسکو ساحلِ تمنا کا خوش کن منظر سمجھا تھا۔ وہ نشۂ جوانی کی مخموری اور نمودِ نظر کا دھوکا تھا سراب کو آب سمجھ کر تشنہ کام اُس کی طرف لپکا۔ لیکن وہاں جاکر دیکھا تو یہ موہوم اور اس کے سوا کچھ نہ تھا۔ جس گلزار میں بہار آئی تھی آج اس میں خزاں کا دور دورا ہے جہاں نسیمِ سحر ناز سے اٹھلا اٹھلا کر چلتی تھی۔ وہاں آج بادِ سموم کے زہریلے جھونکے چل رہے ہیں غنچوں میں مقفل امید و ارماں ان کے کھلتے ہی رنگ و بو بن کر اڑ گئے۔ منہ بند کلیاں بھی کھلیں اور اپنی بہارِ جانفزا بھی دکھلا چکیں۔ اب کوئی دم میں پژمردہ ہونے ہی کو ہیں۔ اُن خوشگوار پھولوں میں اُن عطر بیز گلوں میں اب نہ وہ بوئے خوش ہے نہ وہ تر و تازگی نہ وہ عروسانِ چمن کی سرسبزی و شادابی۔ نہ وہ جوانانِ چمن کی اکڑ اور جوانی۔ سبزۂ خود رو پامال ہو کر خشک ہوگیا۔ کونپلوں سے شاخیں ہوئیں پتے بنے کچھ مرجھا گئے اور کچھ خشک ہو کر شاخ سے جدا ہو ہو کر زمین پر آ رہے اور بادِ مخالف روندتی ہوئی کہیں کی کہیں اڑا لے گئی۔ لالہ۔ جو ساغر بکف تھا۔ اب داغِ ناکامی لئے ایک خونچکاں کفن پہنے خاک پر لوٹ رہا ہے۔ سراپا انتظار نرگس بیمار جو مخمور ہوگئی تھی اس کا تمام نشہ ہرن ہوگیا جسکی منتظر اور بیمار تھی اُس شاہدِ مقصود کو دیکھ چکی اب چشم وا بند ہوا ہی چاہتی ہے۔ بلبل خوشنوا خزاں سے بیخبر جو آمدِ بہار کے ترانے میں مصروف تھی۔ اب بہار کی وداع پر خزاں کے ورود پر چمن کی تباہی پر اور گلوں کی پژمردگی پر نواسنجِ فغاں مصروفِ نالہ و فریاد ہے اب گلوں کی محبت سے اس کا ننھا سا دل ٹوٹ گیا چمن کے قیام سے جی چھوٹ گیا۔ صیاد گھات میں کمند لئے پھرتا ہے آشیانہ کے تنکے بکھر گئے۔ اب برقِ فلک گرا ہی چاہتی ہے گریگی اور گر کر پھونک دے گی۔ برباد کردیگی۔ آہ! بحرِ سکون میں حباب کا عالم دیکھکر۔ گلزار میں پھولوں کا حال دیکھکر۔ کلیوں کا کھل کر مرجھانا دیکھ کر دن کا ڈھلنا اور سورج کا غروب ہونا دیکھ کر۔ چراغِ سحری کا ٹمٹما کر خموش ہونا دیکھ کر

میری عقل، میرا تجربہ کار ذہن اب مجھے یہ مستحکم رائے قائم کرنے پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ بجز ذاتِ خدا دنیائے فانی کی ہر چیز اور ہر شے فانی۔ بے ثبات اور ناپائدار ہے۔"

محمد شفاعت علیخان ناشاد سہسرامی

منظر فنا

نہ ہم ہوں گے نہ تم ہو گے نہ اسباب جہاں ہونگے
عدم سے آئے تھے اور سب عدم کے میہماں ہونگے

نہ اورنگِ سلیمانی نہ جامِ جم کہیں ہو گا
نہ عمرِ خضر ہی ہوگی نہ عیشِ جاوداں ہونگے

گدا و شاہ کا مسکن زمیں میں ایک ساں ہو گا
نہ ٹوٹے جھونپڑے ہونگے نہ یہ اونچے مکاں ہونگے

نہ یہ شمس و قمر ہونگے نہ یہ قوسِ قزح ہوگی
نہ چمکیلے ستارے نور بخشِ آسماں ہونگے

نہ آبادی کہیں ہوگی نہ ویرانہ کہیں ہوگا
نہ بحر و کوہ ہونگے اور نہ دشت و گلستاں ہونگے

تعلق عاشق و معشوق کا مٹ جائیگا بالکل
نہ شادی وصل کی ہوگی نہ فرقت میں تپاں ہونگے

نہ سبزہ ہوگا گلشن میں نہ کانٹے ہونگے صحرا میں
نہ یہ جوشِ جنوں ہوگا نہ یہ رنگِ جہاں ہونگے

نہ گل پھولیں گے شاخوں میں نہ جھومینگے شجر تنکر
نہ یہ ٹھنڈی ہوا ہوگی نہ طائر نغمہ خواں ہونگے

مرض ایذا رساں ہوگا، نہ صحت سے سکوں ہوگا
نہ چارہ گر کوئی ہوگا، نہ عیسائے زماں ہونگے

شبِ ماہتاب ہوگی، اور نہ نورانی سحر ہوگی
نہ بیداری کہیں ہوگی نہ یہ خوابِ گراں ہونگے

بتانِ مہوشاں ہونگے، نہ بدصورت کوئی ہوگا
یہ سب مٹی کے پتلے خاک میں اکدن نہاں ہونگے

ولادت کی خوشی ہوگی، نہ مرنے کا الم ہوگا
تلون طبع ہونگے، اور نہ نیرنگِ جہاں ہونگے

تموّل اور نہ جاہ و حشمت و اجلال ہی ہوگا
نہ پھر یہ وسعتِ میدانِ عظمت کے نشاں ہونگے

یہ نقشِ عالمِ ایجاد، مٹ جائیگا اک دم میں
نہ بچے ہونگے عالم میں، نہ یہ پیر و جواں ہونگے

یہ نو ایجاد اشیا خاک میں ملجائینگے اک دن
نہ موجد ان کے ہونگے اور نہ اجناسِ گراں ہونگے

بنا ہے عالمِ ہستی بگڑنے کے لئے اک دن
پریشاں دیکھ لینا سب یہ اجزائے جہاں ہونگے

نہ یہ آوازِ دلکش اور رباب و چنگ ہی ہوگا
نہ بزمِ رقص ہوگی اور نہ رقاصِ جہاں ہونگے

یہ کہنہ بوریہ، یہ بالشِ مخمل ہے اک دھوکا
گدائی کا پتہ ہوگا نہ شاہی کے نشاں ہونگے

نہ عشقِ بدبلا ہوگا، نہ حسنِ دلربا ہوگا
نہ آہِ عاشقاں ہوگی نہ نازِ مہوشاں ہونگے

درندے دشت میں ہونگے نہ ماہی بحر میں ہوگی
نہ طائر اڑنے والے پھر یہ زیرِ آسماں ہونگے

نہ ہوگا نور آنکھوں میں نہ گویائی زبانوں میں — نہ یہ باریک بیں ہونگے نہ یہ اہل زباں ہونگے
نہ ماہ و سال وسنہ ہونگے تماشاہ گاہِ عالم میں — نہ یہ عمر رواں ہوگی نہ یہ روز رواں ہونگے
غرض یہ عالم ہستی فنا ہو جائے گا خنجر — طبق ہونگے زمیں کے اور نہ یہ ہفت آسماں ہونگے

مرزا فدا علی خنجر لکھنوی

احساس

حُسن سے متاثر ہونا ایک فطرتی امر ہے۔ مگر میں تو ایک حسین چہرے کو دیکھکر وارفتہ ہو جاتا ہوں۔ اور اس غیر مرئی نقش قدم کو جو ہر صاحب حُسن و جمال کی شرمیلی اور کیف زا ادائیں ایک زود اثر دل پر نامعلوم طور سے چھوڑ جایا کرتی ہیں۔ ایک بار یک حجاب میں سے دیکھتے ہوئے اپنے خیالات کو وقفِ کیفیت کر دیتا ہوں

میں دیکھتا ہوں کہ اپنی شخصیت کو محو کر دینے کا سہل علاج یہی ہے۔

موسیقی کا پُر کیف ترنم ہر ایک ایسے دل کو چند لمحوں کے لئے مضطرب کر دیتا ہے۔ جو دنیا کے حالات سے تنگ آگیا ہو۔ جو محسوس کرتا ہو کہ یہی تسلسلِ حادثات جن پر عالم کا دار و مدار ہے۔ محض مختلف اللون چیزوں کے مجموعے کا نام نہاد خیال ہے۔

وہ محسوس کرتا ہے کہ آخر زندگی میں ایک لطیف شئے ایسی ہے جو باوجود اس سکونِ انجمادی کے افسردہ طبیعتوں کو اپنے زیرِ اثر لا سکتی ہے۔

مگر میں تو سرود نوازی کی دلفریب لے سنتے ہی اپنی آنکھوں کو محض اس کے چہرے سے ادراکِ مدہوشی کا سبق دیا کرتا ہوں وہ دلکش موزونیت جو اس کی اپنی پر افسوں شخصیت۔ موسیقی کے سوز و ساز کے ساتھ ملکر پیدا کر دیتی ہے۔ میرے لئے ایک لذت ہوتی ہے۔ اضطراب ایک کیف ہوتا ہے بیقرار لوگ تو محض چہرے کی دلفریبی کو رسیلی تانوں سے ملا کر اپنے لئے فردوسِ گوش اور جنتِ نگاہ بناتے ہیں۔ مگر میرا احساس پذیر دل تو یوں محسوس کرتا ہے۔ گویا در و دیوار پر اس کی ہم آہنگی ایک نقش چھوڑتی چلی جاتی ہے۔ جو ہمیشہ کے لئے وہاں پر ثبت ہو جاتا ہے۔

شعر سے تقریباً ہر شخص متاثر ہوتا ہے اور شاعر کے خیالات کو اپنے گرد و پیش کے حالات پر صادق کرنے کی کوشش کرتا ہے اور سچ بھی یوں ہے کہ شاعری کا منتہائے کمال بھی یہی ہے۔ مگر میں تو جب کسی

حدِ حسن تو بہ ادراک نشائد دانست ویں سخن نیز باندازۂ ادراک من است

تو گھنٹوں سر دھنا کرتا ہوں کہ حادثاتِ زمانہ کا وہ سیلاب جو ایک شیکسپیئر یا ایک غالب سے زیادہ قرنہائے دراز میں پیدا کرنا پسند نہیں کرتا۔ وہ اس شعر کو تہ و بالا کیوں نہیں کرتا۔

مجھے وہ دن یاد ہیں جب میری زندگی ایک آرزو تھی پیہم۔ ایک تمنا تھی نامعلوم۔ میں اپنے دل کے اضطراب کو کبھی اپنی زندگی کی تجسس کے ادراک پر محمول کرتا اور کبھی شباب کے کیف آور زمانے کا تقاضا سمجھتا اور تسلی نہ پاتا۔ میں چاندنی راتوں میں اختر شماری کو محض نیند نہ آنے کے عذر سے ٹالتا۔ اور کبھی ان بکھرے ہوئے موتیوں کی دل آویزی کا بہانہ پیش کرتا۔ اور مطمئن نہ ہوتا۔ میں ایک شراب کے سربند چشمے کی طرح تیار تھا کہ اُبل پڑوں۔ اس بات سے بے حس کہ مجھ سی اپنی پیاس بجھانیوالا میرے ارادوں کے مطابق اتریگا یا نہیں +

الغرض !!! میری لغزش پا صرف اس بات کی منتظر تھی کہ کوئی ایسا پائے ناز ملے جس کی عقیدت تا ورائے میرے لئے منتہائے کمال ہو۔ اور جس سے ایک بار ٹھکرایا جانا منتہائے نیاز۔

میں اپنی پیشانی میں ہزاروں سجدے اسواسطے پنہاں رکھتا کہ کوئی آستانِ نیاز ایسا ملے جس پر جبہ فرسائی چاہوں اور نہ کر سکوں جس کی آرزو میں کروں اور نہ پاؤں۔ میں اپنے دل کے عمیق ترین پردے میں اپنے راز کو چھپاتا۔ صبح کے وقت شگفتہ پھولوں سے صبا کی چھیڑ چھاڑ ایک انجذابِ محویت کیساتھ مجھے باغ میں لیجاتی۔ شام کے وقت شفق کی حنا آگیں رنگینی آسمان کے کناروں پر گوٹا ٹانک دیتی۔ اور میرا دل مجھے کشش مقناطیسی سے وہاں لے جاتا

وہ ہستی جس نے مجھے میری شباب کی قیمت سے آگاہ کیا۔ جس نے مجھے یہ بتایا۔ کہ شبِ ماہ اور روزِ ابر کی پُر لطف کیفیتوں میں ایک لطیف شے کی ہم نشینی کیسی مسرت کا اضافہ کر دیتی ہے۔ جس نے مجھے چھوا اور میں شگفتہ ہو گیا۔ جس نے مجھے دیکھا اور میں سمجھ گیا ایک .. .... تھی یا وہ ......

وہ مجھ سے اپنے جذبات کو چھپانے کی کوشش نہ کرتی۔ میری آمد پر وہ محجوبیت کے پردہ میں محبت کا مژدہ سناتی۔ اور میرے رخصت کے وقت وہ اپنے جھکے ہوئے سر کے حجاب میں رنج ظاہر کرتی جب مجھ سے کسی رات اپنا وعدہ بھول جاتا تو وہ دوسرے دن ان کلیوں کو دکھاتی۔ جو اُس کے بستر پر بچھائی گئی تھیں۔ جو اس شباب کی گرمیوں سے مرجھا کر رہ گئی تھی اور مسکرا دیتی۔

وہ انجم فروزاں میری شاہراہِ حیات پر تھوڑی سی دیر کے لئے چمکا اور پھر غائب ہو گیا۔

آہ۔ اب کہ وہ مجھ سے ہمیشہ کیلئے جدا ہو گئی ہے۔ موت کے زبردست ہاتھ نے مجھ سے اس کو چھین لیا ہے میں ویسا ہی احساس پزیر ہوں جیسا کہ اُس کی حیات میں تھا۔

سید عابد علی عابد

کلامِ شیدا

قیصروزار کا کیا۔ حالِ زبون و زار کیا
دیکھئے رنگ لائے اب چرخِ ستم شعار کیا

فصلِ بہاری آتی ہے۔ گُل کی سواری آتی ہے
دیکھئے گُل کھلاتی ہے۔ گردشِ روزگار کیا

پھونکدیں کیوں نہ ایکدم۔ آہ شررِ فشاں سے ہم
جوشِ جنوں میں اب کریں جامہ کو تار تار کیا

غیر نے تم کو جاں کہا۔ سمجھے بھی اُس نے کیا کہا
یعنی کہ بیوفا کہا۔ جان کا اعتبار کیا

دنیا کبھی کی جا چکی۔ دین کی خبر بھی آچکی
اس سے زیادہ اے بتو ہوتی ہی لوٹ مار کیا

آبلہ پائی سے مرے فصلِ خزاں میں گُل کھلے
سُرخ ہوا ہے خار زار آ ہی ہے بہار کیا

عہد شکن نے کردیئے وعدے تمام چُور چُور
وقت نکل گیا تو پھر۔ قول کجا۔ قرار کیا

رام رچپال شیدا دہلوی

تخیّلات

(۱) صبح کی سپیدی ظلمتِ شب کے آخری پردوں سے جھانک کر مسکرا دیتی ہے۔ تو سبزہ تھرّا کر رہ جاتا ہے۔ اور شبنم آئینۂ استعجاب بنکر۔ نسیم کی خوشخرامیاں نکہتِ گل کی پریشانیوں پر مضراب زن ہو جاتی ہیں۔ جنونِ حرکت ذرّہ ذرّہ کے دل میں چٹکیاں لینے لگتا ہے۔ دنیا ایک بہتا ہوا ترانہ ایک جھلکتا ہوا تبسّم نظر آنے لگتی ہے۔ اس وقت میں اپنی حسرتوں کے مزار پر ایک ٹوٹے ہوئے دل کا بربط بجاتا ہوں۔ اور اشکہائے نیاز کے پھول چڑھاتا ہوں۔ اور جب تیری دستِ حنائی کی مسکراہٹ میری خوں گشتہ آرزوؤں سے جھلملش کرتی ہے۔ تو میں گلزارِ شفق میں نیرنگِ ناکامی بنکر سما جاتا ہوں۔
اس طرح جبینِ فطرت پر داستانِ سیماب مثال کی سُرخیاں عیاں ہوتی ہیں

(۲) غنچہ چٹخا۔ مگر کس شانِ موسیقی سے! خوشبوؤں نے وحشت کے ساز چھیڑے۔ رنگوں نے تراوت کا ارگن بجایا۔ شبنم نے تحیر کا ترانہ گایا۔ دل نے بھی اپنے ٹوٹے ہوئے رباب سے مستی کے ترنم بلند کئے۔ جس کے اثر سے وہ دم بھر کے لئے شوخی بھولکر روحِ حیا بن گئی۔ گلوں نے دلفریبی کے پردوں سے جھانک کر اُن کے تبسّمِ حیا کو دل میں رکھ لیا۔ وہ گھبرائے۔ اور ایک پل میں میری نگاہِ شوق میں جذب ہو کر روپوش ہوگئے !!!

(۳) لبِ دریا ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں بنفشہ کے پھول مسکرا رہے ہیں۔ حباب رقص کرتے ہوئے

اُن کے دامن کو چھوکر داستانِ سرفروشی کہ جاتے ہیں۔ فنا فروش موجیں طوفان کے گھوڑوں پر سوار ہیں۔ گرداب مسئلہ حیات وممات کے حل کرنے میں سرگرداں ہیں۔ حشمتِ دریا انساں کی بے مائیگی کی تفسیر کر رہی ہے۔ رفتہ رفتہ ظلمتِ شب کے فرمان جاری ہوتے ہیں۔ اطراف واکناف ایک سنسنی خیز ہیبت سے سہمے جاتے ہیں۔ بنفشہ کے پھول تاروں کی چھاؤں میں مسکرا رہے ہیں! ان کی شانِ استغنا فطرت کے ہولناک نظاروں پر خندہ زن ہے۔ دریا کا محشرستانِ شوروغل اور پھولوں کے خاموش تبسم کی دنیا تصویرِ فطرت کے دو شاندار پہلو ہیں۔ میں ان ننھے ننھے حسن کے پتلوں کی شوکت وعظمت سے اسیقدر مرعوب ومبہوت ہوجاتا ہوں۔ جتنا کہ دریا کے جاہ وجلال سے۔ دونوں مجھے انسان کی فرومائیگی وبے بساطی کی داستان سناتے ہیں +

محمد اسلم۔ ایم اے

کنول کے پرستار

اس نے خشکی کی جانب اشارہ کیا اور کہا شاباش میرے بہادرو یہ کوہ تمثال نہریں بہت جلد ساحل مراد تک پہنچا دے گی۔

وہ سہ پہر کے وقت اس خطۂ ارض میں پہنچے جہاں تمام دن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا عصر کا وقت ہے، ساحل کے گرداگرد خمار آلود ہوا بیہوشی کے عالم میں سائیں سائیں کر رہی تھی۔ جیسے کوئی درماندہ حال خواب میں لمبے لمبے سانس لے رہا ہے پورا چاند وادی کے اوپر بے نقاب کھڑا تھا۔ سیم برندی سلسلۂ کوہسار میں دودِ آسمانی کی طرح چلتی ٹھہرتی ٹھہر کر چلتی معلوم ہوتی تھی +

یہ ندی نالوں کی زمین تھی۔ اکثر ندیاں دھوئیں کے نقاب پوش بادلوں کی طرح توسن بلوریں پر رواں تھیں۔ بعض نور وظلمات کی لہریں ہیں۔ جھاگ کی خمار آفریں چادر لئے پتھروں پر جبہ سائی کر رہی ہیں اُنہوں نے ایک تابناک دریا دیکھا جو ملک کے اندرونی حصہ سمندر کی جانب رواں تھا۔ دور مقام پر بلند بالا کوہستان کی خاموش چوٹیاں سحر مثال برف سے لبریز۔ ڈوبتے سورج کی شعاعوں میں تابندہ دکھائی دیں۔ ایسا معلوم ہوا کہ چلغوزے کے سایہ دار درخت گوہر باراں سے مرصع ببول کے جھنڈ کے اوپر سے اس عالم نشاط کا تماشہ کر رہے ہیں۔

سحر زدہ آفتاب افق لالہ پوش میں آہستہ آہستہ غروب ہوا۔ سلسلۂ کوہسار میں کئی اور وادیاں بھی نظر آئیں جہاں کھجور اور تاڑی کے درخت سر کھولے استادہ تھے۔ سنبل وریحاں سے وہ خطہ جو گیا

اور مرغزار عطر آگیں تھا۔ ایسا دلکش مقام کہ قدرت کے مناظر ہر وقت اور ہر آن یکساں ہی نظر آتے۔ سیاہ فام کنول کے پرستار جو شعاعوں کے عکس سے زرد معلوم ہو رہے تھے جہاز کے گرد جمع ہوئے ان کے ہاتھوں میں اس سحر آگیں پودے کی شاخیں تھیں۔ جو پھل پتوں سے بھرپور تھیں۔ ان پھلوں کو توڑ کر احباب کو تحفہ دیتے رہے۔ لیکن جس کسی نے اس ثمر سحر آمیز کو لیا۔ اور اُس کو چکھا اُسے ایسا معلوم ہوا۔ کہ دور سمندر کے کنارے دیوانہ لہریں ہذیاں سرا ہیں۔ اگر کسی نے کلام کیا۔ تو اُس کی باریک اور آہستہ آواز ایسی معلوم ہوتی کہ گورستان میں سر لحد کوئی بھیانک رُوح بول رہی ہے۔ گو آنکھیں کھلی رہتیں۔ لیکن نیند کے خمار سے ایک بیخودی طاری ہو جاتی ہے۔ دھڑکتے دل سے ایک پرکیف نغمہ بلند ہوتا۔ جو سماعت کو فرحت دیتا۔ آرام دیتا۔

پھر وہ ریت پر بیٹھ گئے۔ ایک جانب مستورِ آفتاب حجابہائے لالہ فام میں روپوش ہو رہا تھا۔ اور دوسری جانب جوشِ حسن سے بے کل ملکۂ ماہتاب بے نقاب ہو رہی تھی۔ اس حالت میں گھر کا خیال آیا۔ وطن کی محبت اور ہمدم دمساز کا خیال دامنگیر ہوا۔ لیکن جونہی کہ اس خیال کا اثر گہرا ہوا۔ سمندر کا تکان محسوس ہوا۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ چپو بھاری نظر آنے لگے۔ سمندر کی باؤلی لہریں تکان اور درماندگی کی مجسم صورتیں نظر آئیں۔ آخر جسم چور چور ہو گیا۔ تب ایک نے کہا "ہمیں مراجعت کی ضرورت نہیں"۔ وہ نغمہ سرا ہوئے۔ "وطن دور ہے۔ سمندر پار ہے۔ اب سفینہ رانی کی حاجت نہیں"

(۱) یہ خوشگوار مقام ہے۔ نغمۂ عشرت جو فردوس خیال سے نتوح نفس کے ساتھ نازل ہوتا ہے یہاں ہم شبنم سے زیادہ محبوب ہے۔ گلاب کے سبزہ زار پر فدایانہ نثار ہونے سے زیادہ پیارا ہے۔ درماندہ آنکھوں پر جھکے ہوئے پپوٹے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اس نغمۂ عشرت کا تہ خانۂ دل میں داخل ہونا اس سے زیادہ لطیف اور محبوب ہے۔ اس کا خواب آور نزول بابرکت ہے۔

یہاں فرش زمرد ہے۔ نرگس کی خمار آلود نگاہیں بنفشہ کی عفت پر فدا ہیں۔ ندی نالے پھول اور پتھر نغمہ خیز ہیں اور غاروں کے منہ پر پوست کے درخت خشخاش کے ٹینٹوں سے بھرے خواب گراں میں معلق

(۲) کیا فائدہ کہ ہم افسردگی کے زیر بار ہوں۔ اور آسیب تکالیف میں پس پس کر غبار رہ ہو جائیں کیا تعجب کی بات ہے کہ اس محفل ہستی کی تمام اشیاء درماندگی سے ناآشنا رہیں۔ فردکش سکون ہوں اور ہم اشرف المخلوقات بارِ محنت سے خمیدہ کمر۔ دام الم میں ایسے گرفتار کہ ہمارے شہپر آزادی بندِ غم سے کبھی آزاد نہ ہوئے۔ زخم خوردہ پیشانی مرہم راحت سے مندمل نہ ہوئی۔ مگر سنئے۔ رُوح فطرت کیا سرود انگیز ہے ترنم ریز ہے کہ یہ مقام امن اور آرام کا مقام ہے دارالسلام ہے۔ تو ہم جو مخلوقات کے سرتاج ہیں

کیوں رنج اٹھائیں۔ زحمت کش محنت ہوں۔

(۳) آہا۔ قدرت زحمت یا محنت سے کیسی ناآشنا ہے صحرا کا پھول نسیم کی سحر آفرینی سے متبسم ہے خندہ زن ہے۔ دوپہر کو حرارت آفتاب سے تاباں ہے اور زیر مہتاب شبنم کی گوہر افشانی سے شکر بار ہے۔ اس ناز و نعمت سے پل کر زرد پڑ جاتا ہے۔ گر جاتا ہے۔ مرجاتا ہے۔

سبب حدت گرما سے پک کر خزاں کی خاموش راتوں میں۔ ڈالیوں سے گر پڑتا ہے۔ پھول گنتی کے دن اپنے مقام پر کھلتا ہے۔ مرجھا جاتا ہے اور گر پڑتا ہے۔ اسے کوئی کام نہیں۔ زحمت محنت نہیں۔ کوئی رنج نہیں تکلیف نہیں۔

(۴)۔ یہ نیلگوں آسمان۔ نیلی فام سمندر کا سرپوش کیا کریہ منظر ہے۔

زندگی کا انجام موت ہے۔ تو پھر کیوں زندگی وبال جاں ہو۔ کیوں محنت کے زحمت اُٹھائیں اور کیوں نہ خوشی کے یہ چند دن آرام سے گزاریں؟

وقت مستقبل کی طرف راہوار خیال پر رواں ہے۔ تھوڑے عرصہ میں ہمارے لب بند ہوجائینگے۔ زبان لذت گویائی سے ناآشنا ہوجائیگی۔ پھر کیوں نہ ہم یہ چند دن آرام سے گزاریں؟

اس دنیا میں آخر کسے رہنا ہے۔ یہ تمام مال و منال لٹ جائیگا۔ اور اس کا ذرہ ذرہ ماضی میں فنا ہوجائیگا تو پھر کیوں نہ ہم یہ چند دن مزے سے گزاریں۔

بدی کے ساتھ جنگ آزما ہو کر ہمیں کیا سرور حاصل ہوگا؟ کیا کبھی اٹھتی موجوں پر استادہ ہونے سے طمانیت قلب بڑھ جاتی ہے؟ تمام اشیاء عالم محنت سے عاری ہیں۔ سکون سراپا ہیں۔ حیات حباب آسا کے چند دن ختم کر کے وہ ورد ہلاکت ہوجائینگی۔ ثمر حیات پختہ ہوتا ہے۔ گرجاتا ہے فنا ہوجاتا ہے۔

آؤ ہم راحت کا سامان بہم کریں۔ عنبر پوش موت کا قبہ دیکھیں۔ یا پُرخواب راحت والی زندگی کی تلاش کریں +

(۵) یہ کیا ہی عمدہ بات ہے کہ ہم اونگ اور نیم خوابی کے عالم میں اپنی نیم باز نگاہوں سے آب رواں کی درماندگی کو دیکھیں اور عالم خیال میں انگاروں کی طرح دھکتے پہاڑوں کا تماشہ کریں جہاں حنا کے پودے پھولے ہیں۔ ایک دوسرے کی سرگوشیاں سنیں۔ پھر سمندر کی خمدار لہروں کا تماشہ کریں کہ کس طرح سرنیاز کوہ ناز سے ٹکراتی ہیں۔ پوست کی کیف آور رس سے مضمحل دل کو قوی کریں۔ پھر اپنا دل اپنی جانیں وقت آمیز تفکر کے سپرد کریں اور ان پرانے رفیقوں کی یاد کو اپنے دل میں پھر تازہ کریں۔ جو گورستان غریباں میں مٹی کے چند ڈھیلوں کے نیچے بستر راحت پر فرد کش ہیں +

(۶) محبوب ہے ایام محبت کی یاد۔ محبوب ہے ہمراز بیویوں سے آخری وقت کی ملاقات۔ اور اُن کے دیدۂ پرنم سے محبت اور شفقت کے گرم آنسوؤں کا ٹپکنا۔ لیکن وہ نظام بدل گیا۔ اب ہمارے گھروں میں ہماری یاد ٹھنڈی پڑ گئی۔ ہمارے فرزند ہمارے مکانوں کے وارث ہیں۔ اب ہماری نگاہوں میں غیریت کے آثار پیدا ہو گئے۔ اگر کہیں یاوری بخت سے وہاں جائیں بھی تو وہ ایسا گمان کریں کہ اُن کے بزرگوں کی روحیں ماہتاب شادمانی کو گہن لگانے کے لئے گورستان سے نکل آئی ہیں یا شاید جابر رئیس ہماری ملکیتوں پر قابض ہوں۔ اور بھاٹ لوگ ہماری شجاعت کے نیم فراموش کارنامے ان کے سامنے سناتے ہوں۔

کیا وطن مالوف میں کوئی فتنہ برپا ہے؟ اب جو کچھ ہو گیا سو ہو گیا۔

قسمت کی شکست کو کون جوڑے اب یہ بہت ہی مشکل ہے کہ دوبارہ اس جزیرہ میں امن قائم کریں۔

گو فتنہ موت سے بدتر ہے مصیبت پر مصیبت تکلیف پر تکلیف ٹوٹ رہی ہے۔ لیکن اس پیرانہ سالی میں جیب دل ہی بیٹھ گئے۔ اُمنگیں بھی معدوم گئیں۔ آنکھیں قطب شمالی کو دیکھتے دیکھتے پتھرا گئیں۔ اب دوبارہ امن قائم کرنا بڑا ہی دشوار ہے۔

(۷) لیکن تلسی اور نرگس کی کیاریوں میں تکیہ لگائے جبکہ خمار انگیز ہوا خراماں ہو غنودگی کے عالم میں نیم باز آنکھوں سے اس نیلوفری مقدس آسمان کے نیچے شفاف اور تابناک دریا کو ارغوانی کوہستان سے رواں دیکھنا کیسا ہی دلآویز ہے لیکن پیاری پیاری آوازوں کا جو غاروں کے دہانوں سے عشق پیچے کی بیلوں سے گزر کر آتی ہیں سننا۔ اور جوئے آب کا مقدس پودوں کو بوسہ دیتے دیکھنا۔ اور دیودار کے جھنڈوں سے پرے سمندر کی دیوانہ وار آوازوں کا سننا اس سے بھی زیادہ دلآویز ہے۔ نشاط انگیز ہے۔

(۸) ہرے پہاڑوں کے نیچے تمام کنول کے پھول کھلے ہیں۔ اور ہر جوئے آب پر جہاں نگاہ پہنچتی ہے نیلوفر کے دلخوش کن پھول دکھائی دیتے ہیں۔ تمام دن خوشگوار ہوا چلتی ہے۔ ہر ایک نشیب اور عطر آگیں خیاباں کے گرداگرد کنول کے زرد پھول کھلے ہیں۔ ہم نے بہت جانکاہی کی بہت چھوڑ کر سمندر کی سطح پر سفینۂ مراد نے موجوں کے بہت سے تھپیڑے کھائے اور بہت سی مچھلیوں نے ہمیں کھانے کے لئے منہ نکالا۔

آؤ ہم حلف اٹھائیں اور صدق دل سے وعدہ کریں کہ باقیماندہ وہ حصۂ عمر اس خیابان نیلوفر میں گزاریں گے جس طرح کہ دیوتا اور پریاں اپنی کوہستانی مسکنوں میں رنج انسانی سے بے پروا ہیں جہاں عشائے آسمانی سے وہ ہر روز بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ اور اپنی تفریح کے لئے کبھی کبھی رنج و الم کے ناوک ان وادیوں کی طرف بھی پھینک دیتے ہیں۔ جہاں انسان آباد ہیں۔

سحاب نور گزرتے وقت ان کے محلات کو بوسہ دیتے ہیں۔ وہ فضائے عیش میں انسانی رنج و

مصائب۔ قحط۔ وبا۔ بھونچال و طوفان۔ باد و گرد و خانہ جنگی۔ آتش زدگی اور دیگر ہجوم آلام پر خندہ زن ہیں وہ انسانی دعاؤں کو سُن سُن کر ہنستے ہیں۔ وہ قہقہ زن ہیں کہ انسانوں کی گمراہ نسل کیا زمین پر ہل چلاتی ہے۔ کاشت کرتی ہے۔ فصل کاٹ کر گندم کے انباروں کے انبار جمع کرتی ہے۔ ایسی نسل کی دعائیں منتیں مرادیں اُن کے لئے ایک قسم کا نغمہ ہے حتیٰ کہ وہ مرجاتے ہیں بعض تو جہنم کی خوفناک آگ میں دائمی تکلیف میں مبتلا ہوتے ہیں اور بعض انگوروں کی بیلوں کے نیچے فردوس کی روشوں میں تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔

یقیناً نیند محنت سی پیاری ہی۔ موجوں کے تھپیڑوں، چپوؤں کی کشمکش اور نیلگوں سمندر میں جانکاہی کی نسبت ساحل کا آرام زیادہ محبوب ہے۔ دل پسند ہی

عزیز ہمراہیو۔ اب صبر کا وقت آگیا۔ آرام سے عیش کے دن گزر گئے۔ اب ہم اور سفر نہ کرینگے۔ اور مصیبت نہ اُٹھائینگے۔

غلام عبّاس خان ایم۔ اے

تو آگیا

راستے پر میں نے تیرا انتظار کرنا شروع کیا۔ اور کرتی رہی .... مگر تو نہ آیا! اُس کے راستے پر سے گذرنے کا وقت تو شاید ہو چکا! .... شائد یہ راستہ اُسکی گذرگاہ نہیں ہی! یہ تھے میرے خیالات انتظار میں، مگر میں کسقدر غلطی پر تھی! کیونکہ تیری آنیکا مقررہ وقت ابھی بہت دور تھا اور تو اُسی راستے پر سے گذرنے والا تھا!

میں منتظر بیٹھی رہی!

فضا لطیف ہونے لگی۔ غیر لوگوں کی آمد و رفت بند ہو گئی راستے پر ایک سکوت چھا گیا۔ تمام کائنات دم روکے ہوئے ——— گوش بہ آواز ——— ہمہ تن منتظر بنی ہوئی تھی،

تیری شاندار سواری آنے لگی!

میں نے تجھے دور سے رتھ میں دیکھا۔ میرا دل دھڑکنے لگا، میں کانپنے لگی۔ میرے چہرہ پر پسینہ آنے لگا..... آہ! میں نے اب محسوس کیا کہ میں تجھ سے بھیک مانگنے کے لئے تیار نہ تھی! مجھے اس بات کے احساس نے شرما دیا اور میں نے شرم سے اپنا مونہہ آنچل میں چھپا لیا میں نے محسوس کیا کہ رتھ سے اتر کر تو میری طرف آنے لگا۔ مجھے اس بات کا کامل یقین ہو گیا کہ تو میری طرف آرہا ہی

لیکن آہ! میں تو تیرے لئے تیار ہی نہ تھی

میں کسطرح منہ سے آنچل اٹھا لیتی؟

لیکن اے آقا! تیرا شاہانہ ترحم تو میری اس خطا کو بھی درگزر کرنا چاہتا تھا تو نے آکے میرے مونہ سے آنچل ہٹا دیا! اور مجھ کو کریمانہ ترحم سے ہاتھ پکڑ کے اُٹھا لیا!! اے آقا تیرے لاہوتی لمس پر میری حیا مسرور ایک طویل پر عجز تبسم میں مبدل ہو گئی!

گوتم بدھ

کوہ ہمالیہ کے دامن میں کپل وستو نام ایک چھوٹی سی ریاست تھی جسمیں سکیا قبیلے کے لوگ آباد تھے۔ بدھ مذہب کا بانی گوتم وہاں کے راجہ کا بیٹا تھا۔ گوتم مہابیر کا ہمعصر اور عمر میں اُس سے چھوٹا تھا۔

اسنے انتیس سال کی عمر میں شادی کی اور دس سال تک گرہست زندگی بسر کرتا رہا۔ اگرچہ اُسے عیش و عشرت کے سب سامان مہیا تھے لیکن حقیقی خوشی اور راحت نصیب نہ تھی۔ اُسے دنیا میں ہر سو دکھ درد اور تکلیف ہی دکھائی دیتی تھی جب اُسے دنیا کی بے ثباتی اور انسانی زندگی کے انجام کا خیال آتا۔ تو دل پر سانپ لوٹنے لگتے تھے۔ ایکدن شاہزادے کے مغموم دل میں خیال پیدا ہوا کہ کوئی ایسی سبیل کرنا چاہیئے جس سے انسان کو حقیقی خوشی حاصل ہو۔ ایکدن رات کے وقت جب اُس کے بیوی بچے گہری نیند میں سو رہے تھے وہ گھر سے نکلا۔ اور جنگل کی راہ لی۔ اس واقعہ کو بدھ مذہب کے لوگ مہا تیاگ کے نام سے تعبیر کرتے ہیں جس کے معنی دنیا سے کنارہ کشی کے ہیں۔

گوتم پہلے پہل دو برہمنوں کا چیلہ بنا لیکن انکی صحبت میں اسکی تسلی نہ ہوئی اس کے بعد وہ کئی سال تک فقیروں کے لباس میں جنگلوں میں پھرتا رہا تپسیا کرتا اور اپنے جسم کو انواع و اقسام کی تکلیفیں دیتا رہا۔ مگر یہ سب باتیں بے سود ثابت ہوئیں۔ آخر بڑی غور و خوض تجسس اور تلاش کے بعد جب وہ گیا کے شہر میں ایک درخت کے نیچے بیٹھا تھا اسپر ایک بہت بڑی حقیقت یا صداقت آشکارا ہوئی۔ اس حقیقت یا صداقت کو ہم تہاتت کہہ سکتے ہیں۔ جس درخت کے نیچے گوتم پر القا ہوا تھا۔ اُسے بدھ مت کے لوگ بُدھی یا عقل کا درخت کہنے لگے۔ یہ درخت صدیوں تک بدھ لوگوں کا معبد رہا۔ اسوقت سے گوتم کو لوگ بدھ یا عاقل کہنے لگے۔ اسکے بعد گوتم بدھ۔ مہابیر کی طرح شہر شہر اور گاؤں بہ گاؤں پھرنے اور اپنے طریقے یا مذہب کی اشاعت کرنے لگا۔ اُس کے مذہب کو اُسکے بانی کے نام پر بدھ مت کہتے ہیں گوتم بدھ کا ۴۸۶ ق م۔ کوسی نگر میں انتقال ہوا

گوتم نے سب سے پہلے بنارس کے جنگلوں میں اپنے مذہب کی تلقین شروع کی۔ لیکن اُس نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ مگدھ پارس کے اس گرد کی ریاستوں میں بسر کیا۔ اسکی عین حیات ہی میں اسکے بہت سے چیلے ہر طرف پھیل گئے۔ اور بیشمار لوگوں کو بدھ کا معتقد بنا لیا۔ ان چیلوں کو کوئی تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ بلکہ وہ بھیک مانگ کر بسر اوقات کرتے تھے اس لئے ان کو بھکشو کہا جاتا تھا۔ عورتوں کو بھی اجازت تھی کہ وہ راہبوں کی طرح زندگی بسر کریں اور تبلیغ کا کام کرتی ہیں تاکہ یہ بھی بھیک مانگ کر اپنی گزران کرتی تھیں۔ لوگ انکو بھکشنی کہنے لگے۔ بدھ سب سے پہلا شخص تھا جس نے دنیا میں رہبانیت کی بنیاد رکھی۔ عیسائی اس امر میں بدھ کے خوشہ چیں ہیں۔

ان راہبوں کے ذریعہ بدھ مذہب بہت جلد ہندوستان میں پھیل گیا۔ لیکن اشوک کے زمانہ تک ہندو دھرم

کی طاقت بھی قائم رہی۔ اشوک کے زمانہ میں یہ مذہب چین جاپان۔ وسط ایشیا اور افغانستان میں بھی پھیل گیا مگر کچھ عرصہ کے بعد ہندو دھرم نے پھر زور پکڑا۔ اور بدھ مذہب کو نیچا دکھایا۔ بدھ مذہب کے لوگ ایک ایک کرکے پھر ہندو ہوگئے۔ اور آج یہ حال ہے کہ ہندوستان میں بدھ مذہب کے لوگ خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ لیکن سیلون۔ تبت۔ چین اور جاپان میں بدستور بدھ مذہب کے پیرو موجود ہیں۔ گو ہندوستان میں یہ مذہب مفقود ہے مگر دنیا کی آبادی کا تیسرا حصہ اس کا پیرو ہے۔ بُدھ نے خدائی یا پیغمبری کا دعوٰی کبھی نہیں کیا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ میں دوسرے انسانوں کی طرح معمولی انسان ہوں۔ بدھ کی تعلیم یہ تھی کہ سب انسان برابر ہیں۔ ایک کو دوسرے پر کوئی فوقیت نہیں۔ اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ شودر اور نیچ ذات کے لوگوں نے بہت جلد بدھ کا مذہب قبول کرلیا۔ بدھ کا تکیہ کلام زوان تھا۔ اس نے نفس کشی سکھائی اور قربانی کو قابل نفرت قرار دیا۔ نہ تو مہابیر نے اور نہ ہی بدھ نے کوئی صحیفہ یا اپنے عقائد کی کتاب چھوڑی۔ اس کے چیلے اس کے اشارے پر جان دیتے تھے۔ جب اس کا انتقال ہوا۔ تو اس کے پھولوں (ہڈیوں) کے لئے بعض زبردست قبیلوں اور راجاؤں میں جھگڑا برپا ہوگیا۔ ہر ایک یہی چاہتا تھا۔ کہ سکیامنی کے پھول اسی کے حصہ میں آئیں۔ آخر یہ فیصلہ ہوا۔ کہ انہیں کئی حصوں میں تقسیم کرکے بذریعہ قرعہ اندازی حاصل کیا جائے۔

بدھ کی وفات کے بعد اس کے چیلوں کو فکر پیدا ہوئی۔ کہ اپنے گرو کے اقوال اور اس کی تعلیم کو محفوظ کرنے اور تحریف سے بچانے کے نئی کتاب کی صورت میں جمع کیا جائے۔ اور تاکہ اس کا مفہوم سمجھنے میں کسی قسم کی غلطی کا احتمال نہ رہے۔ بعض الفاظ اور محاورات کی تشریح بھی کردی جائے۔ چنانچہ بدھ کے مرنے کے بعد ہی بدھ مذہب کے ودوانوں کی سنگت ہوئی۔ جنہوں نے اس کام کو نہایت خوش اسلوبی سے اور عین وقت پر سرانجام دیا۔ اس کے بعد بھی جب کبھی بدھ مذہب کے ماننے والوں میں بدھ کی تعلیم کے متعلق اختلاف رائے ہوا۔ تو انہوں نے فوراً سنگت کرکے سوال زیربحث کا فیصلہ کردیا۔ تیسری صدی ق م۔ میں بھی مہاراجہ اشوک کی سرپرستی میں ایک سنگت منعقد ہوئی۔ جو اپنی قسم کی تیسری سنگت تھی۔

گوتم بدھ ہمیشہ کہا کرتا تھا۔ کہ میں دوسرے لوگوں کی طرح معمولی آدمی ہوں۔ مجھ میں کوئی ایسی خصوصیت اور طاقت نہیں۔ جو دوسرے لوگ پتسیا کرکے اپنے اندر پیدا نہیں کرسکتے۔ لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ لوگ اس کی سیدھی سادی تعلیم کو بھولتے گئے۔ اور بدھ کی زندگی کے متعلق طرح طرح کے عجیب وغریب قصے گھڑ لیے گئے۔ یہاں تک کہ خوش اعتقاد لوگ اس کی ہڈیوں کی پرستش کرنے لگے اور کہنے لگے کہ ان سے معجزات صادر ہوتے ہیں۔ پہلی صدی عیسوی تک تو بدھ خاصہ دیوتا بن گیا۔ اور لوگ اس کی اس طرح پرستش کرنے لگے جیسا کہ وہ پرانے دیوتاؤں کی پرستش کرنے کے عادی تھے۔ اس زمانے میں بدھ مذہب کے دو فرقے

ہو گئے۔ ایک فرقہ تو وہ تھا۔ جو اصلی بدھ مذہب کے اصولوں پر کاربند تھا۔ یہ لوگ خدا کی ہستی اور دعاؤں کے اثر کے منکر تھے۔ اور بدھ کی تعلیم پر عمل کر کے نروان حاصل کرنے کے قائل تھے۔ اس فرقہ کا نام ہنایانا تھا۔

دوسرا فرقہ وہ تھا۔ جو بدھ کو دیوتا اور دنیا کا نجات دہندہ سمجھنے لگا۔ یہ لوگ دعا کے اثر کے بھی معتقد تھے۔ اس فرقہ کو مہایانا کہتے تھے۔ بدھ مذہب میں ذات پات کی کوئی تمیز نہیں تھی۔ اس لئے وہ مقبول عام ہو گیا۔ پھر اس میں بت پرستی کا عنصر بھی داخل ہو گیا۔ بدھ مذہب اور جین مت نے قریباً ایک ہی وقت اور ایک ہی سلطنت میں فروغ پایا۔ بدھ اور مہاویر ایک دوسرے کے ہمعصر تھے۔ اور دونوں نے مگدھ ہی سے اپنے اپنے طریق کی تبلیغ شروع کی۔ دونوں مذہب بھکشوؤں کے ذریعے پھیلے۔ دونوں مذہبوں کو ویدوں کے الہامی کتابیں ہونے سے انکار ہے۔ دونوں حیوانی قربانی کے خلاف ہیں اور اہنسا پر کاربند۔ دونوں مذہبوں کا مقصد نروان حاصل کرنا ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ بدھ نے غصہ کینہ اور خواہشات کو مار کر نروان حاصل کرنے کی تلقین کی۔ مہاویر نے تپسیا کے زور سے۔

اخلاقی اصول دونوں مذہبوں کے ایک سے ہیں۔ دونوں مذہبوں میں چوری۔ دروغ گوئی اور اس قسم کی دوسری مذموم عادتیں ممنوع ہیں۔ جینیوں کے نزدیک بھوکا رہ کر خودکشی کر لینا مباح ہے لیکن بدھ مذہب میں اس کی ممانعت ہے۔ بدھ اپنے مذہبی پیشواؤں کی ہڈیوں پر گھپے بناتے ہیں۔ لیکن جین اس قسم کی نمایش کے مخالف ہیں۔ بدھ مذہب کے لوگ ذات پات کی پابندی نہیں کرتے لیکن جینی ذات کی تفریق کو تسلیم کرتے ہیں۔

(۱) بدھ مذہب کی تعلیم ہے۔ کہ انسان خود اپنی کوشش سے مکتی حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن ہندو عام طور پر اپنے دیوتاؤں کو خوش کر کے نجات حاصل کرنے کے معتقد ہیں۔ بدھ مذہب کے مطابق۔ انسان براہ راست خدا سے تعلق پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن اہل ہنود برہمن کی مدد کے بغیر کوئی عبادت نہیں کر سکتے

(۲) بدھ لوگ دوسرے مذاہب کے لوگوں کو اپنے مذہب میں شامل کر لیتے ہیں۔ لیکن ہندو غیر مذاہب کے لوگوں کو اپنے مذہب میں شامل نہیں کرتے۔ بدھ مذہب کے مطابق کرم سے انسان بڑا بنتا ہے۔ اس کے نزدیک پیدائشی بڑائی کوئی بڑائی نہیں لیکن ہندو دھرم میں انسان پیدائش سے بڑا ہوتا ہے نہ کہ کرموں سے۔ شلاً بدھ مذہب کے مطابق اچھے کرم کرنے سے چھوٹے سے چھوٹا آدمی بھی برہمن کے رتبہ تک پہنچ سکتا ہے۔ لیکن ہندو دھرم کے مطابق شودر خواہ کیسے ہی نیک کام کیوں نہ کرے شودر ہی رہیگا۔ اور برہمن باوجود اپنی بداعمالیوں کے برہمن ہی رہیگا۔ اپنی ذات سے گر کر شودر نہیں ہو سکتا بدھ مذہب میں خواہ شودر ہو یا برہمن سب مکتی یا نروان حاصل کر سکتے ہیں۔ مکتی کا حصول ذات پات پر منحصر نہیں ہے۔ لیکن ہندو دھرم میں مکتی صرف آریا نسل کے لوگوں کا حق ہے کیونکہ غیر ذات کا شخص اسے بالکل حاصل نہیں کر سکتا۔

سید عبد القادر ایف۔ اے

غزل

تمہیں نیرنگ عالم کی خبر کیا — خبر ہو بھی تو ہوتا ہے اثر کیا
خدائی اک طرف ہیں اک طرف ہوں — کسی ناصح کی باتوں کا اثر کیا
مریض غم کے تیور کہہ رہے ہیں — بنا لینگے اب آکر چارہ گر کیا
خدا رکھے جمال طور ہے کچھ — بشر کیا شے ہے اور اسکی نظر کیا
صبا یا نیند نے زلفیں بگاڑیں — کسی مست جوانی کو خبر کیا
طلسمات تغیر ہے ترا حسن — ادا کہتی ہے کیا ترچھی نظر کیا
خیال و خواب ٹھہری اپنی ہستی — بڑھے گا اور اب درد جگر کیا
محبت ہے مرا ایمان ناصح — کہا جو کچھ کہا پھر اُس کا ڈر کیا
قیامت ہے طلسم کوئے جاناں — پھریگا خیریت سے نامہ بر کیا
غم فرقت میں ایک اک پل قیامت — گھڑی بھر کیا ہے اے دل عمر بھر کیا
یہی جانکنی کے بعد اجل ہے — شب فرقت کی لائیگی سحر کیا
نہ آئے گا کوئی اس ضد پہ محشر — کھڑے ہو تم میان رہگذر کیا

محشر لکھنوی

مشاہیر کے اقوال

رومیوں کے ہاں یہ قاعدہ تھا۔ کہ جن کمروں اور نشستگاہوں میں بچوں کی آمد و رفت اور نشست برخاست زیادہ ہوتی تھی اُن کی زیبائش بھی ایسے سامان سے کی جاتی تھی جس کے ہر وقت پیش نظر رہنے سے بچوں کے دلوں دماغوں میں عالی حوصلگی اور بلند ہمتی کے جذبات متحرک ہوتے ہیں مثلاً وہ ان کمروں میں اپنے ملک کے بہادروں اور جانبازوں کی تصویریں اور شبیہیں سنگ مرمر اور دوسرے پتھروں کے تراشے ہوئے مجسمے رکھتے تھے جن کو دیکھ کر بچوں کے دلوں پر اُن سورماؤں کے کارنامے تازہ ہوتے رہتے تھے اور نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ہر فرد سن تمیز کو پہنچتے پہنچتے اوصاف حمیدہ کا وہ جام برریز ہو جاتا تھا جس کی کیفیت سے آج ہر مہذب قوم سرشار ہے۔

زمانہ مابعد میں لوگوں نے ملکی رسم و رواج کی بنا پر اس مذاق میں اور اضافے اور اصلاحیں کیں

چنانچہ آج یورپ امریکہ وانگلستان ایشیا افریقہ و ہندوستان میں یہ دستور کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے کیونکہ اس کے باثر ہونے سے کسیکو انکار نہیں۔ لوگ کتبخانوں، مدرسوں، یونیورسٹیوں، بنکوں، کارخانوں اور ہر قسم کے دفتروں میں تصویریں، کتبے، قطعات، فقرات واشعار خوبصورت وصلیوں اور منقش وزرنگار چوکھٹوں میں لگاکر آویزاں کرتے ہیں جس کا مقصد فقط دیدہ زیبی ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ ظاہری نمود کے ساتھ یہ مدعا بھی مرکوز خاطر ہوتا ہے۔ کہ دیکھنے اور پڑھنے والوں کے دل اعلیٰ جذبات کے ساتھ لبریز پند و نصائح ہیں

دنیا کے بڑے بڑے مشہور لوگوں کے حالات زندگی پڑھنے سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ اکثر صورتوں میں ہمارے مایہ ناز فرد کی شان امتیازی کے حصول و اکتساب میں کسی قول یا اصول کا زبردست اثر کارفرما ہوا ہے۔ اکثر مشاہیر کی کامیابی اور شہرت کا دارومدار کسی کتاب کے مطالعہ کسی ناصح مشفق کے اتفاقی ریمارک کسی نظم یا شاید کسی وعظ کے چبھ جانیوالے فقرات پر ہوتا ہے۔ ہمیں آئے دن تجربے ہوتے ہیں کہ کسی ہونہار نوجوان کی زندگی کو شاہراہ کامیابی پر ہدایت کرنے کے لئے ایک اعلیٰ اصول کے تعلیم دینے والے زریں الفاظ رہبر کامل سے زیادہ ثابت ہوئے ہیں۔

بڑے بڑے اصول اگر ایجاز واختصار کے ساتھ پر اثر الفاظ کے زریں جامہ میں آراستہ و پیراستہ کرکے کسی ہونہار نوجوان کے ہر وقت پیش نظر رکھے جائیں تو ممکن نہیں کہ اُن کا جادو نہ چلے۔ اور اُس شخص کو آسمان ترقی پر ماہ دو ہفتہ بناکر نہ چمکادیں۔ اُس کی زندگی ان مقولوں سے کامیابی کے نصف النہار پر پہنچکر دیکھنے والے کی آنکھوں میں خیرگی اور چکاچوند پیدا کردے گی۔

امریکہ کے ایک مشہور قادر الکلام ناثر کا یہ دستور تھا کہ اپنی لکھنے کی میز پر ایک سنگ مرمر کا ٹکڑا رکھا کرتا تھا۔ جس پر بڑے بڑے موٹے حروف میں لفظ "آج" کندہ تھا۔ یہ کتبہ ہمیشہ وقت کی قدر و قیمت کا خیال اُس کے دل میں تازہ کرتا رہتا تھا۔ نیز اُس سے یہ امر بھی خاطر نشیں ہوتا تھا کہ آج دن بھر میں اکتساب دولت، اکتساب فضل و ہنر اور اکتساب عیش و مسرت کا کیا تناسب رہا۔ اور کس حد تک شاہد آرزو کو کامیابی اور فائز المرامی کی جلوہ گاہ پر دیدہ زیبی اور نظر فریبی کا موقعہ ملا۔

رسکن لکھتا ہے کہ میرے احباب میں سے ایک شخص درس و تدریس کے سلسلے سے ایک مدرسہ میں ملازم تھے۔ ویسے تو علمی قابلیت میں یگانہ عصر و یکتائے زمانہ تھے۔ لیکن اُن کی وضعداری اور پابندی اصول کا اثر طلبا پر اس طرح ہوتا جیسے پر کاہ پر کہربا کا یا لوہے پر مقناطیس کا۔ اُن کی عادت تھی کہ اپنی ہر بیاض ہر نوٹ بک کی پشت پر یہ عبارت آب زر سے لکھوا لیتے تھے۔ "ہمیشہ حصول کامیابی کی کوشش کرتے رہو حصول کامیابی پر بھی اپنے آپ کو بامراد نہ سمجھو"

فرانس کا مایۂ ناز مشہور سائینس داں اراگو ابھی لڑکا ہی تھا کہ شفیق والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا اس لئے یتیمی کے ساتھ عسرت اور تنگدستی کے پنجہ میں پھنسا ہوا تھا۔ ضروریات لاحقہ انسانی کی فراہمی کے سلسلہ میں ایک جلد ساز کی دوکان پر شب و روز کام کیا کرتا تھا۔ اتفاقاً ایک دن ورق گردانی اور شیرازہ بندی کے دوران میں ایک پھٹا ہوا ورق اس کو ملا جسے وہ جلد کے پٹھے پر گوند لگا کر چپکا رہا تھا کاغذ کے ایک کونہ پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے "کئے جاؤ! میاں کوشش کئے جاؤ" اس تحریر کو دیکھ کر داگو کے ننھے سے دل پر جو کچھ اثر ہوا۔ اس نامور عالم منیجر نے اس کا کئی موقعوں پر تذکرہ کیا اور صاف صاف بیان کیا۔ اس مختصر سی تحریر نے میرے دل و دماغ میں ایک نئی روح پھونکدی۔ گویا میری تمام کامیابی اور علمی ترقی کا راز اسی تحریر میں مضمر ہے

لیجئے اسی طرح کا ایک اور مقولہ یہ ہے جس سے گارنیلڈ کی زندگی تعلیم کامیابی اور نام آوری کی مثال بن گئی ہے۔ کیوں نہ ہو اس نامور کی زندگی پر اس مقولہ کا زبردست اثر پڑا ہے۔ مقولہ بھی سنئے

"کچھ کام ایسے ہیں جن کے کرتے ہوئے دل خوف کھاتا ہے مگر میں ذلیل کام کرنے سے خوف کھاتا ہوں"۔

ایک اور یہ تھا ... دنیا کا کوئی کام انجام پذیر نہیں ہوتا تاوقتیکہ کوئی شخص مرد میداں بنکر اسکی سرانجامی کو اپنے ذمہ نہ لیلے۔

متذکرہ ذیل کتبات کا کارخانوں اور دفاتر میں آویزاں کرنا خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ یہ ایسے مقولے ہیں۔ جن کے اثر سے مردوں عورتوں کی زندگیوں میں حیرت انگیز تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں۔ ملاحظہ ہوں اپنے ہر کام میں اختصار کا لحاظ رکھو" - "اختصار پسند بنو کیونکہ ہر شخص کو روزی کمانا ہے اور اس میں زندگی کا بڑا حصہ صرف ہوتا ہے"

ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے میں نے خود ایک بڑے کاروباری تاجر کے دفتر میں مندرجہ ذیل کتبے لکھے دیکھے تھے

"موقعہ کا انتظار نہ کرو بلکہ اپنے لئے موقعہ نکال لو"

"مستقل مزاج راسخ الارادہ انسان کیلئے دنیا خود راہ تیار کر دیتی ہے"

"روزی کمانے سے بڑھ کر بھی کام ہے یعنی زندگی کو بنانا"

"معاش سے بڑھکر انسان کو معاد کی فکر کرنا چاہیئے"۔

"غریب آدمی کا سارا دھن دولت اس کا چال چلن (کیرکٹر) ہے" یا

"غریب آدمی کیلئے کیرکٹر سے بڑھکر کوئی دولت نہیں"

"اپنے کمزور پہلو کا خیال رکھو"

"نظر بالا رہے زندگی اعلیٰ رہے"

"دولتمند وہ ہے جو اپنے ہمجنسوں کو نہال اور دولت سے مالا مال کرتا ہے"

"جدھر سے جاؤ پھول برساتے جاؤ کیونکہ دوبارہ اسی راستہ پر چلنا ہوگا"

"گھبراتے کیوں ہو یہ حالت قائم نہیں رہیگی کہ دنیا ہے فانی اللہ ہے باقی" کسی نے سچ کہا ہے

۵۔ میں نے مانا کہ آج خنجر مرا کلو بھی نہیں رہیگا۔
مگر ہیں قاتل کی او ستمگر ہمیشہ تو بھی نہیں رہیگا۔

"جو کر سکتا ہے وہی میر ہے"
ہمارے یہاں کہتے ہیں "جو پہلے مارے وہی میر"
"زمانہ کی گھڑی میں ہمیشہ ایک ہی وقت رہتا ہے
یعنی اب (زمانہ حال)"
"اپنے پیشہ میں سب سے بڑھکر کامیابی حاصل کرو"
"اپنی زندگی میں جو لگاتے ہیں اُسی کا ثمرہ پاتے ہیں"
"بے توجہی اور لاپرواہی کے ساتھ بہت سے کاموں پر ہاتھ نہ ڈالو۔ ایک کام ہاتھ میں لو اور خوبی کیساتھ پورا کرو" یکے دگیر و محکم گیر۔
جو عادت بچپن میں پڑجاتی ہے تمام عمر کے لئے پڑجاتی ہے"
"ہم اپنی قیمتیں آپ بناتے ہیں۔ بس اس سے زیادہ ملنے کی امید کرنا بے سود ہے"
"مثل مشہور ہے کہ اپنی عزت اپنے ہاتھ ہے"
"ضرورت ایک بے بہا مہمیز ہے"
"تمہاری قابلیتوں پر تمہاری پیشہ کا دارومدار ہے۔ عالی حوصلگی اپنا شعار بناؤ بے کم و کاست مراد دلی کو پاؤ"
"زندگی کی دوڑ شاندار ہو کامیابی نیکنامی سے بڑھکر نہیں"
"بڑے بڑے موقعوں کا انتظار نہ کرو چھوٹی چھوٹی باتوں سے فائدہ اُٹھاؤ اور اُن کو شاندار بناکر دکھادو"

لانگ فیلو کے اقوال ملاحظہ ہوں۔
"میں نے جی میں ٹھان لی ہے کہ کچھ ہو کر رہونگا"
شاعر مذکور ایک جگہ لکھتا ہے کہ بچپن ہی سے میں نے اس مقولہ کو چراغ ہدایت بنایا تھا۔
"ہر موقعہ کو بڑا موقعہ سمجھو کیونکہ تمہیں نہیں معلوم کب کسی جگہ بڑی جنگ کے لئے تمہاری تاب لیجاتی ہو"
یہ وہ اقوال ہیں جنہیں دنیا کے لوگوں نے مفید سمجھا ہے
"دنیا کے مقابلہ میں تمہارا منہ سامنے رہے اور کر جھکنے نہ پائے"
"جو دن تمہارے سامنے ہے قیمتی ہے۔ جو دن گزر گئے تمہارے نہ ہونے کے برابر ہیں"
"آج کے کام کو کل پر اُٹھا رکھنے میں جو وقت ضائع ہوتی ہے اکثر اس کام کو پورا کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے"

وہ اقوال جن کے اختیار کرنے سے ہم میں بہتوں کا فائدہ ہوگا"
"ایسا مونہہ بنائے رکھنا کہ زندگی دلفروز خوشی کے بجائے جانگداز الم و یاس کی تصویر بن جائے بہت بُرا ہے"
"تم خوشی اپنے ساتھ لئے پھرو۔ ورنہ جنت میں بھی نصیب نہ ہوگی"
"گذشتہ کے لئے تردد نہ کرو آیندہ کے خواب نہ دیکھو زمانہ موجودہ کو اچھی طرح پکڑلو۔ اور اسی سے سبق حاصل کرو"
"وہ شخص تمام فنوں کا ماہر ہے جس کا چہرہ تبسم

کی لہروں میں ہنستا کھیلتا نظر آتا ہے چاہے اس کا دل غم کے سمندر میں ڈوبا ہو۔ گویا ایسا شخص ضبط و اختیار کے میدان کا مرد ہے۔"

"اگر اب تک نہیں کیا۔ تو سب سے پہلے اپنے کام سے عشق پیدا کرو۔"

"اصلی خوشی سہل الحصول ہو اور ارزاں ہے۔ لیکن ہم کو نقلی خوشی ہی کے بڑے دام دینے ہوتے ہیں۔"

"آدمی تمام مال و منال سے اعلےٰ اور تمام جاہ و جلال سے ارفع ہے۔"

"چال چلن (کیرکٹر) بڑی زبردست طاقت ہے۔"

"دنیا کے تمام اسکولوں میں اس کتبہ کو سنہری حروف میں لکھکر آویزاں کردو۔ کسی بچہ کا کمرہ اس سے خالی نہ رہے۔ مائیں اپنے ہونہار بچوں کے لوح دل پر کندہ کردیں۔

"اپنے دلی اعتقاد پر مردانگی سے قائم رہو۔"

"اکثر آدمی صحت خراب کرکے کامیابی حاصل کرتے ہیں۔"

"دھن والے آدمی نے ہمیشہ دنیا کے چہرہ پر تغیر کی شکن پیدا کردی ہے۔"

"سست آدمی مردہ سے بدتر ہے۔ کیونکہ زیادہ جگہ گھیرتا ہے۔"

"نیکنامی بہترین سرمایہ ہے۔"

"پہلے انسان بن لو۔"

"بچے میں استقلال ہو اور حرف شناسی۔ پھر زندگی کی دوڑ میں کوئی رکاوٹ اُس کے حائل نہیں ہوسکتی۔"

"فاضل اوقات میں کبھی کوئی ایسا کام نہ کرو کہ کل کام کرنے کے وقت تمہارا سر جھکرائے۔ فقط

(ماخوذ از انگریزی)

مظفر علی بی۔ اے منشی فاضل

خیالات

گلہ ترا جو کبھی تیرے روبرو کرتے — یہ دردمند قیامت کی گفتگو کرتے

سیہ دلی نے معطل کئے تھے ہوش و خرد — ضرور ورنہ یہ جوہر کبھی نمو کرتے

رجوع قلب نہ تھے نیتیں بجز نہ تعجب — یہ رند زاہد پھر کرکے کیا وضو کرتے

سحر کے ساتھ ہوا ہائے وہ گریباں چاک — تمام رات گذاری جسے رفو کرتے

گلوں کا مرتبہ ملتا جگر کے داغوں کو — کہیں قبول یہ ظالم جو رنگ و بو کرتے

جہان عشق سے کس طرح سرخرو اُٹھتے — وفاپرست نہ پانی اگر لہو کرتے

سکون خاطر و سامان عیش و حسن مآل — دو روزہ زیست میں کس کس کی آرزو کرتے

تباہئ دل سے مدعا معاذ اللہ۔۔ — پس اس گناہ کو کرتے تو شعلہ رو کرتے

کرم اگر رندوں نے عمریں گزار دیں ساقی — مزاج دانئ پیمانہ و سبو کرتے

نکل کے چشم سے ہوتے نہ اسقدر رسوا — یہ طفل اشک جو آپ اپنی آبرو کرتے

ہوتی کشمکش جبر و اختیار کبھی — ستم اُٹھانے کی تسنیم تم جو خو کرتے

سید سرفراز حسین۔ آ (علیگ)

چاندنی رات

اے خوفناک تیرگی میں ضیا پاش ہونیوالی شب ماہ! تیری جلوہ آرائیاں کس قدر دلفریب ہیں جب تو اپنے نورانی چہرے سے نقاب ہٹا کر تبسم کرتی ہے۔ تو تمام جنگل جگمگا اٹھتا ہے' ذرے ہنسنے لگتے ہیں اور ہر طرف حسن جمال کا دریا بہنے لگتا ہے۔ تارے رعب جمال سے تیرے حضور میں خاموش و ساکت ہو جاتے ہیں۔ کہکشاں کا رنگ فق ہو جاتا ہے۔ اور نیلی فضا سے لیکر کرہ ارض تک تیری فرمانروائی مستلط ہو جاتی ہے......

ہاں میں دیکھتی ہوں۔ اے ملکہ حسن! تیرے وجود سے ٹوٹے ہوئے ٹھیکروں اور پامال خس و خاشاک پر شعریت برس رہی ہے تیری جلوہ ریزی سے ہر چیز نور سے معمور نظر آتی ہے۔ ہاں! اے جود و سخا کی دیوی تیرا فیض عام ہے۔

پرستاران فطرت گرم تماشا ہیں۔ چکور دلکش نغمے کیساتھ اپنی جان تجھ پر قربان کر رہا ہے میں بھی تیرے صبیح چہرہ سے لطف اندوز ہو رہی ہوں۔ مگر یہ خیال بار بار آ کر کہ "اے کاش انسانی دل تیرے باطن کی طرح مصفا ہوتا" میری مسرت و شادمانی کی گھڑیوں کو منغص کر دیتا ہے۔

بنت کبری ڈاکٹر محمد عبد الکریم

چائے کے مزے

کیا مزہ دیتی ہے مجھ کو ایک پیالی چائے کی — یا خدا ہو روز افزوں قدر عالی چائے کی
ہاں اک بیکار شئے ہے صبح کو جبتک کہ میں — پی نہیں لیتی ہوں بھر کر ایک پیالی چائے کی
ہے سرور افزا و لذت بخش اس کا ذائقہ — آفریں اس پر بنا جسنے کہ ڈالی چائے کی
درد سر کھانسی، زکام اور تپ دیتی ہے بھگا — میں نے کیا اچھا کیا عادت جو ڈالی چائے کی
گر تھکا ماندہ کوئی پی لے حرارت دور ہو — تازہ کرتی روح تک کو ہی پیالی چائے کی
رنگ بادامی ہوا اس کا ملی جب دودھ سے — سب کیا کرتے ہیں تعریفیں نرالی چائے کی
امتحاں کیوقت میں ہوتی ہے یہ میری شریک — اک صفت میں نے یہ دیکھی ہے نرالی چائے کی
جب کتابیں دیکھنی ہوتی ہیں راتوں کو مجھے — نیند دیتی ہے بھگا بالکل پیالی چائے کی
کیا مزہ آتا ہے جسدم بھائی بہنیں ایک جا — جمع ہو کر پیتے ہیں اک اک پیالی چائے کی

کیا ہی اچھی وہ گھڑی ہوتی ہے صبح و شام کی
بیٹھتی ہے جس گھڑی مجلس نرالی چائے کی

لا بٹھاتی ہے ہر اک چھوٹے بڑے کو میز پر
ایک دنیا پر ہے روشن قدر عالی چائے کی

ضد کبھی کرتی ہے میری چھوٹی موٹی ناز جب
بھر کے دیدیتی ہوں اسکو ننھی پیالی چائے کی

بھولنا ہرگز نہیں ہے عمر بھر جس نے کبھی
بھول سے پی لی کہیں اک بار پیالی چائے کی

(مس قاسم مدن)

جذبۂ فطرت

ماں باپ و بہن کی وہ حالت بھی عجیب عبرت انگیز ہے۔ جبکہ جوان اولاد یا بھائی بیم و رجا کی حالت میں بستر علالت پر حکیموں کا تختۂ مشق بنا ہوا ہے۔ ماں اپنے لال لال آنسوں کی نہ ختم ہونیوالی تسبیح سے دعا کرتی ہے۔ باپ کی خاموشی دلی دعاؤں کے لئے وقف ہے۔ بہن کی ہر سانس یا آہیں سلامتی کی دعاؤں کا خاموش وظیفہ ہیں۔ تمام دنیا کی دعاؤنکے لائق وہ قابل رحم انسان ہے جس کا ایک جوان صالح لڑکا مر چکا ہے اور دوسرا بستر علالت پر بیم کی حالت میں ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔ موسم سرما کی چاندنی رات میں ایک ایسے باپ کی بیقراری آہ و زاری جبکہ اُس کا جوان بچہ سکرات کی حالت میں ہے۔ نہایت ہی عبرت خیز ہے۔ موت کی تکلیف میں بچہ کا تلملانا اُٹھا تھ پاؤں مارنا پکا لیے پر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا والدین کے دل پر تیر و خنجر کا کام کر رہا ہے۔ یاس اور امید کے دو ذخار سمندر حائل ہیں جن کا عبور کرنا نہائت دشوار ہے۔ یہ رات ایک وحشت ریز صحرا ہے یا مہیب سمندر جس کی ہر لہر ایک نہنگ ہے جو اس بھنور میں پھنسا وہ بمشکل بچا

یہ سب کچھ ہے لیکن ایسے جن کی جوان اولاد مر چکی ہے۔ اور آئندہ بوجہ پیرانہ سالی اولاد کے امید منقطع و مسدود ہے۔ بالعموم شفتی القلب ہو جاتے ہیں ایسوں کے لئے میری دلی دعا بہترین تعزیت ہے

اہلیہ محمد ظہیر الدین خاں شیر پور ضلع پیلی بھیت

ایک حاجی کی ڈائری

آجکل یورپ میں علم ارواح کا بہت چرچا ہے۔ بھوت پریت کی ہستی اب قریب قریب مسلمہ ہے چشم دید واقعات ہر روز اخباروں اور رسالوں میں دیکھے جاتے ہیں اور عجیب قسم کی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ مگر میں اک انوکھا واقعہ بیان کرتی ہوں مجھے خود یقین نہیں آتا۔ مگر جسنے بیان کیا ہے۔ وہ نہایت معتبر ہے۔ حاجی صاحب

اپنی ڈائری یعنے تزک میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔

"یہ میرا چوتھا حج تھا۔ بمبئی سے ایک شخص میرے ساتھ ہو لیا۔ میں اُس کا نام لکھنا نہیں چاہتا۔ بظاہر متقی اور پرہیزگار تھا۔ مجھے باطن کا حال معلوم نہیں۔ ہم منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔ ان ایام میں مکہ معظمہ میں ہیضہ کی سخت شکایت تھی۔ بہت لوگ مر رہے تھے۔ دفن کرنے والے نہ ملتے تھے۔ میرے رفیق کو بھی اجل کا پیغام آگیا۔ وہ ہیضہ سے جاں بحق تسلیم ہوا۔ میں نے اُسے اُس کے لباس میں ایک جگہ دفن کر دیا۔ کفن ملنا دشوار تھا اور وہ قلاش۔ میں نے ایک واسکٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس کی جیب میں میری تمام دولت ساٹھ پونڈ کی شکل میں تھی۔ جب میں اپنے رفیق کے لئے پتھروں کو سرکا کر قبر بنا رہا تھا۔ تو مجھے گرمی محسوس ہوئی۔ پسینہ آگیا میں نے واسکٹ اتار کر قبر میں ایک طرف رکھ دی اور دفن سے فارغ ہو کر جائے قیام پر واپس آگیا۔ بڑی دیر کے بعد مجھے یاد آیا کہ میری واسکٹ بھی مرحوم کے ساتھ دفن ہو گئی۔ رات کو میں پھر وہاں گیا۔ قبر کو آسانی سے کھولا۔ مگر میرے ہوش اُڑ گئے۔ اس قبر میں میری واسکٹ کا نشان تک نہ تھا۔ لیکن جہاں میں نے اپنے رفیق کو دفن کیا تھا۔ اب وہاں ایک خوبصورت نوجوان عورت کی نعش تھی جس کا کفن سفید ریشم کا تھا اور وہ کمخواب کے ایک تھان میں لپٹی ہوئی تھی۔ قریب تھا کہ میں دیوانہ ہو جاؤں۔ مجھے خوب معلوم تھا۔ کہ یہ وہی قبر ہے اور میں غلطی نہیں کر رہا۔ اب میں محتاج تھا۔ جو کچھ میرے پاس تھا۔ وہ اس واسکٹ میں تھا۔ میری پریشانی کی انتہا نہ رہی۔ ناچار میں نے وہ بیش بہا کمخواب کا تھان اُٹھا لیا۔ تاکہ اُس کو فروخت کر کے وطن تک پہنچوں۔ اور واپس چلا آیا۔ قافلہ والوں نے ازراہِ عنایت میرے لئے چندہ کیا اور مجھے بمبئی پہنچا دیا۔ بمبئی پہنچکر میں نے وہ کمخواب کا تھان فروخت کرنا چاہا۔ اور ایک معزز مسلمان بزاز کی دوکان پر لیگیا۔ بزاز نے جو ملول اور محزون معلوم ہوتا تھا۔ تھان دیکھا اور اس کا رنگ زرد ہو گیا وہ مجھے دوکان کے اندر لیگیا۔ اور کہنے لگا۔ ظالم تو نے یہ کیا ستم کیا۔ تو دزدِ کفن ہے۔ اس تھان میں میں نے اپنی پاکدامن بہن کو لپیٹا تھا۔ چالیس دن ہوئے کہ اُس نے ہیضہ سے قضا کی۔ میں تو اس فکر میں تھا۔ کہ اس کی قبر پختہ بنواؤں۔ تو نے بہت بُرا کیا۔ دیکھ لے اس پر ہماری دوکان کے حروف لکھے ہوئے ہیں۔ یہ وہی تھان ہے اب بتا تجھ سے کیا سلوک کیا جائے۔ یہ سنکر میں خوف زدہ ہو گیا۔ میں نے تمام قصہ اُسے سنایا اور بقید حلف کہا کہ ناداری کی وجہ سے میں لے یہ تھان مکہ معظمہ کی ایک قبر سے نکالا ہے۔ ناممکن ہے کہ یہ تمہارا تھان ہو۔ تم نے اپنی بہن کو بمبئی میں دفن کیا ہے۔ وہ مکہ معظمہ کیسے چلی گئی۔ بزاز کو یقین ہو گیا۔ کہ میں دیوانہ ہوں۔ وہ اور اس کے چند کارندے میرے ساتھ ہو لئے۔ اور بمبئی کے مشہور قبرستان میں مجھے لیگئے۔ وہاں اُنہوں نے مرحومہ کی قبر کھولی اور دیکھا تو بجائے مرحومہ کی نعش کے اسمیں میرے رفیق کی میت تھی۔ اور اُس کے کپڑوں میں میری واسکٹ بھی تھی

واسکٹ کی جیب میں ساٹھ پونڈ بجنسہ موجود تھے"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کی بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

خورشید سلطانہ

رشحاتِ اثر

تمہیدِ انقلاب زمین و زمان کی ہے
جو آرزو کفیلِ دلِ ناتوان کی ہے

نام و نشان کی فکر نہ خواہش مکان کی ہے
معلوم ہو مجھے جو حقیقت جہان کی ہے

دل حسرتوں سے بستے ہی بستے اُجڑ گیا
رونق سناکر و کہ مکیں سے مکان کی ہے

گو قافلہ رواں ہے صدائے جرس ہے بند
منزل قدم قدم پہ کسی بے نشان کی ہے

اک پل میں آکے ٹوٹ پڑیں لاکھ بجلیاں
تاریخ مختصر یہ مرے آشیان کی ہے

اب امتیازِ حسن و محبت کو چھوڑ دو
دیکھو آؤ جان آنکھوں میں اک نیم جان کی ہے

نیرنگیوں کے دام بچھائے ہیں ہر طرف
آخر کچھ انتہا بھی میرے امتحان کی ہے

پھرتا ہے میری فکر میں دن رات آسمان
مجھ سے یہ دشمنی اُسے آخر کہاں کی ہے

لذت فزا ہے درد جو ہو داغ دل نصیب
صحرا کو جا رہا ہوں ہوس بوستان کی ہے

ہستی کا داغ دھو جو تلاش حیات ہے
نقشِ خودی مٹا جو تمنا نشان کی ہے

عقل و حواس کھو دے اگر تجھ کو ہوش ہے
صحرا میں جا کے بیٹھ جو حسرت مکان کی ہے

تو جسکو ڈھونڈھتا ہے وہی تو ہے بے خبر
تصویر تو ہی لیلیٰ مجنون نشان کی ہے

شاید سنا ہو تم نے اثر کا کلام کچھ
تُربت اسی نواح میں اس نوجوان کی ہے

جعفر علیخان اثر

عالمِ خیال

رات تاریک تھی اور خاموشی اپنا سکہ جما چکی تھی۔ ماہتاب نور افشانی کر رہا تھا۔ اور درخشان تارے اطراف چھٹکے ہوئے تھے۔ کائنات نقرئی چادریں ملبوس تھی۔ میں آسمان پر ٹکٹکی لگائے مبہوت لیٹا ہوا تھا۔ میری نیند رک گئی تھی اور میرا دل جل رہا تھا۔ میں اپنی زندگی پر غور کر رہا تھا۔ یکایک دل میں ایک ٹھنڈک سی پیدا ہوئی اور آنکھوں نے لطافت محسوس کی۔ میں وقفِ حیرت تھا۔ میری نگاہوں کے سامنے میرے دوست کی تصویر تھی۔ میں محو نظارہ تھا۔ بینائی لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اور دل کی دھڑک بڑھ رہی تھی

اسی عالم خیال میں میرا دوست مجھ سے کہنے لگا۔

"اے بحرِ ہستی کے تیراک! اور اے مادی زنجیروں میں جکڑے ہوئے قیدی!! میدانِ حیات میں بھٹکنے والے وحشی زندگی کا مقصد دل سے محو کر۔ انسانی قوت کا اندازہ کر۔ دماغ کو روح پر ور بنا اور روح کی صیقل کو جسمانی الائش چھوڑ کر روحانی رشتۂ حیات اپنی زندگی کے ہر لمحہ کے موتی کو منسلک کر۔ مادی اشیاء سے فائدہ اٹھانیوالے روحانی منازل طے کر۔ جادہ حیات پر سیدھا چل۔ صحیفۂ قدرت پر انسانی کوششوں کے نتیجہ کو ترجیح دینے والے! دیوانِ فطرت کا مطالعہ کر دیکھ! آبشاروں میں کون گنگناتا ہے۔ پھول میں کون مسکراتا ہے۔ شاخیں کس کا سجدہ کر رہی ہیں کون بتیوں میں سما کر سبق معرفت سکھاتا ہے۔ ہوا کے محظوظانہ رقص میں کس کا ترنم ہے۔ پودوں میں کون وجد سے جھوم رہا ہے۔ پھول کے رخسار میں کس کی تجلی ہے اور بلبل کے دل میں کس کی تڑپ ہے کلی میں کس کی چٹک ہے اور پتہ میں کس کی صنعت ہے۔ پھول کی مہک میں کون بسا ہوا ہے۔ آفتاب کی کرنوں میں کون پنہاں ہے۔ شبنم میں کس کی جھلک ہے۔ صبح صادق کے پردہ سے جھانک کر کون ہنس رہا ہے شام کس کے چہرے پر نقاب پڑا ہوا ہے۔ رات کسکے نور کو چھپائے ہوئی ہے۔ ہر شئے میں کسکے حسن کی جھلک ہے"

میرا دوست مجھے کہہ رہا تھا۔ اور مجھ میں روحانی مسرت حلول ہو رہی تھی۔ وہ مجھے تھپک تھپک کر مسلک روحانیت پر چلنے کی ترغیب دے رہا تھا۔ مجھ پر ایک خاص کیفیت طاری ہوئی اور میں سو گیا۔

میں نے تدری گلشن خواب کی سیر کی تھی۔ میں نے پھر محسوس کیا۔ کہ میرا دوست سامنے کھڑا ہے قطرات اشک سنہری رخسار پر سے ڈھلک رہے تھے۔ پھولوں کی پنکھڑی پر شبنم کے قطرے تھے۔ یا پیشانی فلک پر تارے تھے یا چند درخشاں موتی۔ میں نے چند موتی اٹھا کر دل میں رکھ لئے۔ اور محظوظ ہو کر رقص کرنے لگا میں نے کہا!

"اے گلزار حیات کے سدا بہار پھول۔ اور اے آسمانی زندگی کے درخشاں نیتر۔ میں نے تیری نصیحت دل سے سنی اور مانی۔ زندگی سرعت سے ختم ہو رہی ہے۔ ہر لمحۂ حیات معدوم ہو رہا ہے۔ دریائے فنا بے پایاں ہے جسمیں ہر لمحۂ زندگی کا قطرہ فنا ہوتا جاتا ہے۔ بہتر ہے کہ زندگی کے ہر لحظہ کا قطرہ شفاف ہو تاکہ آسانی سے زائل ہو جائے۔ آ۔ تاکہ اپنے دلوں کو مثل شفاف آئینے کے بنا لیں۔ حیات کے زمردی رشتہ میں ہر لمحہ زندگی کا چمکتا ہوا موتی پرو لیں۔ تاکہ ایک قابل قدر امانت ہماری زندگی کی بنا ہو۔ آ۔ اور نزدیک آ۔" میں نے ایک لطافت محسوس کی اور بیدار ہو گیا۔ فقط

عزیز احمد۔ ثریا

عورت

نظر سے جو گذرا شباب نومبر تو عورت کے مضمون کو میں نے پڑھکر
کہا دل سے اے دل تو ہی فیصلہ کر کہ عورت ہے کیا آدمی کے برابر؟
کہا دل نے ہے راحت جان عورت اگر اسمیں ہے نیک خوئی کا جوہر
ولے آفتِ زندگی ہے وہ ناری نہیں ہے جو رسم محبت کی خوگر
اگر پارسائی سے ہے وہ مزین تو بیشک ہے شوہر کی وہ نصف بہتر
وے شوخ بیباک مغرور ناری یقیناً ہے نارِ جہنم کی ہمسر
جو مفلس پہ چاہے وہ احسان کرنا۔ تو اُس کو بنا دے وہ قارون کا ہمسر
جو چاہے معزز کو بدنام کرنا تو ممکن نہیں دم وہ لینے دے دم بھر
کہیں ہے وہ شعلہ کہیں ہے بھبوکا - کہیں نکہت گلشن جان پرور
اسی کی بدولت ہے آباد خانہ - اجاڑے اگر چاہے وہ قصر قیصر
کہیں ہے وہ سب نیکیوں سے معرا - کہیں جملہ اوصاف کا ہے وہ جوہر
اگر بزدلی کی کہیں انتہا ہے کہیں ہے دلیری میں رستم سے بڑھکر
وہ اولاد کے واسطے ماممتا ہے تسلی ہے بچوں کی تسکین شوہر
بھلائی برائی کا ہے وہ مرقع کہیں ہے وہ اخگر کہیں مشک عنبر
کسی نے کہا خوب ہے یہ ولیکن سمجھ لو بجا اس کو جان برادر
(زن خوب و فرماں برو پارسا کند مرد درویش را بادشا)

جذبات ٹیگور

رام رتن - ایم اے

(ا)

مجھے صرف محبت کا انتظار ہی۔ تاکہ آخر کار میں اپنی ہستی اُسے دے ڈالوں۔ تاخیر کا باعث صرف یہی ہے اور یہی سبب ہے کہ مجھ سے اس قدر فروگذاشتیں سرزد ہو رہی ہیں۔ لوگ آتے ہیں۔ اور مجھے قوانین اور ضوابط میں پابزنجیر کرنا چاہتے ہیں۔ مگر میں ہمیشہ انہیں ٹالدیتی ہوں۔ کیونکہ مجھے محبت کا انتظار ہے۔ تاکہ آخر کار میں اپنی ہستی اُسے دے ڈالوں۔ لوگ۔ مجھے الزام دے رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں بے پرواہ ہوں۔ کچھ شک نہیں

اُن کے الزام سچے اور وہ بھی سچے ہیں ۔

میلہ ہو چکا اور ان لوگوں کا جو مصروف تھے بازار سرد ہو گیا ۔ جو لوگ مجھے بیفائدہ بلانے آئے تھے ۔ وہ خفا ہو کر واپس چلے گئے ۔ مجھے صرف محبت کا انتظار ہے تاکہ آخرکار میں اپنی ہستی اُسے دے ڈالوں ۔

(۲)

گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں ۔ تاریکی عالمگیر ہے ۔ اے محبت تیرا دل کیسے چاہتا ہے کہ میں دروازے کے باہر تنہا انتظار میں کھڑی رہوں ؟

دوپہر کے کاروبار کے مصروف لمحوں میں میں ہجوم خلایق کے ساتھ ہوں لیکن اس تاریک اور وحشت خیز دن میں مجھے صرف تیری آرزو ہے ۔

اگر تو نے مجھے اپنا چہرہ نہ دکھایا ۔ اگر تو نے مجھے بالکل نظرانداز کر دیا تو میں نہیں جانتی کہ میں کیسے یہ دراز ابرآلودہ گھنٹے بسر کر سکوں گی ۔

آسمان پر دودرنگ تاریکی محیط ہے اور میں اس طرف حیرت زدہ تک رہی ہوں ۔ باد تند کے ساتھ میرا بیقرار کلیجہ بلیوں اچھل رہا ہے ۔ اور میں خوشیون ہوں

ماسٹر محمد حمزہ خاں از نا ندورہ

کلامِ جوش

چمن میں رو رہا ہے کون بلبل ہلکر نشیمن سے
کوئی کہدو کہ شادابی اُڑی جاتی ہے گلشن سے

تقاضا ہے مری فطرت کا یہ احساں نہیں کوئی
محبت کے لئے مجبور ہوں میں دوست دشمن سے

ادب کو دخل دے، اس بحر میں لہریں ہیں وحدت کی
غبار ماسوا اٹھکر ذرا شاعر کے دامن سے

ملائے ہیں یہ کس استاد نے پردے کہ آتی ہیں
صدائیں ایک سی اب بربط شیخ و برہمن سے

بس اے قاتل نہ دھو یہ دستخط ہیں دادخواہونکے
ارے یہ خون کے دھبے کہیں چھٹتے ہیں دامن سے

انہیں قدموں پہ اے حسنِ ازل قربان ہونے دے
چنے ہیں میں نے تازہ پھول کچھ فطرت کے گلشن سے

بلندی عرش کی اُس کی سرافرازی سے جھکتی ہے
تری حرمت پہ جس کا سر جدا ہوتا ہے گردن سے

ہنسی آنا قیامت ہے تبسم پر غنیمت تھا
کلی چٹکی کہ سرد اک آہ نکلی قلب گلشن سے

دم زینت مرے آنے ہی یہ صورت قیامت تھی
جھکالی آنکھ آئینہ چھپایا ہنسکے دامن سے

الہ آباد اب ہم عنقریب اے جوش جائینگے
لپٹ کر روئینگے جی کھولکر اکبر کے مدفن سے

جوش ملیح آبادی

گھر چل

تو کیوں غافل بیٹھی ہوئی کھیل رہی ہو اور اپنی چوڑیاں چھن چھنا رہی ہے - اپنی گاگر بھر لے - اب گھر چلنے کا وقت ہو -
تو کیوں اپنی ہاتھوں سے پانی اچھال رہی ہے اور غفلت کی کھیل میں سڑک کی طرف کسیکو ڈھونڈھ رہی ہے اپنی گاگر بھر لے اور گھر چل
صبح کا وقت گذر رہا ہو اور تاریک پانی بہ رہا ہو - لہریں ہنس رہی ہیں اور غفلت کی کھیل میں سرگوشیاں کر رہی ہیں - بادل جو آوارہ تھے - افق آسماں پر جمع ہو رہے - وہ جاتے جاتے ٹھہ جاتے ہیں تیری چہرے کی طرف دیکھتے ہیں اور غفلت کی کھیل میں مسکرا دیتے ہیں - اپنی گاگر بھر لے اور گھر چل +

ممتاز علی چشتی

سیّارہ

ٹیگور

عالمِ اجرام میں سیّارہ کہتے ہیں جسے
اے منجم رات بھر میں دیکھا کرتا ہوں اسے

مصحفِ ایوانِ قدرت کا یہ اک سیپارہ ہے
قدسیوں کے واسطے یہ نور کا گہوارہ ہے

کوہسارِ شام میں سیمرغ زرّیں بال ہے
شعلۂ جوالہ ہے ترکِ فلک کی ڈھال ہے

آسمانی تشتری میں خوشۂ انگور ہے
گنبدِ نیلم کی چھت پر خانۂ زنبور ہے

جھومتا میخانہ سے نکلا کوئی مستانہ ہی
دستِ ساقی میں چھلکتا حسن کا پیمانہ ہے

تختۂ سوسن پہ رقصاں نقرئی بزغالہ ہے
یا مسی مالیدہ لب پر حور کے بنخالہ ہے

دستِ قدرت نے بنایا بات یہ معقول ہے
تارِ زر سے وسمئی ریشم پہ روشن پھول ہے

سیرگاہ عام میں خلطک زناں عیار ہے
توسنِ پرّاں ہے یہ اور اڑتا ہوا رہوار ہے

بحرِ اسود میں رواں کا لسکۂ کافور ہے
انقلابِ دہر سے گردش میں کوہِ طور ہے

اے چراغِ تختۂ سرو چراغانِ فلک
اے گلِ گلدستۂ طاق شبستانِ فلک

تو بھی کیا دل ہے مرا کس واسطے بیتاب ہے؟
لرزہ براندام ہے کیا ماہیٔ سیماب ہے؟

بیدِ مجنوں ہے کہ شب بھر کانپتا رہتا ہے تو
شش جہت ہی کس لئے منہ سے نہیں کہتا ہے تو

کیا مری مانند ہے تجھ کو بھی سودائے طواف
یا کسی کا ڈر ہے تجکو کیوں نہیں کہتا ہے صاف

انقلابِ آسماں سے آمدِ وقتِ سحر
سرد مطبخ ہو گیا اور بجھ گئے اس کے شرر

اے مسافر حسن کے لٹنے کا غم بے سود ہے
یہ مآلِ رونقِ بازارِ ہست و بود ہے

ماہ و اختر کو میسر ایک شب کا ہے کمال
اک فقط انساں کی قسمت میں ہے بارسوں جمال

ایڈیٹر

جلد ۴ نمبر ۶ بابت ماہ رجب سنہ ۱۳۴۰ھ مطابق مارچ سنہ ۱۹۲۲ء

شذرات

اس نمبر کے ساتھ بفضل خدا چوتھی جلد ختم ہوتی ہے۔ خدا کرے۔ پانچویں جلد گزشتہ جلدوں سے بڑھ چڑھ کر ہو۔

عزیزہ محترمہ خورشید سلطانہ اسسٹنٹ ایڈیٹر کو دوسری جلد کے نمبر اول کی جو اکتوبر ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اور جسمیں علامہ خانصاحب عبدالمالک صاحب مشیر مال بہاولپور کی تصویر ہے۔ جلد دوم کی تکمیل کیلئے سخت ضرورت ہے اگر کسی صاحب کے پاس فالتو ہے تو ازراہ کرم قیمتاً عنایت فرمائی جائے

نئے قدردان گزشتہ جلدیں بڑے اصرار سے طلب فرماتے ہیں۔ جلد اول و دوم و سوم نایاب ہیں۔ لیکن مکمل چوتھی جلد کی چند کاپیاں موجود ہیں۔ اگر کسی صاحب کو اکتوبر ۱۹۲۱ء سے مارچ ۱۹۲۱ء کا مکمل سٹ یکجائی کاپی درکار ہو۔ تو چار روپے یا گیارہ آنے علی الترتیب بھیجکر منگا سکتے ہیں۔

رباعیات وشاق یعنی آفتاب معرفت کا ذکر ہم پہلے شباب اردو کے کسی پرچے میں کر چکے ہیں۔ ہمارے دوست میاں علاؤالدین ریویو کا تقاضا بار بار فرما رہے ہیں۔ انشاءاللہ وقت پر ریویو کیا جائیگا۔ اسوقت ہم اسقدر اور بتا دیتے ہیں کہ ان رباعیات کو پڑھکر ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ ایک پندرہ سال کے نوعمر بچے کی اگر یہ تصنیف ہے۔ تو کرامت سے کم نہیں ہے۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ لالہ رودردت وشاق غیر معمولی دل و دماغ لیکر آئے تھے۔ اور ان میں کشف کا ملکہ تھا۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنے مرنے کا دن اور وقت بتا دیا تھا۔ رباعیات قابل دید ہیں اور سبق آموز ہیں یہ کتاب ایک روپیہ کو لالہ دیو دت صاحب ساکن کوچہ وائی بھولی لاہور سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

کتب خانہ شباب جناب مولوی سید محمد ضامن صاحب کنتوری کا رہون منت ہے۔ کہ انہوں نے اپنا دیوان ارژنگ خیال عنایت فرما کر اس میں بیش بہا اضافہ فرمایا ہے۔ اس کساد بازاری کے زمانہ میں مولنا ضامن کا دم مغتنمات سے ہے۔ ان کی طبیعت میں بلا کی آمد ہے۔ مضامین آفرینی۔ شکوہ الفاظ۔ نازک خیالی کے لحاظ سے آپ کی نشست شعرائے صف اول میں ہے۔ مفصل ریویو بعدہ کیا جائیگا۔ قیمت ارژنگ خیال حصہ اول قسم اول تین روپے اور قسم دوم دو روپے ہے۔ یہ کتاب مصنف سے بمقام گورنمنٹ سنٹرل پریس حیدرآباد دکن دستیاب ہو سکتی ہے۔

شباب کا فروری نمبر پروف ریڈر کی بے پرواہی کی روشن مثال ہے۔ خدا رحم کرے۔

جناب محمد علی صاحب عرف آغا علی صاحب تعلقدار کے لاجواب مضمون علم النفس کا غلطنامہ ہم ذیل میں درج کر کے اظہار ندامت کرتے ہیں۔

صفحہ	سطر	غلط لفظ	صحیح
۱۳	۶	اوتم	اتم
۱۴	۸	طریق ملل	طریق اول
۱۵	۵	تو بہی	تو یہی
"	۶	بہرتی	برتی
"	۱۴	قوت آزادی	قوت ارادی
۱۶	۲۰	احساس کیفیت	احساسی کیفیت
۱۶	۲۱	قصہ	قضیہ
۱۸	۲۲	مصلح	مسیح
۱۹	۱۴	حمایت	جماعت
	۱۸	غضبی لتر	عصبی اثر

برکت علی ایم-اے-ایل ایل بی جائنٹ ایڈیٹر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شباب اردو

جوگن

سیتا نور کی پتلی تھی۔ گلرو تھی۔ گل اندام تھی۔ اُس کا باپ چندر بھان ایک دولتمند ساہوکار تھا چندر بھان کی بیوی اور سیتا کی ماں اندر کور بذاتہ بہت مالدار تھی۔ سیتا کا نانا ٹھاکر داس ٹھیکہ دار تھا۔ وہ مہارانی لچھمی کا نذر کردہ تھا۔ اندر کور اُس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ٹھاکر داس تلوں میں سے تیل نکالتا تھا۔ پائی پائی پر جان دیتا تھا پہلے درجے کا بخیل تھا۔ وہ خزانہ پر سانپ تھا۔ اچھا کھانا۔ فاخرہ لباس اُس کے مقدر میں نہ تھا۔ جب مرض الموت میں گرفتار ہوا تو کفایت شعاری کے خیال سے ڈاکٹر نہ بلایا آخر بصد حسرت اس دنیا سے رخصت ہوا۔ اسکے مرنے پر اندر کور کو ایک لاکھ نقد اور دو عالی شان مکان بلا درد سر مل گئے۔ چندر بھان کو اس غیر مترقبہ وراثت کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اس جہاں میں زر زر کو خزانہ خزانہ کو کھینچتا ہے۔ چندر بھان اولاد نرینہ سے محروم تھا۔ کئی بچے ہوئے۔ مگر سب دودھ چھڑانے سے پہلے مر گئے صرف سیتا زندہ رہی اور جوان ہوئی۔ اور جب جوان ہوئی۔ تو چودھویں رات کے چاند کو شرمانے لگی۔

(۲)

تارا خوش شکل جامہ زیب نوجوان تھا۔ یہ یوسف جمال ماہ تمثال تھا۔ یہ غزال رعنا تھا۔ یہ سرو سہی تھا مگر اس کا باپ سومناتھ ایک غریب دوکاندار تھا۔ تارا تین سال کا تھا۔ کہ اس کی والدہ

ہمیشہ کے لئے اس سے جدا ہوگئی۔ باپ نے اُس کو پالا۔ اور اُس کے لئے پھر شادی نہ کی۔ وہ تارا کو آنکھ کا تارا سمجھتا تھا۔ سومناتھ اور چندر بھان میں بڑی دوستی تھی۔ بچپن میں یہ ہم مکتب تھے جب تارا آٹھ سال کا ہوا تو سومناتھ بیساکھی کے دن دریا پر اشنان کرنے گیا۔ وہ کپڑے اتار کر پانی میں اترا ہی تھا کہ یکایک غوطے کھانے لگا۔ اُس کا پیمانہ عمر لبریز ہو چکا تھا۔ دفعۃً شور مچ گیا کہ تارا کے باپ کو گھڑیال نگل گیا۔ خدا جانے کیا ہوا پھر اس کی نعش کا کچھ پتہ نہ چلا۔

سومناتھ غریب نہایت غریب تھا۔ اس کے مرنے سے تارا محتاج ہوگیا۔ تارا کے باپ کے قریبی رشتہ دار موجود تھے۔ مگر سب نے آنکھیں بدل لیں۔ بھلا غریب کی کون بات پوچھتا ہے اس بیکسی کے عالم میں چندر بھان کے دل میں خدا نے رحم ڈالا۔ وہ اُسے اپنے گھر لے گیا۔ اور اُس کی پرورش کرنے لگا۔ چند دن میں تارا اپنے اصلی باپ کو بھول گیا۔ عہد طفلی میں وہ سینتا کو بہن۔ اندرکور کو ماں اور چندر بھان کو باپ سمجھتا تھا۔

تارا عمر میں سینتا سے تین سال بڑا تھا۔ بچپن میں یہ دونوں اکٹھے رہا کرتے تھے۔ ان کے مکان کے ساتھ ایک دلکشا چمن تھا جسمیں ایک پانی کا حوض اور حوض میں فوّارہ تھا۔ دونوں اس حوض کے کنارے بیٹھ کر ایک دوسرے کو کہانیاں سنایا کرتے۔ پھول توڑ کر حوض میں ڈالتے اور جب پھولوں کی پنکھڑیاں حوض میں رقص کرتی ہوئی دکھائی دیتیں تو کھل کھلا کر ہنستے تھے۔ ان کی ہنسی کی آواز جو گناہ کی آلایش سے پاک تھی ایک ایسی چاندی کی گھنٹی کی آواز سے متشابہ تھی جو صرف عصمت کی دیوی کے مندر میں پاکدامنی کی پریاں گنگاجل سے اشنان کر کے بجاتی ہیں۔

(۳)

جب سینتا کی عمر پندراں برس کی ہوئی تو تارا اٹھاراں سال کا تھا۔ دونوں ماہ منیر اور بے نظیر تھے۔ تارا صرف شکیل اور جمیل ہی نہ تھا۔ وہ روشن دل اور روشن دماغ بھی تھا۔ ہنگام گفتگو اس کے دہن سے پھول جھڑتے تھے اور وقت تحریر اس کا قلم موتی اگلتا تھا۔ چندر بھان نے اُسے اپنی حقیقی فرزند کیطرح پالا تھا اس لئے وہ امیرزادوں کی طرح سواری کا شایق تھا اور ہمیشہ پرتکلف لباس پہنا کرتا تھا۔ گھوڑدوڑ میں شریک ہوا کرتا تھا اور پولو کامیابی کے ساتھ کھیلتا تھا۔ اس کے دل کا آئینہ کدورت غم سے بالکل صاف تھا۔ فکر کا اُسنے نام ضرور سنا ہوا تھا مگر اس کی شکل کبھی نہ دیکھی تھی۔ سینتا سے اُسے اب بھی محبت تھی بہت زیادہ محبت تھی مگر یہ محبت پہلی محبت سے مختلف تھی۔ اب اس کی محبت وہ محبت تھی جو بلبل شوریدہ سر کو فرخندہ پھول سے جو سوختہ سامان پروانوں کو شمع شبستاں سے ہے جس محبت پر

قیس کو فخر تھا جس پر فرہاد کو ناز تھا۔ اس کی پہلی محبت ایک جوئے شیر تھی اور اب قلزم شہد یا شراب طہور کا آبشار۔ اس کی پہلی محبت ایک میٹھی لوری تھی اور اس کی موجودہ محبت نغمۂ صور یا شور محشر۔ اسکی پہلی محبت عرق خواب آور تھی تو موجودہ محبت شربت جنوں خیز و ولولہ انگیز۔ ہاں اب اُسے وہ محبت تھی جس سے آتشکدۂ نمرود گلزار خلیل اور جس سے دوزخ خلد بریں بنجاتا ہے جس کی بدولت ہم کنوئیں جھانکتے ہیں تنکے چنتے ہیں جو باعث دشت نوردی اور موجب صحرا گردی ہے کیونکہ سب کو امید اور تارا کو یقین تھا کہ بی اے کے امتحان کی کامیابی پر اس کا بیاہ سیتا سے ہو جائیگا۔

(۴)

دنیا ایک چھلاوا ہے یہ شعبدۂ خواب ہے یہ قصر حباب ہے یہ موج سراب ہے۔ اسمیں بہت کم کسی کی امید بر آتی ہے۔ یہاں خوشی اور غم توام ہیں۔ یہاں ہمیشہ تمنائیں سنگسار کیجاتی ہیں۔ یہاں مدعی آرزوؤں کا خون بہاتے ہیں۔ یہاں دلوں کے ارمان ہمیشہ آبلوں کی طرح پھوٹتے رہتے ہیں۔ امید کا گھر خالی ہوا کرتا ہے۔ تارا کی امید ناامیدی بن گئی۔ اسکا یقین وہم و گمان ہو گیا۔ تارا نے بی۔ اے کی ڈگری عزت کے ساتھ حاصل کی مگر اسکا چراغ مسرت ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا۔ انقلاب کی آندھی اور گردش زمانہ کے طوفان نے بلدۂ یقین ویران کر دیا۔ چندر بھان کی وفات سے حالت دگرگوں ہو گئی۔ اندر کور نے برادری کے بہکانے اور حاسدوں کے ورغلانے سے سیتا کا بیاہ رام چندر سے کر دیا۔ اور تارا کے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا۔

رام چندر اپنے ہمنام کی ضد تھا۔ راجہ رام چندر سے اسے کچھ نسبت نہ تھی تارا اور اسمیں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ وہ بھگوان کا اوتار تھا یہ پاپ کا سروپ۔ تارا نے بی اے کی ڈگری عزت کیساتھ حاصل کی تھی اور رام چندر انٹرنس میں چار بار فیل ہو چکا تھا۔ تارا مردانہ اور شیر فرزانہ تھا تو رام چندر بزدل متعصب اور شتر کینہ۔ تارا خوبصورت اور شیریں گفتار تھا تو رام چندر کریہ منظر اور تنک مزاج ترش رو۔ تارا سلیم الطبع تھا تو رام چندر مغرور نمرود نخوت انانیت مجسم۔ البتہ تارا یتیم تھا اور رام چندر امیرزادہ صاحب مال و منال۔ لیکن ہمارے ملک میں ذاتی جوہر ہیچ ہے۔ اشراف وہی ہے جس کے پاس اشرفی ہے۔

(۵)

نوع انسان میں طبائع مختلف ہیں۔ بعض ایسے ہیں کہ کوئی مرے کوئی جیئے۔ انکی پیشانی پر بل تک نہیں پڑتا۔ اور بعض اس قسم کے ہیں کہ اگر ذرا سی بھی ٹھیس لگے تو دل چکنا چور ہو جاتا ہے۔ تارا آخر الذکر قماش کا انسان تھا۔ اس کے دل میں سارے جہان کا درد بھرا ہوا تھا۔ اس ناکامی سے اسکی

کایہ پلٹ گئی۔ اب وہ پہلا تارا نہ تھا۔ اچھے لباس کا اُسے بہت شوق تھا۔ غذا کم کھاتا تھا لیکن نفیس۔ اب وہ غذا اور لباس کی طرف سے بے پروا تھا۔ کپڑے میلے ہو جاتے تھے اور وہ تبدیل نہ کرتا تھا۔ کھانا کہنے سے کچھ کھا لیتا تھا منہ سے نہ مانگتا تھا۔ سیر اور ہوا خوری یکقلم ترک کر چکا تھا۔ مطالعہ کتب اُس کی عادت تھی۔ اب کتابوں پر خاک اُڑ رہی تھی۔ کتاب اگر سامنے آجائے تو اس کی طبیعت گھبرا جاتی تھی۔ اپنے کمرے میں دروازے بند کرکے رہنا پسند کرتا اور سر پر ہاتھ رکھکر پہروں سوچتا رہتا تھا۔ مسرت اُسکے چہرے پر ہر دم تبسم ریز رہا کرتی تھی۔ اب مسرت کافور تھی اور حسرت اور یاس بیتابی اور حرماں بلا گرداں۔ چند دن یہی حالت رہی پھر تپ محرقہ نے آدبایا۔ جان کے لالے پڑ گئے۔ شدت بخار میں ہذیان کا غلبہ ہو گیا۔ سیتا کو پکارتا تھا اور روتا تھا۔ آخر سیتا آئی اور اُسنے اپنا حنا مالیدہ ہاتھ اُس کی پیشانی پر رکھا۔ پیشانی انگارہ بنی ہوئی تھی۔ تیماردار ہر نت ل چکے تھے۔ خواب آور دوا دیکر مایوس ہو گئے تھے۔ باوجودیکہ تارا بیہوش تھا اور سیتا کو پہچان نہ سکتا تھا لیکن خدا جانے اس پنجۂ نازک میں کونسی مقناطیسی طاقت تھی کہ ہاتھ لگتے ہی تارا کو قرار سا آگیا۔ اس کا اضطراب گھٹنے لگا اور وہ سو گیا۔

سیتا کی موجودگی نے جادو کا کام کیا اور چونکہ تارا کی طبیعت باساخت جسم زحمت کش تھی وہ رفتہ رفتہ اچھا ہو گیا۔

ایکدن جبکہ تارا آرام چوکی پر تکیہ لگائے بیٹھا تھا اور تنہا تھا سیتا نہایت شان و شوکت سے گلنار عروسی لباس زیب تن کئے انا پہرن کہتی ہوئی وہاں آئی۔ اسوقت وہ سرتاپا شعلۂ آتش بنی ہوئی تھی۔ اُس کے کانوں کے آویزے سرخ تھے۔ اور اُس کے ہاتھوں کی چوڑیاں یاقوت نگار۔ اُس نے اپنی نور فشاں نظر سے تارا کی طرف دیکھا اور اس کے تمام زخم ہائے دل آئے ہو گئے۔ پھر اُس نے مسکرا کر کہا کہ بھائی وہ تمہارا بہنوئی ہے تمکو مناسب ہے کہ میری خاطر اس سے محبت کرو میں دیکھتی ہوں کہ تم اس سے علیحدہ علیحدہ رہتے ہو۔ دیکھو تمہیں میرے سر کی قسم اس میں میری بدنامی ہے۔ اگرچہ اس دلدوز فقرے نے تارا کے دل کو گہرائیوں تک چھید ڈالا۔ اگرچہ اُس کا خرمن تحمل جلکر خاک ہو گیا مگر اُسنے عالم ضعف و نقاہت میں کانپتی ہوئی آواز سے کہا۔ سیتا تم کیا کہتی ہو۔ میں تمہاری رام چندر پر اپنی جان اپنی عزت قربان کر دونگا

٦

رام چندر اُن معدودے چند خوش نصیب انسانوں میں سے تھا۔ جن کے مُنہ میں پیدائش کے وقت نقرئی چمچہ ہوتا ہے اور جو پیدا پیچھے ہوتے ہیں اور سنہری گہوارہ پہلے تیار ہو جاتا ہے۔ اُسی

سب کچھ میسر تھا۔ اُس کے پاس اس قدر زر تھا کہ اگر قارون ہوتا تو اپنی شہرت اسپر قربان کر دیتا۔ اُسے بے شک سب کچھ نصیب تھا۔ مگر اُس کے پہلو میں دل نہ تھا۔ وہ یہ سمجھتا تھا۔ کہ ٹھنڈی اور عطر بیز ہوا کے جھونکے۔ سورج کی روشنی۔ چاند کی چاندنی۔ لالہ و گل۔ زمین اور آسمان صرف اُس کے آرام کے لئے قدرت نے بنائے ہیں۔ ان خیالات نے اُسے پرلے درجہ کا خود مطلب بنا دیا تھا۔ سیتا ایک گوہر بے بہا تھی مگر وہ گوہر شناس جوہری نہ تھا۔ سیتا ایک روح افزا پھول تھی لیکن وہ گل نواز باغباں نہ تھا۔ وہ اپنے زعم باطل میں سمجھتا تھا کہ عورتیں صرف مرد کی خدمت کے لئے پیدا ہوئی ہیں اور سیتا اُس کی کنیز ہے۔ اُس کی روح آتش اور حرارت سے محروم تھی۔ اس کا سینہ درد اور سوز سے بیگانہ تھا۔ تارا جانتا تھا کہ اُس کی اور اس کے خوش قسمت رقیب کی طبیعت میں بعد المشرقین یا المغربین ہے۔ لیکن وہ بدل ناخواستہ صرف سیتا کو خوش رکھنے کے لئے اس سے ملتا تھا گو اس کی مجلس اُس کے لئے عذاب الیم تھی۔ بعض فیلسوف دولت کو دختر گناہ کہتے ہیں شاید ہو۔ مگر اتنا ہم ضرور کہہ سکتے ہیں کہ بیکار کاہل اور جاہل کو یہ فرعون بنا دیتی ہے۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا کرتی ہے۔ وہ وہ شاخسانے نکالتی ہے۔ ایسے ایسے ہنگامے برپا کرتی ہے کہ فرشتے کانپ جاتے ہیں۔ رام چندر دولتمند تھا۔ بیکار تھا۔ جاہل تھا۔ فرعون بن گیا عیاشی اور میگساری کے ہاتھ بک گیا۔ سیتا کو اپنے شوہر سے عشق تھا۔ یہ بد اعتدالیاں دیکھتی تھی اور شمع کی طرح جلتی تھی۔

ایکدن کا ذکر ہے رام چندر گھر سے شکار کیلئے نکلا۔ سیتا کے اصرار سے تارا بھی ساتھ تھا۔ ایک ہرن کے تعاقب میں یہ دونوں ہمراہیوں سے جدا ہو گئے اور انکا گذر ایک کھیت میں ہوا۔ اتفاق سے رام چندر کی بندوق خود بخود چل گئی اور ایک کسان کا لڑکا جو وہاں مویشی چرا رہا تھا زخمی ہو گیا۔ زخم مہلک نہ تھا۔ مجروح کے شور و غل پر اسکا باپ وہاں آ گیا۔ رام چندر میں اس قدر برداشت کب تھی کہ اسکی بدلگامی سہے طیش میں آ گیا اور مجروح کے باپ کو بالارادہ نشانۂ بندوق بنا دیا۔ بندوق دونالی تھی۔ گولیاں دل اور جگر کو زخمی کرتی ہوئی سینے سے پار نکل گئیں۔ وہ معًا زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ اور دیکھتے دیکھتے سرد ہو گیا۔

۷

کشورِ محبت میں دشت نورد قیس اور کوہکن فرہاد بہت مشہور ہیں۔ یہ دونوں میدان وفا کے شہسوار ہیں۔ بزم محبت میں پروانہ سب کا سردار ہے لیکن تارا کی محبت نے ان سب کی شہرت پر اوس برا دی

نمرود نخوت رام چندر۔ رندِ سیاہ مست رام چندر۔ سیاہ قلب متعصب رام چندر صریحاً قتل عمد کا مجرم تھا۔ اس نے علانیہ ایک غریب کسان کو بلا اشتعال نشانہ بندوق بنایا تھا۔ مگر وہ کور باطن۔ بے ایمان اور دولتمند تھا۔ اس نے روپیہ کوڑیوں کی طرح صرف کیا۔ جھوٹے گواہ بنائے زمین اور آسمان کے قلابے ملائے اور اپنی جگہ تارا کا چالان زیر دفعہ ۳۰۲ مجموعہ تعزیرات ہند کروا دیا۔ سب تارا کو مجرم سمجھنے لگے۔ اور وہ سزائے موت کا سزایاب ہوا۔ کہتے ہیں کہ اپنی محبوبہ کے شوہر کو بچانے کے لئے اُس نے جرم کا اقبال کیا۔ اور شہادت صفائی پیش کرنے سے انکار کر دیا۔ کہتے ہیں کہ جب پھانسی کا وقت آیا تو اس کے چہرے پر نور برستا تھا۔ وہ ہنس رہا تھا۔ اور بشاش تھا۔ کہتے ہیں کہ اسوقت عنادل چونچوں میں پھول لئے ہوئے آئے اور تارا کے بلاگرداں ہونے لگے کہتے ہیں کہ آسمان کے دریچے کھل گئے اور فرشتے آب حیات چھڑکنے لگے۔

× × × × × × × × × × × ×

دو سال گذر گئے۔ رام چندر سنگدل رام چندر ایک رقاصہ کی محبت میں از خود رفتہ ہے۔ اور دنیا و مافیہا سے غافل ہے۔ شہر سے باہر مرگھٹ کے قریب ایک عالی شان بارہ دری سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہے۔ اس میں تارا کے پھول دفن ہیں۔ وہ دیکھو ایک جوگن جو نہایت حسین ہے مگر جس کا چہرہ گرد ملال سے مکدر ہے۔ جس کے بال بکھرے ہوئے ہیں۔ جس کے گیسو پریشان ہیں جوگیا لباس میں کھڑی ہوئی مدفن پر گنگا جل چھڑک رہی ہے۔ بظاہر یہ جوگن ہے مگر حقیقت میں یہ سیتا ہے۔ اس کا دل ٹوٹ کر چکنا چور ہو چکا ہے نہیں نہیں اُس کا دل جل کر خاکستر کا ڈھیر ہے وہ بیکسی چتا کی جلکر بجھی ہوئی راکھ ہے۔ اُس نے اپنے دل کی آگ کو زندگی کے خون سے بجھایا ہے۔ اب غم یا مسرت کی طرف سے وہ بیخبر ہے مدہوش ہے۔ وہ زندہ ہے مگر مردوں سے بدتر وہ ہر روز شام کے وقت اس بارہ دری میں آتی ہے۔ مدفن پر گنگا جل چھڑکتی ہے۔ چراغ جلاتی ہے۔ اور بھجن گاتی ہے*

ایڈیٹر

خون کے پیاسے

(گذشتہ سے پیوستہ)

بیساکھا سنگھ نے پانسو روپیہ کا رہنامہ با قبضہ سود دمنافع برابر بیس بیگہ اراضی کی بابت جو بیٹ میں واقع تھی لکھدیا اور گوبند رام کے حوالہ کیا تین سو روپیہ ملا جمال کے نام شرح سود ڈیڑھ روپیہ لکھا گیا - اور دوسو روپیہ اپنے حصہ کا مہر عبداللہ نے اُسی وقت ادا کردیا -

لالہ گوبند رام کے وعدۂ امداد کا یہ نتیجہ نکلا - کہ اس نے بہت احسان رکھ کے یہ بیان کیا کہ اُس نے پچیس روپے انعام صاحب سیشن جج کے اردلیوں کو بریت کے روز دیا ہے - وہ سردار سے نہیں لونگا - مہر عبداللہ نے کہا پچیس روپے دینے کی کیا ضرورت تھی - پانچ روپے کافی تھے - لالہ گوبند رام نے کہا - یہ سیشن جج کمبخت کوئی اپیل منظور نہیں کرتا - اسلئے اردلی بھوکے مرتے تھے - فاسٹ صاحب جانے کے بعد یہ اول بریت ہوئی تھی - اس لئے انہوں نے کہا - ہم پچیس روپے سے کم نہ لینگے - سردار نے کہا یہ رقم میں اپنے پاس سے دونگا - لالہ صاحب سے دلانا نہیں چاہتا - چنانچہ یہ رقم سردار نے اسیوقت ادا کردی -

باب ۱۴

ناظرین کو یاد ہوگا - کہ کماں کی سسرال نے جب نکاح کا تقاضا کیا - تو ملا جمال نے بڑی مشکل سے اُن سے ایک سال کی مہلت لی تھی - یہ مہلت اتفاقاً اسیوقت ختم ہونے والی تھی جب مولا چینگڑ کا مقدمہ زیر تفتیش تھا - ڈپٹی کریم بخش کو حقیقت حال معلوم ہوئی - تو خاموشی سے انہوں نے چھ ماہ کی مہلت اور منظور کرلی - جب یہ مدت بھی گزر نیوالی تھی - تو ملا جمال نے اس بنا پر ایک اور مہلت طلب کی کہ اس مقدمہ میں اٹھارہ سو روپیہ خرچ ہوگئے اور اس لئے وہ اسوقت شادی کے اخراجات کی برداشت نہیں کرسکتے لیکن لڑکی بالغ ہوچکی تھی ڈپٹی کریم بخش کی بیوی نے ایکدن کی بھی اور مہلت نہ دی اور یہ دھمکی دی کہ اگر ملا جمال شادی نہیں کرینگے تو وہ اپنی لڑکی کا ناطہ کسی دوسری جگہ کردیگی - یہ عورت ایسی ہٹیلی تھی - کہ وہ ایسا کربھی گزرتی - ملا جمال مجبور ہوگئے - اور دو ماہ کی مہلت بمشکل حاصل کی

ارائیوں کی قوم میں شرعی مہر کا رواج تھا یعنی ۳۲ کا لیکن ڈپٹی صاحب ڈیرہ دون میں رہ آئے تھے اور ہندوستان کی مہر دیکھ آئے تھے جہاں غریب سے غریب شریف بھی سوالاکھ روپیہ کا مہر باندھتا ہے - اس لئے مہر کی بابت کچھ دنوں گفتگو ہونے کے بعد یہ طے ہوا - کہ بیس ہزار کا مہر ہوگا - یہ بھی قرار پایا - کہ اس میں نصف معجل اور نصف موجل ہوگا - اور معجل میں سے دو ہزار روپیہ

کی ہدایت کے زیورات ساچق میں چڑھائے جائینگے۔ یہ بھی قرار پایا کہ کم سے کم پانسو آدمی برات میں آئیں اور ان میں سے دو سو گھوڑے کے سوار ہوں بیٹی کی ماں نے کہا کہ اگر اس سے کم برات ہوگی تو واپس کر دونگی۔ ملا صاحب نے لالہ گوبند رام سے پوچھا کہ تم چار ہزار روپیہ کا انتظام کر سکتے ہو یا نہیں اُس نے کچھ دنوں پہلے ملا جمال گوبند رام سے کہہ چکے تھے کہ کسی روز فرصت کے وقت لکھ لکھی رہنوں کی پیداوار اور سود کا حساب کر لو۔ لیکن گوبند رام برابر ٹال رہا تھا۔ گوبند رام نے یہ سوچکر کہ اسوقت دباؤ کا اچھا موقعہ ہے۔ جواب دیا۔ کہ میرے پاس اس قدر روپیہ کی گنجایش نہیں۔ یا تو آپ کسی اور ساہوکار سے بندوبست کریں۔ ورنہ میں اپنی معرفت کرا دونگا لیکن یہ یاد رکھو۔ کہ آجکل بازار میں سود کی شرح بہت تیز ہے ۸ر فیصدی سے کم روپیہ نہیں ملیگا ملا جمال سمجھے کہ ممکن ہے کہ اور زیادہ قرض دینے کی گنجائش گوبند رام میں فی الحقیقت نہ ہو۔ اسکا جواب سنکر خاموش رہے۔ چند روز کے بعد وہ اور بیلی رام لاہور سے آتے ہوئے شام کے وقت زیب النساء بیگم کے باغ کے دروازہ کے قریب اتفاقاً یکجا ہوگئے۔ لالہ بیلی رام کچھ دنوں سے آنریری مجسٹریٹ ہوگئے تھے۔ اور انہوں نے ایک ٹم ٹم خریدی تھی اب وہ پیدل چلنا اپنی کسر شان سمجھتے تھے۔ بیلی رام نے ملا جمال کو پیدل جاتے ہوئے دیکھا اور ٹم ٹم ٹھہرا کر ان کو اپنے برابر بٹھا لیا۔ ملا جمال نے بیلی رام سے ذکر کر دیا۔ کہ کمال کی شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے۔ اور مجھے چار ہزار روپیہ قرضہ کی ضرورت آپڑیگی۔ بیلی رام نے کہا کہ یہ قرضہ میں آپ کو ۸ر فیصدی پر دے سکتا ہوں۔ بلکہ یہ بھی کہا۔ کہ اگر گوبند رام حساب سمجھانے میں تساہل کرے۔ تو آپ نوٹس دیدیں۔ میں کل روپیہ کا انتظام ۸ر فیصدی پر کر دونگا۔ ملا جمال کو گوبند رام کی طرف سے بدگمانی پیدا ہوگئی تھی۔ کہ اُس کا حساب کرنے میں لیت و لعل کرنا علت سے خالی نہیں۔ ملا صاحب نے بیلی رام کی شرط کو فوراً منظور کر لیا۔ اور اُس سے پختہ وعدہ لیکر اس کا اطمینان کر دیا کہ میں گھر جاتے ہی گوبند رام کو نوٹس دیدیتا ہوں۔ کہ وہ حساب سمجھا دے ورنہ ایک ہفتہ کے بعد آپ میرے ساتھ چلیں۔ آپ کے سامنے دس روپیہ کے کاغذ پر حساب فہمی کا دعوی دائر کر دونگا۔ دوسرے دن علی الصباح ملا جمال میاں نور الدین کے دفتر میں گئے۔ اور گوبند رام کے پاس رجسٹری شدہ نوٹس روانہ کرا دیا گوبند رام نوٹس پڑھتے ہی بہت گھبرایا اور دوڑا مہر عبداللہ کے پاس آیا۔ اور اُس سے تمام حال بیان کیا۔ کہ میں نے تو مصلحتاً اخراجات شادی اٹھانے سے انکار کر دیا تھا اور ملا صاحب کو اجازت دیدی تھی کہ وہ کسی اور ساہوکار سے انتظام کر لیں۔ اب معلوم ہوا کہ بیلی رام نے میری ضد پر اس کو ۸ر فیصدی پر چار ہزار روپیہ قرضہ دینا

کرلیا ہے اور یہ بھی وعدہ کرلیا ہے کہ اگر گوبند رام پر حساب فہمی کا دعویٰ دائر ہو جائے۔ تو جس قدر روپیہ گوبند رام کا دادنی نکلیگا۔ وہ بھی بیلی رام ۹ فیصدی پر قرض دیگا۔ مہر عبداللہ نے کہا۔ تم نے نہایت سخت غلطی کی تم تو ملا جمال کے معاملہ میں مجھ سے مشورہ کئے بغیر کوئی کام نہ کرتے تھے۔ اس دفعہ تمکو کیا ہو گیا تھا۔ جو ایسی سخت غلطی کر بیٹھے۔ گوبند رام نے کہا۔ ہونا تھا سو ہو گیا۔ اگر کچھ تدارک کر سکتے ہو تو کرو مہر عبداللہ نے کہا اچھا میں ملا جمال سے گفتگو کرکے تمکو نتیجہ سے اطلاع دونگا۔ ذیلدار نے ملا سے دریافت کیا۔ وہ سیدھا سادہ آدمی تھا۔ اُس نے تمام حقیقت حال ظاہر کردی۔ اور جو گفتگو اس کی گوبند رام سے اور بعد ازاں بیلی رام سے ہوئی تھی حرف بحرف سنا دی۔ اسوقت ملا جمال نے گوبند رام کی شکایت کی کہ میں اُسکو چھ ماہ سے حساب سمجھانے کے لئے کہہ رہا تھا لیکن وہ بالکل کچھ جواب نہ دیتا تھا اب مجھے شبہ پڑ گیا ہے کہ اس کی نیت میں خلل ہے اور اس لئے میں نے نوٹس دیدیا ہے۔ اور اب میں حساب سمجھے بغیر نہ رہونگا۔ مہر عبداللہ نے اسوقت اپنے عقب گزاری کا بھی بہت اچھا موقعہ دیکھا اور کہا کہ ملا صاحب مجھے بھی گوبند رام کی طرف سے کچھ شک ہو گیا ہے۔ کیونکہ تین سال سے اُس نے چاہات کا انتظام براہِ راست اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اور پہلے سال کا حساب بھی مجھ سے ایک بہانہ سے لے گیا۔ کہ ملا جمال کو حساب طیار کرکے عنقریب دینے والا ہے۔

ملا جمال نے جب یہ سنا تو وہ اور بھی گھبرا گئے اور مہر عبداللہ نے اپنی شرمندگی دور کرنے کا یہ چارہ نکالا کہ وہ نہایت شد و مد کے ساتھ ملا صاحب کا ہمزبان ہو گیا کہ حساب فہمی کا دعویٰ فوراً کر دینا چاہیئے۔

جب گوبند رام مہر عبداللہ سے ملا تو مہر عبداللہ نے اُس سے کہا کہ تمنے سب کام بگاڑ دیا۔ اور اب اس کے بس کا کام نہیں رہا۔ حساب سمجھانا پڑے گا۔ اس موقعہ پر ذیلدار نے باتوں باتوں میں یہ بھی کہدیا کہ میری پاس حساب کی دوسری نقل ہے۔

بیلی رام رات کو ملا جمال کے پاس آیا۔ اور کہا کہ میں نے چار ہزار روپے کی رقم کا انتظام کرلیا ہے رقم تیار ہے اور یہ بھی کہا کہ وہ اس سے زیادہ بھی رعایت کرنے کو آمادہ ہے۔ سات آنے فیصدی پر یہ رقم دے سکتا ہے۔ بلکہ زیورات اور پارچات کی تیاری میں بھی مدد دیگا۔ ورنہ لاہور کے سنار اور بزاز ملا صاحب کو لوٹ لینگے۔ ملا جمال نے بیلی رام کا شکریہ ادا کیا۔ اور ایک فہرست پارچات اور زیورات کی فوراً بیلی رام کو دیدی جن کی قیمت کا اندازہ تین ہزار دو سو روپیہ ہوتے تھے۔ دوسرے دن ملا جمال نے چار ہزار روپیہ کا تمسک بیلی رام کے حق میں لکھدیا۔ آٹھ سو روپیہ تو بیلی رام نے نقد ملا صاحب کو دیدیا اور تین ہزار دو سو روپیہ کا رقعہ بیلی رام نے ملا صاحب کو دیدیا یہ کہہ کر کہ جب میں پارچات اور زیورات اور اجناس جہیز وغیرہ آپکے حوالہ کر دونگا۔ یہ رقعہ واپس لے لونگا

جب یہ تمام اشیا اور اجناس بیلی رام نے لاکر ملا صاحب کے حوالہ کیں - اور انہوں نے اپنی بیوی کے سپرد کیں - تو ملا صاحب نے دبی آواز سے کہا کہ اگر تو کسی غریب زمیندار کے گھر یہ رشتہ کرتی تو چار ہزار روپیہ کے بجائے چار سو میں کل رسوم ادا ہو سکتی تھیں - اور ہم آیندہ آرام سے رہ سکتے تھے۔ یہ سنکر ملا صاحب کی بیوی نے آنکھیں دکھا کر ملا صاحب کو وہ تنار بتائی کہ ملا صاحب چپ ہو گئے اور پھر کبھی آیندہ اس قسم کا ذکر زبان پر نہ لائے

اب شادی ہونے میں فقط ایک مہینہ باقی رہ گیا تھا کہ ملا صاحب کو دفعتہً بخار ہو گیا - اور چوراسی سال کی عمر میں چوبیس گھنٹہ کے اندر اندر وہ اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے - انا للہ وانا الیہ راجعون -

کمال کی عمر اسوقت کچھ دن کم اٹھارہ سال کی تھی یکایک تمام بوجھ اُس کے سر پر آ پڑا - مہر عبداللہ نے بندوق کے مقدمہ کے بعد کمال اور اُس کی ماں کے دل میں ایک خاص جگہ پیدا کر لی تھی - اب ان دونوں کا مشیر اور سرپرست وہی رہ گیا تھا - لیکن ملا جمال کے مرتے ہی اس نے اپنے دل میں عہد کر لیا تھا کہ میں کمال اور اس کی والدہ کے ساتھ بہت نیک نیتی سے سلوک کرونگا - جیسا کہ ملا صاحب نے میری نابالغی کے زمانہ میں محبت اور ایمانداری سے کام کیا تھا - میں بھی اس کا عوض اتار دونگا - انصاف تو یہ ہے - کہ وہ اپنے اس عہد پر قائم رہا اور کہنا پڑتا ہے - کہ اُس نے ایسا ہی کیا - چنانچہ اس نے ملا جمال کے چہلم پر سو روپیہ سے زیادہ خرچ نہ ہونے دیا - اور برات کا انتظام بڑی خوش اسلوبی سے کرکے کمال کو بیاہ لایا - یہ اُسی کے دم کی برکت تھی - اور اُسی کی خوش انتظامی کا نتیجہ تھا - کہ وہ چار ہزار روپیہ میں سے دو سو روپے بچا لایا - اگر ملا جمال زندہ ہوتے - تو کم سے کم ایکہزار روپیہ اور زیادہ خرچ ہو جاتا۔ شادی کے بعد سب سے مقدم کام جو مہر عبداللہ کو کرنا تھا وہ یہ تھا - کہ گوبند رام سے حساب سمجھ کر معلوم کرے - کہ گوبند رام کا کس قدر قرضہ کمال کے ذمہ باقی ہے - چونکہ مہر عبداللہ اور گوبند رام اس معاملہ میں ایک دوسرے کے رازدار تھے - اس لئے دونوں نے یہی مناسب سمجھا - کہ یہ معاملہ عدالت تک نہ پہنچے دونوں نے نفع نقصان کا زیادہ خیال نہ کرکے میاں نورالدین کے مشورہ سے اس طرح فیصلہ کر لیا - اور دو چاہات سلیمان والا اور رحمان والے کو بیچکر بارہ ہزار روپیہ یکمشت گوبند رام کو ادا کیا گیا - اور گوبند رام نے ایک فارغخطی کمال کے حق میں لکھدی میاں نورالدین نے زیادہ تر اس خیال سے کبھی عدالت میں جانے کا مشورہ ذیلدار کو نہیں دیا تھا کہ ان دنوں میں لاہور کے سب جج لالہ دونی چند ایم - اے تھے - جو ذات کے انند کھتری اور بھیرہ کی تحصیل میں ایک گاؤں کے پٹواری کے بیٹے تھے -

رحم

(شکسپیر کی شہرۂ آفاق نظم کا ترجمہ)

جنبش پذیر زور سے ہوتا نہیں ہے رحم ہوتا ہے خود بہ صورتِ ابرِ کرم چکاں
روئے زمیں پہ از طرفِ اوجِ آسماں!

یہ رحم ہے دوگونہ سعادت سے سرفراز اک وہ سعید جس کی طرف سے ہوا عیاں
اور دوسرا وہ جس کو کیا اُس نے شادماں!

طاقتوروں میں طاقتِ اعلیٰ یہی تو ہے شاہوں کے واسطے ہے یہ از تاجِ زرفشاں
ہے اس سے زیب زینتِ شاہانِ ذی نشاں!

مظہر ہے اقتدارِ مجازی کا وہ عصا دستِ شہی میں جس کو میسر ہے عز و شاں
بے شبہ ہے وہ سطوت و جبروت کا نشاں!

لیکن عصائے رحم کا ہے مرتبہ بلند نسبت عصا کو ہاتھ سے ہوتی ہے بیگماں
اور رحم تختِ دل سے ہے شاہوں کے حکمراں!

ہے رحم وصفِ خاص خداوند پاک کا جب اُس کا جلوہ ساتھ ہوا عدل کے عیاں
پیدا وہیں بشر میں ہوئی شانِ قدسیاں!

تلوک چند محروم بی اے

خوابِ ہستی

دنیا کی گوناگوں دلچسپیاں اسباب راحت کی دلفریبیاں بالعموم انسان کو اپنے وجود کی ماہیت کی طرف مائل نہیں ہونے دیتیں دنیا میں بہت زیادہ لوگ ایسے پائے جاتے ہیں کہ جس وقت سے انکے قلب و دماغ میں احساس و ادراک کا نشو و نما ہونے لگتا ہے اسی وقت سے وہ اپنی حیاتِ چند روزہ کے اسباب راحت میں ایسا سرگرداں و منہمک ہو جاتے ہیں اور اس وسیع اور اہم مسئلہ کی طرف سے کہ (آیا ہماری ہستی مرنے کے بعد ہمارا وجود باقی رہیگا یا نہیں) ایسی لاپرواہی برتنے لگتے ہیں کہ گویا ان کی خلقت خلاقِ عالم نے دنیا میں اسی جسم کے ساتھ زندہ رہنے کی غرض سے ہوئی ہے اور بالآخران کا یہ حشر ہوتا ہے کہ قدرت کا زبردست ہاتھ غفلت اور نیم بیہوشی کی حالت میں جبراً و قہراً فنا کے عمیق سمندر میں دھکیل دیتا ہے ہاں اس دلفریب

اور مدہوش کرنیوالی دنیا میں دو گروہ ایسے بھی پائے جاتے ہیں۔ جنکے نزدیک اس مسئلہ کی تحقیق لازمی و ضروری ہے۔ اور وہ اُن کی زندگی کا ایک جزو بنی ہوئی ہے۔ ہم ناظرین رسالہ کو پہلے ایک گروہ کا قیاسی معیار تحقیق اور اس کا حشر دکھاتے ہیں۔ اُس کے بعد دوسرے گروہ کا عملی معیار دکھائینگے۔

اوّل الذکر گروہ نے جو زیادہ ذہین اور طباع تھا اور جو ہر قسم کے علوم دنیاوی سے بھی بہرہ ور تھا اپنے متبحر علمی کے زعم میں یہ فیصلہ کیا۔ کہ اس مسئلہ کو عقل کی معیار پر کسنا چاہئے چنانچہ اُس نے فلسفہ و سائنس کی عینک لگا کر اس مسئلہ کے جوہر کو عقل کی کسوٹی پر کسنا شروع کیا۔ برسوں کی محنت اور مشقت کے بعد ایک خاص دائرہ کے اندر اس نتیجہ پر پہنچا۔ کہ اس ہستی کا مجموعہ چند اجزار حادثہ کے اجتماع سے وجود پذیر ہوا ہے۔ اور کچھ دن کے بعد اسکے اجزا بوجہ فطری انحطاط پذیر ہو کے خود بخود علیحدہ ہو جائینگے۔ اور اس مکمل وجود کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائیگا۔ اس تحقیق کا نتیجہ ایسا دلشکن اور مایوس کن تھا۔ کہ جس سے ان لوگوں کے ہوش و حواس معطل ہونے لگے۔ ایک ایسی ذات کے لئے جسے یہ دعویٰ ہو۔ کہ میں نے تمام طول و عرض دنیا کو ناپ ڈالا بڑے بڑے سمندروں پر اپنی قوت سے فتح پائی۔ تمام اجرام فلکی کی ماہیت کو سمجھ لیا ہے۔ میرے ایک اشارے سے لاکھوں اشیاء عالم چشم زدن میں نیست و نابود ہو سکتی ہیں میرے سامنے اتنے بڑے اور مرتفع پہاڑ پانی کے بلبلوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ خلاصہ یہ کہ تمام وسیع اور لامحدود کائنات عالم میرے قبضہ و اقتدار میں ہے۔ اور اُسے یہ یقین ہو جائے کہ میرا وجود ایک حباب سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اور کچھ دن کے بعد یہ موقر اور فلک پایہ ہستی نیست و نابود ہو جائیگی اور عدم محض کے تاریک اور خوفناک غار میں ہمیشہ کیواسطے گر جائیگی۔ جس قدر زیادہ تکلیف دہ نہ ہو کم ہے اور چونکہ انسان بالطبع عدم محض کے خیال سے بہت گھبراتا ہے۔ اُس لئے اس خیال سے زیادہ دنیا کی کوئی شے قلب انسان کیواسطے تکلیف دہ نہیں ہو سکتی۔

ان نتائج کا یقین کے حدتک پہنچنا تھا۔ کہ وہ لوگ اپنی ہستی سے بیزار ہونے لگے۔ اور دنیا کی تمام سامان نشاط اس خاص تخیل کیوجہ سے جو اسوقت پیدا ہو رہا تھا۔ انکی نظروں میں اذیت رساں نظر آنے لگے۔ انمیں کے بعض افراد ایسے تھے۔ جنہوں نے بحالت مجبوری اس دنیا کو بہشت و دوزخ کا مجموعہ سمجھ لیا۔ اور اپنی مسرت کا دارومدار چند نا شدنی چیزوں کا حصول قرار دے لیا۔ اور بالآخر تھوڑے دن اس چندروزہ جنت یا دوزخ میں رہنے کے بعد افتاں و خیزاں فنا کی منزل پر پہنچ گئے مگر ان میں کے بعض افراد ایسے بھی خوش نصیب تھے۔ جنپر انتہائی مایوسی کیوجہ سے غشی کا سا عالم طاری ہو گیا۔ اُسی عالم میں ان لوگوں نے دیکھا کہ تمام کرہ ارض اور فضاء عالم ایک بقعہ نور

بنا ہوا ہے جس شخص کے چہرے کیطرف نگاہ جاتی ہے تو وہاں بھی ایک مسرت واطمینان کی برقی لہر ساتھ لاتی ہے۔ اور وہاں کے سب لوگ باوجود قرآن کی اس آیت کریمہ (مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ) کی تعمیل کرتے ہوئے بھی اطمینان وشادمانی کے آب مسرت سے سیراب ہو رہے ہیں یہ عالم دیکھکر وہ سخت متعجب ہوئے اور یہ خیال کرنے لگے کہ کیا دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں جنکو اپنی نا پائداری زندگی کا علم نہیں اسی تخیل میں آگے بڑھے ہی تھے کہ سامنے کچھ عبا پوش بزرگ دکھائی دیئے جن کا نورانی چہرہ اُن کی پاکیزگی نفس کا آئینہ بنا ہوا تھا بوجہ اجنبی ہونے کے اتنی جرأت نہ ہوئی کہ ان حضرات سے یہاں کا کچھ حال دریافت کر سکیں۔ دوسری طرف نظر گئی تو دیکھا کہ کچھ لوگ صورت شناس سے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جلد جلد قدم بڑھاتے ہوئے اُن کے قریب گئے۔ وہاں جاکر معلوم ہوا کہ نواب حاجی محمد اسحاق خانصاحب سکریٹری علیگڈھ کالج اور لسان العصر خان بہادر سید اکبر حسین اکبر پنشنر جج اور سید غلام مجتبیٰ صاحب وکیل ہائیکورٹ الہ آباد اور مولوی عزیز مرزا صاحب بی اے اور کچھ ایسے حضرات جنکو وہ پہچانتے نہ تھے۔ ایک عالیشان عمارت کے برآمدہ میں جو ہر قسم کے سامان راحت سے آراستہ تھے جلوہ افروز ہیں۔ مولوی سید غلام مجتبیٰ صاحب نے ان لوگوں کو دیکھکر ان کی تعظیم کی اور اپنے قریب بلاکر بٹھایا اضطراب و مایوسی کی علامت دیکھکر خیر و عافیت دریافت کیا۔ سب لوگوں نے اپنے تمام واقعات من وعن بیان کئے۔ مولوی صاحب موصوف نے ارشاد فرمایا کہ آپ حضرات نے اس مسئلہ کی تحقیقات کرکے ناحق اپنے کو پریشان کیا مشیت ایزدی اس کی اجازت نہیں دیتی کہ انسان راز ہستی معلوم کرے ہاں اُس کے کچھ شعبے اسوقت معلوم ہو سکتے ہیں جب روحانیت کی دنیا میں ایک عرصہ تک زندگی بسر کیجائے۔ عقل کی کسوٹی اس راز کی تحقیق کیلئے ایک بیکار شے ہے اسوقت چونکہ آپ حضرات پریشان معلوم ہوتے ہیں اسلئے میری التجا ہے کہ یہیں قیام فرمائیے آج شام تک آپ کے دماغ سے اضطراب و بیچینی کا اثر کم ہو جائیگا۔ توکل انشاءاللہ اس مسئلہ میں بات چیت ہوگی اور بہت ممکن ہے کہ میں بھی آپکے قلبی تکلیف دفع کرنیکا ذریعہ ہو سکونگا۔ دوسرے روز حسب وعدہ مولانا خود ان لوگوں کے پاس تشریف لائے۔ مسٹر کے۔ اے واجد نے جو ان میں سب سے زیادہ ذہین اور سائنس کے پروفیسر تھے۔ مولوی سید غلام مجتبیٰ صاحب سے کہنے لگے۔

کے۔ اے۔ واجد مولانا معاف فرمائیگا۔ آپ کی کل کی مختصر گفتگو سے میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ باوجود ایک اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے آپ اب تک اُسی فرسودہ خیالی کی پیروی کرتے جاتے ہیں۔ کیا کسی مسئلہ کی تحقیق میں عقل کی کسوٹی سے زیادہ اور کوئی دوسرا معیار صحیح و درست ہو سکتا ہے؟

مولوی سید غلام مجتبیٰ صاحب کم از کم اس بات سے تو آپ بھی مجھ سے اختلاف نہ فرمائیں گے

کہ فلسفہ و سائنس کی ہر تحقیق کامل نہیں ہوا کرتی۔ اکثر تھوڑی کچھ زمانے کے بعد غلط یا قابل ترمیم ثابت ہوا کرتی ہے۔

واجد (کلام قطع کرکے) بیشک آپ کا فرمانا بجا ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان کی عقل ہر مسئلہ کے سمجھنے سے عاجز تھی۔

مولوی سید مجتبیٰ صاحب۔ میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عقل ایک بیکار شے ہے بلکہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ فلسفہ و سائنس کی تحقیق اکثر غلط ثابت ہوا کرتی ہے۔ جسکے یہ معنی ہیں کہ عقل کی کسوٹی دنیا کے ہر جوہر کو صحیح طور پر نہیں کس سکتی۔ راز ہستی ایک ایسا اہم اور دقیق مسئلہ ہے کہ جس کی بابت خلاق عالم نے اپنے برگزیدہ بندے حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ اپنی مخلوق سے صرف یہ کہلایا کہ یہ ایک امر رب ہے جسکے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ ہم لوگوں کی عقل کو ہم نے ایسا محدود خلق کیا ہے جس کی وجہ سے اس راز کی کماحقہ واقفیت تم حاصل نہیں کر سکتے۔ اس کے بعد اب میں عقلی دلائل اس راز کے ناقابل حل ہونے کے بارے میں آپکے سامنے پیش کرتا ہوں۔ آپ کے سامنے اگر کسی شخص نے کبھی عمل مسمریزم کیا ہوگا۔ تو آپنے خود دیکھا ہوگا۔ کہ معمول کی زبان سے جو بیہوش رہتا ہے ہزارہا میل کے واقعات جو اس وقت ہوتے رہتے ہیں معلوم ہو جاتے ہیں اور جس کی صحت کی تصدیق بعد میں ہو جاتی ہے اور ایسے واقعات بھی معمول بیان کرتا ہے جس کو اس نے کبھی نہ دیکھا نہ سنا۔ کیا آپ کے عقل نے کبھی اس مسئلہ کی تحقیق کی کہ بغیر کسی شے کے سلسلہ کے ایک بیہوش پڑا ہوا شخص ہزارہا میل دور کے واقعات چند منٹ میں کیسے معلوم کر لیتا ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر کسی پیپر پر کوئی نام کندہ کیا جائے اور اُسکے بعد دوسرا تیسرا نام کندہ کیا جائے تو اس صورت میں پہلا نام یقیناً خراب ہو جائے گا۔ یا ایک فوٹو کے پلیٹ پر ایک شے کی تصویر بجا رہے اس کے بعد اسپر دو تین تصویروں کا اور عکس لیا جاوے تو پہلی تصویر حتماً مٹ جائیگی۔ مگر اس مسئلہ کلیہ کے خلاف آپ کے دماغ میں ہزارہا نام کندہ ہیں لاکھوں تصویروں کا نام عکس موجود ہے اور یہ غیر ممکن ہے کہ کوئی تصویر یا نام خراب ہو جائے یا مٹ جائے۔ جس وقت آپ کو کسی نام کے یاد کرنے کی یا کسی شے کی شناخت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو اس وقت قدرت کی ایک پراسرار قوت فوراً نہایت خوبی کے ساتھ آپکے سامنے اس کی تصویر حاضر کر دیا کرتی ہے۔ گو بعض وقت زیادہ عرصہ ہونے کی وجہ سے یا کسی دماغی نقص کے واقع ہونے سے بعض عکس اُس کے دفتر سے خارج ہو جاتے ہیں۔ مگر پھر بھی ہزارہا تکلیں عکس شدہ اس قوت کے دفتر میں ہر وقت موجود رہا کرتی ہیں۔ کم از کم اس ہستی کے ادنیٰ شعبہ کے راز کو آپ کیمسٹری کرکے اپنی عقل کی امداد سے تحقیق کرکے بتلا دیجئے کہ اس ہڈی اور خون اور گود ے کے مجموعہ میں کونسی ایسی چیز ہے

جو ایسی ترتیب سے کام کیا کرتی ہیں۔ اور انسان کے مرنے کے بعد دماغ میں جب کہ وہی ہڈی اور گودا بجنسہٖ باقی رہتا ہے تو پھر کیوں دماغ سے اس طرح کام نہیں چلتا۔ جیسا کہ انسان کی زندگی میں چلتا تھا۔ مگر یہ خیال رہے کہ وہ تحقیق قیاسی اور خیالی نہ ہو بلکہ واقعی ہو۔

کے۔ ان۔ واجد۔ بیشک مردہ جسم کا دماغ بھی بعینہٖ ایسی حالت میں ہوتا ہے جیسا کہ زندہ جسم کا بجز اس کے کہ اس میں خون نہیں ہوتا۔

مولوی سید غلام مجتبیٰ صاحب۔ تو جناب مہربانی فرما کر زندہ انسان کے دماغ کے خون کی کیمسٹری کر کے بتلایئے کہ یہ عجیب و غریب قوت اسکے کس جزو میں پائی جاتی ہے۔

حضرت سائنس و فلسفہ کا میں مخالف نہیں ہوں۔ یہ ایسے جوہر ہیں۔ جنسے اسرار الٰہی کا انکشاف ہوا کرتا ہے مگر اس بات کا یقین کر لیجیے کہ اسی حد تک وہ انکشاف کر سکینگے جس حد تک رسائی کی قوت اُن میں قادر مطلق نے خلق فرمائی ہے۔ اس مسائل کے علاوہ کیا کبھی آپنے اس مسئلہ پر بھی غور فرمایا ہے کہ باوجود مڈیکل سائنس کی اس قدر ترقی کے اب بھی صدہا نئے عارضے انسان کے جسم میں دیکھے جاتے ہیں۔ جن کی حقیقت کے سمجھنے سے ڈاکٹر عاجز رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ جس دوا سے ایک مریض اچھا ہوتا ہے بعض وقت اُسی دوا سے اسی قسم کا مریض باوجود ڈاکٹر کی سخت محنت اور خاص توجہ کے اچھا نہیں ہوتا کیا اس سے یہ بات ثابت نہیں کہ محض ایک معمولی شعبہ ہستی میں اب تک مڈیکل سائنس کی تحقیق نامکمل ہے اور یہ صدہا قسم کے ڈاکٹری آلات اور لاکھوں قسم کی دوائیں جو ہر مڈیکل کالج میں دیکھی جاتی ہیں۔ انسان کے جملہ امراض کی شفا کیلئے کافی نہیں ہیں۔ ان دلائل کے علاوہ میں آپ کی توجہ اُس جدید تصنیف کیطرف مبذول کراتا ہوں جو بیسویں صدی کے شروع میں ایک فرانسیسی فلاسفر نے مسئلہ وجود روح کے متعلق لکھی ہے اور جس میں اُس نے تمام ان دلائل کی تردید کیا ہے۔ جو اس کے قبل تک تمامی فلاسفروں نے وجود روح کے خلاف لکھا تھا اس کتاب کے مصنف کے دلائل ایسے زبردست ہیں۔ جن کی تردید اب تک دنیا کے کسی فلاسفر نے نہیں کی بلکہ اس زبردست فلسفی نے بھی وجود روح کو تسلیم کرتے ہوئے اُس کی ماہیت کے سمجھنے سے اپنی مجبوری ظاہر کی ہے۔

کے۔ اے۔ واجد۔ ان دلائل پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی مسئلہ راز ہستی ناقابل حل ہے۔ جبکہ ادنٰے ادنٰے شعبہ میں بھی اب تک انسان کی تحقیق کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ تو اس راز کا علم ہونا محال ہے۔ آپنے جس نئی تصنیف کا حوالہ اس تقریر میں دیا ہے اسکو ایک روز مولوی سید کرامت حسین صاحب جج ہائیکورٹ الہ آباد نے مجھے دکھایا تھا۔

مولوی سید غلام مجتبیٰ صاحب۔ اگر آپ حضرات کو اسی مسئلہ کی تحقیق کا شوق ہے تو اس کا ہمیشہ خیال رکھیے گا کہ راز ہستی کے طلسم کی مکمل تحقیقات نہ کیجیے گا۔ اس راز کا علم سوائے قادر مطلق کے خاص برگزیدہ بندوں کے اور کسی کو ہونا محال ہے۔ ایک ذریعہ ایسا ضرور ہے کہ جس سے ممکن ہو آپ اپنی ہستی کے بعض شعبے معلوم کر سکیں یا کم از کم اتنا علم تو آپ کو ضرور ہو جائے کہ جس جوہر کو آپ مٹ جانے والا سمجھتے ہیں وہ نہ کبھی مٹ سکتا ہے اور نہ فنا ہو سکتا ہے اور وہ ذریعہ یہ ہے کہ آپ اپنے نفس کو پاکیزہ کیجیے اور اس سے اپنے قلب کی ایسی جلا کیجیے جس کی وجہ سے وہ اس منبع فیض سے جو ہر جگہ موجود ہیں۔ استفادہ حاصل کر سکے۔ اور رفتہ رفتہ اس میں اتنی صلاحیت پیدا ہو کہ اس میں اس وسیع اور لامحدود چشمۂ نور کی تجلیات پڑنے لگیں جس کا پتہ دنیا کے ہر ایک ذرے سے چشم بصیرت رکھنے والوں کو مل سکتا ہے۔ اور انہیں تجلیات کی روشنی میں اپنے وجود کی جو بجائے خود ایک عالم ہے مرحلہ پیمائی کیجیے۔

کے لیے۔ واجد مولانا آپکی اس مدلل تقریر نے اسوقت "مسیحائی" کا کام کیا ہے مگر یہ وہی گذارش غالباً بے موقع نہ ہوگی کہ ہر شے شاہراہ پر چلنے کیواسطے ایک رہبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا آپ مہربانی فرما کر ہم لوگوں کی پیشوائی کرنا منظور فرمائینگے۔

مولوی سید غلام مجتبیٰ صاحب۔ میں آپ کی اعانت دل و جان سے کرتا۔ مگر میں ایک ایسے عالم میں ہوں جو اس طرح کی امداد کا مانع ہوتا ہے۔ اس قدر مشورہ البتہ دے سکتا ہوں کہ ہر مذہب و ملت میں ایسے قدسی صفات نفس آپ کو تلاش کرنے پر مل جائینگے جن کو آپ اپنا رہبر بنا سکتے ہیں۔ ان کے پہچاننے میں آپ کو دقت ضرور ہوگی کیونکہ نہ تو ان کا کوئی خاص لباس ہے اور نہ وہ کسی مخصوص قوم میں پائے جاتے ہیں۔ ان کا ذریعہ شناخت محض ان کی عملی زندگی ہے جو ایک عرصہ تک ان کی خدمت میں رہنے سے معلوم ہو جاتی ہے۔

اس گفتگو کے دوران میں چونکہ ان لوگوں کا قلب سکون اور اطمینان کی طرف خود سبقت کر رہا تھا جس کی وجہ سے ہوش و حواس بھی اپنے مرکز کی طرف واپس ہو رہے تھے۔

یہیں تک گفتگو ہونے پائی تھی۔ کہ دماغ میں ایک احساسی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں سب لوگوں کو ہوش ہو گیا۔

کئی سال کے بعد اکثر افراد ان میں کسی اور رنگ میں رنگے ہوئے پائے گئے جنہیں مولوی سید غلام مجتبیٰ صاحب اور خان بہادر سید اکبر حسین صاحب تھے۔

محمد علیخاں عرف آغا علیخاں تعلقدار

ادب عالیہ

بیٹھا ہوں پاؤں توڑ کے تدبیر دیکھنا
منزل قدم سے لپٹی ہے تقدیر دیکھنا

آوازے مجھ پہ کستے ہیں پھر بند کان عشق
پڑ جائے پھر نہ پاؤں میں زنجیر دیکھنا

پہنا دیا ہے طوق غلامی تو ایک دن
میری طرف بھی مالک تقدیر دیکھنا

مجھ ناتواں کا صبر تو کیا آزماؤ گے
راس آسکے نہ تم کو جوہر شمشیر دیکھنا

ہوش اڑ نہ جائیں صنعت بہزاد دیکھ کر
آئینہ رکھ کے سامنے تصویر دیکھنا

مردوں سے شرط باندھ کے سوئی ہے اپنی موت
ہاں ہاں دیکھنا ذرا فلک پیر دیکھنا

پروانے کر چکے تھے سرانجام خودکشی
فانوس بن کے آگیا تقدیر دیکھنا

شاید خدا نخواستہ آنکھیں دغا کریں
اچھا نہیں نوشتۂ تقدیر دیکھنا

مرغوب و زشت آپ ہی اپنی مثال ہے
حد کمال کاتب تقدیر دیکھنا

جب تک نہ تھی تجلی شوق میں عالم سیاہ تھا
خواب نظر فریب کی تعبیر دیکھنا

اصلاح کی مجال نہیں ہے تو کیا ضرور
بے ربطیٔ نوشتۂ تقدیر دیکھنا

باد رہ چل چکی لشکر اٹھا و یاس
پھر آگے بڑھ کے خوبیٔ تقدیر دیکھنا

ابوالمعالی مرزا یاس لکھنوی

شمع شبستاں

نور کا رخسار پر قطرات اشک — شمع بھی کیا چیز ہے روتی بھی ہے ہنستی بھی ہے

ظلمات میں تاریک کوٹھریوں کے اندر جہاں ماہ ضیا پاش کی شعاعیں بھی محروم تھیں۔ ایک ایسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے جو اگر ماہ کامل کی طرح ہمیں روشنی دے نہ سکے تو کم از کم اپنی سوزش جاں گداز اور اپنے تبسم دلنواز سے کمرے کی بھیانک تاریکی دور کرنے کے بعد اُسے معمورۂ نور بنا دے۔ ایک شب تاریک میں جس وقت ہر سو ہر گوشہ میں سنسان خاموشی حکمران تھی اور کرۂ جہاں ظلمت کدہ بنا ہوا تھا۔ میری خوابگاہ میں آئینہ کی مقابل دیوار پر ایک سرو قامت شمع کافوری جل رہی تھی۔ میں محو تخیل تھا یہ شب میری شب فرقت تھی

کے باعث خاردار سمجھے ہوئے کروٹیں بدل رہا تھا۔ مگر میری پرنم نگاہیں اس شمع سوزاں کی طرف ٹکٹکی باندھے اس لیے تک رہی تھیں کہ اگرچہ اسمیں سوزش تھی۔ مگر اُس کی آب و تاب اُس کی ضیاپاشی اُس کا تبسم کسی رشکِ گل کے رونقِ حسن سے ملتا جلتا تھا۔ غرض اسمیں اور اسمیں یہ تھا کہ اسمیں سوز و گداز کا مادہ موجود تھا۔ اور اسکا سینہ شفاوت و صفائی کا دفینہ تھا۔ پھر بھی تناسبِ حسن تھا۔ میں اپنے تصورِ کمالات میں شمع روشن کو اپنا نصب العین بنائے ہوئے تھا۔ لیکن آہ جب اُس پیکرِ سوز اور مجسمۂ گداز کا ایثار اُس کی اندوہناک حالت اور اُس کے جاں گدازِ غم پر نظر پڑی تو میں اپنی داستانِ غم کو بھول گیا۔ اور میرے خیالات اُس کی طرف رجوع ہو گئے۔ دیکھتا کیا ہوں کہ وہ سبق آموزِ عشق طرپا عشق و محبت کی تصویر بنی اپنے سینہ میں کسی کی محبت کی لَو سے آگ بھڑکائے ساپنی ہستی کو جلا رہی ہے۔ اور بغیر آہ و فغاں کے اور بغیر شیون و نالہ کے اپنے نامعلوم محبوب کی یاد میں ہنس ہنس کر اپنی جان دے رہی ہے معلوم یہ ہو رہا ہے کہ اس نے فنا ہو کر وصال حاصل کرنے کا فلسفہ سمجھ لیا ہے۔ اور اسی لئے گھل گھل کر اپنی جسمانیت سے بری ہونے کے بعد دریائے حقیقت اور عشق وحدت میں ملنے والی ہے آہ کیا دردانگیز منظر ہے۔ فنا میں بقا کی تصویر کھینچی جا رہی ہے۔ پروانے گرداگرد اُس شمع نازک کی حقیقت کو سمجھ کر اُس کا طواف کر رہے ہیں اور اس کی مٹتی ہوئی ہستی پر خود فنا ہو رہے ہیں۔ وہ اُن پروانوں کی شوریدہ سری دیکھتی ہے اور ایک نورِ تبسم سے مسکرا دیتی ہے۔ جس سے ان دلدادگانِ شمع کی اور تقویت ہو جاتی ہے۔ اور وہ دیسر ہو ہو کر اُس کے ہر تبسم پر نثار ہو جاتے ہیں۔ گویا وہ حسن کا مقتل تھا۔ جاں نثار عشاق جل بجھنے کے لئے موجود تھے۔ اور جن میں سے ہر ایک کی یہ خواہش تھی۔ کہ دلبرِ طناز کی تیغِ ابرو کا پہلا نخچیر میں ہی ہوں۔ ہر پروانہ کم سے کم اس نور کی تپلی کی نین بار بلائیں لیتا تھا۔ اور آخر کو اس کے صدقے ہو کر قدموں پر جان دے دیتا تھا۔ شمع ان کے لیے حسرت و اندوہ کے ساتھ اپنے سینے سے اشکِ پُرغم بہا رہی تھی۔ یہ نہیں کہ اُسے ان ہزاروں کے خون کا غم نہ تھا۔ روتی ضرور تھی۔ مگر اپنی فنا کے بعد جو حیاتِ جاودانی اُسے ملنے والی تھی۔ اُس کی خوشی پر اپنے تبسم کو روک بھی نہیں سکتی تھی۔ اور پھر یہی وجہ تھی کہ میں اُسے دیکھ رہا تھا۔ کہ ایک طرف اس کا جگر کٹ کٹ کر بجائے اشک کے گر رہا تھا۔ اور وہ شہیدانِ حسن کا ماتم کر رہی تھی اور دوسری طرف شوقِ وصال اور جذبۂ صادق کے جوشِ مسرت میں مسکرا بھی رہی تھی۔ میں یہ حالت دیکھ کر بے قرار ہو گیا۔ بستر پر رہ نہ سکا۔ اُٹھ کر چاہا کہ اس عاشقِ صادق کا، اُس فنا میں بقا کو ڈھونڈنے والے کا، میں بھی فدیہ بن جاؤں۔ میرے قدم شمع کی جانب بڑھے۔ لیکن آہ ابھی کچھ دور ہی تھا۔ کہ مرغِ سحر نے

ایک طرف بانگ دی اور دوسری طرف سے موذن نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا۔ اور اُس کے ساتھ ہی شمع کی ہستی اسم حقیقی کو سنتے ہی فنا ہوگئی۔ اور میں اپنا دل تھام کر رہ گیا۔

قسمت کو دیکھیے کہ کہاں ٹوٹی جا کمند　　　دو چار ہاتھ جبکہ لب بام رہ گیا

قاسم علی عارف

ابتدائے محبت

وہ مجھے پُر حسرت نگاہوں سے دیکھتا ہے

میں کھیت میں اناج کاٹتی ہوں۔ تو وہ بھی میرے ساتھ اناج کاٹنے لگتا ہے۔ لیکن اُس کے کاٹے ہوئے اناج کی ڈھیری کم رہتی ہے۔ .... اور میری ڈھیری بہت زیادہ ہوتی جاتی ہے! مجھے شک و تعجب ہونے لگتا ہے۔ اور

وہ مجھے پُر حسرت نگاہوں سے دیکھتا ہے۔

میں اپنے گاگر بھر کے گاؤں کو واپس ہوتی ہوں تو راستے کے کنارے کی لمبی لمبی گھاس میں بانسری کی آواز میرے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ میں گاؤں میں پہنچ جاتی ہوں تو بانسری چھپائے ہوئے وہ مجھ تک آتا ہے اور

مجھے پر حسرت نگاہوں سے دیکھتا ہے

کھیت میں کام کر کے بارہ بجے آرام کرنے کے لئے جب کھیت کے درخت کے سایہ میں آتی ہوں تو وہاں میرے لئے پتوں کی ایک سیج بچھی ہوتی ہے۔ میں سایہ میں بیٹھی رہتی ہوں - تو وہ سامنے سے گذرتا ہے اور

مجھے پر حسرت نگاہوں سے دیکھتا ہے

میں نے ایک دن اُس سے پوچھا "تم مجھے کیوں دیکھتے ہو؟" وہ مسکرانے لگا اور شرما گیا۔ کچھ کہتا ہی نہیں! صرف

مجھے پر حسرت نگاہوں سے دیکھتا ہے۔

محمد میر خان

والد مرحوم کی قبر پر

صبح کے وقت میں والد مرحوم و مغفور کی قبر کے سرہانے کھڑا تھا۔ ہاتھ فاتحہ کیواسطے اُٹھے ہوئے تھے اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ کائنات پر خاموشی طاری تھی۔ مگر میرا دل سیماب کی طرح بیقرار تھا۔ میں اسکی دھڑکن سن رہا تھا۔

میں سوچتا تھا کہ وہ نگاہِ مہر جس میں شفقت پدری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور جس کے لئے میں ترس گیا ہوں۔ اب مجھے نصیب نہیں ہو سکتی۔

والدین کا سایہ دنیا میں سب سے بڑی نعمت ہے۔ جس کو یہ میسر ہو اُس کو اور کسی چیز کی ضرورت نہیں رہتی میرے دل میں ان حسرت آمیز خیالات کا تلاطم برپا تھا۔ میرے آنسو مرقد منور کی خاک پاک پر گر رہے تھے اور مجھے اس سے تسکین ہو رہی تھی۔ میں بیری درخت کے نیچے جو قبر کے پہلو میں اُگا ہوا تھا بیٹھ گیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے کلیجہ میں ٹھنڈک سی پڑ گئی۔ میں اس خیال سے ایک روحانی لذت کا بہرہ اندوز حلاوت تھا۔ پرندے چہچہانے لگے۔ بادِ نسیم چلنی لگی۔ مزار کے پھول کھل گئے۔ کائنات بیدار ہو گئی۔

مگر افسوس کہ اس عالمگیر بیداری نے بھی اُنہیں نہ جگایا۔ انہوں نے کروٹ تک نہ بدلی۔ تاہم میں محسوس کرتا تھا کہ انہیں میری موجودگی کا علم ہے۔ یہ خیال سے میرے لئے باعث تسلی ہوا۔ طبیعت میں حسرت افزا اطمینان پیدا ہو گیا۔ اور مرحوم کی پاک روح پر فاتحہ پڑھتا ہوا میں شہر خموشاں سے رخصت ہوا۔

آوارہ و مجنوں نے رسوا سر بازارے

فراق طفلی

چھٹے بچپن سے سخت ایذا اُٹھائی دہائی ہے جوانی کی دہائی کہاں ہے اب بیہوشی کا عالم کہاں ہے خود فراموشی کا عالم
بلا دنیا کے جھگڑوں کی لگائی سمجھ کیا آئی گویا آفت آئی گئے وہ دن کہ ہم کچھ اور ہی تھے کبھی انجام نیک و بد سے بچھے
کہاں ہیں اب وہ راتیں اور وہ دن کہاں ہے راحت و آرام کا سن قریب آیا زمانہ ربطِ غم کا اُٹھا بادل نے بیڑا اصبطِ غم کا
نہیں ماں باپ اب کیوں ناز بردار کیا فطرت نے ہمکو خود ہی ہشیار ہنسیں اب کیوں اُٹھائے کسکو پڑا کوئی بہلائے کیوں کیسے جو روتا
کوئی کیوں پوچھے اب اپنے آنسو سنوارے ہر سحر کیوں کوئی گیسو بزرگوں کا کبھی ہم ننھے کھلونا ہمارے دم سے سب کا جی بہلتا
[illegible] طبیعت [illegible] سے زیادہ نزاکت

جدھر جانا ادھر اپنی ہی کہنا گھڑی بھر کے لئے نچلے نہ رہنا رگ و پے میں شرارت ہی شرارت کہ رونے کو ہنسا دینے کی عادت
تمام اشغال دل کے اضطراری تمام افعال شرح بے قراری طبیعت میں یہ نافہمی کی تھی لاگ سمجھتے ہی نہ تھے ہم آگ کو آگ
سحر تک شام سے جی بھر کے سوتے سحر سے شام تک خوشیاں کیا کیا فراغت ہی فراغت کا زمانہ مسرت ہی مسرت کا زمانہ
نکل جائے جو منہ سے بس وہی حق بری ہو بات کوئی یا بھلی ہو ارادے جس قدر سب بے ارادہ خیال کم نہ پابستہ زیادہ
نہ تکلیفات شرعیہ سے کچھ کام نہ شیخ و حضرت ناصح سے کچھ کام اشارے نقش معیار تخیلات کنائے شرح اظہار خیالات
طبیعت وجہ حسن شرارت شرارت جزو اجزائے طبیعت نہ دل میں امتیاز دوست دشمن نگاہوں میں برابر موم و آہن
نہ قدر گوہر و سیماب سے کام نہ دردِ دل نہ بیتابی سے کام نہ سرد و گرم عالم کی خبر کچھ نہ مطلق دہشت نفع و ضرر کچھ
مزاج ایسا اگر بگڑا تو بگڑا بہانہ ہی آتا ہے غصہ پہ غصہ منانے میں منانے والے کیا کیا بگڑ جانا ہنسی بل تیوریوں کا
چلی ہی آتی ہیں چیزوں پہ چیزیں مگر لیکن یہی باقی ہے ہم کو مٹے جاتے ہیں سب ہی نازبردار پھٹا دنیا کے کا سوتی سرد کا
محبت ہی سے دیکھا جس نے دیکھا اٹھایا گود میں اور پیار آیا دعا ملتی تھی طول زندگی کی تمنا تھی کہیں جلدی ہو شادی
نظر میں پالنے والوں کی رہنا دم تنبیہ کچھ منہ سے نہ کہنا اتر جاتے تھے صدقہ نہ صدقے نظر بھر کے اگر دیکھا کسی نے
نیا کپڑا گلے میں جبکہ ڈالا اتارا سب نے مل کر کالا دانا ابھی پہنا ابھی میلا ہوا وہ ابھی اترا ابھی بدلا گیا وہ
ہمارے ہی لئے آتے تھے تیوہار خوشی جس کی منائی سب نے اتوار نہ دن کو دن نہ سمجھے رات کو رات رہے ہر فصل میں یکساں خیالات
ہر اک فصل اپنی تھی فصل مسرت دمکتی ہی رہی چہرے کی رنگت طبیعت غالب آتی تھی مرض پر نہ سمجھے یہ کوئی پڑتا ہے کیونکر
اگر بیمار کچھ دن کو ہوئے بھی طبیعت چارہ گر بنتی تھی خود ہی دوا کیا چیز تھی پینا تھا کیا شے کبھی سمجھے نہ یہ جھگڑا تھا کیا شے
نہ ہم کرتے نہ کوئی فکر و وسواس جو ہو بھی تو نہ کچھ ہوتا تھا احساس رہا عالم فراموشی کا عالم کہ ایک اک پل تھا مدہوشی کا عالم
مزاج خاص میں خوش و خرم تھے بس اپنی آن بان تھی اور ہم تھے نہ تکلیفات مذہب سے غرض تھی نہ کوئی جوش مشرب سے غرض تھی
بنے جاتے ہیں کہ دنیا والے کیا ہیں ہمیں کیا تھا جنہیں جانا کہیں ہم تکلف سے بری شان طبیعت بنی تھی سادگی شان طبیعت
سحر سے شام تک بس کھیل ہی کھیل تمام افعال بے جوڑ اور بے میل عیاں ہر رگ رگ سے شوخی و تلون نہاں طینت میں تاثیر تلون
کبھی اوجھل نہ ہونے تھے نظر سے اکیلے کب نکلنے پائے گھر سے فراغت کی تھی محشر زندگانی نہ جانیں کیا دکھائے نوجوانی
زمانہ آگرا دنیا نے پوچھا ہوئے ارمان دل میں جمع کیا کیا تمیز حق و باطل کا ہوا سن خدا محفوظ رکھے آئے وہ دن
سنت ہی دنیا رہتی ہے نفس میں کہ جیسے کل خدائی ہے دسترس میں کریں کیونکر نہ ہم طفلی کا ماتم جوانی لے کے آئی دفتر غم

محشر

زبان اردو

بعض مسلمان محققین و مورخین کا بیان ہے کہ زبان اردو کا ایجاد شاہجہان کے عہد سے ہوا تھا۔ اس کے لشکر میں مختلف ملکوں کے لشکری تھے۔ اُن سب نے آپس میں اپنی اپنی زبان کے الفاظ ملا کر استعمال کئے اور یہ زبان بنگئی۔ چونکہ ترکی زبان میں اردو لشکر کو کہتے ہیں۔ اس لئے اس زبان کا نام اردو رکھا گیا۔ مولوی امام بخش صہبائی اپنی کتاب گلستانِ سخن (جو اُن کے شاگرد مرزا قادر بخش صابر کی تصنیف بتائی جاتی ہے) میں فرماتے ہیں کہ "اوایل روزگار میں دہلی کے رہنے والوں کی زبان ہندی تھی جس کو بھاکا کہتے تھے۔ بادشاہان اسلام مختلف دیار سے وارد ہوئے مثل سلطان محمود غزنوی اور غوری اور لودی اور سلاطین چغتائی۔ ہر ملک کی زبان کے لغت نوبت بنوبت اس زبان میں داخل ہوتے گئے۔ رفتہ رفتہ زبانِ ہندی اپنی اصل پر نہ رہی اور السنہ مختلفہ سے ملکر لباسِ نو میں جلوہ گر ہوئی۔ چونکہ یہ لوگ اردوئے معلّےٰ سلاطین کے متعلقین سے تھے۔ اہلِ ہند اُن الفاظ مخلوط کو اردو کہتے تھے۔ یعنی یہ الفاظ جو ہماری زبان میں مل گئے سلاطین کے اردو (لشکر) کی بولی کے ہیں"۔

حضرت صہبائی کے اس قول سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ ہندوستان میں سنہ ۵۰۰ ہجری سے اردو کا وجود ہے کیونکہ ملا قاسم فرشتہ نے ہندوستان میں سلطان محمود غزنوی رح کی آمد سنہ ۲۵۲ ہجری میں بیان کی ہے۔ اور حدایق المعانی میں بادشاہ ممدوح کے وصال کی یہ تاریخ مندرج ہے ؎

آنکہ محمود غزنوی بودہ واقفِ سرِّ معنوی بودہ
سالِ شنقارِ آں ضدیوزماں ہاتفم گفت۔ شاہبازِ جہاں (۴۲۱)

سنہ ۴۲۱ ہجری سے شاہجہان کے آغازِ سلطنت تک زبانِ اردو نے کوئی ترقی نہیں کی۔ وہ فقط اپنے ایک ہی رنگ پر رہی۔ جب شاہجہان کے عہد میں دہلی نئے سرے سے بسائی گئی۔ اور اس کا نام شاہجہان آباد رکھا گیا۔ تو زبان اردو بھی صاف ہوتی چلی سنہ ۱۷۲۳ء مطابق سنہ ۱۱۲۵ ہجری میں اردو ایک خاص زبان ہوگئی اور اہل دہلی اپنے مطالب اس زبان میں ادا کرنے لگے۔ سب سے پہلی کتاب دہ مجلس میاں فضلی دہلوی نے اردو میں لکھی۔ اسوقت تک مسلمانوں نے اردو کا کوئی لغت مرتب نہیں کیا تھا۔ اور اس زبان کے تمام الفاظ تتر بتر تھے۔ چنانچہ لندن کنگ کالج کے پروفیسر ڈنکن فاربس اپنی ڈکشنری کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ "سنہ ۱۷۹۰ء میں ڈاکٹر گلکرسٹ نے ایک ہندوستانی ڈکشنری مرتب کی جو دو جلدوں میں تمام ہوئی۔ یہ ڈکشنری سنہ ۱۸۱۰ء میں دوسری بار ایڈن برا میں طبع ہوئی۔ ہندوستان

کے اکثر محققوں اور فاضلوں نے اس کو پسند کیا اور قریب قریب نصف صدی تک ان کی جانکاہ مشقت کی داد دی۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کے ابتدائی زمانے میں ہندوستانی زبان کے لغت بے ترتیب تھے اور ان کا املا بھی نادرست تھا۔ ان کے بعد ۱۸۰۸ء میں ولیم ہنٹر نے ایک ڈکشنری مرتب کی۔ ظاہر ہے کہ اسی طرح اور بھی یورپ کے محققین نے زبان اردو کی ڈکشنریاں اس وقت مرتب کیں جب مسلمانوں کے دماغ میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اردو لغات کی تدوین کی جائے۔ غدر کے بعد میرے مخدوم محترم مولوی سید احمد صاحب دہلوی مرحوم نے اس کار اہم کے لئے اپنی کمر باندھی ۱۸۸۸ء میں ارمغان دہلی کے کچھ حصے سید صاحب نے مرتب کئے۔ بعض نااہل لوگوں نے انکو بہت ہی ایذائیں پہنچائیں۔ ع

یوسف از بیمہری اخوان بچاہ افتادہ است — بیحسد نہ بود برادر گرچہ پیمبر زادہ است

حیا مردانگی کا ایک بہت بڑا جوہر ہے۔ اور حیا اسی کی آنکھوں میں ہوتی ہے جسکو مردانگی اور عزت کا پاس ہوتا ہے۔ اس پر آشوب زمانے کے مسلمان رئیسوں کے مصاحب کیا ہیں۔ برائیوں کی پوٹ اور رئیس کی گانٹھ ہیں۔ رئیسوں کا یہ حسن ظن کہ مصاحبوں سے ہمارے دل بہلتے ہیں اور مصاحبوں کا یہ خیال کہ ایک ذرا سی بھیا بھی میں کام نکلتا ہے نصیبوں کی یاوری سے اتنے بڑے دربار میں اپنی پہنچ ہوئی ہے۔ ان مصاحبوں میں جہان دنیا بھر کی اخلاقی برائیاں ہیں۔ وہاں ان کو حسد کی بھی ایک خو پڑ گئی ہے۔ ہر رئیس اپنے مصاحبوں پر دباؤ ڈالکر انہیں بھیا بنا دیتا ہے۔ ہر مصاحب ہر فن اور ہر صحبت کی دو چار باتیں جانتا ہے۔ چونکہ وہ رئیسوں کے ساتھ رہتا ہے اور رئیسوں کے یہاں سوز خوانوں۔ مرثیہ خوانوں۔ داستان گویوں شطرنج بازوں۔ کبوتر بازوں۔ طوائفوں اور طبیبوں کی آمد و رفت رہتی ہے اسلئے ان کی اصطلاحیں جلد آجاتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک مختصر قصہ بیان کرتا ہوں کہ پڑھنے والوں کو عبرت آئے۔

(۱) رئیس کے پہلو میں مصاحب بیٹھا ہے۔ ایک عورت گا رہی ہے۔ مصاحب کہتا ہے۔ ای سبحان اللہ بی [illegible] میں توبہ کس حسن سے ادا کی ہے۔ خدا جانتا ہے۔ تانیں چھریاں بنکر کلیجے میں اتر گئیں۔ [illegible] اللہ ہے اگ بھاؤ کس غضب کا ہے۔ اللہ رے چھل بل بوٹیاں ہیں کہ پڑی پھڑک رہی ہیں [illegible] دیکھئے [illegible] اشاروں میں بول ادا ہو جاتے ہیں۔ رئیس مسکرا کر مصاحب کے سر پر ایک [illegible] لگاتا ہے۔ مصاحب قہقہہ لگا کر کہتا ہے۔ کہ حضور کا دست مبارک پھول کی چھڑی سے [illegible] ایک نر ہے

(۲) محرم کی مجلس عزا میں یہ سوز سنتا ہے۔ ع۔ اک روز جناب خسرو اور حضرت [illegible]

بہتر سوز نیئں نہیں سُنا۔ جزاک اللہ حضرت جادو ہے جادو۔ تنہا تو اس حُسن سے ادا کیا۔ کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ ہائے آواز کے اُتار چڑھاؤ نے کیا کٹاری ماری ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

عاقل و آزمودہ کار پر پوشیدہ نہیں کہ ان کا عدم و وجود یکساں ہے۔ میں اس زمانے کی نئی پود کو نصیحت کرتا ہوں کہ ایسوں کی صحبت سے احتراز کریں۔ کیونکہ ان کی صحبت کے اثر سے حیا باقی نہیں رہتی۔ اور دل کمزور ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس دل میں خوشامد نے جگہ کر لی ہے وہ کیا زور رکھ سکتا ہے۔ شاعر کہتا ہے ؎

از صحبتِ جیز مرد نامرد شود بے ہمت و بے غیرت و بیدرد شود
صد سال اگر شعلہ فروزد آتش یک غوطہ در آب گر خورد سرد شود

اب ان مصاحبوں نے یہاں تک پیٹ سے پاؤں نکالے ہیں کہ اپنے آپکو زبان اردو کا محقق سمجھتے ہیں۔ اور فرہنگِ آصفیہ پر اعتراض کرتے ہیں۔ لیکن ذی علم جُہلا کی باتوں کو دھیان میں کب لاتے ہیں۔ میں تو یہی کہونگا۔ کہ جب صوبہ بہار کے اہلِ علم زبانِ اردو کے محقق نہیں۔ تو ان مصاحبوں کا کیا مُنہ ہے کہ زباندانی کا دعویٰ کریں۔ پٹنہ بہار اور گیا میں سینکڑوں اچھے وکیل اور بیرسٹر ہیں لیکن وہ اُردو کی چار سطریں بھی صحیح نہیں لکھ سکتے۔ انتہا یہ ہے کہ اُن کو لفظوں کی تذکیر و تانیث کا بھی علم نہیں۔ چونکہ وہ مسلمان ہیں اس لئے بیوی بچوں میں اور کچہریوں میں مغل تازہ ولایت کی طرح اردو بولتے ہیں۔ میں افسوس کرتا ہوں کہ صوبہ بہار میں طبقۂ خاص کی زبان ناقص ہے اور یہاں کے عامیوں کی بول چال سے بہت کم تفاوت رکھتی ہے۔ اردو زبان کی تاریخ شاہد ہے کہ یورپ کے محققین کی ہندوستانی ڈکشنریوں کے بعد اگر اردو کی کوئی جامع و مبسوط فرہنگ ہے۔ تو فرہنگِ آصفیہ ہے۔ چنانچہ میں نے اس کا ذکر اپنی تقریظ میں کیا ہے۔ جو فرہنگِ آصفیہ کی جلد اوّل میں طبع ہوئی ہے۔ یہ ترمیم شدہ جلد ۱۹۱۸ء میں طبع ہو کر شائع ہوئی ہے۔ میں پھر اس کا مجمل ذکر کرتا ہوں۔ کہ سب سے پہلے ۱۸۰۷ء میں انشاء اللہ خاں نے دریائے لطافت لکھی۔ یہ کتاب لغت نہیں ہے صرف چند محاورات ہیں۔ اور دہلی کے اکثر طبقات کی بولیاں ہیں۔ جس نے اصل دریائے لطافت دیکھی ہے وہ جانتا ہے کہ اُس کا نصف حصہ قواعد عروض پر مشتمل ہے۔ دریائے لطافت کو دیکھ کر میر علی اوسط رشک لکھنوی نے اُردو لغت کی ایک کتاب مرتب کی۔ اس کا نام نفس اللغۃ ہے۔ یہ طبع ہو چکی ہے۔ لکھنؤ میں اس کی قلمی جلدیں۔ میر نفیس اور فصاحت سر کرتے [illegible] عظیم آبادی نے اپنی کتاب ثمرۂ تحقیق میں لکھی ہے

[redacted]

۱۸۸۶ء میں مرزا مچھو بیگ عاشق لکھنوی نے بہار ہند مرتب کی۔ اس میں صرف باب الف کے لغات و محاورات ہیں۔ ۱۸۸۹ء میں جلال لکھنوی نے گلشن فیض لکھی۔ ہر چند بہت سے الفاظ چھوڑ دیئے ہیں۔ لیکن جس قدر الفاظ ہیں اعراب کے ساتھ ہیں اور ان میں جلال کی تحقیق کے جوہر نمایاں ہیں۔ کاش لغت کی اور کتابوں میں بھی یہی خوبیاں ہوتیں۔ جلال کی ایک کتاب اور بھی ہے۔ جس کا نام سرمایۂ زبان اردو ہے۔ لیکن گلشن فیض سے بہتر نہیں ہے۔

ارمغان دہلی کو دیکھ کر امیر مینائی کے دل میں یہ شوق پیدا ہوا کہ لغت کی کوئی جامع کتاب لکھوں چنانچہ ۱۸۹۱ء میں امیر اللغات کے دو حصے آگرہ میں طبع ہوئے۔ زبان کے عاشق بہت خوش ہوئے کہ لکھنؤ کی زبان کے الفاظ و محاورات کے صحیح اعراب و معنی کا ایک لغت مرتب ہو رہا ہے لیکن اس خوشی کے ساتھ ساتھ لوگوں کو یہ غم بھی ہوا کہ دو ہی حصے چھپ کر رہ گئے۔ [illegible] نہیں۔ امیر مینائی پر کیا بجوگ پڑا جس نے اُن کو اس کام کے سنوارنے سے مجبور رکھا۔ امیر اللغات کے متعلق میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اور جو باتیں میں بیان کروں گا۔ اُن کو اعتراض سے کوئی نسبت نہیں۔ میں امیر مینائی کو علم شعر کا ماہر اور لکھنؤ کی زبان کا محقق سمجھتا ہوں۔

(۱) امیر مینائی کے شاگرد اور بعض ناواقفانِ زبانِ اردو جس قدر امیر اللغات کی تعریفیں کرتے ہیں یہ اُن کی خوش اعتقادی ہے۔ لیکن جو اُس کے محاسن اور عیوب کو سمجھتا ہے۔ وہ ان تعریفوں کو ان کی چرب زبانی پر محمول کرتا ہے۔

(۲) امیر کے شاگردوں کا دعویٰ ہے کہ الف ممدودہ اور مقصورہ کے تمام الفاظ امیر اللغات میں ہیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ اکثر وہ الفاظ و محاورات جو لکھنؤ میں بولے جاتے ہیں اور ٹکسالی زبان میں داخل ہیں۔ امیر اللغات میں نہیں ہیں۔ اور ایسے الفاظ بھی ہیں۔ جن میں اعراب نہیں ہیں۔ ملاحظہ ہو

آنکھوں کرنا۔ سر سے نہ نہانا۔ تھوڑا سا جسم دھو ڈالنا۔ جانصاحب ؎

بی بی کا دانہ کھائے گی آنکھوں کرے ضرور — تو اگر نہیں ہے نہانے کی احتیاج

اٹھرا (بواؤ مجہول) وہ چند کسیلی دوائیں جو زچہ کو اسقاط میں پلاتے ہیں۔ جانصاحب ؎

ہے جننے کو تو اے لوگو ابھی دن ہیں بہت — راج بی دائی نے منگوایا ہے اٹھرا بہت

اجمود۔ (بواؤ مجہول) تخم کرفس۔ یہ الفاظ امیر اللغات میں نہیں ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی الفاظ ہیں جو لکھنؤ کے فصحا اور بیگمات کی زبانوں پر ہیں۔ اور امیر اللغات میں نہیں ہیں۔ اگر کوئی یہ کہے

کہ احمؔد کے لکھنے سے کیوں چشم پوشی کی۔ اَلغاروں۔ یہ نہیں بیان کیا گیا کہ بواو معروف ہے یا بواو مجہول۔ اگر احمؔد یوں لکھتے ؎

رات برسا ہے مینہ وہ الغاروں ندّیاں چڑھ کے بن گئیں جیحوں

اور محمودؔ یوں لکھے ؎ بنیئے تیلی بخیل و شہ چاروں مال رکھتے ہیں گھر میں الغاروں۔

اور ان شاعروں میں یہ بحث ہو کہ تم نے غلط قافیہ لکھا ہے۔ الغاروں یہ وزن جیحوں صحیح ہے۔ لاؤ امیر اللغات میں دکھا دوں۔ جب امیر اللغات دیکھتے ہیں تو اس میں اس لفظ کی صحت کا پتا ہی نہیں چلتا۔ اُپھنگن۔ یہ نہیں لکھا گیا ہے کہ اس کی تائے ہندی اور کاف فارسی مفتوح ہے یا مکسور۔ اَوت۔ یہ نہیں لکھا ہے کہ بواو معروف ہے یا بواو مجہول۔ اور دہلی کی زبان سے امیر اللغات کو تو کوئی نسبت ہی نہیں۔ انصاف کی نظر سے بغور دیکھو۔

آنوٹ۔ آن کی تصغیر ہے۔ چھب۔ ادا۔ کے معنی میں مستعمل ہے۔ داغ ؎

وہ حسن وہ انداز وہ پھر بانکپن اُس کا چھل بل ہے قیامت کی تو انوٹ ہے غضب کی

اڑے تھڑے میں کام آنا۔ وقت بے وقت کام آنا۔ جیسے اچھی آتو صاحب میں نے اپنے روپے لگا رکھے ہیں کہ اڑے تھڑے میں کام آئینگے۔ داغ ؎

کریں نہ قدر جو دل کی تو اور کس کی کریں اڑے تھڑے میں ہمارے یہ کام آئے گا

اَمَن چَین (بفتح میم) بھونچال۔ زلزلہ۔ اَڑکی اَڑ۔ جوں کی توں۔ کم نہ زیادہ۔ جیسے ماما نے اڑکی اڑ کہدی۔ یہ الفاظ و محاورات جو دہلی کے شرفا میں آٹھوں پہر مستعمل ہیں امیر اللغات میں نہیں ہیں۔

اگر صرف اردو الفاظ و محاورات صحیح اعراب کے ساتھ امیر اللغات میں لکھے جاتے تو وہ ایک نادر کتاب ہوتی۔ ہر محقق اور ذی فہم یہ اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ کہ امیر اللغات میں۔ آب آتشیں آب گیر۔ احتراق۔ اور افتراق کے اعراب و معنی کوئی نہیں دیکھتا۔ کیونکہ فارسی اور عربی زبان میں بہت سی لغت کی کتابیں ہیں۔ جن کے ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔ اور یہ دونوں زبانیں اس کی محتاج نہیں ہیں کہ ہندوستان کا کوئی شاعر یا راوی ان زبانوں کے الفاظ کے معنی و اعراب لکھے۔ ہاں اردو زبان لغت کی بہت ہی محتاج ہے۔ ہندوستان میں بہت سے پھول پھل درخت اور درند و پرند ایسے ہیں۔ جن کے خواص اور نام سے آج ہم ناواقف ہیں۔ اور اس کا سبب [illegible] کے محققوں نے اس کی بہت

[redacted]

چھان بنان کی ہے۔ اور وہ ہم سے کہیں زیادہ ہندوستان کی ہر چیز کا علم رکھتے ہیں۔ پہاڑوں کے دامن میں ایسے درخت پھول اور پرند نظر آتے ہیں۔ جن کی تعریفوں کا کیا مذکور ہے۔ اردو لغت کی کتابوں میں اُن کے نام تک نہیں ہیں۔ برابر پہاڑ (جو گیا سے سات کوس پر ہے) کے دامن میں ملا جو جُوہی سے بہت مشابہ تھا۔ لیکن اُس کی بو جوہی سے بہت تیز تھی اور اس کی بیلیں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اور وہ پھول اس غضب کا نازک تھا۔ کہ چند لمحوں میں ہتھیلی کی گرمی سے مرجھا گیا۔ خبر نہیں ہند میں اُس کا کیا نام ہے۔ اہلِ فارس تو اُس کو یاسمین صحرائی کہتے ہیں ندیوں اور دریاؤں کے نام تو جغرافیہ سے مل بھی جائینگے۔ لیکن دامن کوہ کے خودرو پھولوں اور صحرائی پرندوں کے نام بمشکل کسی اردو لغت میں ملینگے۔ فرہنگ آصفیہ میں بعض بعض پھولوں اور پرندوں کے نام ہیں۔ لیکن تصریح اور اعراب کے ساتھ نہیں ہیں۔ مؤلف فرہنگ نے زیر طبع شدہ جلدوں میں اس کا خیال کیا ہے۔ اردو زبان کو ایک مبسوط اور جامع لغت کی ضرورت ہے۔ جس میں الفاظ کی صحت کی سند کلام فصحائے سے لیجائے۔ غزلوں کی زبان اس قدر محدود ہے کہ لغت کو بہت ہی کم مدد مل سکتی ہے۔ واقعہ نگاری سے زبان کی وسعت کا پتا چلتا ہے۔ ذی علم خوب جانتے ہیں۔ کہ شاہنامہ کی بدولت بہت سے تُرکی پہلوی اور فارسی الفاظ زندہ ہیں۔ اگر آج اردو میں اسی رنگ کی کوئی مثنوی ہوتی۔ تو وہ اردو الفاظ جو فنا ہو گئے۔ زندہ رہتے۔ میر انیس لکھنوی کے مرثیوں سے لغت نگار کو ایک حد تک مدد مل سکتی ہے۔ اکثر حالات حرب۔ مثلاً ڈانڈ۔ جمدہر۔ بوڑی۔ پھال وغیرہ اور پہلوانوں کی اصطلاحیں اُن کے کلام میں نظر آتی ہیں۔ فی لولجی (علم زبان) کے میر انیس ماہر تھے۔ اور یہی سبب ہے کہ ہر لفظ کو نہایت حسن سے صرف کیا ہے۔ اسوقت تک فصحائے تین طبقوں کی زبانوں کی سند لی ہے۔ (۱) زبان ریختہ۔ (۲) زبانِ ریختی یعنی طبقۂ نسواں کی بولی (۳) مرثیہ گویوں کی زبان۔

زبان ریختہ کے متعلق میں عرض کر چکا ہوں۔ کہ وہ بہت ہی محدود ہے اور جب تک فصحائے کے قصیدوں اور مثنویوں سے مدد نہ لی جائے گی۔ لفظوں کے صرف کا موقعہ و محل اور اعراب کا صحیح پتا چلنا مشکل ہے ریختی کے موجد سعادت یار خان رنگین دہلوی ہیں۔ انہوں نے دہلی کے لال قلعہ کی زبان میں ریختیاں کہی ہیں۔ زینت محل کے انتقال کے بعد تو وہ زبان فنا ہو گئی۔ فقط الفاظ و محاورات کتابوں کے اندر رہ گئے ... رنگین نے دیوان ریختی کی ایک فرہنگ بھی لکھی ہے ان کے چاروں دیوان اور مثنویاں لغت نگار کو ... مدد دے سکتی ہیں لیکن رنگین۔ شاہ نصیر دہلوی۔ میر حسن دہلوی اور مصحفی کے دیوان نایاب ہیں

[illegible] ... دہلوی ... ریختی ... [illegible]

جانصاحب لکھنوی نے اپنے دیوان کی کوئی فرہنگ نہیں لکھی ہے۔ جن اشعار میں زبان اور لکھنؤ کی بیگمات کے محاورات ہیں۔ اُن کو بجز محقق اور اہلِ زبان کے کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ مرثیہ گویوں میں میرانیسؔ اور میر تقی نے زبان کی خوبیاں بہت کچھ دکھائی ہیں۔ میں نے میر نفیسؔ کے مرثیئے اس وقت دیکھے تھے۔ جب طبع بھی نہ ہوئے تھے۔ حسنِ بندش اور الفاظ کا صحیح استعمال دیکھ کر ہر ذی علم کہہ سکتا ہے کہ اہل فارس کا تتبع کیا ہے۔ واقعات کا تسلسل قائم رکھکر بھی زبان کے محاسن اور اسالیب بلاغت کے جلوے دکھلائے ہیں۔ مومنؔ اور غالبؔ کے سوا ہندوستان کے کسی اردو شاعر کے کلام میں یہ حسنِ بندش نہیں پایا جاتا۔ ۱۹۱۲ء سے میں قمر اللغات اور آفتاب اردو کی تدوین میں مصروف ہوں۔ ہر چند بہت سی آفتیں سنگ راہ ہوئیں۔ لیکن میرے شوق کا وہی عالم ہے۔

محمد نقی قمرؔ گیاوی

جذبات ٹیگور

نہ سویا میں اس فکر پر رات بھر　　کہ تھک کر نہ سوتا رہوں تا سحر
اچانک کو پیارا میرا صبحدم　　نہ آجائے اس حال میں میرے گھر
عزیزو نہ روکو نہ روکو اُسے　　کھلا چھوڑ دو اس کا تم رہگذر
جگانا نہ مجھ کو خدا کے لئے　　جگائے نہ قدموں کی آہٹ اگر
میری نیند اور آہ انمول نیند　　جو ہے اُس کے دیدار کی منتظر
ضیا میں تبسم کہ آنکھیں مری　　کھلیں اور ہوں دید سے بہرہ ور
نکل آئے وہ پردۂ خواب سے　　کہ جوں ظلمتِ شب سے نورِ سحر
جہاں بھر کی مخلوق و اشکال سے　　دکھائی مجھے دے وہی پیشتر
ہو پیدا اسی کے ہی دیدار سے　　میری آتما میں خوشی کا اثر

تمنا ہے جب آپ میں آؤں میں
تو محبوب کو سامنے پاؤں میں

چندسروپ

آنہ

مغربی جواہر ریزے

"جب کسی عاشق کے عشق کی مخالفت کی جاتی ہے۔ تو اس کا عشق بدرجہا زیادہ ہوجاتا ہے" (لارڈ لیٹن)

"خراب صحت موت کا ایک حصہ ہے" (ایضاً)

"خدا نے انسانی دل کو کمزور مگر لچیلا بنایا ہے۔ اور اسے زہر کو تریاق بنا دینے کی عجیب و غریب قوت بخشی ہے۔ ہمیں آب و ہوائے بہشت سے محروم کردو۔ بستر علالت پر لٹا دو۔ کسی خطرناک و تاریک مقام میں محبوس کر ڈالو۔ اور دیکھو کہ با ایں ہمہ ہم اپنے خیال کے ساتھ مشغول رہ سکتے ہیں۔ اور جسمانی قید کی پہلی تکلیف کے بعد باوجود اس قید کے درحقیقت آزاد ہیں" (ایضاً)

"بسا اوقات یاس نا امیدی انسان کے ضعف دماغ کی علامت ہوتی ہے" (ایضاً)

"ہر مصنف کی تصنیف اس کی فطرت کا آئینہ ہے" (ایضاً)

"مفلس آدمی لاکھوں انسان کے مجمع میں ہونے کے بعد بھی کامل تنہائی محسوس کرتا ہے" (ڈبلیو ایل کاکس)

"... ن ہوجانا" بہ نفس خود ایک تعلیم ہے۔ (برنارڈ شا)

"... انسان چاہے۔ خوش قسمت بن سکتا ہے" (جی۔ ڈبلیو اسٹونس)

"... ار(نصیحت) ... ف عمل سے بہتر ہے" (رابرٹ بین ٹرعیون)

"شمع محبت کے حق میں طلب زر سے زیادہ کوئی ہوا ٹھنڈی نہیں" (اس کار بک)

"... پیمانہ - ہر ایک ایسا پیمانہ ہے۔ جو آبجوئے خیر دوام سے بھرا گیا ہے۔ اس میں جنت کے ... ے ہیں۔ اور اسے فرشتوں کے ہاتھ چھپائے رہتے ہیں" (فٹزجرلڈ)

"جب کوئی انسان کہتا ہے کہ میں "ہیچ میرز" ہوں تو دنیا ہمیشہ اُسے اسی کی لکھی ہوئی ... سمجھا کرتی ہے" (ایضاً)

"... میں خاتون کے ساتھ گاڑی میں سفر کرنا بھی زندگی کی شادمانیوں میں ایک بڑی ... ہے" (ڈاکٹر جانسن)

"... ت اور مشغولی انسان کو افسردگی سے بچاتی ہے" (ایضاً)

"... صرف حقائق کے مجسمے ہیں" (ہنری وارڈ بیچر)

"زندگی کا ماحصل اخلاق ہے - خوشی نہیں" (ایضاً)

"خود غرضی وہ قابل نفرت برائی ہے جسے کوئی شخص معاف نہیں کرتا - مگر اس سے کوئی انسان بری نہیں" (ایضاً)

"حقیقی انسان وہ ہے جو دوسروں کے خطاؤں کی توجیہ کیا کرے - اور اپنی غلطی کے لئے کوئی عذر پیش نہ کرے" (ایضاً)

"کامیابی قبل از حصول مرادوں کا مجموعہ ہوتی ہے - لیکن بعد از حصول اُس ویران آشیانہ کی طرح معلوم ہونے لگتی ہے جسے سال بھر سے طائرانِ خوش نوا چھوڑ چکے ہیں" (ایضاً)

عبد المنان بیدل عظیم آبادی - ایم - اے

یادِ ایام

سوزِ غم سے قطرہ قطرہ خون جل کر رہ گیا　　آرزوئیں مٹ گئیں اک داغ دل پر رہ گیا
آنسوؤں سے میرا دامن صبح تک تر رہ گیا　　دیدۂ گریاں کا اک طوفان شب بھر رہ گیا
کس مصیبت سے کٹی ہے راہِ دشتِ شوق کی　　صورتِ نقشِ قدم میں ہر قدم پر رہ گیا
سنتے ہی آندھی چلی تھی کل چمن میں اے صبا　　کیا ہمارا آشیانہ شاخِ گل پر رہ گیا
اک معمہ بن گیا ہے حالِ یارانِ عدم　　جو گیا بس گوشۂ تربت میں جا کر رہ گیا
یاس و حسرت کے سبب دل میں جگہ باقی نہ تھی　　پھر غمِ کونین کیونکر دل کے اندر رہ گیا
کچھ کھٹک سی ہوتی ہے رہ رہ کے اے مژگانِ دوست　　دیکھ میرے دل میں شاید کوئی نشتر رہ گیا
ہوتا ہے آخر زوالِ حسن بھی خونریزِ خلق　　گھٹتے گھٹتے ماہِ کامل شکلِ خنجر رہ گیا
مل گیا سب خاک میں ثاقب تڑپنے کا مزہ　　چلتے چلتے جب گلے پر رک کے خنجر رہ گیا

سید ابو محمد ثاقب کانپوری

چینی سیاح فاہین

چین کی "آسمانی سلطنت" اگرچہ آج کل جاپان و دول یورپ کی حرص و ہوا کا تختہ مشق بن رہی
[redacted] [illegible]

پر تھا۔ ساتویں صدی مسیح میں جب دنیا کے بیشتر حصہ پر جہالت اور بربریت کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ چینیوں نے آمدورفت کیلئے سڑکیں۔ قیام و آسائش کے لئے سرائیں اور آبپاشی کے لئے نہریں کھدوا رکھی تھیں۔ علم ہیئت میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ چھاپہ خانہ جسنے دنیا میں ایک عظیم انقلاب پیدا کر دیا ہے چینیوں ہی کی ایجاد ہے۔ تاریخ عالم کا سب سے پہلا اخبار جاری کرنے کا سہرا بھی انہیں کے سر ہے۔ لیکن باوجود اس قدر ترقی کے انہوں نے غیر ممالک سے اتحاد پیدا کرنے کی بہت کم کوشش کی اور ہمیشہ اپنے فراخ گھر کی چار دیواری کے اندر بند رہے۔

عام امور میں چین کو خواہ کتنا ہی تنگ خیال کیوں نہ مان لیا جائے۔ لیکن مذہب کے معاملہ میں ان کی کشادہ دلی اور عالی ہمتی ناقابل انکار ہے۔ یہ لوگ دو مشہور چینی پیغمبروں کن فیوشش اور تاؤ کے پیرو تھے۔ ان دونوں کا مذہب محض چند اخلاقی نصائح پر مشتمل تھا۔ روحانیت اور عرفان کا اس میں نام تک نہیں پایا جاتا تھا۔ اس لئے ان چینیوں کو جہاں کہیں سے زریں اقوال ملے۔ انہوں نے اپنے مذہب میں شامل کر لئے۔ خود گوتم بدھ کا مذہب ابتدا میں چند اخلاقی اصول کے مجموعہ سے زیادہ نہیں تھا۔ یعنی چوری نہ کر۔ زنا نہ کر۔ جھوٹ نہ بول۔ قتل نہ کر وغیرہ جب یہ مذہب پھیلتا پھیلتا چین کی حدود تک پہنچا۔ تو چینیوں کے دل میں اس کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ اور اس کے اصول جو کن فیوشش اور تاؤ کے مذہب سے ملتے جلتے تھے۔ انہوں نے اپنے مذہب میں داخل کر لئے۔ اور رفتہ رفتہ چین کا بیشتر حصہ بدھ مذہب کا پیرو ہو گیا۔

چینیوں کے بدھ مذہب اختیار کرنے کے بعد چین اور ہندوستان میں سلسلہ آمد و رفت مستحکم ہو گیا۔ اور بہت سے چینی بدھ مذہب کے استھانوں کی جاترا کے لئے آنے جانے لگے جنکے سفر کے حالات افسوس ہے کہ تاریخوں میں نہیں ملتے لیکن اس ابتدائی زمانہ کے حالات سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے ۶۶۱ء میں خاقان چین نے اپنے ایلچی خشکی کے راستہ ملک سندھ میں بھیجے۔ جو کئی سال کے قیام کے بعد بہت سی مذہبی کتابیں۔ بدھ کی مورتیاں اور مذہبی رسوم کے ادا کرنے کے لئے ایک پوجاری ہمراہ لیکر چین کو واپس چلے گئے۔ اسجگہ یہ بیان کر دینا کچھ بیجا نہ ہوگا۔ کہ گو چینیوں نے بدھ مذہب اختیار کر لیا تھا لیکن انہیں بھکشو یا راہب بننے اور راہب خانے بنانے کا حق حاصل نہ تھا۔ اس کیلئے بھکشو ... ی اور مذہبی رسوم ادا کرنے والے لوگ کئی سو سال تک ہندوستان ہی سے جاتے رہے۔ ... ی صدی مسیح میں ہندوستان کی بدھ سنگت نے چینیوں کو بھی بھکشو بننے اور راہب خانے

کے پجاری بن گئے۔ اور ملک کے طول و عرض میں ہزاروں راہب خانے معرض وجود میں آگئے۔

چین میں بدھ مذہب کی مقدس کتابوں کی تو ابتدا ہی سے بہت کمی تھی۔ لیکن راہب خانوں کی تعمیر، اور لوگوں کے گروہ در گروہ پجاری بننے کے بعد یہ کمی اور بھی زیادہ محسوس ہونے لگی۔ اس لئے قریباً ۳۹۹ء میں چین کے بادشاہ نے فاہین کو مقدس کتابوں کی طرف روانہ کیا۔ فاہین گیارہ سال تک ہندوستان میں رہا۔ اور اس عرصہ میں اس نے شمالی ہندوستان کے قریباً تمام بڑے بڑے شہروں کی سیر کی اور بدھ مذہب کی کتابیں اور روایتیں فراہم کرکے ۴۱۱ء میں چین واپس چلا گیا۔ فاہین نے اپنے سفر کے حالات ایک کتاب کی صورت میں جمع کئے ہیں۔ جن سے ہندوستان قدیم کے حالات پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ گو فاہین گیارہ سال تک ہندوستان میں رہا اور جہاں جہاں پہنچا۔ وہاں کے حالات اپنے سفرنامہ میں قلمبند کرتا رہا۔ لیکن تمام کتاب میں ایک جگہ بھی وہ ہندوستان کے مہاراجہ چندر گپت ثانی کا نام نہیں لیتا۔

اس خاموشی کی وجہ عام طور پر یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ کتابوں کے نسخے حاصل کرنے میں اس درجہ تک منہمک تھا۔ کہ اسے فرمانروائے ہندوستان کا نام لکھنے کی بھی فرصت یا ہوش نہ تھا لیکن یہ وجہ چنداں معقول معلوم نہیں ہوتی۔ یقیناً اس خاموشی کی کوئی اور وجہ ہے۔

فاہین کے یہاں آنے کی اصل غرض و غایت بدھ مذہب کی کتابوں کی تلاش تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب تک وہ یہاں رہا اس کا ذہن سوائے کتابوں کے اور کسی طرف منتقل نہ ہوا۔ اس کے سفر کے حالات یقیناً مشرح و مبسوط ہیں۔ لیکن وہ اس نے اس ارادے سے نہیں لکھے تھے۔ کہ ملکی معاملات پر روشنی ڈالیں۔

جو کچھ اس زمانے کے ہندوؤں کے متعلق ہمیں معلوم ہے وہ مورخین نے نہایت غور اور تحقیق کے بعد اس کے بعض بیانات سے اخذ کیا ہے ورنہ فاہین کے سفرنامہ میں براہ راست کوئی ایسی شہادت موجود نہیں جن سے چندر گپت کے طرز حکومت یا اس زمانہ کے عام حالات کے متعلق ہم کوئی قطعی رائے قائم کرسکیں۔

فاہین ۳۹۹ء میں چین سے روانہ ہوا اور صحرائے گوبی میں سے گزرتا ہوا وسط ایشیا کے مشہور شہر ختن میں پہنچا۔ اس زمانہ میں وسط ایشیا کے لوگ بدھ مذہب کے پیرو تھے۔ چنانچہ فاہین ختن میں اپنے ہم مذہب لگا [illegible] [redacted]

ہوا۔ سوات پہنچا۔ اور وہاں سے ٹکسلا کے راستہ پشاور میں جاکر قیام کیا۔ پشاور سے چلکر پنجاب اور ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کی سیر کرتا ہو پٹالی پترا (پٹنہ) آیا۔ جہاں وہ تین سال تک مقیم رہا۔ پٹالی پترا سے یہ من چلا سیاح تام راپستی گیا۔ یہ شہر ان دنوں ضلع مدناپور واقع بنگال میں ایک مشہور بندرگاہ تھا۔ لیکن اب یہ سمندر سے ساٹھ میل کے فاصلہ پر اندرون ملک ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ ورنام لوک کہلاتا ہے۔ تام راپستی کے بندرگاہ سے سمندر کے راستہ نکلا اور جاوا کی سیر کرتا ہوا فاہین سنہ ۴۱۴ء میں پورے پندراں سال کے سفر کے بعد اپنے ملک میں واپس چلا گیا۔

فاہین نے پٹالی پترا میں تین سال تک قیام کیا وہ لکھتا ہے کہ اس سلطنت میں بہت بڑے بڑے شہر واقع ہیں۔ لوگ خوشحال اور فارغ البال ہیں سڑکوں پر مسافروں کے آرام کے لیے سرائیں اور ڈاک بنگلے ہوئے ہیں۔ ملک میں دھرم ارتھ کے کاموں کی کوئی کمی نہیں۔ ہر شہر میں شفاخانے اور مویشیوں کے ہسپتال قائم ہیں۔ اس زمانہ میں پٹالی پترا میں اشوک کا عالیشان اور خوبصورت محل موجود تھا۔ فاہین اس کی خوبصورتی اور صناعی کو دیکھکر بہت حیران ہوا۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ انسان کا بنایا ہوا معلوم نہیں ہوتا۔ اسے ضرور دیوتاؤں یا فرشتوں نے بنایا ہوگا۔ افسوس ہے۔ کہ گردش زمانہ سے یہ شہر بالکل تباہ ہوگیا۔ اور اب موجودہ پٹنہ سے تین میل کے فاصلہ پر اس کے کھنڈرات برآمد ہوئے ہیں۔ جن سے اس وقت بھی فاہین کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔

فاہین ہندوستان کے نظام سلطنت کو دیکھکر بہت متاثر ہوا۔ لوگ بغیر پروانہ راہداری لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ جاسکتے تھے۔ راستے میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہوتی تھی۔ ملک میں بالکل امن و امان تھا چوری اور ڈاکے کا کہیں نام ونشان تک نہ تھا۔ چنانچہ فاہین نے اپنے طویل سفر کے دوران میں ایکدفعہ بھی چوروں اور قزاقوں کے ہاتھ سے نقصان نہیں اٹھایا۔ مجرموں کو حسب حیثیت جرمانہ دینا پڑتا تھا۔ قید یا نظر بندی کا دستور نہ تھا۔ باغیوں کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا جاتا تھا۔ ان دنوں ٹیکسوں (محصولات) کی بھرمار نہ تھی۔ حکومت کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ مالگذاری تھا۔ جو غالباً دس فیصدی سے زیادہ نہ تھی۔ اور کبھی انعام واکرام کے طور پر جاگیریں بھی

فاہین لکھتا ہے۔ کہ شمالی ہندوستان میں اہنسا کا جذبہ بہت زوروں پر تھا۔ کوئی شخص جیو ہتھیا نہیں کرتا تھا۔ اور سوائے چنڈالوں کے کوئی شخص بھی لہسن پیاز نہیں کھاتا تھا۔ بعض مورخوں نے فاہین کے اس بیان کو صحیح نہیں سمجھا کہ اس زمانہ میں جانوروں کے مارنے کا دستور نہ رہا تھا۔ اور جو شخص [illegible]

میں لوگ عام طور پر بدھ کے پیرو تھے۔ جن کے مذہب میں کسی جاندار کا قتل بہت مذموم سمجھا جاتا تھا اس لئے ہندوستان کے مذاہب پر گہری نظر ڈالنے والے فاہین کے بیان کو ذرا بھی شبہ کی نظر سے نہیں دیکھ سکتے۔

فاہین کے زمانہ میں شمالی ہندوستان میں بدھ مذہب کا عام طور پر چرچا تھا۔ دریائے سندھ اور جمنا کے درمیانی علاقہ میں جہاں کہیں گیا۔ اس نے بدھ مذہب کو سرسبز پایا۔ دریائے جمنا کے کنارے پر کئی شہر خاص طور پر بدھ مذہب کے دلدادہ تھے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے۔ کہ صرف متھرا میں بدھوں کے بیس راہب خانے تھے۔ جن میں تین ہزار راہب رہایش رکھتے تھے۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس زمانہ میں بدھ مذہب کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ بادشاہ خود "نئے ہندومت" کا پیرو تھا۔ اور بدھ اور اُس کے معبدوں کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا۔ حکومت کی آنکھیں پھری ہوئی دیکھ کر بدھ کے پیرو ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں بدھ سے منحرف ہو کر ہندو مذہب میں داخل ہو گئے۔ گیا کا مشہور شہر جو کسی زمانہ میں بدھ مذہب کا مرکز تھا اُجڑ گیا۔ اور بدھ گیا کے مشہور تیرتھ گھنے جنگلوں کے نیچے دب گئے۔ کپل وستو۔ کوسی نگر۔ اور سرسوتی کے مشہور شہر ویران ہو گئے۔ یہاں تک کہ ان میں سوائے چند راہبوں کے ایک انسانی شکل بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ چندر گپت اور اس کے جانشینوں کی توجہ سے ہندو مذہب میں نئے سرے سے جان پڑ گئی۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ان راجاؤں کے عہد کے جس قدر کتبے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان پر برہمنی مذہب کے دیوتاؤں کے نام درج ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ گپتا بادشاہوں کے زمانہ میں لوگوں نے بہت سے مندر اور غریب خانے بنوائے اور اپنے دیوتاؤں کے نام وقف کر دئے۔ ان واقعات سے بدھ مذہب کے زوال اور ہندو مذہب کی تجدید پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔

سید عبد القادر ایم۔ اے

غزل

کیا فائدہ ہے عرض محبت کے طول سے ۔۔۔ سنتا نہیں کسی کی وہ سمع قبول سے

منظور ہے کرم تو تغافل کو چھوڑئیے ۔۔۔ کوئی سلوک کیجئے لیکن اصول سے

کہتے ہیں زندگی میں تمنا نہ کیجئے ۔۔۔ کچھ کم فضول یہ بھی نہیں اس فضول سے

تھا عرض مدعا یہ مرا ختم مدعا ۔۔۔ کہتا میں دل سے سنتے وہ گوشِ قبول سے

زیرِ سپہر جو فلکوں کچھ عجب نہیں ۔۔۔ ہاتھ آئے صبحِ عیش شبِ غم کے طول سے

ہے بستہ ... ۔۔۔ فطرۃ کو اس قدر جو محبت ہے بھول سے

[redacted]

سیر ماہتاب

ڈاک کا ہرکارہ ۴۵ سال کا لکھا ہوا ایک خط لایا۔ اس پر دنیا کے کسی ڈاک خانہ کی مہر نہ تھی۔ وہ خط صندوقچی میں ڈالکر چلا گیا۔ وہ کون تھا مجھے یہ بھی علم نہیں۔ ایسا یاد ہے کہ اس کی شکل ہماری صورتوں سے مختلف تھی اُسے کوئی عجیب و غریب چیز کہنا چاہیئے۔

اس پر دنیا کے کسی ڈاک خانہ کی مہر نہ تھی۔ لنڈن۔ پیرس۔ ٹوکیو وغیرہ مختلف مقامات سے مجھے اکثر خطوط آتے ہیں۔ ہر مقام کی مہر خوب اٹھا سکتا ہوں۔ مگر اس پر کوئی ایسا نشان نہ تھا جس سے معلوم ہو کہ دنیا کے کس گوشہ سے روانہ ہوا ہے۔ مگر یہ مجھے کس طرح معلوم ہو گیا۔ کہ یہ خط آج سے ۴۵ سال قبل روانہ ہوا مجھے خود تعجب ہے۔ میرے لئے معمہ ہے ۔

میں برآمدہ میں آرام کرسی پر بیٹھا تھا کہ اچانک ایک گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ خادم نے کہا حضور ایک بادپائے آہنی (بیسکل) کا سوار مکان کے سامنے مؤدب استادہ ہے حضور کی اجازت کا خواستگار ہے مگر میں خاموش رہا۔ مجھے مجسطی کا مطالعہ ایک اجنبی کی شناسائی سے زیادہ محبوب تھا۔ میں نے کچھ خیال نہ کیا۔ لیکن تھوڑے سکوت کے بعد میری پاس ایک محبت نامہ پہنچا جس میں میرے ایک عزیز کے متعلق چند پیشگوئیاں درج تھیں کہ فلاں فلاں اوقات میں اسے اختلالِ مزاج کا اندیشہ ہے۔ نامہ بر چلا گیا۔ اُس کی دھندلی سی یادداشت اب بھی باقی ہے۔ نامہ بر ہمارے اندازۂ رفتار کے مطابق ۱۸۶ $\frac{3}{4}$ میل یومیہ سفر طے کر کے $\frac{1}{2}$۳ سال کے طویل عرصہ میں اس مقام تک پہنچا۔ لیکن افسوس میں نے اس کی تواضع نہ کی وہ ناشاد واپس چلا گیا۔ مگر میرے دل کو تسکین ہے۔ کہ اس کے اپنے دیس کے حساب کے مطابق اس نے یہ تمام منزل $\frac{1}{2}$۳ دن میں طے کی۔ یہ ایک مل طلب معمہ ہے۔ میں حیران ہوں کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ ساڑھے تیس سال کا سفر ۳ دن اور چودہ گھنٹوں میں ختم ہو جائے۔ یہ کیا دیوانگی ہے۔ مجھے تعجب آتا ہے میرے لئے یہ ایک چیستاں ہے

تمام دن اسی سوچ میں گذرا۔ ناگہاں ایک طیارہ فراٹے بھرتا ہوا میرے سر سے گذرا۔ اور جاتے ہوئے ایک سندنامہ جو میری جذباتِ جلیلہ کے متعلق مجھے حاصل ہوتا تھا۔ پھینک کر غائب ہو گیا۔ یہ سو کیلومیٹر فی گھنٹہ کے حساب سے اڑ رہا تھا۔ اور آج اسے منزلِ اوّل سے روانہ ہوئے ۱۶۰ دن گزر چکے تھے۔ سندنامہ میں صرف دو تین سطریں تحریر تھیں۔ اور پشت پر حکیم نورالدین اندلسی بطلیموس مصری اور نصیر الدین طوسی کے دستخط ثبت تھے ۔

کیا یہ خطوط اُن دیکھے جہاں سے رفتگان کی روحوں نے ہمارے لئے روانہ کئے۔ میں حیران ہوں

کہ الٰہی یہ کیسا طلسم ہے۔ اس قسم کے خطوط مجھے کیوں آتے ہیں۔ کہاں سے آتے ہیں؟ کون بھیجتا ہے؟ کس لئے بھیجتا ہے؟ یہ کیا راز ہے۔

ان ہی خیالات میں مستغرق تھا۔ کہ ایک مہیب اور خوفناک سبب گولا سطح زمین سے بلند ہوتا ہوا دکھائی دیا گویا ایک پارۂ کوہ تھا جو آتش خیز مادہ کی ضرب سے سطح زمین سے بلند ہوا تھا۔ طلسم ہوش ربا میں منشئ سحر طرازی کے اس قسم کے افسانے نظر سے گزرے تھے۔ وہ منظر آنکھوں میں پھر گیا۔ دل پھڑک اٹھا حیران ہو گیا۔

سراسیمگی حیرت سی حیثیت زن تھی مرغ دل بےچین تھا۔ غور سے دیکھا کہ یہ کیا بھید ہے۔ اتنے میں سورج غروب گیا۔ شفق حنا پیکر چاندنی پر نثار ہو گئی۔ ماہتاب کا جمال نیلوفری آسمان پر حکمرانی کرنے لگا ستارے دیدہ باز تھے۔ چاروں طرف چاندنی چٹک رہی تھی۔ لیکن وہ مہیب گولا جو سطح زمین سے بلند ہوا تھا۔ میری نظر کے سامنے تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ تیز رفتار گولا پونے آٹھ میل ثانیہ کے حساب سے ۱۲ کیلو میٹر فی ثانیہ ابتدائی زور کے ساتھ فضائے سکوں کو چیرتا ہوا بلندیوں میں غائب ہو گیا۔ اب خوف سے جان لرز اٹھی مبادا کہ عالم خواب میں یہ پہاڑ تی کا پشتارہ سقف بالاخانہ پر آ گرے اور قفس عنصری کی تیلیاں چور چور ہو جائیں۔ اس کشمکش میں حرام ہے جو مجھے نیند آئی ہو میں پہروں جاگتا رہا۔ تارے گنتا رہا لیکن متجسس نگاہیں گولہ پر ٹکٹکی باندھے تھیں۔ ایک سیاہی کا داغ تھا۔ جو دل کو کھینچ رہا تھا۔ آخر نصف شب گزرنے پر یہ تمام راز افشا ہو گیا۔ لاسلکی سلسلۂ پیام کے تار دنیا کے گوشہ گوشہ میں دوڑ گئے۔ کہ امریکن یونیورسٹی کا ایک پروفیسر ماہتاب پر چاند ماری کرنے میں پورا اترا۔ اب انسانی خونریزی سے دست کش ہو جانا چاہیئے افریقہ اور قطبین کی مہموں کی بجائے فضائے آسمانی میں خلا نوردی کیلئے نئی فتوحات کے راہ کشادہ کئے جائیں۔ ماہتاب کو زیر نگیں کیا جائے۔

زمین پر ایک بھونچال سا معلوم ہوا۔ سمندر کی چادر گوہر بار نے ساحل کو یامراد کیا۔ سیپ اور کوڑیاں چٹانوں سے ٹکرائیں ایک زور کا دھما کا تمام کائنات میں محسوس ہوا۔

یہ کیا تھا؟ ماہتاب کی اس کشش کا اثر جو زمین اور چاند کے درمیان ہے۔ اب دیکھنا چاہیئے۔ کہ فضاء آسمانی کا یہ تابناک جوہر جو سینے میں ایک داغدار دل رکھتا ہے کیا ہے۔ اکثر اسے بزم فلک میں حرف زن دکھا گیا گاہے آتش بجام پایا گیا۔ بارہا ایسے عالم میں جب دنیا محو سکوت تھی۔ ہوا پابند سکوت تھی۔ کائنات کا ذرہ ذرہ شیدائے سکوت تھا۔ بارہا یہ خیال آیا۔ کہ کاش میرے بازوؤں کے ساتھ فرشتوں کے دو پر ہوتے۔ کہ اس پیاری پیکر نوری کرہ کے پاس اڑ کر چلا جاتا۔ اس سے لپٹ جاتا۔

[redacted]

تمام امنگوں کی کلی حسرت کے کانٹوں میں لپٹ کر رہ گئی۔ وہاں کی زندگی کے حالات کے لئے دل ایسا ہی بےچین رہا بے قرار رہا۔ سیماب مثال بیتاب رہا۔

بچپن میں جب نشاطِ بچپن کی بنی ہی کے مزے آغوشِ مادر میں انگڑائیاں لیا کرتے تھے یا ممیرکی انگلی میں غضب کی کشش تھی کہ بزمِ شہود کے تماشہ کے لئے اسے پکڑے چلا جاتا ۔ یہ چمن قدرت کا آبگینہ ایسا ہی دلفریب تھا جیسا کہ اس کی عجائبات اس سنجیدگی کے عالم میں تعجب انگیز اور ہوش ربا ہیں مگر اسوقت یہ ایک خزانہ استعجاب تھا۔ دفینہ حیرت تھا۔ مگر اسوقت یہ آئینہ عبرت ہے جسمیں قدرت کا جمال خود پرتو افگن ہے۔ محبت پرور ہے۔

شاعر نے چاند کا نقشہ کھینچا شاہد رعنا کے رخ وبدہ افروز سے تشبیہ دی۔ ابر و مشیہ یہ کیا مطرز وساقی کا حریف بنایا۔ کبھی یہ پرچم توحید پر نور کی کرن بنکر چمکا امیدوں کی شعاع بنکر جلوہ پیرا ہوا کبھی عید کا پیام تھا۔ گویا خود نبیذ جام بنکر آیا دل کی کلی دوبارہ تازہ ہوئی مہک اٹھی +

کبھی دل سے تشبیہ دی گئی جو زخم خوردہ عشق و محبت ہو کبھی کہا گیا کہ یہ پروانہ محبت ہو عشق مجسم ہے دیوانہ ہے سودائی ہے۔ فلک پیمائی اس کا شیوہ ہو چکا ۔ فضا نوردی اس کا رویہ ہو گیا۔ وارفتگی اس کا چلن ٹھیرا۔ اس نے راہِ عشق میں خود کو گم کر دیا۔ حیران کر دیا۔ تباہ کر دیا۔ برباد کر دیا۔

کبھی اس کے عروج و زوال کی داستان نے بزم رفتنی کا نقشہ کھینچا۔ لذات دنیا سے دل کو چھڑایا ذاتی خوبی اور جوہر کی طرف دعوت دی گئی ۔ الغرض تشبیہات کے پل کے پل باندھ دیئے گئے۔

جذبات کے فوٹو کاغذ پر اتارے گئے۔ لیکن حقیقت اس تصویر نگاری سے بے سامان نکلی تجسس کار اس تمام کیفیت سے بہرہ مند نہ ہوئی کرۂ تابندہ گوہر جسمیں ایک شکستہ کھنڈر انسان رخ زیبا تن کا عکس انداز ہے۔ ہماری زمین کی طرح ایک اجڑی بستی ہے۔ جو کبھی آباد ہوگی۔ اب برباد ہے کبھی نازکشِ عروج ہوگی اب خاکسارِ زوال ہے۔ ایک اجڑا مسکن اور ویران ٹھکانہ ہے ۔ . . . جہاں آگ پانی ہوا۔ نباتات و حیوانات کا کوئی نشان نہیں۔ وہاں کبھی متنفس ہونگے۔ اب وہ کائنات حسنیا سے خالی ہے۔ وہ تعجب انگیز بستی کیا چیز ہے جسمیں نہ آگ نہ پانی نہ ہوا نہ حرارت نہ نباتات نہ چرند نہ پرند۔ بلکہ ایک ہو کا عالم۔ موت کی صورت کامل سکوت ایک ڈراؤنی اور خوفناک زمین گورستان کی طرح بھیانک اور روح فرسا۔ جہاں خوف و ہراس کی ہولناک صورتیں ہیبت کی بلائیں لیتی ہوں۔ اضطراب پر نثار ہوتی ہوں بیم و خطر پر قربان ہوتی ہوں۔ دہشت پر فدا ہوتی ہوں . . . . اور ایک بربرا اور چٹیل زمین میلوں تک

[illegible]

تک پہنچ جائے۔ ایک ثانیہ میں ہر متنفس بٹیر کی طرح بھونک ہو جائے۔ سردی اتنی کہ پارہ کی پوزیشن صفر سے ۳۰۰ درجہ تک نیچے اتر آئے۔ اس قسم کی تعجب انگیز سنگلاخ زمین۔ بیرنگی دنیا جو ہوا اور پانی کے نشان سے بھی معرا ہے اکثر حسن و جمال کی ملکہ بنکر ہماری تاریک راتوں کو روشن کرتی ہے بزم آرائیاں کرتی ہے۔

اس میں موسموں کا تغیر و تبدل ایک بڑے خیال کی بات ہے۔ بہار کی چمن آرائی اور نزہت افزوزی۔ برکھا کی شادابی اور زینت کاری خزاں کی تباہی اور بربادی تخیل آفرینی اور بلند پروازی کا انتہائی خیال ہے۔ دھنک جو ساون کے مہینہ میں رنگ آفرینی اور قدرت کی گلکاریوں کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ جو اس نیلگوں آسمان کے دونوں گوشہ ملاتی ہے یہاں ایک موہومی چیز ہے۔ جو ابتدائے آفرینش سے آنکھوں کی پتلیوں نے آجتک نہ دیکھی۔

وہ سنسان زمین کیا ہوگی ایک موت کا ٹھکانا ہے شاید ہماری روحیں وہاں قیام پذیر ہوتی ہوں غروب آفتاب کے وقت سحاب لالہ اندام سطح آب میں ایک دلاویز عکس پیش کرتا ہے۔ مگر اس کرہ عالم میں یہ دلکش نظارہ ایک خیالی بات ہے۔ وہم و گمان ہے شفق جو افق نخلئے گاہ کے ماتھے پر شعرار کے خون جگر سے ایک قشقہ کھینچتی ہے بالکل مفقود ہے۔ ہاں روشنی کی ایک تار پیہم صبح و شام افق نمایاں کرتی ہے۔ سورج کی ٹکیا جو سوا دو منٹ سے زیادہ تاباں نظر نہیں آتی۔ یہاں گھنٹوں بحر نور میں غوطہ زن دکھلائی دیتی ہے۔ جیسے حسن و جمال کی کوئی پری بحر فضا میں نہا رہی ہو۔ یہاں کا کیلنڈر ہمارے کیلنڈر سے ضرور مختلف ہوگا صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ اس کرۂ عالم کا ایک دن ہمارے حساب کے مطابق ۳۵۴ گھنٹوں کا ہے۔ راتیں بھی ایسی ہی طولانی ہیں۔ لیکن وہاں کا روز روشن ہمارے دن کی نسبت زیادہ منور اور تابناک ہے۔ چاندنی راتیں بھی ہماری نسبت زیادہ لمعہ ریز ہیں۔ زمین اس کرہ کائنات کے لئے بدر و ہلال کے نقشے پیدا کرتی ہے۔ مگر یہ ہلال ہمارے چاند سے ۵۰ گنا بڑا ہوتا ہے۔ گویا شہسوار فلک کی بے نیام تلوار جوہر تابی کے جلوے دکھاتی ہے۔ یہ اسی طرح چڑھتا بڑھتا ہے اور غروب ہوتا ہے۔ زمین جو اس مقام سے ۲۳۸۸۳۳ میل کے فاصلے پر خلا میں معلق ہے۔ اس طرح معلوم ہوتی ہے کہ ایک بڑا ستارہ ہے جو کلاہ آسمان میں چمک رہا ہے۔ ایسا دلکش اور پرتجمل کہ اس کا دلفریب منظر پیکر مضمون میں اتارا نہیں جا سکتا جس دن کہ خنجر ہلال ہماری امیدوں کو تازہ کرتا ہے۔ ہماری زمین اس کرہ پر بدر کی صورت میں چمکتی ہے۔ اس کی روشنی اس قدر تیز اور تابناک ہوتی ہے۔ کہ

یہ مہیب اور خوفناک کرہ جس کا قطر ۲۱۶۰ میل کے قریب ہے۔ انگشتری نما سلسلہ کوہ و کوہسار سے بھرپور ہے جنکی تعداد ۳۲۸۵۶ کے قریب معلوم ہو چکی ہے۔ اور بعض کی بلند چوٹیاں ۲۶ ہزار فٹ اونچی پائی گئی ہیں۔ جنوبی حصّہ میں الپائن پہاڑ کا سلسلہ ۱۶۰ میل کی گہرائی میں ۴۰۰ میل تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے دامن میں ایک بے آب و گیاہ صحرا کا ایک ٹکڑا ہے جو بحیرۂ بخارات سے موسوم ہے۔ اسی سلسلہ میں جبل گرگ ۱۱ ہزار کی بلندی تک سرکشیدہ ہے۔ کوہ موبرت کی چوٹیاں جو ۱۹ ہزار فٹ بلند ہیں بحیرہ کہر کے کنارے ایستادہ ہیں۔ ذرا شمال کی جانب کوہ بلانک کے سلسلہ میں دائرہ فلاطون ایک نہایت ہی تعجب انگیز مقام ہے۔ یہ ایک آتش افشاں پہاڑ کی سرد شدہ بھٹی ہے جسمیں ایک مخروطی ستون اس زمانے کی یاد تازہ کر رہا ہے جبکہ سیال مادہ ابل ابل کر بہہ رہا تھا۔ راہوار نظر اس مقام کو چھوڑ کر بحر ظلمات کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ جو بحیرۂ بخارات کی طرح ایک بے آب و گیاہ ریگستان کا ٹکڑا ہے اس کے شمال کی جانب چند چھوٹے چھوٹے سلسلہ ہائے کوہ طے کرنے کے بعد ہپارکس اور بطلیموس کے انگشتری نما پہاڑ نظر آتے ہیں جن کا قطر کسی طرح سے بھی ۱۲۵ میل سے زیادہ نہیں۔ سابقہ پہاڑوں کی طرح یہ پہاڑ بھی نوکدار اور گاؤدم ہیں جنوبی دامن میں ایک کشادہ وادی ہے۔ لیکن اس کے کنارے پر اس قدر گنجان پہاڑوں کا سلسلہ ہے کہ تخیل کا فوٹوگرافر بھی زمین پر اس کا منظر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ بعض چوٹیاں ساڑھے چھ ہزار اور دس ہزار کے درمیان ہیں اور بعض کا قطر بارہ میل سے بھی کم ہے۔ جبل کلیوس جو انتہائی گوشہ پر واقع ہے ۱۶ ہزار فٹ بلند ہے۔ قطب جنوبی کی جانب بلند و بالا پہاڑوں کی ایک باڑ ہے۔ ناممکن ہے کہ اگر کوئی متنفس وہاں پہنچ بھی جائے تو اس کو عبور کر سکے۔ بعض چوٹیاں ایورسٹ کو نظر حقارت سے دیکھتی ہیں لیبنز اور ڈیورفل کی چوٹیاں ۲۵ ہزار اور ۲۶ ہزار فٹ بلند دیکھی گئی ہیں افسوس کہ اس عجب سیر میں صرف ایک جانب کا نظارہ پیش ہوا۔ معلوم نہیں کہ اس کرہ کا دوسرا طرف کا خاکہ کس قدر دلکش ہو۔ لیکن دونوں سروں کی حرکت سے گاہے گاہے دوسری جانب کا تھوڑا سا حصّہ نظر سے گزرتا ہے۔ گمان ہوتا ہے۔ کہ ماہتاب کی دوسری جانب بھی ایسی ہی سنگلاخ اور پتھریلی ہے۔ جیسی کہ یہ طرف پہاڑ جو اس سطح کا جزو عظیم ہیں۔ سورج کی شعاع میں ہم خاک نشینوں کو درخشاں و تاباں نظر آتے ہیں اور نیلے نیلے داغ جو کلف کی طرح رُخ ماہتاب پر رونما ہیں جیسے معلوم ہوتے ہیں صحرا و دشت کے ٹکڑے ہیں۔ جس میں ریت اور مٹی کے اجزا پانی کے قطرے کو ترس رہے ہیں کیا ہوا اگر یہ زمین سنگلاخ شدت حرارت کو پیش کرتی اگر ایسا ممکن ہو کہ اس کرۂ ارض کا

لیکن تنفس اس کرۂ قمر تک پہنچ جائے۔ تو وہ اپنی معمولی رفتار کے مطابق اس تمام کرہ قمر کو نصف شب کے قلیل عرصہ میں طے کر سکیگا۔ اور اس کی بڑی بڑی چوٹیاں معمولی گھنٹوں میں چڑھی جا سکینگی کیونکہ جو فرد یہاں ۲۰ فٹ جست لگا سکتا ہے۔ وہاں آسانی سے ۱۲۰ فٹ پھلانگ سکتا ہے۔ اگرچہ وہ یہ دیکھ کر بیتاب ہی کیوں نہ ہو کہ اس کا ڈیڑھ من وزن گھٹ گھٹ کر صرف دس سیر ہی رہ گیا ہے۔

یہ دلچسپیوں کی زمین کس قدر استعجاب انگیز نقشے پیش کرتی ہے۔ دل یہی چاہتا ہے کہ کسی طرح اڑ کر وہاں چلا جاؤں۔ اور اس خلوتخانۂ فضا میں جہاں ہر چیز پابند سکون ہے۔ اضطراب کی چند گھڑیاں گزاروں۔ اور وہاں ایک لمحہ کے لئے سوچوں کہ وہ منظر جو اس مستعار کے بغیر آئیگا۔ کیسا ہی دلچسپ ہوگا۔ جہاں نہ جہات کی پابندی ہوگی۔ نہ وقت کا تلازم ہے ہوگا۔ صرف ذات الٰہی کا نور پرتو فگن ہوگا۔ اور ہماری بیقرار روحیں اس نور کی طرف پیہم رواں ہونگی

غلام عباس خاں۔ ایم۔ اے

جذبات جوش

افشائے راز عشق کا ساماں کئے ہوئے — آیا ہے حسن بال پریشاں کئے ہوئے
پھر مست چل رہی ہے ہوا کوہ و دشت میں — دنیا کو اپنی رو میں گلستاں کئے ہوئے
کم ہو چلی تھیں دل کے دھڑکنے کی کاہشیں — پھر آگیا وہ زلف پریشاں کئے ہوئے
خنجر بکف بڑھا ہے مری سمت حسن پھر — کہنی تک اپنے ہاتھ کو عریاں کئے ہوئے
پھر آ رہا ہے میری طرف مطرب جنوں — ہر شے کو اپنے ساتھ غزلخواں کئے ہوئے
پھر آکے اس نے حسن کا اقرار لے لیا — مدت ہوئی تھی دل کو مسلماں کئے ہوئے
پھر پردۂ حجاز میں آیا ہے حسن دوست — بے طرح قتل جوش کا ساماں کئے ہوئے

جوش ملیح آبادی

ذکی مرحوم

حافظ سید محمد ذکریا خاں نام۔ ذکی تخلص۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ اور وہاں کے سادات عظام میں سے شمار کئے جاتے تھے۔ ان کے والد سید محمود خاں خود بھی صاحب دیوان تھے

ذکی مرحوم کی پیدائش ۱۸۳۹ء میں شاہجہاں آباد میں ہوئی۔ غدر سے پیشتر پنڈت رام کشن بسمل میرزا غالب اور شیخ امام بخش صہبائی سے منطق طب ریاضی اور فلسفہ کی تعلیم پائی۔ ماسوا اردو کے فارسی نظم ونثر میں بھی قدرت رکھتے تھے۔ ہنگامہ غدر میں انہوں نے دہلی سے قدم باہر نکالا۔ اور روزگار کی تلاش میں بدایوں۔ میرٹھ۔ الہ آباد۔ اور بریلی پھرتے رہے۔ آپ کی عمر کا آخری حصہ بدایوں میں بسر ہوا۔

۱۹۰۰ء میں تقریباً ۶۰ سال کی عمر پاکر جہانِ فانی کو خیرباد کہا۔ نواب ذکی قدیم تہذیب کا ایک نمونہ تھے۔ مولوی حشمت اللہ صاحب تمت۔ پنڈت جواہر ناتھ کول۔ ساقی دہلوی۔ اختر صدیقی ان کے نامور شاگردوں میں سے ہیں۔

ادب کو ذکی مرحوم کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ مگر یہاں یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ غالب نے انہیں چند سطور بطور سند شاعری لکھ کر عطا کی تھیں۔ جنپر انہیں بھی فخر ہونا بجا تھا۔ مرحوم ان کو بڑے فخر سے اپنے احباب کو دکھایا کرتے تھے۔

کسی انگریزی فلسفی نے کہا ہے کہ اگر مجھ سے شاعر کی نسبت دریافت کیا جائے تو میں یوں جواب دونگا کہ شاعر وہ ہے کہ جس کا دل حد سے زیادہ حساس ہو۔ قاعدہ ہے کہ ایک حساس شخص کسی غیر معمولی واقعہ کا۔ کسی خوبصورت چیز کا یا رنج والم کا اثر دوسرے لوگوں سے زیادہ ہوتا ہے یہی حالت شاعر کی سمجھ لیجیے۔ کہ وہ فطرت کی ہراک چیز کو دیکھ کر وجد میں آجاتا ہے۔ اور اس کے منہ سے خودبخود کلام موزوں نکلتا ہے۔ آگے اس کا کلام کا نقائص وعیوب سے پاک ہونا۔ اور اس کلام کا اثر شاعر کے کمال پر دلالت کرتا ہے۔

رندانہ ہوس پرستی کو چھوڑ کر حسن وعشق کی صحیح واردتیں اور ان کا اثر بیان کرنا ذکی مرحوم کا خاص کمال ہے۔ مندرجہ ذیل مثالیں اس کی شاہد ہیں۔

(۱) معشوق کے جلوے کا اثر۔ ساتھ ساتھ اہلِ تماشا کا وہ تشنہ رہ جانا + اللہ اللہ تیرا جانبِ محشر جانا۔

(۲) جنون کی عزت۔ کھل گیا عاشقِ دیوانہ کا دانا ہونا + خاک اڑ آنے کو تری کوچے میں اکثر بانا

(۳) مسلکِ رضا۔ غیر کے حق میں نہ کہیو دلِ ناداں کوئی حرف + وہی بہتر ہے جسے یار نے بہتر جانا۔

(۴) شبِ غم۔ شبِ غم مرتے ہی آخر ہوئی یعنی برابر ہے + نکلنا جان کا آسان ہونا ایک مشکل کا۔

(۵) ہمزبانیِ اربابِ وفا۔

لبوں سے جان ہی نکلے تو حرفِ مدعا نکلے — کلیم آساں نہیں اہلِ وفا کا ہمزباں ہونا

(۶) معشوق کی بے اعتنائی ؎

غضب ہے اب تغافل مجھ سے میں دم بخود ہوں کہ میرا دل ٭ فریب مہر دے کر آپ کی آنکھوں نے چھینا تھا

(۷) حیرانیٔ عشق ؎ ہم جان و دل تو نذرِ غمِ عشق کر چکے - حیران ہیں اب لٹائینگے راہِ وفا میں کیا -

(۸) امتحانِ ضبط ؎ امتحانِ بزم میں ٹھہرا ہے جگرداری کا - دلِ بیتاب سنبھل جا وہ ادھر دیکھتے ہیں

حسرت موہانی کا ایک شعر بھی اسی طرح کا ہے - ؎

بہت مجھ پہ وہ مہرباں ہو رہے ہیں مرے ضبط کا امتحاں ہو رہا ہے

(۹) ذوقِ اسیری ؎ بڑھا ذوقِ اسیری جب انہوں نے - کہا کہدو کہ بیتاب سے رہا ہیں -

(۱۰) گم شدگیٔ حسرت ؎ کہاں ہے حسرتِ ذوقِ تپیدن + دلِ بسمل وہ خنجر آزمائیں -

(۱۱) انتہائے شوق ؎ اُڑے جاتے ہیں مگر شوق میں اربابِ وفا + راہ میں ورنہ کہیں نقشِ کفِ پا ہوتا -

(۱۲) طرزِ دلبری ؎ تری وضعِ تغافل میں ہلاک بیکساں مخفی + تری طرزِ تبسم سے عیاں آرامِ جاں ہونا

تلازمہ الفاظ کا سحر شعر کو لے اڑا ہے -

(۱۳) تغافل سازگارِ دردِ اہلِ شوق کیا ہوگا ادا سے دو فریب ایسا کہ دل دیوانہ ہو جائے

اب ہم ذکی مرحوم کی اس صفت کو لیتے ہیں جس کے لئے وہ مخصوص ہے یعنی مضمون آفرینی ذکی مرحوم کے کلام میں دونوں طرح کی مضمون آفرینی پائی جاتی ہے یعنی کسی پرانے خیال کو نئے پیرائے میں بیان کرنا - اور ایک نیا مضمون پیدا کرنا - ذیل کی مثالیں ملاحظہ ہوں -

(۱) شرم پر اسکی مٹا ہوں کہ نظر کو جس کی ننگ ہے پردۂ مژگاں سے کبھی باہر جانا

(۲) سکونِ دل سرورِ چشمِ زنگار رنگ حاصل ہو ترا دیدار ہے نظارۂ باغِ جناں ہونا

(۳) یہ مٹ نہ جائے کہیں نقشِ آب کی مانند کہ تابِ موجِ نفس جسمِ ناتواں میں نہیں

(۴) دہن سے اُنکے کھلا مجھ کو رازِ بیم و امید وہ بات کرتے ہیں ایسی کہ نکلے ہاں میں نہیں

(۵) اشکِ خوں کی یہ تراوش ہو تو کیونکر مانوں جگر و دل میں جراحت نہیں ناسور نہیں

(۶) ادائے شوخ جب دل چھین کر آزردہ کرتی ہے نگاہِ صلح جو اُٹھتی ہے عاشق کے منانے کو

(۷) اسیری میں تباہی رونق کاشانہ ہو جائے قفس ہی نالوں سے جل کر چراغ خانہ ہو جائے

(۸) رہائی میں مجھے بھی تھا نہیں حسرت اسیری کی سمجھ لیتے اگر اپنا تو وہ آزاد کیوں کرتے

(۹) نفس نفس ہے نسیمِ وفا محرکِ شوق یہ وہ مزا ہے جسے ذوقِ جاوداں کہئے

(۱۰) چاک داماں کیجئے ٹکڑے گریباں کیجئے کچھ تو آخر چارۂ طبعِ پریشاں کیجئے

شوخی اور معاملہ بندی کے لئے داغ دہلوی مشہور ہیں۔ اور اُن کے ایسے اشعار زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ مگر حق یہ ہے کہ ذکی مرحوم کے کلام میں اگرچہ شوخی اور معاملہ بندی خال خال ہے۔ مگر جس جگہ بھی ہے ایسی واقع ہوئی ہے کہ بادرو شاید۔ ذیل کے شعر ملاحظہ ہوں۔

(۱) پہلے دل پوچھتے ہیں تو نے ہمیں کیا سمجھا　　ابھی آفت ہو اگر کہنے کہ دل سب سے جانا

(۲) حسرت یہی رہی کہ حسینوں کو دیکھتے　　ہیں ناک بھی ہوا تو غضب پر نظر ہوا

دست ہے۔ بوسے سے باقی بردگر لشکنی پیمانہ رہا۔

(۳) ناصح سے رادت ؎

ہر بات میں حوالہ ہے ہر بات میں سند　　ناصح کو مانتے ہیں ہم اہلِ کتاب ہیں

(۴) کھنچتے ہیں سرزنش غیر پہ مرنے کو دل ہو　　بے وفا لفظ ہے خنجر نہیں تلوار نہیں

طالب املی کا شعر ہے ؎

آتش از سرزنش خار چہ پروا دارد　　عاشق از طعنۂ غیب چہ پروا دارد

(۵) تم مضطرب ایسے ہوئے جاتے ہو کہوں کیا　　آئی ہے عدو کی خبر ایسی کہ نہ پوچھو

(۶) ہاں ذبح کرو شوق سے گھبراؤ نہ اتنا　　زانو پہ نہ رکھو سر نخچیر کو دیکھو

(۷) چلے ہیں عرضِ وفا کو ہم اور رکھتے ہیں　　گرو میں ایک دل اُس کا کل دوتا کیلئے

ذرا یہ جسارت تو دیکھئے ؎

نہ پوچھ [illegible] جزا یہ حیا نسباز　　نہیں نہ کھینچ تو خنجر کہ امتحاں ہو جائے

معاملہ بھی خال خال موجود ہے ؎

تمہارا ذکر نہ ہو رو نسیب از شوق نہ ہو　　تو یہ ہی کیوں نہ کہو کوئی بے زباں ہو جائے

نری طرز تغافل سے ہیں کیوں طرز وفا چھوڑ دوں　　مت عاشق ہوا ہوں جیسا بہت معشوق برستے ہیں

اُن کو مذاقِ ستم عذرِ جفا کیا کریں　　خو ہمیں تسلیم کی اس کا گلہ کیا کریں

تماشا ہے امید و بیم کا یہ [illegible] ان کی　　نہ ہے اقرارِ وصل اُن کو نہ وہ انکار کرتے ہیں

عموماً دیکھا جاتا ہے۔ کہ اگر کوئی مضمون آفریں شاعر سادہ رواں زبان میں اپنے مطلب کو ادا کرنا چاہے۔ تو مزے کے شعر نہیں نکلتے۔ مگر تعجب ہے کہ ذکی جیسے شخص نے باوجود اپنی مضمون آفرینی کے ایسے سلیس اور صاف شعر لکھے ہیں۔ ایسی کوثر میں دھلی ہوئی زبان استعمال کی ہے۔ کہ بعض شعروں پر داغ کا دھوکا ہوتا ہے

او چشم بے نیاز ذرا دیکھ تو سہی کیا حال ہو گیا ترے امیدوار کا
قیامت میں کیوں اُن سے ملنا نہ ہوگا وہاں تو کوئی عذر فردا نہ ہوگا
مریض وفا کا مداوا ہے مرنا یہ اچھا بھی ہوگا تو اچھا نہ ہوگا
مقرر ہے اثبات نفی مکرر کہو وصل ہرگز نہ ہوگا نہ ہوگا

ریاضی کے مسئلے سے اپنے مطلب کی بات پیدا کی ہے۔

کہو وہاں سے کوئی کیا مراد دل پائے جہاں زباں نہ ہلے عرض مدعا کیلئے
ذکی ہم اپنا دل نہ دیں کسیکو کیوں دیتے بتوں نے حسن کے جلوے دکھا دکھا کے لئے

مشکل مشکل زمینوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ایک غزل کے دو شعر ایسے صاف نکلے ہیں۔ گویا منجھے ہوئے ہیں۔

وفا پرست ہوں اہل وفا بنائیں گے تبرکاً مرے خاک مزار کی تسبیح
تمہاری آرزوئے وصل شغل جان حزیں تمہارا ذکر دل بیقرار کی تسبیح
دل ناچیز اپنا نہیں توڑ کے کیا یاد رہے یہ تو شیشہ بھی نہیں ہے کہ صدا یاد رہے

غالب کے کلام میں تصوّف اور اخلاق کا رنگ بہت غالب ہے۔ برخلاف اس کے ذکی مرحوم کے کلام میں تصوف کم اور اخلاق کمتر ہے۔

روبرو جلوہ فزا ہے چمنستان شہود نگہ شوق کبھی دید میں معذور نہیں
ہو گیا پردہ برانداز انا الحق کہتا بزم توحید میں گنجایش منصور نہیں
نیرنگ کائنات میں بازیٔ دل فریب کرتا ہے کوئی شوخ تماشا چھپا ہوا
جب درمیان حجاب۔ یقین نہیں رہا ذرہ سے تا بمہر خدا ہی خدا ہوا
اس کے سوا کہ شاہد و مشہود ایک تھا میں کیا کہوں کہ عالم حیرت میں کیا ہوا
یہ ارباب طلب کیا بیخبر ہیں ذوق وحدت سے معاذ اللہ بیگانہ سمجھتے ہیں یگانے کو
ڈالا جو دل میں تھا وہی منصور نے کیا گویا یہ بازگشت صدا کی ہے چاہ سے

ذکی مرحوم کے کلام میں آپ کو بہت شعر سہل الممتنع ملینگے۔ جس کی مثالیں سعدی اور حافظ کے ہاں بکثرت مل سکتی ہیں۔ چند شعر سنیئے۔

اللہ رے ناز حسن تیری خود ستائیاں جاں اور نذر نیم تبسم مگر نہ لی۔

تنکے لیے اور دن کے لئے۔ کی زمین بہت پامال ہو چکی ہے۔ مگر ذکی کی طبع رسانے اس میں خوب خوب

شعر نکالے ہیں سے

باغ میں بلبل نے پھر تنکے لئے + خانماں برباد کے دن کے لئے + کیا برجستہ مطلع ہے۔

بت وہ کافر ہیں کہ ان کا جلوہ ہے۔　　نور ایماں قلب مومن کے لئے

کاہش انتظار میں جینا　　ایک وعدے نے جانفزائی کی

دیوان صنائع و بدائع سے بھی خالی نہیں۔ لطف تشبیہ و استعارہ کے بھی چٹخارے موجود ہیں

میری قسمت میں تھا کہ اشتباہ یوں　　مہر ہوتی ہے دانے دانے پر

سیہ سر جو نہ ہو صہبا پینگے خون دل اپنا　　یہ ہم نے تاک رکھی ہے مئے انگور سینے میں

قتل ہو کر بھی تو رہتے ہیں پریشان عشاق　　سر جدا۔ ہاتھ جدا۔ پاؤں جدا ہوتا ہے

دم گھٹا جاتا ہے کیسا کھٹک رہی ہے کوئی یہ عذاب　　جل بھی چکا اسے دل پر سوز دھواں ہوتا ہے

خستہ ہے کشمکش دیر سے ہر ایک وجود　　موج کے دام سے پڑتے ہیں شکن پانی میں

سندت گریہ میں کیا وہ مری فریاد سنیں　　قابل فہم نہیں صوت و سخن پانی میں

فروغ شعلۂ داغ جگر سے محو حیرت ہوں　　فروزاں ہو گئی گویا کہ شمع طور سینے میں

تری آنکھوں کے آگے فق ہے رنگت سبزہ رنگوں کی　　یہی سفاک آہو سبزۂ فردوس چرتے ہیں

سید عابد علی عابد

قومی نمکحرام

چڑیمار نے کر کے تیار جال　　لیا جال کو اپنے کندھے پہ ڈال

دیا جا کے وہ جال اک جا لگا　　لگاتے ہی تیتر اک اس میں پھنسا

سمجھ کر یہ اُس نے کہ موت آگئی　　نہایت خوشامد سے یہ عرض کی

اگر جان بخشی ہو اے مرد نیک　　تجھے میں بتاتا ہوں تجویز ایک

ذرا چھوڑ دے مجھ کو میدان میں　　وہ بولوں گا بولی کہ اک آن میں

نہ آجائیں تیتر اگر بے شمار　　نہ کرنا مرا پھر کبھی اعتبار

چڑیمار بولا کہ اے فیلسوف　　سمجھتا ہے کیا تو مجھے بیوقوف

تری بات کا کر کے میں اعتبار　　کروں ضائع کیوں ہاتھ آیا شکار

علاوہ ازیں فکر ہے یہ مجھے　　نہیں جانتا معتبر میں تجھے

جب اپنوں سے ہے تیرے دل میں دغا تو امید غیروں کو ہو تجھ سے کیا

بہت ایسے ہوتے ہیں ملت فروش نہیں جن میں قومی حمیت کا جوش

نہ حق کی حمایت نہ مذہب کا پاس صداقت سے ایثار سے ناشناس

انہیں ہے فقط حبِ جاہ کا مرض ذلیل اس قدر ہیں وہ اور خودغرض

تباہ ہو اگر قوم پروا نہیں گرو زر بسر اور قوم پروا نہیں

نہیں ایسے لوگوں کی عزت کہیں کہیں اُن کی توقیر و وقعت نہیں

سمجھتے ہیں وہ بھی اُنہیں دل میں خوار
جو ظاہر میں کرتے ہیں اُن کا وقار

محمد حسین عارف ایم اے

حُسن کا ڈاکو

(چاند کی زبانی)

(۱) میں صدیوں سے زمین پر نکلا۔ اور نکل نکلکر ڈوب گیا۔ چوڑی چکلی زمین کا گوشہ گوشہ مجھ سے آشنا اور میں اس سے شناسا۔ سمندر اور اُس کی لہریں۔ آبشاریں اور اُنکی روانی۔ پہاڑ اور اُن کی وادیاں۔ ریگستان اور اُنکے ناچیز ذرّے۔ انسان اور حیوان۔ غرض کہ دنیا کی کل کائنات مجھ سے واقف اور میں اُن کے معمولی سے معمولی راز سے آگاہ ہوں۔ مؤرّخوں کی صدہا کی کوشش نے جو واقعات فراہم کئے۔ وہ میرے ایک روز کے مشاہدے کے برابر نہیں۔ زمین اور اُس کے بسنے والوں میں سینکڑوں نامور ہستیاں پیدا ہوئیں۔ اور ہو ہوکر فنا ہوگئیں۔ اہل اور نینوا جیسے چوٹی کے شہر میرے سامنے آباد ہوئے۔ عروج پایا۔ اور ہمیشہ کے لئے تہ خاک پوشیدہ ہوگئے۔ کیسے کیسے حسین اور بھولی صورتیں بنتے دیکھیں۔ جو بچپن سے جوانی تک ہنستا انسانوں کے بول کو ملیا میٹ کرتی ہیں۔ آہ! آج دنیا میں اُن کا کوئی نام لیوا بھی باقی نہیں۔ یہ سب کچھ ہوا اور ہمیشہ ہوتا رہیگا۔ ہر آنیوالی رات میری معلومات میں کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور کر جاتی ہے۔ میرے سینے میں واقعات عالم کا ایک خزانہ ہے جو محفوظ ہے۔

(۲) میری شب عروج کی تیرہویں تاریخ ہے۔ زمین گردش محوری میں اسیطرح مشغول ہے۔ پہاڑ سرسبز ہیں۔ کہیں سمندر خشک اور کہیں زمین گہوارۂ سیلاب بنی ہوئی ہے۔ میری نظریں گرد ہیں ایک سونے عالیشان مقبروں پر۔ سنسان اور خاموش قبرستانوں پر۔ سر بفلک

گرجاؤں پر، عالیشان مسجدوں پر رقص کر رہی ہیں۔ تو دوسری طرف کوہ الپس کی برف آلود چوٹیوں پر،
قصر یلدیز کے خاموش کنگروں پر۔ باسفورس کی مضطرب لہروں پر، مراکش الجزائر۔ ٹیونس، طرابلس
اور جزیرۃ العرب کے ریگ زاروں۔ الحمرا کے میناروں پر، جبل الطارق کے سنگلاخ راہوں میں
اناطولیہ اور سمرنا کے قتل گاہوں میں، ڈاؤ ننگ نال کے سقف ،، پر، بابل اور نینوا کے کھنڈر کے
اور دریائے نیل کی روائے نیلی پر یکساں طور پر ضیا پاش ہو رہی ہیں۔

رات کا نصف سے زیادہ حصہ گذر چکا ہے۔ آرمینیا کے برفانی پہاڑ میرے سامنے ہیں۔
جن میں سے دو دریا دجلہ اور فرات ہو کر مختلف سمتوں میں بہتے ہوئے ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں

فرات ابتدا میں بہت تیزی کے ساتھ ایک آبشار سے دوسری آبشار میں گر کر ایک گہرے
تنگنائے سے گذر کر، چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے ذریعہ مغرب کی جانب ہو کر ایک دم جنوب کی جانب چلا جاتا
ہے۔ اس کی تیز رفتاری دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ یہ ضرور بحر روم میں گریگا۔ لیکن کوہستان سے نکلتے
ہی اس کی رفتار میں سکون پیدا ہو جاتا ہے۔ اور آہستہ آہستہ غیر آباد جنگلوں سے بہتا ہوا
مشرق کی جانب رُخ پھیر کر خلیج فارس میں گر جاتا ہے۔

دجلہ تین چشموں سے ملکر پہاڑوں سے نکلتا ہے اور ایک ہلکے پرنالے کی طرح تنگناؤ سے
ابلتا ہوا نہر کی صورت اختیار کر کے تیر کی طرح اچھلتا کودتا ایک جنگل میں جنوب کی طرف پھیل
جاتا ہے۔ یہاں ایک اور تیز رفتار ندی اس میں آکر مل جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی روانی
میں تیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور بغداد سے ستر فرسنگ طے کرنے کے بعد فرات میں ملکر خلیج
فارس میں گر جاتا ہے۔

(۳) دنیا کا مشہور تاریخی شہر بغداد اسوقت میری نظر کے سامنے ہے۔ سر بفلک عمارتیں
عالیشان مسجدیں، شاندار مقبرے خوبصورت نہریں، میری شعاعوں کے عکس سے عجیب لطف
پیدا کر رہی ہیں۔ شہر کے جنوبی حصہ میں باغات کا ایک سلسلہ ہے جن میں اسوقت پھولوں کی مہک
سے وجدانی کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔

نہر زبیدہ کے کنارے ایک عالیشان محل جسکے صاف و شفاف سقف اور رکندن کی طرح
چمک رہے ہیں۔ اس کے مغرب کی طرف ایک خوبصورت پائیں باغ اپنے دلکش اور دلفریب
پھولوں اور پھلوں کے ساتھ عجیب لطف دے رہا ہے۔

بغداد میں اسوقت بالکل سناٹا چھایا ہوا ہے۔ کبھی کبھی منحوس جانوروں کی صدا سنائی دے جاتی ہے

پائیں باغ کی ایک روش پر ایک نوجوان آہستہ آہستہ چہل قدمی میں مشغول ہے - اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی اہم معاملے کی غور و فکر میں ڈوبا ہوا ہے - ٹہلتے ٹہلتے اکثر رک جاتا ہے کبھی میری طرف دیکھتا ہے کبھی پھولوں کی طرف دیکھ کر کچھ سوچنے لگتا ہے - آخرش اس نے ٹہلتے ٹہلتے دھیمی آواز سے دو مرتبہ "یاقوت" "یاقوت" کہکر آواز دی - فوراً ایک خوفناک حبشی سامنے آکر کھڑا ہوگیا جسکے دونوں طرف کمر میں دو خنجر لگے ہوئے تھے

ٹہلنے والا شخص - یاقوت کچھ کہو؟ **یاقوت** - حضور ہر طرح فہمایش کی گئی لیکن افسوس......

مخاطب - آخر اس کے دل میں کیا ہے؟ کیا کمبخت کی موت میرے ہاتھوں لکھی ہے - اچھا اسے ہمارے روبرو لا -

یاقوت چلا گیا اور تھوڑی دیر میں دو اور ساتھیوں کے ساتھ ایک خوبصورت نازنین کو لئے ہوئے حاضر ہوا - جو سر جھکائے ہوئے آہستہ آہستہ سامنے آکر کھڑی ہوگئی - اس کا گلاب سا چہرہ زرد ہو رہا تھا - بال بکھرے ہوئے تھے لیکن جس وقت اسکے خوبصورت چہرے پر میرا عکس پڑتا تھا - ایک بجلی سی کوند جاتی تھی -

یاقوت آگے بڑھا اور کہا - حضور پر جبیں حاضر ہے -

"پر جبیں تو اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہیں آئے گی"

پر جبیں - نہیں ہرگز نہیں میں اس جوہر شرافت یعنی عصمت پر سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں

"اچھا تو مرنے کے لئے تیار ہوجا"

"ہائے افسوس میرے ماں باپ میری چھوٹے چھوٹے بھائی میرے لئے تڑپ رہے ہونگے - ان کو کیا معلوم کہ میں ایک ظالم انسان کے قبضے میں ہوں -

مخاطب - بس او زبان دراز لڑکی بس!! زباں روک - اور مرنے کے لئے تیار ہوجا -

پر جبیں - (گردن جھکا کر) اے خدا میں عصمت پر اپنی زندگی قربان کرتی ہوں -

مخاطب - (غصے سے سرخ ہوکر) لے تیری دعا قبول ہوتی ہے خوفناک خنجر کو خفیف سی حرکت ہوئی ایک ہلکی سی بجلی چمکی اور سامنے ایک دوشیزہ نازنین کا لاشہ تڑپتا دکھائی دیا - جسم میں لرزا پیدا ہوا ہاتھ پیروں نے جنبش کی، زباں سے چند بےمعنی فقرے نکلے - اور چند منٹ میں نعش تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہوگئی -

ظالم شخص نے پھر یاقوت کو آواز دی - یاقوت حاضر ہوا - اس کو حکم دیا گیا - کہ اس کی نعش دریا میں

بہا دی جائے

(۴) باغ کا ہر ایک درخت ماتم میں خاموش کھڑا تھا۔ نالے ٹوٹ رہے تھے۔ نہر کی روانی رک گئی تھی۔ مجھ پر بھی اس واقعہ کا اسقدر اثر ہوا کہ میں ایک آنکھ اس جانب دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اور اس کوشش میں تھا۔ کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے یہاں سے آگے نکل جاؤں۔ اسی وجہ سے میں نے جلد جلد اپنا راستہ طے کرنا شروع کیا۔

لیکن میں نے خیال کیا کہ دنیا میں اسی کا نام انسانیت ہے۔ کیا انسان ایسی ہی دردناک واقعات کے بنا پر اشرف المخلوقات کہے جانے کا مستحق ہے۔ اس واقعہ نے میرے دل میں انسانوں کیجانب ایک نفرت پیدا کر دی اس واقعہ کو میں ایک عرصہ تک نہیں بھولونگا

عبدالوحید خان بھوپالی

میری پریشانی

میری شادی کو پانچ سال ہو چکے۔ میں نے آئینہ دیکھا اور دیکھا کہ اب میرا رنگ زردی مائل ہو چلا ہے۔ اب وہ سرخی عنقا ہے۔ میرے دانت ویسے صاف اور شفاف نظر نہیں آتے۔ ہونٹ جو گلاب کی پنکھڑی سے ملتے جلتے تھے اب وہ نہیں رہے۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ مجھے فکر ہوئی کہ اب کیا ہوگا۔ کہیں وہ بھی بدل نہ جائیں۔ اس فکر میں میری طبیعت بدمزہ تھی۔ سر چکرا رہا تھا۔ ہاتھ پانوں ٹوٹ رہے تھے۔ کلیجہ گھٹ رہا تھا۔ وہ آئے۔ گھبرا گئے۔ فٹن تیار ہوئی۔ ہم سیر کے لئے نکلے۔ ان کا خیال تھا کہ باغ کی سیر سے اوداسی دور ہو جائیگی مگر میری وحشت اور بھی بڑھ گئی باغ ویران تھا۔ نہ بلبل کی صدا تھی نہ قمری کی نوا۔ نہ پھولوں کی مہک نہ سبزے کی لہک۔ نونہالوں کے رخ پر ہوائیاں اوڑ رہی تھیں۔ شجر جو کل ہرے بھرے تھے خشک تھے۔ پتے زرد ہو کر پانی میں تیر رہے تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ شام ہونے کو تھی۔ آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ بادل عزاداروں کی طرح اس کے اردگرد جمع تھے۔ اور اُس کے زوال پر سر دھن رہے تھے۔ ہم دونوں ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ میری پریشانی متعدی امراض کی طرح اثر پذیر ہوئی وہ بھی خاموش تھے۔ اُن کو خاموش دیکھکر میرے دل میں ایک درد اٹھا۔ یکایک ایک موٹر گول باغ میں آئی۔ اور ایک خوش پوش عورت اترکر ہنستی ہوئی میری طرف بڑھی۔ میں اُسے پہچان نہ سکی۔

مجھے حیران دیکھ کر وہ ہنسی اور کہا کہ میں ما رنتھا ہوں۔ ما رنتھا کا نام سنکر میرا ماتھا ٹھنکا۔

مارتھا ایک شعلہ رخسار لڑکی طالبعلمی کے زمانہ میں میری ہم مکتب تھی۔ وہ گلرو تھی۔ یہ سانولی۔ اُس کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ اس کی دھندلی۔ اس کا چہرہ صاف اور شفاف تھا اس کا سیتلا کے داغوں سے بھرا ہوا۔ مارتھا پھر ہنسی اور کہا کہ بہن میں وہی تمہاری سہیلی ہوں۔ نہ بہار تھی۔ اب خزاں ہے۔ یہ تمام سیتلا کی کارستانی ہے۔ شکر ہے کہ جان بچ گئی۔ حسن کی یہ بربادی دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ بچپن کی محبت کے انگارے جو خاکستر مفارقت سے دبے ہوئے تھے دھکنے لگے گذشتہ زمانہ میری آنکھوں کے آگے پھر گیا۔ میں مارتھا سے بغلگیر ہوئی۔ ہم میں دیر تک باتیں ہوتی رہیں دورانِ گفتگو میں مجھے معلوم ہوا کہ مارتھا کا خاوند ایک مشہور بیرسٹر ہے۔ دونوں کی آپس میں بہت محبت ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ حسن وجمال کی تباہی سے اُس کی محبت میں فرق نہیں آیا یہ سنکر مجھے مسرت ہوئی۔ میری پریشانی دور ہوگئی۔ میری مسرت سے وہ بھی خوش ہوگئے۔ میں نے مارتھا کا اُن سے تعارف کرایا۔ اُس نے وعدہ کیا۔ کہ اتوار کو آونگی اور تمہارے ہاں چاے پیونگی ہم خوش خوش اس سے رخصت ہوئے۔ ہم اپنی فٹن پر سوار ہوئے وہ موٹر پر۔ ہم دونوں کی ہنسی سے ہوا گونجنے لگی۔ جب ہم گھر کی طرف لوٹے تو کوئی شعر گاتا ہوا گذرا ؎

اس گلشن ہستی میں عجب دید ہے لیکن — جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم ہے خزاں کا

لیکن اب میرا دل غم کی دسترس سے بہت بلند جگہ پر تھا۔

سبزہ بیگم

چھوٹے بچے اور تارے

اے چمکتے چھوٹے تارو کیا بھلے لگتے ہو تم — آسمانِ نیلگوں پر جس گھڑی پھرتے ہو تم
بخشدیتا گر پرِ پرواز مجھ کو بھی خدا — آسماں پر اڑ کے میں مجلس تمہاری دیکھتا
ہے تمہاری عمر کتنی کچھ نہیں معلوم ہے — کیا تمہاری ہے زباں؟ کچھ بولنا معلوم ہے؟
جگمگاہٹ رات بھر گر ہو تمہاری تو بھلا — رات بھر گر تم کرو آنکھیں مچولی تو بھلا
کاش ہم بھی ہوتے اے تارو تمہارے ساتھ میں — ساری دنیا کی خوشی ہوتی ہمارے ہاتھ میں
آسماں پر بادلوں کے پار ہم تم گھومتے — اور ہمارے پاؤں دونوں قطب تارے چومتے
وہ ہمارا چاند پیارا جو کہ پورا گول تھا — اور جو اب چھوٹی کشتی کی طرح کا ہو گیا
اس پہ چڑھ کے بادلوں کی خوب کرتے سیر ہم — اور تارے تھکے پھر تم سے نہ رہتے غیر ہم

پیارے پیارے تارو تم مجھ کو یہ بتلاؤ ذرا — کیوں مقرر کر لیا ہے تم نے چکر روز کا
کس لئے مشرق سے مغرب کی طرف جاتے ہو تم — کیوں چلے جاتے ہو اور پھر کس لئے آتے ہو تم
سن لیا تاروں نے جب بچوں کا سارا یہ سوال — بولے لو سن لو نہیں معلوم گر تم کو یہ حال
کیا نہیں تم چھوٹے بچو اب تلک یہ جانتے — ہم بھی ہیں اللہ ہی کو اپنا خالق مانتے
سر جھکا دیتے ہیں ہم ہر حکم پر ہر بات پر — جان تک اپنی فدا ہے اس کی عالی ذات پر
حکم عالی اس کا ہم کیا۔ سارا عالم مانتا — اس کی قدرت سے اسے ہر شخص ہی پہچانتا
جو بجا لاتا ہے حکم اس کو وہ کرتا پیار ہے — اور جو نافرمان ہے اس کی خفگی میں وہ تنہا ہے
پیارے بچو گر تمہیں بھی اس کی رحمت چاہئے — تم کو ہونا نیک سیرت نیک خصلت چاہئے
باپ ماں گر خوش رہیں تم سے تو خوش داور رہے — کیا تعجب ہے کہ رتبہ ہم سے بھی بڑھ کے رہے

(مس قاسم مدن)

ایک حاجی کی ڈائری

حاجی صاحب کی ڈائری سے ایک واقعہ شباب اردو میں درج کر چکی ہوں۔ ناظرین کے اصرار سے آج ایک اور واقعہ درج کرتی ہوں۔ میری رائے میں یہ بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں ہے۔

"یہ میرا تیسرا حج تھا۔ میں اور خدا بخشے شیخ کریم بخش پشاور سے اکٹھے روانہ ہوئے۔ ہم دونوں گھر سے پانچ پانچسو روپے لیکر چلے۔ راہ میں چند دن کے لئے ہمیں شہر لاہور میں ٹھہرنا پڑا۔ ہم میاں سلطان کی سرا میں مقیم ہوئے۔ ان ایام میں شہر لاہور میں طاعون کا زور تھا۔ کریم بخش حسب معمول صبح کی نماز سے فارغ ہوکر ہوا خوری کے لئے گیا۔ اس کا گذر ایک غریب محلہ میں ہوا۔ ایک کچے مکان کا دروازہ بند تھا۔ اور اندر سے ایک بچہ کے رونے کی دردناک آواز آرہی تھی۔ رحمدل کریم بخش نے دروازہ پر دستک دی۔ کوئی نہ بولا۔ پھر اس نے زور سے کھٹکھٹایا پھر بھی کوئی باہر نہ آیا۔ وہ خود دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ یہ ایک ٹوٹا پھوٹا خستہ مکان تھا۔ اسمیں ایک دالان تین کوٹھڑیاں اور چھوٹا سا صحن تھا۔ ایک کوٹھڑی میں چولھے کے قریب ایک بڑھیا برہنہ سر بیٹھی تھی۔ اس کے کپڑے میلے کچیلے تھے۔ اس کے گھٹنے کے ساتھ لگا ہوا ایک دبلا پتلا تین سال کا لڑکا کھڑا رو رہا تھا۔ لڑکے کا پیٹ بڑھا ہوا تھا۔ رنگ موم کی طرح تھا اور جسم میں خون کا نام تک نہ تھا۔ ایک کوٹھڑی میں ایک جوان عورت چارپائی پر پڑی ہوئی کروٹیں بدل رہی تھی۔ اس کا بدن انگار

کی طرح گرم تھا آنکھیں سرخ تھیں اور گھنگرو بول رہا تھا۔ اسی کوٹھڑی میں ایک بوریا پڑا تھا جس پر ایک جوان بیٹھا تھا۔ مگر ضعف اور نقاہت سے اُس کی حالت غیر تھی بات کرنے کی طاقت نہ تھی۔ بڑھیا نے کریم بخش کو دیکھا اور چلا کر بولی۔ سائیں جاؤ۔ اپنا رستہ لو۔ ہم خود محتاج ہیں۔ میری بیٹی کوئی دم کی مہمان ہے۔ داماد اس قدر کمزور ہو گیا ہے کہ شاید ہی بچے۔ یہ بچہ میرا نواسہ ہے۔ تین دن کا فاقہ ہے۔ یہ روٹی مانگتا ہے۔ ضد کر رہا ہے۔ اتنا کہا اور وہ رونے لگی۔ جوان نے جو بوریے پر پڑا تھا دیوار کو تھام کر چاہا کہ اُٹھے مگر نہ ہو سکا اور منہ کے بل گر پڑا۔ لڑکا جو رو رہا تھا نانی کو بولتا سن کر چند منٹ کے لئے خاموش ہو گیا لیکن پھر زور زور سے رونے لگا۔ زمین پر لیٹ کر ایڑیاں رگڑنے لگا۔ بار بار یہی کہے جاتا تھا۔ نانی روٹی دو۔ ہمیں روٹی دو۔ بھوک لگی ہے۔ کریم بخش نے جیب سے ایک میٹھا کلچہ نکالا۔ جونہی لڑکے کے دماغ میں اناج کی خوشبو گئی وہ ادھر لپکا اور دونوں ہاتھوں سے کلچہ تھام کر کھانے لگا

کریم بخش فوراً بازار گیا اور سودا سلف خرید کر واپس آیا۔ اُسنے اپنے ہاتھ سے آگ جلائی۔ جوان کو یخنی اور مریضہ کو دودھ پلایا اور بڑھیا کو روٹی پکا کر کھلائی۔ ایک دونے میں فلاقند تھی وہ اُس نے بچہ کو دی۔ کریم بخش تمام دن خبر گیری کرتا رہا۔ اور میرے دل میں طرح طرح کے وہم اُٹھتے رہے۔ وہ شام کو واپس آیا اور مجھے ہمراہ لیگیا۔ اور کہنے لگا کہ میں ان لوگوں کو اس حال میں نہیں چھوڑ سکتا۔ میں تمہیں بمبی میں آملونگا۔ میں نے بہت زور دیا۔ مگر اُسنے اپنا ارادہ نہ بدلا۔"

"بمبی میں کئی دن میں نے کریم بخش کا انتظار کیا۔ مگر وہ نہ آیا۔ ناچار میں تنہا جہاز پر سوار ہوا کیونکہ حج کے ایام قریب آرہے تھے اور بخیریت تمام مکہ میں جا پہنچا اور حریم کعبہ میں داخل ہوا جمعہ کے دن نویں ذوالحجہ کو عرفات کا سارا میدان مہبط انوار بن گیا۔ امیر غریب کالے گورے سر کھولے ایک چادر اوڑھے ہوئے ذوق شوق کے ساتھ لبیک لبیک پکار رہے تھے۔ اور انہیں میرا دوست کریم بخش بھی موجود تھا۔ میری حیرت کا ٹھکانا نہ رہا۔"

"میں نے اس کو اپنی طرف مخاطب کرنا چاہا۔ مگر وہ کیفیت طلسمی میں گرفتار تھا۔ پھر وہ کہیں ہجوم میں غائب ہو گیا۔ حج سے فارغ ہو کر میں نے اُسے بہت ڈھونڈھا۔ مگر وہ نہ ملا۔ واپسی پر میں لاہور میں ٹھہرا اور اُس غریب محلہ میں گیا۔ اب یہاں کچھ اور عالم تھا۔ تمام اہل خانہ تندرست تھے۔ بچہ کھلونوں سے کھیل رہا تھا۔ بڑھیا کھانا پکا رہی تھی۔ اس کی بیٹی قمیض سی رہی تھی۔

اور جوان دوکان پر جانے کو طیار تھا۔ مجھے دیکھ کر ٹھہر گیا۔ اور مجھے پر تکلف کھانا کھلایا۔ چائے پلائی۔ اور کہا کہ آپ کا دوست فرشتہ رحمت تھا۔ وہ تین ماہ ہمارے پاس رہا۔ اس نے مجھے سلائی کی مشین خرید کر دوکان کھول دی۔ اب میں درزی ہوں میرا کاروبار خوب چمکا ہوا ہے۔ تم پشاور جا رہے ہو۔ ہم سب کی طرف سے اُسے سلام کہنا۔"

یہ سنکر قریب تھا کہ میں دیوانہ ہو جاؤں کیونکہ میں نے اپنی آنکھوں سے کریم بخش کو حج کے وقت دیکھا تھا۔ میں نے اُس کی بات کا کچھ جواب نہ دیا۔ لیکن جب میں پشاور گھر پہنچا۔ تو کریم بخش مجھ سے بغلگیر ہوا۔ اور کہنے لگا۔ کہ آپ کو غلطی ہوئی ہے۔ میں ہرگز حج کے لئے نہیں گیا۔ سال آئندہ جاؤنگا سچ ہے۔ ۵ دل بدست آور کہ حج اکبر است از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

خورشید سلطانہ

غریب کی آہ

لڑکی۔ تم کون ہو۔ کیوں آئے ہو۔ اور یہ فوج کس کی ہے۔ کہاں جا رہی ہے۔؟

جوان۔ میں ایک سپاہی ہوں یہ فوج روس کی ہے۔ طہران کو جا رہی ہے۔ مجھے پیاس معلوم ہوئی تو ادھر آگیا۔ تھوڑا پانی ٹھنڈا دیدو۔

لڑکی۔ سچ سچ کہو کہ طہران میں فوج کس لئے جا رہی ہے۔ آخر سبب کیا ہے۔ برائے خدا کہو میں پریشان ہوں۔

جوان ہمارے شہنشاہ کا حکم ہے کہ تمام ملک بے چراغ کرکے تمام خزانہ امام رضا کا لوٹ کر لے جائیں

لڑکی کانپ کر تھر تھرا کر روتی ہوئی آواز میں دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر کے۔ ہائے خدا تو نے ہمارے وطن کو برباد کر دیا۔ اب صرف نیم جاں ہی کچھ دم باقی ہے کیا اس کو بھی یہ لوگ برباد کر دینگے۔ ملک ایران تو گیا تھا اور کیا ہوگیا۔ انشاءاللہ میں اپنے ملک کو ضرور بچاؤنگی ضرور بچاؤں گی۔

جوان۔ او نادان لڑکی تو کس طرح بچا سکتی ہے۔ اگر تمام ایران کے باشندے بھی فوجی سپاہی بنجائیں تو بھی روس کی برابری نہیں کرسکتے۔ ہمارے پاس اتنی فوج ہے۔ کہ دنیا میں کوئی سلطنت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ تو یہ بتا کہ تو کس طرح بچا سکتی ہے۔ تیرے پاس کیا چیز ہے۔ جو تو ایران کو بچائے گی۔

لڑکی۔ صرف میری دعا سے میرا ملک بچ جائیگا۔ اور میری آہ سے تیری سلطنت برباد ہو جائیگی

انشاء اللہ مجھ غریب کی آہ بیں ضرور اثر ہوگا۔

جوان (ایک قہقہہ زور سے لگا کر) واہ سے تیری آہ اچھا ہم دیکھینگے تیری آہ کا کیا اثر ہوتا ہے۔ مجھے پانی تو دیدو۔

لڑکی لڑکی نے پانی کی جگہ چھاچھ کا جسکو فارسی میں دوغ کہتے ہیں۔ ایک کاسہ دیکر کہا۔ یہ پیکر ہمارے گلے پر خنجر چلا ہمارے ملک پر حملہ کر مگر یاد رکھ کہ خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ دو شخص اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے تعجب سے غیر مرد کو اندر دیکھ کر کہا تو ہمارا دشمن ہی۔ تو یہاں کیوں آیا۔ نکل باہر ہو۔ اور یہ بتا کہ یہ فوج جو ایران میں لڑنے کو جا رہی ہے کس خطا و قصور پر جنگ چھڑی ہے اس کا سبب بتا کر جانا ہوگا۔ ورنہ تجھے ابھی قتل کر دینگے اور تو اپنا نام بتا کہ کون ہے۔

سپاہی جنگ اس لئے ہوگی۔ کہ ایران نے چند معزز آدمیوں کو امریکہ سے بلایا ہے تاکہ ایران کی ترقی ہو۔ اور دراصل بہت سی باتوں میں ترمیم بھی ہوگئی تھی۔ مگر ہمارے شہنشاہ کا حکم آیا۔ کہ ایران کے آدمیوں کو ایران سے نکالدو۔ ایرانی حکومت نے نہیں مانا۔ ایران کی عورتوں نے بھی جنگ کے لئے کمر کس لی تھی۔ یہی قصور یہی خطا ہی میرا نام الیگزنڈر ہے۔ تو میں جاتا ہوں۔

لڑکی۔ یا واجان میں میدان جنگ میں جاتی ہوں جو خدمت مجھ سے ہوسکے گی اپنے ملک کیلئے کروں گی۔ اب ایک منٹ میں نہیں ٹہرتی۔

بڈھا۔ بیشک جا ضرور جا میں بھی چلتا ہوں اپنے بھائی کو اور سب گھر والوں کو بلا۔ اسیوقت چلو دیر نہ کرو۔ تمام محلہ میں جا اور لوگوں کو اسیطرح دیکر سب عورتوں کو تو اپنے ہمراہ لے اور مردوں سے میں کہتا ہوں

تھوڑی ہی دیر میں تمام دیہات میں اس قدر جوش پھیل گیا۔ کہ چار ہزار کا ایک قافلہ بن گیا۔ کوئی پیدل کوئی گھوڑے پر کوئی گدھے پر عورت مرد جوان بوڑھا سب کے سب چلے طہران میں جا کر خوب لڑے بھڑے۔ مگر روس کے مقابل جیت نہ سکے آخر ایران نے شکست کھائی۔ بہت شہید تیغ جفا ہوئے۔ جو لوگ میدان جنگ سے بچ گئے وہ زندہ اپنے اپنے گھر واپس آئے۔ ان میں یہ لڑکی اور اس کا باپ بھائی بھی اپنے گھر زندہ واپس آئے اس کا ایک بھائی اور چند قرابتی مارے گئے۔ جب یہ اپنے گھر لوٹ کر آئے۔ تو کیا دیکھتے ہیں۔ تمام دیہات کو روسی فوج نے برباد کر دیا ہے۔ بہت سے گھر لوٹ لئے گئے۔ تمام مال و اسباب چرا لیا گیا۔ چونکہ یہ لوگ صاحب مال تھے از سر نو مکان بنانا شروع کیا۔ پہلے ایک کنواں کھدوایا اس میں سے ایک دفینہ نکلا۔ اب کیا تھا راتوں رات مکان تیار ہو گیا۔ یہ سب نہایت آرام سے رہنے لگے۔ مگر لڑکی کی آہ و زاری کسی طرح نہ رکتی تھی۔ اس کی شادی بھی ایک بڑے گورنر (کرمان شاہ) کے

کے لڑکے سے ہوگئی۔ دو بچے بھی ہوئے۔ ایک روز اپنے شوہر اور بچوں کے ہمراہ باغ میں ٹہل رہی تھی۔ ایک شخص دوڑتا ہانپتا کانپتا آیا اور بے اختیار ان دونوں کے پاؤں پر گر پڑا۔ کہا مجھے پناہ دو۔ بللہ مجھے پناہ دو۔

لڑکی۔ تم کون ہو کسی کا کیا بگاڑا ہے جو تم پریشان ہو شائد کسی کو مار ڈالا ہے

نووارد۔ میں روس کا ایک افسر ہوں۔ شہنشاہ روس کے عزیزوں میں ہوں۔ کل روس کے بادشاہ کو معہ اس کے تمام کنبہ کے قتل کرنے کا حکم ملا ہے۔ چونکہ میں بھی اس کا عزیز ہوں۔ اس لئے بھاگ نکلا ہوں۔ میرے اکثر عزیز اور جوان جوان لڑکے سب جنگ میں مارے گئے صرف میں کمبخت بچ گیا ہوں۔ خدا کے لئے مجھے پناہ دو۔

لڑکی۔ تمہارا نام کیا ہے تمہاری صورت میں پہچانتی ہوں۔ کیا تم کبھی اس دیہات میں آئے تھے اس گاؤں کا نام محلات ہے

نووارد۔ میرا نام ایسی ناف ہے چھ سال کا عرصہ ہوا۔ کہ میں اس سرزمین میں آیا تھا۔ اور روس کی فوج کے ہمراہ تھا۔ اسی دیہات میں ایک مکان میں پانی پینے گیا تھا۔ وہاں ایک لڑکی نے مجھے پانی دیا۔ اور کہا تھا۔ کہ میری دعا سے میرا ملک بچ جائیگا اور میری آہ سے روس برباد ہو جائیگا"۔ وہ درحقیقت سچ ہوا۔ خدا جانے وہ لوگ کون تھے اور اب کہاں ہیں خبر نہیں۔

لڑکی۔ وہ میں ہوں اور یہ میرا گھر ہے۔ اب میرے باپ بھائی آئینگے تو دیکھ لینا۔ دیکھا خدا کا قہر انسان کے ہاتھ کس طرح نازل ہوا۔ دیکھا مجھ غریب کی آہ نے آخر اثر کیا۔ عزت اور دولت خدا کے ہاتھ میں ہے تم لوگ خدا کو بھول گئے تھے نا انصافی پر کمربستہ تھے۔ جہاں تک تم سے ہو سکا تم نے غربا کو اور اپنے زیر دستوں کو تکلیف دی۔

شکر ہے خدا کا کہ آج تم مجھ غریب کے گھر پناہ مانگنے ہو۔ میں مسلمان ہوں تم عیسائی ہو لیکن میں تم کو پناہ ضرور دوں گی۔ جاؤ اُس کمرہ میں ٹھہر جاؤ۔ پناہ مل جائیگی ؎

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن
اجابت از در حق بہر استقبال مے آید

اہلیہ سید ہمایوں مرزا

عورت

عورت اک لذت ہے مجسم، اک تسکین ہے متشکل۔ اک سحر ہے مرئی، اک نور ہے مادی، اک حیرت انگیز لمعۂ برق، اک حسین ترین عطیۂ فطرت، اک ارمان مجسم۔ حسن خیالات کا مجموعہ، عشق و محبت، شرم و حیا، عصمت و عفت کی ایک مقدس دیوی، خدا کی جمیل و حساس بلکہ احسن مخلوق ہے۔ وہ عطیۂ عظمیٰ ان ہے، لڑکی ہو یا بہن بیوی ہے۔ ہماری غور و پرداخت، تربیت و تہذیب کی سچی معلمہ ہے جس کا وجود گلزار خیال۔ تصور نواز نازکین، نیاز آموز، دلبر، دلسوز، عشرت زا، کلفت ربا، محبت جو، نفرت شو، تفسیر اخلاق، درس جاں نثاری، سبق آموز الفت ہے اور جس کی عدم موجودگی ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی غیر ممکن ہے جس کا رفع نقصان دنیا کی کسی دولت سے نہیں ہو سکتا۔ زندگی ایک بے مزہ کہانی ہے جسمیں ہستی نازک کا ذکر جمیل کامل نہ ہو۔ دنیا ایک پریشاں خواب ہے اگر حور دنیوی کے جلوؤں سے معمور نہ ہو۔ نسیم ایک گردباد ہے جسمیں فردوس تخیل کے کامل مشکیں کی بو نہ ہو۔ زمانہ وحشت کدہ ہے جس کی ایک رات بھی عروس رحمت سے خالی نظر آئے شام ایک زندان تارہے جو جنس لطیف کے تنویر حسن سے نہ جگمگائے۔ وہ صبح، صبح نہیں جس کی روشنی صنف نازک کی انگڑائی کے ساتھ نہ پھیلے۔ راتوں کی تنہائی میں بارہا میں نے اس امر کی کوشش کی کہ میں حسن کو عورت سے جدا دیکھ سکوں یا کوئی ایسی صورت فرض کرسکوں جس سے علیحدہ علیحدہ ان کا نظارہ ہو سکے۔ لیکن سوائے اس کے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ کہ نسائیت ہی نام ہے حسن کا۔ اور جو چیز حسن کا مکمل نمونہ پیش کرتی ہے۔ وہ نسائیت سے خارج نہیں۔ میں نے اس پر کامل غور کیا۔ کہ کیا ایک عورت اسوجہ سے دلکش ہے۔ کہ اس کے خط و خال نازک، اس کی آنکھیں بڑی، اس کا رنگ صاف اس کی کمر نازک، اس کے بال سیاہ و طویل ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ سب باتیں ملکر اس میں دلکشی پیدا کر دیتی ہوں۔ لیکن میں تو سوائے اس کے اور کچھ نہ سمجھ سکا کہ وہ عورت ہے اور بلا کسی سبب کے وہ سب کچھ ہے۔ آہ! دنیا میں کوئی چیز میرے دل کو دھڑکا دینے والی نہیں۔ الا جبکہ اس میں نسائیت ہو۔

محمد شفاعت علیخان ناشاد سہسرامی

ہولی

ہولی تن من پھونک رہی ہے دور سکھی گر دھاری ہے
دل بھی ٹکڑے ٹکڑے ہے اور زخم جگر بھی کاری ہے

ہائے اکیلا کھیل رہی ہوں سارے ڈوبا سیارہ ہے
خون تمنا رنگ بنا ہے آنکھوں کی پچکاری ہے

[redacted]

فسون بربط نواز

مطرب غم سے پہلے مطرب نے بربط بجایا
پھر نغمۂ غم افزا دھیمی نوا سے گایا

گتھیاں صدائے بربط نے دل کی چھو لیں
رگہائے تن نوائے آتش فزا سے چونکیں

طاری تھی ذوق دل پر حالت سرور مے کی
تانیں اڑائیں خوں سے [illegible] رگوں نے لے کی

نادر طلسم بربط سے گوسالہ سامری کا
دعوے ہی چھوڑ بیٹھا تقریر و بیاں کا

مطرب کو باغ دل کے مالی نے یہ صدا دی
بو میرے گل کی تو نے چاروں طرف اڑا دی

قارون دل کو تو نے حاتم بنا دیا ہے
اک تنگدل کلی سے گلشن کھلا دیا ہے

پر کیف سادگی سے جو گیت تو نے گائے
بلبل نوائیوں سے گل کو صبا سنائے

دو روزہ زندگانی مثل نشاط نے ہے
موقوف اک نفس پر جس کی شبانہ لے ہے

پژمردنی ہے روشن تیری شگفتگی سے
گل ہوگا ایسے جیسے تو گل ہوا کلی سے

پھیلائے پر جو تو نے ہوں گے وبال تیرا
لے جائے [illegible] ہوگا بیگانہ بال تیرا

آیا عدم سے تنہا آیا ہے تو چمن میں
تنہا زمیں کے نیچے سوئے گا تو کفن میں

بھائی بہن جگر بند رشتے ہیں سب یہیں کے
یہ کل نہ تم مساوی ہے اصل میں یہیں کے

تاریک چشم تربت ہوگی چراغ تیرا
صالح عمل کی پونجی ہوگی چراغ تیرا

صحن چمن نہ ہوگا ہوگی ہوا نہ ٹھنڈی
انجم کی دلفزا [illegible] ہوگی نہ [illegible]

صبح و شفق کی رونق شام و سحر کی رونق
ہوگی ملال [illegible] جگر کی رونق

حسرت نگاہیوں سے دیکھے گا تو جہاں کو
[illegible] اس عارضی مکاں کو

اس کو ابد نہ ہوگی یہ ہے خیال خامی
[illegible]

جام فنا پئیں گے دنیا و اہل دنیا
باقی رہے گی [illegible] ذات خدا [illegible]

ساحل شکست دریا یعنی کہ موج ہستی
[illegible] والے تو شکستی

اے غافل کہ وہ دن یوم الحساب ہوگا
اس دن [illegible] کیا کیا عذاب ہوگا

دریائے [illegible]
کشتہ امید میں تو [illegible]

[illegible]

پروانہ

شام ہی سے میرا دل بجھا سا نظر آتا تھا۔ دل میں اضطراب تھا۔ بےچینی تھی اور خیالات پریشاں کا ایک محشر خیز طوفان! برسات کی رات ایک تیرہ و تاریک ہو۔ رات اپنے ابتدائی حصے ختم کر چکی ہے۔ بارہ بجے ہونگے گھڑیال گھڑیاں گن رہا ہے۔ ہر طرف سکون و خموشی کا دور دورہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت محو خواب ہے دنیا میٹھی میٹھی نیند کے مزے لے رہی ہے۔ مندروں میں پجاری۔ مسجدوں میں موذن۔ آشیانوں میں پرند، جنگلوں میں درندے، جھونپڑیوں میں غربا۔ شفاخانوں میں بیمار، پُرشان عالی شان محلسراؤں میں امرا پڑے سو رہے ہیں! کوئی دغدغہ و دبدبہ نہیں۔ ہوا ساکت ہو اور فضا خاموش، دنیا خراٹے لے رہی ہے اور کائنات سیاہ اوڑھنی میں لپٹی ہوئی ہے۔

میرا خلوت کدہ برلب دریا ہو۔ میرا معمول ہے کہ میں شب ماہ میں جب چاند متبسم ہو۔ نور کی بارش سے دنیا جل تھل ہو۔ تارے جگمگ کر رہے ہوں۔ اور باد نسیم مستانہ وار جھوم جھوم کر عطر بیزی کر رہی ہو۔ فضا میں ایک خاموش سکون پرور موسیقی لہریں لے رہی ہو۔ دریا کے کنارے دو گھڑی سیر کو نکلتا ہوں۔ مگر برسات کی اس بھیانک اور تاریک رات میں وہ دلفریب منظر کہاں نصیب قلب کی یہ کیفیت ہو کہ اسے ایک لحظ ایک لمحہ چین نہیں۔ جذبات اُمنڈے چلے آتے ہیں اور دل کی ٹوٹی کشتی خیالات کے طوفانی سمندر میں ڈانواں ڈول۔ میں آج سیر کے لئے نہ نکلا۔ بستر پہ پڑا رہا۔ کمرہ کی ہر چیز سے وحشت ہو رہی تھی۔ یکایک میری نظر اس شمع پر پڑ گئی جو میرے کمرہ کو زینت دے رہی تھی۔ اب اس کی روشنی زرد پڑ گئی تھی۔ پروانے محبت کے متوالے اس پر مستانہ وار نثار ہو رہے تھے۔ شمع بھی رو رہی تھی اور اشک کے قطرے اس کی تیز روشن آنکھوں سے پیہم جاری۔

اے کشتۂ محبت! اے مخمور بادۂ الفت ننھے کیڑے۔ اے کسی پر جل جل کر جان دینے والی ننھی ہستی! تو کیوں مضطربانہ کیسے عشق و محبت کی قربان گاہ پر یوں سر دھنکر جان دے رہی ہے؟ تجھ پر کس نے فلسفۂ محبت کے سربستہ راز کو افشا کر دیا ہے؟

تیرے ننھے سے دل کے اندر کس نے محبت کی چنگاری ڈالدی؟

ہائے تو اس قدر سرکیف کیوں ہے؟ تیرا مآل حیات، تیری آرزوئے زیست، تیرا مدعائے ہستی۔ تیری تمنائے زندگی یہ ہی ہے کہ تو جلے بھنے اور جل بھنکر محبت کے مندر پر بھینٹ چڑھے؟

ایک نیم جاں پروانہ جو شمع کے قریب ہی زندگی کی آخری سسکیاں لے رہا تھا۔ بولا۔ "اے

نادان شخص اور اسے عشق کا جھوٹا دعوٰی کرنیوالے انسان تو ایسا سوال نہ کر"

اس مکالمہ کو شمع نے بھی سنا اور سنکر دو گرم گرم آنسو گرا دئے اور میں بھی کچھ سمجھ کر خاموش ہو گیا۔ سپیدۂ صبح ظلمت شب کے پردہ سے جھانک رہا تھا۔ آسمانی محفل اب برخاست ہو چلی تھی۔ چاند کا چہرہ ماند پڑ گیا تھا۔ شب اپنی بساط بیٹ رہی تھی۔ اور کرنوں کی رتھ پر شہنشاہ مشرق کی آمد آمد کا غلغلہ مچا ہوا تھا۔ صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چھیڑ چھیڑ کر نکہت گل کو پریشاں کر رہی تھی۔ نسیم جان کو معطر کر رہی تھی۔ اُف رے غضب! ہوا ایک جھونکا آیا۔ شمع نے آخری ہچکی لی پھڑ پھڑائی اور جان بحق تسلیم ہو گئی! پروانوں کی بیجان ہستیاں شمع کے گرد بکھری ہوئی ہیں۔ یہ شہید محبت ہیں۔

مسعود۔ بریلوی

کوئی نہیں

یہ ذیل کی دلکش نظم ہمارے مکرم دوست جناب ناظر نے علاقہ لداخ کے صحرائے چنگ تھنگ میں دورہ کرتے ہوئے لکھی تھی

آ گئے ہم ایسی منزل میں جہاں کوئی نہیں
گردِ راہ کوئی نہیں اور کارواں کوئی نہیں

شورِ ناقوس اور آوازِ اذاں کوئی نہیں
تفرقہ شیخ و برہمن کا یہاں کوئی نہیں

زیرِ پا جز صندلیں فرشِ زمیں کچھ بھی نہیں
اور سر پر سایباں جز آسماں کوئی نہیں

گل نہیں بلبل نہیں نسریں نہیں سنبل نہیں
مرغ خوش خواں کا چمن میں آشیاں کوئی نہیں

جز شبانوں کے نہیں اس دشت کا کوئی مکیں
اور غاروں کے سوا ان کا مکاں کوئی نہیں

ہمسفر اپنا نہیں کوئی بجز آبِ رواں
ہم نفس ہمدم بجز بادِ وزاں کوئی نہیں

کشمکش سے اہلِ دنیا کی یہاں ہے امن عام
زخمِ دل کوئی نہیں تیغ زباں کوئی نہیں

ایک روحانی تموج ہے ہوا میں ہر طرف
صرصرِ حرص و ہوا کی آندھیاں کوئی نہیں

کوہساروں سے عیاں ہے سطوتِ صنعِ ازل
حضرتِ انساں کی جدت کا نشاں کوئی نہیں

ترکتازِ نفس ہے نے گیرودارِ حسن و عشق
جذبہائے دل کو خوفِ امتحاں کوئی نہیں

ہو کا عالم ہر طرف اور ہا و ہو سب بر طرف
اے جبینِ شوق ایسا آستاں کوئی نہیں

ناظرؔ آنکھیں بند کرکے اب خدا کو یاد کر
تیرے چشم و گوش کا مصرف یہاں کوئی نہیں

مبتلا افکارِ تازہ میں ہوں ناظرؔ اس قدر
گر کوئی پوچھے تو کہدینا یہاں کوئی نہیں

خوشی محمد ناظرؔ بی اے

بیگم سمرو

زیب النسا، جو آگے چلکر بیگم سمرو کہلائی لطف علیخاں ایک عربی النسل رئیس ساکن کوتانہ کی لڑکی تھی کوتانہ ایک چھوٹا سا قصبہ میرٹھ سے تیس میل شمال ومغرب کے گوشہ میں قریب دریائے جمن واقع ہے۔ زیب النسا کی تاریخ پیدائش غالباً ۱۷۵۱ء ہے۔ وہ ہنوز چھ سال کی تھی کہ اُس کے والد نے انتقال کیا اس کے بعد اس کا بڑا علاتی بھائی زیب النسا اور اس کی ماں کے ساتھ ایسی بدسلوکی سے پیش آیا کہ یہ دونوں کوتانہ سے دلی چلے گئے۔ وہاں ۱۷۶۶ء میں جبکہ والٹر رینارڈ عرف سومبر عرف سمرو منجانب ایرآقا راجہ بھرت پور کے دہلی کے محاصرہ میں مشغول تھا۔ اس لڑکی کو اُس نے دیکھا۔ اور اُس سے عقد کر لیا۔ یہ لڑکی پست قامت مگر صبیح الوجہ تھی اور فارسی زبان میں بآسانی تحریر وتقریر کرتی تھی۔ شادی کے گیارہ سال بعد ۱۷۷۸ء میں سومبر عرف سمرو نے انتقال کیا۔ اس مدت گیارہ سال میں وہ جن جن لڑائیوں میں شریک ہوا بیگم سمرو ہمیشہ اس کے ہمراہ رہی۔

بیگم کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ مگر سومبر کی پہلی ہندوستانی بیوی سے ایک لڑکا ظفریاب خان تھا۔ جس کا سردہنہ میں ۱۸۰۲ء میں انتقال ہوا۔ یہ لڑکا باپ کے مرنے کے وقت بہت کم سن تھا۔ اس لئے اور نیز دیگر وجوہ سے شوہر کی جاگیر بیگم کو عطا ہوئی۔

والٹر رینارڈ شہر ٹریوز کا باشندہ تھا جو یورپ میں صوبہ لکسمبرگ کا ایک قصبہ ہے۔ وہ فرانسیسی فوج میں ایک سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہوکر ہندوستان آیا تھا۔ اور جب لارڈ کلایو نے مئی ۱۷۵۷ء میں چندر نگر فتح کیا۔ تو سومبر وہاں سے بھاگ کر مرشد آباد میں نواب بنگالہ کی فوج میں ملازم ہوگیا۔ اور جب نواب مذکور کو ۱۷۶۱ء میں انگریزوں نے گرفتار کر لیا۔ تو میر قاسم گورنر بہار کے ارمنی جنرل گرگین کی فوج میں سومبر نے ملازمت کرلی۔ اور یہاں رفتہ رفتہ ترقی کرکے وہ سپہ سالار بن گیا۔

رینارڈ کا رنگ بہت صاف نہ تھا۔ اس لئے اُس کے ساتھی اُس کو سومبر کہتے تھے جس کے معنی فرانسیسی زبان میں "مایل بہ سیاہی" ہیں۔ یہی لقب اُس کے ہندوستانی ماتحتوں کی زبان سے سمرو سے مبدل ہوگیا جو اب تک زبانِ زد خلائق ہے۔

میر قاسم بالآخر نواب بنگالہ بن گیا اور ۱۷۶۳ء میں انگریزوں سے لڑا۔ ۲۳ر اکتوبر ۱۷۶۵ء کو بکسر کی لڑائی میں نواب بنگالہ شکست کھا کر سمرو کے روہیلکھنڈ کیطرف بھاگ گیا۔ اُس زمانہ میں سلطنت مغلیہ کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ صوبہ دکن اور بنگال منتشر ہوچکے تھے اور مرہٹے اور جاٹ اور سکھ اور روہیلے باری باری سے سلطنت دلی پر حملہ آور ہوکر قابض ہونا چاہتے تھے۔ سمرو نے یہ موقعہ پاکر ایک دستہ اپنی فوج کا تیار کیا جس میں ایک

[redacted]

رسالہ اور چار پیدل پلٹنیں اور چھ توپیں تھیں۔ اس دستہ فوج کے افسر سب یورپین تھے۔ جنہوں نے یورپین طریقہ پر یہ فوج تیار کی۔ سمرو اس فوج کو کرایہ پر چلاتا تھا اور جو راجہ اُس سے مدد کا طالب ہوتا تھا اور اُس کو کافی معاوضہ دیتا تھا اُس کی طرف سے یہ فوج لڑا کرتی تھی۔ کئی برس تک راجہ جے پور اور راجہ بھرت پور کی طرف سے سمرو لڑتا رہا۔ سنہ ۱۷۶۵ء میں جب راجہ رنجیت سنگھ والیٔ بھرت پور شہر آگرہ اور نواحِ دہلی تک قابض تھا۔ تو سمرو اُس کی ملازمت میں قلعہ آگرہ کا حاکم تھا۔

جب شاہِ عالم بادشاہ بنگالہ میں مصروفِ پیکار تھا۔ تو اس کا وزیر نجیب الدولہ (نواب سہارنپور) دہلی پر حکمران تھا۔ جب وزیر مرا تو اُس نے اپنے بیٹے امیر الامرا ضابطہ خاں کو اپنا جانشین دہلی پر قابض چھوڑا۔ دسمبر سنہ ۱۷۷۱ء میں جب شاہ عالم بادشاہ بنگالہ سے دہلی واپس آیا تو اس نے ایک ایرانی سردار نجف خاں کو دہلی کا حاکم مقرر کیا۔ ضابطہ خاں نے امیر ناراض ہو کر بغاوت اختیار کی تو نجف خاں نے سمرو کو معہ اُس کی فوج کے ضابطہ خاں کی سرکوبی کے لئے بلایا۔ سمرو کی فوج نے اودھ تک ضابطہ خاں کا تعاقب کیا۔ اور اُس کے بال بچوں کو گرفتار کر لیا۔ ان خدمات کے صلہ میں نجف خاں کی سفارش پر شاہ عالم بادشاہ نے سنہ ۱۷۷۴ء میں سمرو کو ایک گرانبہا جاگیر عطا کی جس کا محاصل چھ لاکھ روپیہ سالانہ تھا۔ اس جاگیر کا طول نواح مظفر نگر سے نواح علیگدہ تک اور عرض ایک جانب دریائے گنگا اور دوسری جانب دریائے جمن سے محدود تھا۔ اس جاگیر کے وسط میں موضع سردھنہ کو سمرو نے اپنا مرکز قرار دیا۔

اب سمرو کی فوج شاہِ عالم بادشاہ کی ملازم ہو گئی۔ اور بایمائے نجف خاں جو منتزع حصص کو پھر سلطنت دہلی میں شامل کرنا چاہتا تھا متواتر مختلف باغیوں سے برسرپیکار رہی چنانچہ راجہ بھرت پور سے بھی جس کی ملازم رہ چکی تھی۔ یہ فوج نبرد آزما ہوئی۔ اور سنہ ۱۷۷۵ء میں بسانہ کی لڑائی میں جو دہلی سے ساٹھ میل جانب دکن واقع ہے۔ راجہ مذکور کو ہزیمت ہوئی۔ اور اُس نے اطاعت قبول کی۔ پھر آگرہ کو مرہٹوں کے حملہ سے بچانے کے لئے سمرو وہاں کا دوبارہ گورنر مقرر ہوا۔ اور اسی عہدہ پر مامور تھا۔ جب ۴ مئی سنہ ۱۷۷۸ء کو اُس نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

سمرو ایک بہادر سپاہی تھا جو شیخی اور دکھاوے سے نفرت کرتا تھا۔ سادہ لباس پہنتا تھا اور اپنے سپاہیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ رکھتا تھا۔ اوس میں وہ تمام صفات موجود تھیں جن کے باعث سپاہی اپنے افسر کے ساتھ محبت اور عظمت سے پیش آتے ہیں رومن کیتھولک فرقہ کے قبرستان واقعہ آگرہ میں اُس کا مقبرہ اب تک موجود ہے۔ جسکی تاریخ وفات فارسی حروف میں کندہ ہے۔

سمرو کی وفات کے بعد اُس کے ماتحت یورپین افسروں اور ہندوستانی سپاہیوں نے شاہ عالم

بادشاہ کو عرضی دی۔ کہ سمرو کی جگہ اس کی بیوہ زیب النساء اس کی دستہ فوج کی حکمراں قرار دی جائے۔ شاہِ عالم بادشاہ نے جو زیب النساء کی اعلیٰ قابلیت سے واقف تھا۔ یہ درخواست قبول کی۔ اور سردہنہ کی جاگیر بیگم سمرو کے نام برقرار رکھی۔ سمرو کی وفات کے تین سال بعد بیگم سمرو، مئی ۱۷۸۱ء کو اصطباغ لیکر عیسائی ہوگئی۔ اور جوانا اس کا عیسائی نام رکھا گیا۔ اسی زمانہ میں سمرو کا لڑکا ظفریاب خاں بھی عیسائی ہوگیا اور اس کا عیسوی نام والٹر بیلتھزر رینارڈ رکھا گیا

۱۷۸۷ء میں ضابطہ خاں کا لڑکا غلام قادر دہلی اس غرض سے آیا کہ اپنے معزول باپ ضابطہ خاں کا منصب امیر الامراء حاصل کرے۔ اور جب اُس کی یہ مراد بر نہ آئی تو اُس نے علانیہ بغاوت اختیار کی۔ مرہٹہ فوج سے ملکر جو اس وقت بادشاہ کی کمزوری کی وجہ سے شہر دہلی پر قابض تھی۔ شاہی محل پر قابض ہوگیا اور بادشاہ کو قید کر لیا۔ یہ خبر سنکر بیگم سمرو جو اسوقت پانی پت میں سکھوں کے حملہ کی مدافعت کر رہی تھی۔ بادشاہ کو بچانے کے لئے دہلی آئی۔ غلام قادر نے جب اُس کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ اسوقت مغلیہ سلطنت پر قبضہ کرنیکا بہت اچھا موقعہ ہے۔ آؤ اس کو ہم تم آپس میں نصفا نصف تقسیم کرلیں۔ تو بیگم نے اس کا جواب توپوں سے دیا۔ یہ توپخانہ بیگم نے قلعہ کے سامنے بادشاہ کی حفاظت کے واسطے قائم کیا تھا۔ غلام قادر خاں نے بھی ترکی بترکی جواب دیا۔ مگر بالآخر بیگم کے مقابلہ کی تاب نہ لاکر معہ اپنی فوج کے بھاگ گیا۔ اور اس حسن خدمت کے صلہ میں شکر گذار بادشاہ نے بیگم کو "دختر نیک اختر سلطنت مغلیہ" کا خطاب دیا۔

پھر ۱۷۸۸ء میں جب ریواڑی کے قریب نجف قلی خاں سے لڑائی ہو رہی تھی۔ اور بادشاہ معہ بیگم سمرو اور بیگم کی تین رجمنٹوں اور ایک توپخانہ کے محاصرہ کر رہا تھا۔ تو ایک روز علی الصباح محصور فوج نے نکل کر ایسا حملہ کیا کہ قریب تھا کہ بادشاہ معہ اپنے کنبہ کے گرفتار ہو جائے۔ مگر بیگم فوراً خبر پاکر موقعہ پر پہنچ گئی۔ اور بیگم کے کمانڈر جارج ٹامس کے دستہ فوج لے آگے بڑھ کر بندوقوں کی ایسی باڑھ ماری۔ کہ محصورین پسپا ہوگئے۔ پھر شاہی فوج نے کمک پر پہنچ کر وہ قلعہ جس پر نجف قلی خاں قابض تھا فتح کر لیا۔ اس تمام لڑائی میں بیگم سمرو ایک پالکی میں سوار ہوکر اپنی فوج کی خود کمان کرتی رہی۔ فتح کے بعد بادشاہ نے دربار منعقد کیا اور اسمیں بیگم کا خاص طور پر شکریہ ادا کیا اور ایک گرانبہا خلعت کے علاوہ ایک پرگنہ بادشاہ پور جو دہلی سے جانب دکن لب دریا جمن واقع ہے۔ بیگم کی جاگیر میں اضافہ کیا۔ اس کے بعد نجف قلیخان نے اپنے قصور کی معافی چاہی اور بیگم سمرو سے اپنی سفارش کرائی۔ تو بادشاہ نے وہ سفارش قبول کر کے نجف قلی خاں کا قصور معاف کر دیا۔

سمرو کی وفات کے بعد اس کے ماتحت افسران فوج میں کتنی دفعہ باہم مناقشات برپا ہوئے اور چند مرتبہ سپاہیوں نے بھی سرکشی اختیار کی اسلئے بیگم سمرو کو اس کے خیرخواہوں نے یہ صلاح دی کہ اس کو عقد ثانی کر لینا چاہیئے تاکہ اس کا جدید شوہر فوج کا انتظام خاطر خواہ کر سکے۔ جارج ٹامس نے جو بیگم کی فوج میں ۱۷۸۷ء میں داخل ہوا تھا۔ اور ۱۷۹۳ء میں ترقی پا کر سپہ سالار ہو گیا تھا۔ اس موقعہ پر بیگم کے پاس شادی کا پیام بھیجا۔ مگر بیگم نے منظور نہیں کیا۔ اور اپنی فوج کے ایک فرنیچ افسر لو لیسو سے ۱۷۹۳ء میں عقد ثانی کر لیا۔ اس عقد کے بعد جارج ٹامس مستعفی ہو کر دہلی چلا گیا۔ اور سمرو کے لڑکے ظفر یاب خاں سے جو اب شاہی فوج میں نواب منظور اللہ کے لقب سے کمان کرتا تھا جا ملا اور دونوں نے یہ کوشش کی کہ سمرو کی فوج کو بیگم اور جدید شوہر دونوں سے برگشتہ کر دیا جائے اور بجائے بیگم کے سمرو کا لڑکا نواب منظور الدولہ جاگیر پر قابض ہو جائے۔ اس کوشش میں ایک حد تک کامیابی ہوئی کیونکہ بیگم کا عقد ثانی عام طور پر اس کی فوج والوں کو ناگوار تھا اور ان کا یہ خیال تھا کہ سمرو کی عزت اور شہرت کو بیگم نے عقد ثانی کر کے بٹہ لگایا اور یہ اندیشہ تھا کہ سردہنہ کی جاگیر جو فوج کے قائم رکھنے کے لئے عطا ہوئی تھی ایک غیر شخص کے ہاتھ لگ کر برباد ہو گی۔ اسکے علاوہ لو لیسو اگرچہ ایک قابل شخص تھا۔ مگر کسی قدر مغرور اور نامصلحت اندیش تھا اس لئے اپنے افسروں اور سپاہیوں کو راضی نہ رکھ سکا۔ بالآخر بیگم نے ناامید ہو کر مہاراجہ سندھیا سے معاملہ کرنا چاہا۔ اور اس کے شوہر لو لیسو نے سر جان شور گورنر جنرل کو لکھا کہ چندر نگر تک جانے کی اس کو پروانگی دی جائے۔ قبل اس کے کہ جواب آئے۔ اس خط و کتابت کا راز باغی فوج پر کھل گیا جس نے معہ اپنے فرانسیسی سردار مسمی لینترڈا کے علم بغاوت بلند کیا اور سمرو کے لڑکے کو دہلی سے بلا بھیجا۔ یہ خبر سنکر بیگم اور اس کے شوہر نے رات کو چپکے سے بھاگ جانیکا قصد کیا۔ رات کو وہ دونوں سردہنہ سے صرف تین میل کے فاصلہ موضع گروا تک پہنچے تھے کہ باغی فوج کے ایک دستہ نے تعاقب کر کے ان کو آلیا۔ بیگم ایک پالکی میں اور لو لیسو گھوڑے پر سوار تھا۔ لڑائی کی افراتفری میں یہ دونو علیحدہ ہو گئے۔ بندوقوں کی آواز سنکر بیگم نے خیال کیا کہ اس کا شوہر مارا گیا۔ اور اس اندیشہ سے کہ اس کی موت کے بعد خود بیگم کے ساتھ اس کی سپاہی بدسلوکی سے پیش آئینگے بیگم نے ایک خنجر اپنے سینہ میں مارا۔ ہمراہی خادمات نے شور و واویلا شروع کیا۔ لو لیسو نے دریافت کیا تو کسی نے یہ کہدیا کہ بیگم نے خودکشی کر لی۔ اس نے دو دفعہ پوچھا اور دونوں دفعہ یہی جواب پایا۔ یہانتک کہ بیگم کے ایک خادم نے بیگم کا خون آلود نقاب اٹھا کر لو لیسو کو دکھلا دیا۔ یہ دیکھ کر لو لیسو نے اپنے قبور سے ایک پستول نکال کر

بہ صرف سطحی زخم لگا تھا۔ البتہ خون زیادہ نکلنے سے بیگم بیہوش ہو گئی تھی۔ اس حالت میں بیگم کو اٹھا کر باغی سردہنہ لیگئے۔ اور کئی روز تک اُسے توپ کے مونہہ سے باندھے رکھا۔ بالآخر ایک فرانسیسی افسر سالیسر کی سفارش سے کھولکر قید خانہ میں داخل کر دیا۔ اس درمیان میں سمرو کا لڑکا دہلی سے آکر سردہنہ کی جاگیر پر قابض ہو گیا۔ بیگم نے قید خانہ سے مہاراجہ سندھیا اور اس کے مرہٹہ حکمران دہلی کے پاس پیام بھیجے۔ جارج ٹامس نے جو اسوقت دہلی میں مہاراجہ سندھیا کی سپاہ میں ملازم تھا جب بیگم کے ساتھ اس بدسلوکی کا حال سنا تو باغی فوج سے کہلا بھیجا۔ کہ اگر بیگم اس صدمہ سے مر گئی تو اس کی ساری فوج برخاست کر دیجائیگی۔ اور جو جاگیر فوج کے مصارف کیواسطے عطا کی گئی ہے۔ فوراً ضبط کر لی جائیگی مہاراجہ سندھیا کے افسروں نے بھی اس قسم کے پیام باغی افسروں کے پاس بھیجے۔ سالیسر نے بھی باغی افسروں کو سمجھایا کہ نمک حرامی سے باز آئیں مرہٹہ حاکم دہلی نے ایک دستہ فوج کا بسرکردگی جارج ٹامس ان باغیوں کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ جب یہ فوج کنتولی پہنچی۔ تو اکثر باغی تائب ہوکر بیگم کی خدمت میں اپنا قصور معاف کرانے حاضر ہوئے۔ تھوڑی دیر بعد جارج ٹامس نے سردہنہ پہنچکر ظفریاب خاں کو گرفتار کر لیا۔ اور جارج ٹامس کی ہدایت کے مطابق ایک محضر نامہ تیار کیا گیا جسمیں بیگم کے تیس یورپین افسروں وغیرہ نے بحلف اقرار کیا۔ کہ آیندہ سوائے بیگم سمرو کے اور کسی کو اپنا افسر نہ بنائیں گے۔ اس کے بعد بیگم کو مہاراجہ سندھیا کے ایک افسر نے پھر سردہنہ کی گدی پر بٹھایا۔ اس موقعہ پر بیگم نے ایک لاکھ پچاس ہزار روپیہ نذرانہ مہاراجہ سندھیا کو بطور پیش کش بھیجا اور سالیسر کو اپنی فوج کا کمانڈر مقرر کیا۔ اور جارج ٹامس کی شادی اپنی ایک فرنیچ سہیلی کے ساتھ کر دی اور اس کو نہایت گرانبہا جہیز دیا۔ اس واقعہ کے بعد بیگم نے اپنی تمامتر ہمت نظم و نسق جاگیر میں صرف رکھی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ پھر کوئی بغاوت نہیں ہوئی

سنہ ۱۸۰۲ء میں بیگم سمرو مہاراجہ سندھیا سے ملنے آگرہ گئی۔ سندھیا اسوقت شاہ دہلی کا وزیر کہلاتا تھا مگر درحقیقت شمالی ہندوستان کا بادشاہ تھا۔ بیگم کی فراست اور قابلیت دیکھکر وہ بہت تعظیم و تکریم سے پیش آیا۔ اور سکھوں کی مدافعت بیگم کے سپرد کی۔

سنہ ۱۸۰۳ء میں جب انگریزوں نے مرہٹوں کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ تو بیگم کی فوج بسرکردگی سالیسر سندھیا کو کمک دینے آئی اور آسائی کی مشہور لڑائی میں کرنل ویلزلی کی فوج سے نبرد آزما ہوئی۔ اسی کرنل ویلزلی نے ہندوستان سے واپس جاکر واٹرلو میں نپولین اعظم کو شکست دی تھی۔ اور ڈیوک آف ویلنگٹن کا خطاب حاصل کیا تھا۔

سنہ ۱۸۰۵ء میں بیگم سمرو نے انگریزوں سے صلح کر لی۔ جس کی رو سے جاگیر سردہنہ پر بیگم کا حق مادام الحیات تسلیم کیا گیا۔ اسی لئے بیگم کی وفات پر یہ جاگیر ضبط ہو گئی۔ سنہ ۱۸۰۳ء کی صلح کے بعد بیگم کی فوج صرف

جاگیر کی حدود کے اندر امن و امان قائم رکھنے کے لئے کام میں آتی تھی۔ البتہ سنہ ۱۸۲۵ء میں جب انگریز راجہ بھرت پور سے لڑ رہے تھے۔ تو بیگم معہ اپنی فوج کے محاصرہ اور فتح بھرت پور میں شریک ہوئی جس کا سلطنت انگلشیہ نے بعد ختم جنگ شکریہ ادا کیا۔

سردہنہ میں بغاوت فرو ہونے کے بعد سمرو کا لڑکا ظفریاب خاں قید کر کے دہلی بھیج دیا گیا۔ اور وہاں بیگم کے ایک محل میں مقید رہا۔ اوائل سنہ ۱۸۰۳ء میں ظفریاب خاں نے ہیضہ ہو کے انتقال کیا۔ اس کی نعش کو لوگ آگرہ لے گئے اور اپنے باپ سمرو کے پہلو میں ظفریاب خاں دفن ہوا۔

ظفریاب خاں کی شادی کیپٹن لفیور کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ اُس کی اولاد میں صرف ایک لڑکا اور ایک لڑکی جولیا تھی لڑکا ظفریاب خاں کی حیات میں مر چکا تھا جولیا کی شادی ۸۔ اکتوبر سنہ ۱۸۰۶ء کو کرنل ڈائس سے ہوئی جو سالیہ کے مستعفی ہونے کے بعد بیگم کی فوج کا سپہ سالار ہو گیا تھا۔ جولیا نے ۱۳ جون سنہ ۱۸۲۰ء کو انتقال کیا اور ایک لڑکا اور دو لڑکیاں چھوڑیں۔ لڑکیوں کی شادی بعد بلوغ بیگم نے اپنی فوج کے دو یورپین افسروں سے کر دی اور لڑکے کو جس کا نام ڈیوڈ آکٹرلونی ڈائس سومبر اور جو سومبر اول کا پڑپوتا ہوتا تھا بیگم نے متبنیٰ کر لیا۔ اور اپنا وارث قرار دیا۔

عیسائی ہونے کے بعد بیگم کے خیالات مذہبی ہو گئے تھے۔ اور سردہنہ میں قریب دو ہزار عیسائیوں کے جمع ہو گئے تھے۔ وہاں ایک بڑا گرجا بیگم نے تعمیر کرایا تھا جو اب تک اُس کی عظمت اور شوکت کی یادگار ہے۔

یہ گرجا ایک اطالین افسر میجر ریگلینی نے چار لاکھ روپیہ کے صرفہ سے تعمیر کیا تھا۔ اور سنہ ۱۸۲۲ء میں اس کا افتتاح ہوا۔ اس گرجا کا اندرونی آلٹر (پرستش گاہ) جے پور کے سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے اور اس میں قیمتی پتھروں سے پچی کاری کی گئی ہے۔ فرش کا ایک حصہ بھی سنگ مرمر سے بنا ہوا ہے۔ گرجا کے اوپر دو چھوٹے اور دو بڑے مینار ہیں جن میں گھنٹہ لگا ہوا ہے۔

گرجے کے تعمیر کرنے کے بعد بیگم سمرو نے ایک عالیشان محل اپنے واسطے بنوایا۔ اور دوسرا اس سے کسی قدر چھوٹا دہلی میں بنوایا جو عرصہ تک دہلی لندن بنک کے قبضہ میں تھا۔ اور اب ایلائنس بنک واقعہ دہلی کی جدید عمارت کے پشت پر واقعہ ہے۔ ان کے علاوہ بیگم نے میرٹھ میں فرقہ کیتھلک کے لئے ایک گرجا اور ایک بڑا بنگلہ اور چند پل اور دیگر عمارات بغرض رفاہ عام تعمیر کرائیں۔ جن میں بیگم کا پل میرٹھ میں اب تک مشہور ہے۔ سردہنہ کا محل نہایت عمدہ تصاویر سے آراستہ تھا۔ یہ تصاویر زیادہ تر بیگم کے عزیزوں اور افسروں کی تھیں۔ ب سے پچیس برس پیشتر جب سردہنہ کا محل نیلام ہوا۔ تو قبل نیلام یہ تصاویر لیڈی فارسٹر نے لی تھیں۔ محل مع باغ ملحقہ کے سنہ ۱۸۹۵ء میں کیتھولک مشن آگرہ نے ۲۵ ہزار روپیہ میں خرید کیا۔ اب اس محل میں عیسائیوں کا ایک یتیم خانہ ہے۔

عیسائی ہونے کے بعد عرصہ تک بیگم سمرو پس پردہ رہی ۔ اگرچہ اپنی فوج کے ساتھ وہ زیادہ تر سفر میں رہتی تھی ۔ تاہم شرفاء ہند کی رسم پردہ کو اُس نے قائم رکھا ۔ اور وہ اپنا تمام کام اور نظم و نسق جاگیر پردہ کے پیچھے بیٹھکر انجام دیتی تھی ۔ البتہ اپنے شوہر سمرو کے زمانہ سے اعلےٰ افسروں کے ساتھ کھانے پر شریک ہوا کرتی تھی ۔ مگر اب بہت بوڑھی ہونے کے بعد اس قدر پابند نہیں رہی تھی اور اپنے محلات واقعہ سردھنہ اور دہلی میں وہ اکثر یورپین افسروں کو مدعو کرتی تھی اور وایسرائے اور کمانڈر انچیف کی دعوتوں میں خود بھی جاتی تھی ۔ باوجود اسکے کھانے اور لباس اور طرز معاشرت میں بیگم نے کوئی تبدیلی نہیں کی ۔

۱۷ مئی ۱۸۳۵ء کو جو خریطہ ہز ایکسیلینسی لارڈ ولیم بنٹنک وائسرائے ہند نے بیگم کو بھیجا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وائسرائے اُس کی کس قدر عزت کرتے تھے ۔ اس خریطہ میں بیگم سمرو کو وائسرائے نے یور ہائینس لکھکر مخاطب کیا ہے ۔ اور یہ لکھا ہے کہ میں کل انگلستان واپس جا رہا ہوں مگر ہندوستان چھوڑنے سے پہلے میرا فرض ہے کہ میں اُس سچی عزت اور قدر و منزلت کا اظہار کروں جس کے آپ مستحق ہیں اور آپ اور دیگر والیان ملک کے لئے جو اپنی رعایا کی نفع رسانی میں مصروف ہیں میں دست بدعا ہوں ۔

لارڈ ولیم بنٹنگ کی واپسی سے دس مہینہ کے اندر بیگم سمرو بیمار ہوئی اور چند روز کی علالت کے بعد ۲۷ جنوری ۱۸۳۶ء کو سردھنہ میں مرگئی اور اُس گرجا میں مدفون ہوئی جس کا ذکر اوپر آچکا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ وہ غیر معمولی قابلیت کے ساتھ مردانہ عزم رکھتی اور نہایت رحم دل اور نیک نفس عورت تھی ۔ اپنی ریاست میں اُس نے امن و امان قائم رکھا اور زبردستوں کو متمول اشخاص کے جور و تعدی سے ہمیشہ محفوظ رکھا ۔ اپنی مالگذاری بلا جبر وصول کی ۔ تجارت اور زراعت کو اس کے زمانہ میں نہایت فروغ رہا ۔ ایام قحط میں کاشتکاروں کو روپیہ اور غلہ نہایت فراخ دستی سے دیتی تھی اور اپنی رعایا کی آسودگی اور بہبود کی ہمیشہ خواہاں اور جویاں تھی ۔ ان محاسن کا یہ نتیجہ تھا ۔ کہ اس کی وفات پر اس کی تمام جاگیر میں واویلا کا شور بلند ہوا اور دور دور سے اُس کی رعایا اس کی زیارت کے لئے جوق جوق حاضر ہو کر دست بدعا ہوئی ۔ بیگم نے ایک لاکھ روپیہ سردھنہ کی جاگیر کی مرمت کے لئے اور ایک لاکھ سردھنہ کے مدرسہ یا دربان کے واسطے اور پچاس ہزار سردھنہ کے مفالیس کے واسطے چھوڑا ۔ کلکتہ ۔ بمبئی اور مدراس کے کیتھولک مشن کے واسطے ایک ایک لاکھ روپیہ ۔ آگرہ کے مشن کے واسطے تیس ہزار روپیہ اور میرٹھ کے گرجا کے واسطے بارہ ہزار روپیہ چھوڑا ۔ اس کے علاوہ ڈیڑھ لاکھ روپیہ اُس نے پاپائے روم کو خیرات کی غرض سے بھیجا ۔ اور پچاس ہزار روپیہ کلکتہ بھیجا ۔ تاکہ وہاں غربا میں تقسیم کیا جائے اور غریب

مدیونوں کا قرضہ ادا کرکے ان کو جیلخانے سے چھڑایا جاوے۔ سردہنہ کے گرجا مدرسہ اور یتیم خانہ وغیرہ کے لیے جو گرانبہا رقم بیگم سمرو نے سرکار انگلشیہ میں جمع کر دی تھی اس کا منافع اب بھی ان عمارات کی مرمت شکست و ریخت میں صرف ہوتا ہے اور اس کا اہتمام ایک کمیٹی کرتی ہے جسکے صدر نشیں صاحب کمشنر صاحب بہادر قسمت میرٹھ ہیں

مسٹر ڈائس سومبر نے بیگم کی روح کے نجات کے لیے ۲۷ جنوری ۱۸۳۶ء کو روم کے گرجا میں نماز کا اہتمام کیا۔ اور یہیں گرجا کے لئے وہ سنگ مرمر کے مجسمے تیار کرائے جو اب تک گرجائے سردہنہ کے زیب و زینت اور باعث شہرت ہیں۔ یہ مجسمے قد آدم سنگ رخام سے تیار کئے گئے ہیں۔ ایک اونچے تخت پر بیگم کا مجسمہ متمکن ہے۔ بیگم ہندوستانی لباس میں تخت پر بیٹھی ہے اور اس کے ہاتھ میں شاہ عالم بادشاہ کا وہ فرمان ہے جس کی روسے جاگیر سردہنہ اس کے نام بحال رکھی گئی تھی۔ تخت سے نیچے داہنی جانب بیگم کے پرپوتے ڈائس سومبر اور بائیں جانب اس کے وزیر دیوان رائے سنگھ کے مجسمے ہیں۔ تخت کے پیچھے ایک جانب بیگم کے ایڈیکانگ عنایت اللہ اور دوسری جانب بشپ سیمز کے مجسمے ہیں۔

تخت کے نیچے تین جانب تین سنگ مرمر کی لوحیں نصب ہیں ان الواح پر ابھری ہوئی مورتیں کندہ ہیں۔ سامنے کی لوح پر گرجائے افتتاح کی رسم کندہ ہے۔ بیچ میں بشپ بیٹھا ہوا ہے اور بیگم معہ اپنے ہمراہیان کے تحایف لیکر بشپ کیطرف آرہی ہے۔ تخت کی داہنی جانب کی لوح پر ایک جلوس کندہ ہے جسمیں بیگم سمرو ایک ہاتھی پر سوار ہے۔ ان کے علاوہ چھ مجسمے اور ہیں داہنی طرف پہلا مجسمہ ایک عورت کا ہے جو ایک پتھر پر اپنا پیر رکھے ہوئے ہیں۔ یہ مجسمہ عزم اور شجاعت ظاہر کرتا ہے۔ دوسرا مجسمہ ایک عورت کا ہے جو اپنے جسم پر ایک چادر لپیٹے ہوئے اور اپنے داہنے ہاتھ میں ایک سانپ لئے ہوئے غور اور فکر میں مستغرق ہے۔ یہ مجسمہ پیش بینی کا ہے۔ تیسرا مجسمہ وقت کا ہے۔ جسمیں ایک فرشتہ ایک شیشہ ریگ ہاتھ میں لئے ہوئے بیگم کیجانب بڑھ رہا ہے۔ اور دوسرے ہاتھ سے شمع حیات کو گل کر رہا ہے۔ شیشہ میں ریگ سے اوپر کا نصف حصہ خالی ہو گیا ہے۔ گویا کہ حیات مستعار باقی نہیں رہی۔ تخت کی بائیں جانب پہلا مجسمہ ماں کی مامتا ظاہر کرتا ہے جسمیں ایک عورت اپنے شیرخوار بچہ کو دودھ پلا رہی ہے اور اس کے آگے ایک اور لڑکا کھڑا ہوا ایک سیب پیش کر رہا ہے جو ثمر محبت خیال کیا جاتا ہے۔ دوسرا مجسمہ ایک عورت کا ہے جس کا چہرہ بشاش ہے اور جس کے ہاتھ میں ایک گلدان انواع و اقسام کے اثمار اور غلوں کی بالوں سے بھرا ہوا ہے اور وہ ایک گلدستہ پیش کر رہی ہے یہ مجسمہ فراوانی اور اچھے سمے کا ہے۔ تیسرا مجسمہ رنج کی تصویر ہے۔ یہ مجسمے صنعت سنگتراشی کے اعلیٰ نمونے قابل دید ہیں اور ایسے ہیں کہ شمالی ہندوستان میں اس نواح کے گرجاؤں میں دور دور تک اپنا نظیر نہیں رکھتے۔ اسلئے سردہنہ اُنپر جسقدر فخر کرے بجا ہے۔

محمد احمد شیبانی، ایم۔ اے

قند پارس

دریں ایام خوش عنوان چناں فضل خدادارم ۔ کہ از الطاف و اکرامش نگارے مہ لقا دارم

نہ یارے نے مددگارے نہ کس مشکل کشا دارم ۔ کرم کن تکیہ بر تو اے محمد مصطفےٰ دارم

گریبان الم چاک ست و جوش وحشت افزاید ۔ چنیں جوش جنوں در سر الٰہی از کجا دارم

بیاد مصحف رخسار تو اے آیۂ خوبی ۔ بہ پیش چشم من ہر دم کتاب عشق وا دارم

مرا دردیست پنہاں تو بروا اے حاذق نادل ۔ نمی دانی علاج ما کہ دردے لا دوا دارم

ہوائے طرۂ مشکیں دل بیمار مے خواہد ۔ نے آرد کسے یا من مگر باد صبا دارم

کلام رسا

نہ یہ سننے کے لائق ہے نہ یہ کہنے کے قابل ہے ۔ حدیث عشق نے دل کو مرے اب کر دیا سل ہے

مرے آگے ہزاروں دل وہ رکھکے مجھ سے کہتے ہیں ۔ یہ لو پہچان لو ان میں تمہارا کونسا دل ہے

کہا کرتے ہیں وہ طنزاً اسیرا دل لیکے مٹھی میں ۔ تو کس دعوی سے کہتا ہے میرا دل ہی میرا دل ہے

اسیران محبت کو وہ دیکھیں راہ الفت میں ۔ کہیں سر ہے کہیں ہے دست و بازو اور کہیں دل ہے

رسا ہے ششش جہت وہ دیکھ کر ششدر نہ ہو جائے ۔ دم تزئین اس نے آینہ رکھا مقابل ہے

شیرۂ شیراز

چوں تو در خندۂ پنہاں دم عیسےٰ داری ۔ لب کشا ۔ گر غرض زندگی ما داری

قامتت سرو ۔ لبت غنچہ دو چشمت نرگس ۔ بسر گلگشت چمن را چہ تمنا داری

چوں تواں کرد متاع دل و جاں از تو نہاں ۔ با سپاہ خط و خال از سر یغما داری

مے سزد گر بکنی دعوی خوبی کامروز ۔ شاہداں شاہد رخسارۂ زیبا داری

ما گراز ہجر تو اے رشک مسیحا مردیم ۔ سر تو باد سلامت تو چہ پروا داری

اے صبا شرح مکن قصۂ آں زلف مگر ۔ میل آشفتن ایں خاطر شیدا داری

احمد امروز چہ آتش بدلت افتادست ۔ کہ سر سوختن عالم بالا داری

گنور کی رانی

وسط ہند کی ریاستوں میں گنور ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ جب مغلیہ خاندان کا آفتاب اقبال چمکا۔ تو پٹھان دہلی سے جلا وطن ہو کر ہندو راجاؤں کی ریاستوں پر تسلط جمانے لگے سان

[redacted]

انہیں میں سے ایک خان نے گنور میں قیامت برپا کر دی۔ راجہ نے میدان میں نکل کر خوب مقابلہ کیا۔ لیکن خدا کو کچھ اور منظور تھا۔ راجہ اور اُس کے جاں نثار ہمراہی تمام کام آئے۔ بہادر رانی نے خاوند کے مرنے کی خبر سنی اور زرد ہو گئی۔ مگر کسی نے اُسے روتے نہ دیکھا۔ وہ فوراً زرہ پہنکر۔ ایک صبا رفتار گھوڑے پر سوار ہوئی اور اپنے رہے سہے نمک خواروں کو ہمراہ لیکر خان کی فوج پر حملہ آور ہوئی۔ لیکن کہاں خان کا لشکر جرار اور کہاں یہ چند مفلوک جاں نثار۔ یکایک ایک دن صبح دم جبکہ رانی مندر میں پوجا کر رہی تھی۔ پٹھان سیڑھیاں لگا کر قلعہ کی فصیلوں پر چڑھ گئے اور رانی کے نگہبانوں سے چھری کٹاری ہو گئے۔ جو سامنے آیا اُسے مار گرایا۔ اب کیا ہو سکتا تھا۔ رانی نے پناہ مانگی۔ اور خان کو کہلا بھیجا کہ ہم تابع فرمان ہیں۔ ناحق خون کے نالے نہ بہاؤ۔

۲

خان رانی کے حسن و جمال کا شہرہ سن چکا تھا۔ بہت خوش ہوا اور کہلا بھیجا کہ اب تم میری کشور دل کی ملکہ ہو۔ پہلے رانی تھی۔ اب مہارانی کہلاؤ گی۔ اس ریاست کا راج تمہیں مبارک رہے۔ مجھے اپنی غلامی میں قبول کرو۔ رانی نے جواب دیا کہ منظور ہے ایک دن کی مہلت مل جائے ہم نے سامان درست کرنا ہے۔ ہماری مرضی ہے۔ کہ آپکا استقبال آپ کی شان کے مطابق ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک کنیز ایک بیش بہا پوشاک اور ایک یاقوت نگار ہار رانی کی طرف سے لیکر خان کی خدمت میں آئی اور عرض کی کہ رانی کی خواہش ہے کہ حضور یہ لباس زیب تن فرما کر قدم رنجہ فرمائیں۔ خان کی باچھیں کھل گئیں سر شام وہ بڑے طمطراق اور جاہ و جلال سے ۔ ۔ ۔ محل سرا میں داخل ہوا۔ رانی کا محل بر لب دریا قلعہ کی فصیل سے لگا ہوا تھا۔ رانی ایک غرفہ کے قریب طاؤس طناز کی طرح کھڑی تھی۔ اُسکے ارد گرد کئی سہیلیاں بناؤ سنگھار کئے کمخواب سے ڈھپی ہوئی گٹھڑیوں پر بیٹھی تھیں۔ ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک مشعل تھی۔ خان آیا۔ اور ایک تخت پر بیٹھ گیا۔ رانی نے شکریہ ادا کیا۔ سہیلیوں نے پان اور شربت سے تواضع کی دفعتاً خاں کی حالت بدلنے لگی۔ دیکھتے دیکھتے بدن میں آگ لگ گئی۔ رانی نے آگے بڑھ کر کہا۔ صاحب آپ کی زندگی ختم ہو چکی یہ لباس جو آپ پہنے ہوئے ہیں۔ زہر آلود ہے۔ یہ گرمی زہر کی ہے۔ اب کوئی دم میں آپ اپنے ظلم کی سزا پائینگے۔ یہ کہا اور کھڑکی سے دریا میں کود پڑی۔ اس کے کودتے ہی سہیلیوں نے گٹھڑیوں کو جو دراصل بارود کے تھیلے تھے۔ اپنی اپنی مشعل سے چھو دیا۔ پھر کیا تھا۔ ایک خوفناک دھماکا ہوا۔ قلعہ ہلنے لگا۔ اس کمرے کی چھت اڑ گئی۔ دھوئیں سے اندھیرا گھپ ہو گیا۔ جب لوگوں کے ہوش بجا ہوئے۔ اور وہ وہاں پہنچے۔ تو دیکھا کہ اس کمرہ میں چند نیم سوختہ لاشے پڑے تھے اور خان کی نعش تو پہچانی نہیں جاتی تھی

تباشیر سحر

پھٹا پڑتا ہے جوبن ای تباشیر سحر تیرا بلائیں لے رہی ہی سرخ روئی تیری رنگت کی
رخ روشن کا غازہ ہے لب نازک کا لاکھا ہے دلوں کو گدگداتی ہے تیری شوخی قیامت کی
بہار روئے گل ہے لالۂ احمر کا زیور ہے بلا لیں لعل رماں کو جو حاجت ہے شہادت کی
کسی ہندو کا قشقہ ہے کہ محراب مسلماں ہے نشانی ہے عقیدت کی علامت ہے عبادت کی
ہوا خوری کو زہرہ پان کھا کر گھر سے نکلی ہے الٰہی شعبدہ بازی نہ ہو میری بصارت کی
میری آنکھوں سے دیکھیں دیکھنے والے تجھے آ کر کہ تو تفسیر ہے نام خدا قرآن وحدت کی
پھریرا سرخ لہراتا ہے اردوئے مسرت کا ہوا سے اڑ رہی ہے اوڑھنی حور ملاحت کی
اڑا لائی ہے کیا باد صبا پریوں کا گلگونہ ہتھیلی ہے حنا مالیدہ شاید دست قدرت کی
فلک یاد شہیدان وفا میں خون روتا ہے دکھاتا ہے کوئی تصویر یا وقت شہادت کی
کسی نے آب زمزم جاں کے قلزم میں ملایا ہے سیاہی ڈھلتی جاتی ہے شب تاریک کلفت کی
کلید باب قصر نور ہے تو اے جہاں آرا سنہری گوٹ ہے یا دامن پیک سعادت کی
مثال ہدہد ملک سبا پیغام لائی ہے سواری آنے والی ہے کسی بلقیس صورت کی
کہا بلقیس میں نے میرا مطلب صبح روشن ہے کہ جس سے گرد اڑ جاتی ہے صحرائے نحوست کی
مرا سینہ ہے مشرق داغ دل خورشید محشر ہے قسم کھاتے ہیں دیوانے مری شور محبت کی
ترا خورشید خاور میں نے مانا ذرہ پرور ہے مگر تجھ کو نہیں شاید خبر میری طبیعت کی
کسی کے واسطے جلنا روا ہے میرے مذہب میں جلانے کی نہ طاقت ہے نہ عادت ہے خصومت کی
مثال شمع سوزاں جل بجھے بزم محبت میں کبھی ہم نے پتنگوں کے جلانے کی نہ چاہت کی

جگاتی ہے تو پیغام عمل میرے لئے بن جا
کہ میں نے سب سے پہلے تیرا منہ دیکھا زیارت کی

ط . ط